

اَقْلَامُنَا وَنُورُ الْقُرْآنِ

# تَذَكُّرُ قُلُوبِكُمْ

مولانا امین حسن صلامی رحمۃ اللہ علیہ

المُزْمِل ۷۳ — النَّاسِ ۱۱۴



تذکرہ قرآن

جلد نہم



کِتَابُ أَنْزِلْنَا بِرُكْنٍ لَيْدٌ وَالْأَشْهُدُ لَيْتِذْكَرُوا الْإِنْبَاءِ

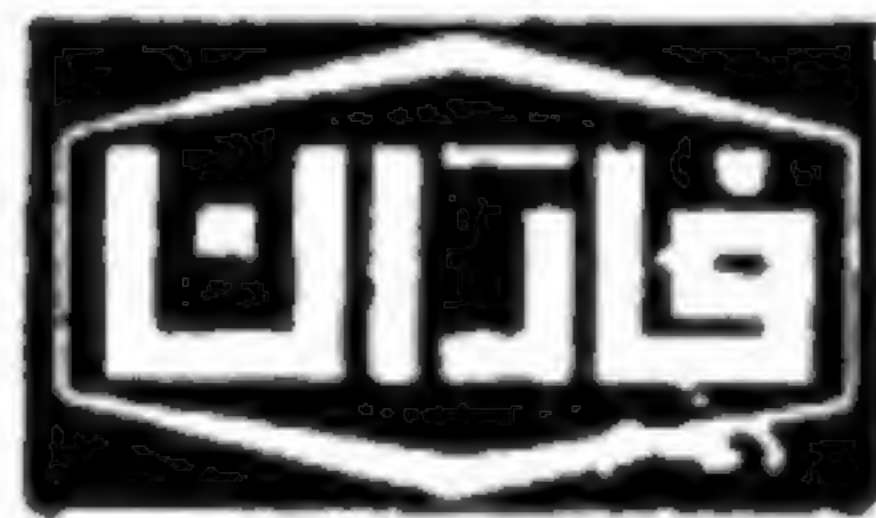
# مَدِيرِ قُرْآن

جلد پنجم

تفاسیر

سُورَةُ مَزْل (۷۳) — تَا — سُورَةُ نَاس (۱۱۴)

امین حسن صمٹلائی



فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان



جملہ حقوق عکس و طباعت محفوظ

اقتسام — حسن خاور

مطبع — فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ —  فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،

ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244

ای میل: faran@wol.net.pk



٤	ديباجه
١٥	تفسير سورة المزمل (٤٣)
٣٥	تفسير سورة المدثر (٤٤)
٦٩	تفسير سورة القيامة (٤٥)
٩٤	تفسير سورة البدر (٤٦)
١٢١	تفسير سورة المرسلات (٤٧)
١٢٩	تفسير سورة النبأ (٤٨)
١٦٤	تفسير سورة التزغلت (٤٩)
١٨٩	تفسير سورة عبس (٥٠)
٢١٣	تفسير سورة التكوير (٥١)
٢٣٣	تفسير سورة الانفطار (٥٢)
٢٣٤	تفسير سورة المطففين (٥٣)
٢٦٥	تفسير سورة الانشقاق (٥٤)
٢٨١	تفسير سورة البروج (٥٥)
٢٩٥	تفسير سورة الطارق (٥٦)
٣٠٤	تفسير سورة الأعلى (٥٧)
٣٢٢	تفسير سورة الغاشية (٥٨)
٣٣٩	تفسير سورة الفجر (٥٩)
٣٦٣	تفسير سورة البلد (٦٠)
٣٤٩	تفسير سورة الشمس (٦١)
٣٩٥	تفسير سورة التيل (٦٢)



٢٠٤	تفسير سورة الضحى (٩٣)
٢٢١	تفسير سورة المرشح (٩٤)
٢٣١	تفسير سورة التين (٩٥)
٢٣٤	تفسير سورة العلق (٩٦)
٢٦١	تفسير سورة القدر (٩٧)
٢٤١	تفسير سورة البينة (٩٨)
٢٨٤	تفسير سورة الزلزال (٩٩)
٢٩٥	تفسير سورة العاديات (١٠٠)
٥٠٤	تفسير سورة القارعة (١٠١)
٥١٤	تفسير سورة التكاثر (١٠٢)
٥٢٤	تفسير سورة العصر (١٠٣)
٥٢١	تفسير سورة الهمزة (١٠٤)
٥٥٢	تفسير سورة الفيل (١٠٥)
٥٦٤	تفسير سورة قريش (١٠٦)
٥٤٤	تفسير سورة الماعون (١٠٧)
٥٨٤	تفسير سورة النكث (١٠٨)
٥٩٩	تفسير سورة الكافرين (١٠٩)
٦١٣	تفسير سورة النصر (١١٠)
٦٢٥	تفسير سورة الهمز (١١١)
٦٣١	تفسير سورة الاخلاص (١١٢)
٦٥٢	تفسير سورة الفلق (١١٣)
٦٦٩	تفسير سورة الناس (١١٤)
٦٤٩	فهرست مضامين



# دیباچہ

(طبع اول)

الحمد للہ ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۹۹۵ء کو تدبیر قرآن کی آٹھویں یعنی آخری جلد کی آخری سطریں سپرد قلم ہوئیں۔ اس کتاب کی تحریر کا کام غالباً میں نے ۱۹۵۵ء میں شروع کیا اور اب ۱۹۸۰ء ہے۔ یعنی کم و بیش تیس سال کے طویل اور پر مشقت سفر کے بعد قلم کا مسافر اپنی آخری منزل پر پہنچا ہے۔ اس طویل سفر میں جن مرحلوں سے گزرنا پڑا اور جن آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا اور میرے رب نے جن جن طریقوں سے ان تمام مراحل میں میری دست گیری فرمائی سے یہ ایک نہایت سبق آموز داستان ہے۔ لیکن اس وقت میں اس کے سنانے میں آپ کا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا، اس کو میں نے اپنے اور اپنے رب کے درمیان ایک راز ہی رکھا ہے اور راز ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ ہر جن موصے اس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ جیسے پچھیر اور بے سرو سامان کو اپنی کتاب عزیز کی ایک ایسی خدمت کی توفیق بخشی جو اس کی عنایت خاص ہی سے کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کی تحریر کا کام تو جیسا کہ عرض کیا، ۱۹۵۵ء میں شروع ہوا لیکن اس کے لیے فکری تیاریوں اس کتاب میں ۱۹۲۵ء سے ہی میں لگ گیا تھا۔ یہی سال ہے جس میں مجھے مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ کا تاریخ حاصل ہوا جس کا سلسلہ پورے پانچ سال قائم رہا۔ اس کے بعد سے قرآن مجید میرے غور و فکر کا مستقل موضوع بن گیا۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ یہ کتاب میری پچپن سال کی کاوشوں کا پتھر ہے۔ لیکن اس میں صرف میرا ہی فکر نہیں ہے بلکہ میرے استاد کا فکر بھی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں ذکر کر چکا ہوں کہ میرا فکر میرے استاد کے فکر سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ استاد مرحوم ہی کے فکر کی توضیح و تکمیل ہے۔ ان کے فکر کے جس حقہ کا تعلق براہ راست قرآن مجید سے ہے میں نے اس کتاب میں اس کو واضح طور پر بیان بھی کیا ہے اور اگر کوئی پہلو مجھے اس کا نشہ محسوس ہوا ہے تو اس کا خلا پر کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ دلائل و حجت اللہ علیہ کے اس فکر کی تاریخ، جہاں تک مجھے علم ہے یہ ہے کہ انھوں نے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں قرآن مجید پر غور کا کام شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحات تک یہ پوری باتا عددگی سے جاری



رہا۔ یہ مدت سب سے بڑی اندازے کے مطابق کم و بیش تیس سو پینتیس سالوں پر مبنی ہے۔ جس کے معنی عدد سر  
لفظوں میں یہ ہوئے کہ تذکرہ قرآن کے کم و بیش چھ ہزار صفحات میں تقریباً ایک صدی کا وہ ٹکڑی مواد آپ  
کے سامنے آیا ہے جس کو آپ نیکر ذرا ہی سے موصوم کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کا نہج اس کتاب کے نہج سے متعلق مقدمہ کتاب میں تفصیل سے واضح کر چکا ہوں کہ اس میں قرآن مجید پر غور  
اور اس کی مشکلات حل کرنے کے لیے براہ راست خور (DIRECT APPROACH) کا طریقہ اختیار کیا گیا  
ہے۔ یعنی تفسیر کا اصل ماخذ قرآن کی زبان، اس کی آیات کے نظام اور اس کے اپنے اندر دنی نظائر و شواہد  
کو قرار دیا گیا ہے۔ مروجہ طریقہ کے مطابق صرف تفسیر کی کتابوں سے نقل اقوال پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے۔  
الفاظ و سالیب کی تحقیق اور نحوی مشکلات میں بھی براہ راست اصل عربی زبان سے رہنمائی حاصل  
کی گئی ہے۔ مجرد اہل تاویل کے اقوال پر اعتماد نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیات کی تاویل و تفسیر میں بھی  
قرآن کی زبان، کلام کے نظام اور قرآن کے نظائر و شواہد کو پوری اہمیت دی گئی ہے۔ کسی قول کو مجرد اس دلیل  
پر نہیں اختیار کیا گیا کہ وہ اگلے اصحاب تاویل سے منسوب ہے چنانچہ اس میں اقوال کی کثرت کے بجائے  
دلائل کی روشنی میں ہر آیت کی ایک معین تاویل سامنے رکھی گئی ہے۔

قرآن کی منطق اور اس کی حکمت کی بنیادیں بھی اس میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اس  
کا عقلی استدلال اور اس کی حجت دل نشین انداز میں سامنے آئے اور متکلمین کے فرسودہ انداز استدلال اور  
قرآن کے فطری طرز استدلال میں جو فرق ہے، وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

تفسیر کی کتابوں، قدیم آسمانی صحیفوں، تاریخ کی کتابوں، اور شان نزول کی روایتوں سے بھی اس  
میں پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لیکن ان کو قرآن کے تحت رکھ کر استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ نہیں  
ہے کہ ان کو قرآن پر حاکم بنا دیا گیا ہو اور قرآن کے الفاظ ان کو قبول کریں یا نہ لیکن ان کو قرآن میں  
گھسانے کی کوشش کی گئی ہو۔

کسی اعلیٰ کلام کا حسن و جمال اس کے نظام اور اس کی ترتیب کے اندر ہی مضمر ہوتا ہے اور اس  
کی قوت استدلال کا انحصار بھی بیشتر اسی چیز پر ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کتاب میں قرآن کا یہ پہلو  
سب سے زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ جو لوگ قرآن کے اندر کسی نظم و ترتیب کے قائل نہیں  
ہیں ان کا یہ سوئے ظن دور ہو۔ اس میں ہر سورہ کے مطالب کا تجزیہ (ANALYSIS) کر کے سورہ کا علم و  
موضوع معین کر دیا گیا ہے، جس سے ہر سورہ منتشر باتوں کے مجموعہ کے بجائے ایک معین موضوع پر ایک  
جامع اور دل نشین خطبہ کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ مطالب کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کا باہمی  
منطقی ربط بھی خود بخود واضح ہو جائے اور علم و دہ کے ساتھ ان کا تعلق بھی بے نقاب ہو جائے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں سورتوں کی زمرہ بندی (GROUPING) جس حکمت پر مبنی ہے اس کا



اصلی سخن و جمال بالکل مخفی تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا رنر اور فلسفہ اس تفسیر میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے دکھایا ہے کہ یہ سورتیں سات گروپوں (زمرات) میں تقسیم ہیں۔ ان میں کئی اور مدنی کی تقسیم اس طرح ہے کہ کئی سورتیں مقدم ہیں مدنی مؤخر۔ نیز ہر سورہ اپنا ایک مشنی بھی رکھتی ہے۔ اگر کہیں اس اصول کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو کسی خاص حکمت کے تحت ہوئی ہے، جس کی وضاحت میں نے کر دی ہے۔ جس طرح ہر سورہ کا ایک معین عمود ہے اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے جو پورے گروپ پر حاوی ہے۔ میرے نزدیک یہ ترتیب منصوص ہے، جس کے دلائل خود قرآن میں موجود ہیں اور میں ان کی وضاحت کی ہے۔

اس تفسیر کی خصوصیات جب میں نے مقدمے میں بیان کی تھیں تو اس وقت اس کی صرف پہلی جلد لوگوں کے سامنے آئی تھی، اس وجہ سے ممکن ہے بہت سے لوگوں کو یہ باتیں انوکھی محسوس ہوئی ہوں، لیکن اب خدا کے فضل سے سورۃ فاتحہ سے لے کر سورۃ ناس تک کی پوری تفسیر آپ کے سامنے ہے۔ اس کو پڑھ کر جانچیں کہ جن اصولوں کا میں نے مقدمہ میں حوالہ دیا ہے، ان پر یہ پوری اترتی ہے یا نہیں اور قرآن پر غور کرنے کے لیے یہ اصول بالکل فطری، عقلی اور سائنٹیفک ہیں یا نہیں۔ پھر اس بات پر بھی غور کیجئے کہ کیا ان اصولوں کو اپنا بغیر قرآن کے اس خزانہ حکمت تک رسائی ہو سکتی ہے جس سے پہرہ یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے!

یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بنا کر ہمارے ہاتھوں میں دیا ہے۔ اگر یہ کسوٹی ہمارے پاس نہ رہے یا ہم اس کے استعمال سے نا آشنا ہو جائیں تو پھر حق و باطل میں امتیاز کے لیے ہمارے پاس کوئی روشنی باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم نہایت صبر کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اس وقت یہی صورت حال ہے۔ قرآن تو موجود ہے لیکن اس کا علم ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ اس وقت یہ یا تو حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کی چیز بن کے رہ گیا ہے یا تجارت کی اور جو جتنی ہی بلند آہنگی سے اس کا نام لیتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اس سے محروم و نا آشنا نظر آتا ہے۔ اگر اس امت کو بحیثیت امت مسلمہ زندہ رکھنا ہے تو یہ کام۔ وحدتِ امت کی مالا جینے سے ہو گا نہ قرآن کا وظیفہ پڑھنے سے، بلکہ اس کے لیے سب سے مقدم شے قرآن کے صحیح علم کو اجاگر کرنا ہے۔ جن کے اندر اس کا صحیح علم ہو گا انہی کے اندر صحیح عمل پیدا ہو گا اور اس امت کی جب بھی اصلاح ہوگی انہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوگی۔ لن یصلح آخر هذه الامة الا بصلاح به اولها (اس امت کے آخر دور کے لوگ بھی اسی چیز سے اصلاح پذیر ہوں جس سے اس کے در اول کے لوگ اصلاح پذیر ہوئے)۔



دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ اس کا آغاز جب میں نے کیا تو اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ گویا ڈوبنے اور تیرنے سے بے نیاز ہو کر ایک سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ اس کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے میں نے اس کی مشکلوں اور نزاکتوں کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا لکھنا ہے، کس طرح لکھنا ہے اور جن کے لیے لکھنا ہے۔ ان کی طرف سے اس کی پذیرائی کی کس حد تک مجھے توقع کرنی ہے۔ اس وجہ سے اگرچہ میں اس کام پر اپنے کو مجبور پارہا تھا لیکن ساتھ ہی دل کے مخفی گوشوں میں یہ خواہش بھی دبی ہوئی تھی کہ اس کے خیر و شر کی ذمہ داریوں سے میں بچا لیا جاؤں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں جب ۱۹۶۲ء میں بہار پڑا اور معالجوں نے میری اس بیماری کا سبب کثرتِ کار کو قرار دے کر مجھے دماغی محنت سے بالکل روک دیا تو مجھے اس بات کا مطلق افسوس نہیں ہوا کہ میرا کام ناتمام رہ گیا، بلکہ دل پوری طرح مطمئن رہا کہ جتنا میرے رب نے چاہا اتنا ہو گیا، اب آگے کا کام اگر اسے منظور نہیں ہے تو اسی میں حکمت ہے اور مجھے اس کے فیصلہ پر راضی ہونا چاہیے۔ میں دوستوں سے یہ بھی کہتا رہا ہوں کہ اگر سورہ توہ تک بھی لکھنے کی فرصت مجھے مل گئی تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا اس لیے کہ استاد مرحوم کے اصولوں کی صداقت اور قدر قیمت واضح کرنے کے لیے اتنی تفسیر بھی کافی ہے۔

بعد میں جب صحت کچھ ٹھیک ہوئی تو مجھے حالات سے مجبور ہو کر لاہور کی سکونت ترک کر کے ضلع شیخوپورہ کے ایک دیہات ————— رحمان آباد ————— میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ دیہات میں قرینہ کا کوئی مکان تھا نہ ابتداء کے چار سالوں میں بجلی وغیرہ کی سہولتیں میسر تھیں، اس وجہ سے شروع شروع میں نہایت صبر آزما حالات سے سابقہ پیش آیا۔ ایسے حالات میں لکھنے پڑھنے کے کسی سرسری کام پر بھی طبیعت کو آمادہ کرنا نہایت مشکل تھا چہ جائیکہ تذکرہ قرآن کا کام، لیکن میں نے مضبوط ارادہ کر رکھا تھا کہ قلم اٹھاؤں گا تو تذکرہ قرآن ہی کے لیے اٹھاؤں گا۔ اس کے سوا کسی اور کام پر اپنی قوت کو صرف کرنا اس رب کی ناشکری ہوگی جس نے مجھے از سر نو قلم ہاتھ میں لینے کی صلاحیت بخشی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کتاب کی کتنی سورتوں کی تفسیر میں نے کسی سرسری یا شیشم کے نیچے بیٹھ کر اس حال میں لکھی ہے کہ اوپر سے چڑیوں اور بھڑوں کی پورش ہے۔ نیچے سے مکھیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے، سودہ پسینہ سے بھیگ رہا ہے لیکن میں کسی آیت کی مشکلات حل کرنے میں اس طرح مستغرق ہوں کہ مجھے اپنے دہنے بائیں کا کچھ ہوش نہیں۔

کوئی مضائقہ نہیں ہوگا اگر یہ راز بھی برملا ظاہر کر دوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لکھنے کی کچھ صلاحیت تو ضرور بخشی ہے لیکن اپنی لکھی ہوئی چیزوں کی طباعت و اشاعت کا کوئی سلیقہ میرے اندر نہیں ہے اور مجھے اپنی اس بے سلیقگی پر کچھ افسوس بھی نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ میرا کام لکھنا تھا میں نے لکھ دیا، اس کو چھاپنا اور سچنا میرا کام نہیں۔ رہا میری معاش کا مسئلہ تو اس کے لیے نہ میں نے کچھ کیا ہے، نہ اب کر سکتا ہوں



میں دوستوں سے مذاق کے انداز میں کہتا رہا ہوں اور آج سنجیدہ انداز میں لکھ رہا ہوں کہ دین اور دنیا دونوں کے معروف کے خلاف میرے نان و نفقہ کی ذمہ داری میری بیوی پر ہے۔ ان کے پاس ان کے والد مرحوم کے ترکے سے ملی ہوئی کچھ زمین تھی۔ میں اس کی کچھ دیکھ بھال کر دیتا رہا ہوں۔ اسی کی آمدنی سے اب تک ہمارا گزارا ہوتا رہا ہے اور چونکہ میاں زندگی کے فتنوں سے ہماری زندگی محفوظ نہ رہی ہے اس وجہ سے اچھا گزارا ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جس ریت کریم نے بچپن میں پالا، جوانی میں کھلایا یا پھنپایا، وہ بڑھاپے میں بھی بھوکا نہ لگائے گا۔ بس یہ یقین میرا اصل سرمایہ ہے۔

اس کتاب کے مستقبل سے متعلق اگرچہ جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں، میں کچھ پرامید نہیں تھا۔ کتاب کے میں جانتا تھا کہ اس دنیا نے امام فراہی علیہ الرحمۃ جیسے محقق کی کیا قدر کی ہے کہ وہ میری چیزوں کی قدر کرے گی، لیکن مجھے بہر حال اپنا فرض ادا کرنا تھا چنانچہ میں نے تالش اور صلہ کی تمنا سے بے پروا ہو کر کام شروع کر دیا اور اب تیس سال کے بعد میرا اندازہ اس سے بالکل مختلف ہے جو پہلے تھا۔ اب میں نہایت واضح اور قابل اعتماد معلومات کا بنا پریراٹے رکھتا ہوں کہ یہ فکر اس تیزی سے اہل علم میں مقبول ہو رہا ہے کہ مجھے نہایت قوی امید ہے کہ یہ تمام ذہین لوگوں کے دلوں کو بہت جلد موہ لے گا۔ مجھے ہر مکتب فکر کے علماء سے بھی ملنے کے مواقع ملے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات سے بھی، میں نے سب کو اس کا معترف و مداح پایا ہے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ یہ راستہ قرآن کو سمجھنے سمجھانے کا سب سے کامیاب راستہ ہے اور دعا کر رہے ہیں کہ یہ مکمل صورت میں ان کے سامنے آجائے تاکہ وہ درس و تعلیم میں اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ پاکستان اور بھارت میں کتنے دارالعلوم اور کتنی مسجدیں ہیں جن میں اس کی روشنی میں درس ہو رہے ہیں۔ یورپ، امریکہ، عرب، افریقہ اور برما میں بھی جن ذہین لوگوں تک اس کا کوئی حصہ پہنچ چکا ہے وہ اس کو مکمل صورت میں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ طریقہ قرآن پر غور کرنے کا سائنٹفک طریقہ ہے، اس کے سوا کوئی اور طریقہ اس زمانے کے لوگوں کو اپیل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اس کو انگریزی اور عربی میں منتقل کرنے پر بھی اصرار کر رہے ہیں کہ جن تعلیم یافتہ غیر مسلموں تک اس کا کوئی حصہ پہنچا ہے وہ اس کے گردیدہ ہو گئے ہیں۔ مصر وغیرہ کی بعض یونیورسٹیاں فکر فراہی پر ریسرچ کرنے والوں کو ڈاکٹر بٹ کی ڈگریاں دے چکی ہیں۔ پاکستان کے بعض تحقیقاتی اداروں میں بھی فکر فراہی پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

لوگوں کو یہ شکایت نہیں ہے کہ تذکرہ قرآن میں کوئی چیز مشکل یا فہم سے بالاتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تفسیر میں وہی کچھ ہے جو تفسیر میں ہونا چاہیے اور یہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کے لیے یکساں مانع ہے خواہ عالم ہو یا عامی۔ میرے پاس اس طرح کی رالیوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ لوگ کتاب کو خود اس کی صلاحیتوں کی روشنی میں جانیں اور پرکھیں، صرف دوسروں سے متاثر ہو کر کوئی



مانے نہ قائم کریں۔ اس وجہ سے میں نے ان کے خطوط کی اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔  
مولانا فراہی علیہ الرحمۃ کو میں نے اپنے علوم و انکار کی اشاعت کے باب میں کبھی فکر مند نہیں پایا،  
بیان تک کہ انھوں نے کبھی اس بارے میں مجھ سے بھی ایک حرف نہیں کہا، لیکن یہ نصیحت وہ بار بار کرتے  
تھے کہ آدمی کو ہمیشہ پوری تحقیق اور کامل غور و فکر کے بعد بات کہنی یا لکھنی چاہیے۔ جو بات محکم ہوتی ہے  
وہ جڑ پکڑتی ہے۔ کمزور باتیں وقتی طور پر چاہے پھیل جائیں لیکن بالآخر وہ ہوا میں اڑ جاتی ہیں۔ مولانا کو  
اس قول کی صداقت الحمد للہ اب مجھ پر اچھی طرح واضح ہو رہی ہے۔

یہ کتاب ایک اگرچہ میں نے اپنی پوری جوانی اور سارا بڑھاپا اسی کتاب کی تیاریوں اور اسی کی تحریر و تصویر پر صرف  
فکر و انقلاب کیا ہے لیکن میں اس دعوے کے ساتھ اس کو پیش نہیں کر رہا ہوں کہ اس کے ذریعہ میں نے قرآن کو سمجھا  
کی راہ ہموار دی ہے یا اس کے سارے علوم اس میں جمع کر دیے ہیں۔ قرآن علم و حکمت کا ایک سمندر ہے، اس کے  
علوم کا احاطہ اس کے نازل کرنے والے کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ احساس میرا ضرور ہے کہ اس  
کتاب میں قرآن پر غور کرنے کی راہ میں فے کھول دی ہے۔ اگر آپ ان اصولوں کو جو اس کتاب میں بیان ہوئے  
میں رہنما بنا کر قرآن پر غور کریں گے تو مجھے پورا اعتماد ہے کہ حکمت کے ان خزانوں تک پہنچ سکیں گے جو اس  
میں موجود ہیں۔ اس سے زیادہ میرا کوئی دعویٰ نہیں ہے اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اگر آپ اس طرح  
قرآن کو سمجھنے کی اہلیت پیدا کر لیں گے تو لاریب آپ کے لیے قرآن مجید ایک ایسی کسوٹی بن جائے گا جس  
کے ذریعہ سے آپ اپنے تمام علوم و افکار کے حق و باطل اور ان کے غٹ و سمین میں امتیاز کر سکیں گے۔  
آپ کے لیے یہ کام نہایت آسان ہو جائے گا کہ آپ احادیث، فقہ، کلام و فلسفہ اور تصوف و سرائر  
سب کو پرکھ کر بتا سکیں کہ ان میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ یہ چیز اس تقلید و جمود کو توڑے گی جس نے  
اس امت کو فرقوں اور گردہوں میں بانٹ رکھا ہے اور کیا عجب کہ اس طرح اس انقلاب کی راہ ہموار  
ہو جائے جو اس منتشر بھیڑ کو پھر اس دنیا میں ایک جہانی قوت بنا کر کھڑا کر دے۔ بہر حال میں نے قرآن  
کو سمجھنے کے لیے صرف راہ ہموار کی ہے، کرنے کا کام ابھی بہت ہے اور وہ آگے آنے والوں کو کرنا  
ہے۔

گاہ مبرکہ بہ پایاں رسید کارِ مغان

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ ناک است

قرآن کا صحیح علم آپ کو حاصل ہو جائے تو آپ کے لیے ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ نہ کوئی قدیم چیز  
آپ کو گمراہ کر سکتی نہ کوئی جدید چیز۔ یہی اصل کلید ہے۔ یہ کلید اگر آپ کو نہ مل سکے یا ملے لیکن آپ نے اس  
کی قدر نہ کی تو اس تاریکی سے آپ کسی طرح نہیں نکل سکتے جس میں اس وقت گھرے ہوئے ہیں۔ میں اس نذر  
کے زہراؤں اور لورٹھوں دونوں کو دعوت دیتا ہوں کہ اگر ان کو اپنا اور اس امت کا مستقبل عزیز ہے تو وہ



یہ نہ دیکھیں کہ بات کس نے کہی ہے بلکہ صرف یہ دیکھیں کہ کیا بات کہی ہے۔ حق ایک ضابطہ مشترک ہے جس پر کسی کا اجارہ نہیں اور کسی حق کی ناقدری کا خسارہ اسی کو ہوتا ہے جو اس کی ناقدری کرتا ہے، نہ کہ حق کے پیش کرنے والے کو۔

۲۹۔ رمضان ۱۳۸۷ھ کو اس کتاب کی آخری سطریں حوالہ قرطاس کرتے ہوئے میں نے صرف یہی فرما احاس نہیں محسوس کیا کہ یہ کتاب میں نے پوری کردی بلکہ یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی زندگی کا آخری ورق بھی الٹ دیا۔ ایک بھاری بوجھ جو تینیس سال اٹھاٹے لیے پھر اس سے سبکدوش ہونے پر ایک گہری مرست کا احساس تو ایک فطری چیز ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ اب کیا کام کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے، جس کے لیے جینے میں لذت ہو۔ میں نے آخری سطریں لکھ پر اپنا سر اپنے رب کے آگے ڈال دیا اور صرف یہ دعا کی کہ اے رب! اگر تو نے اپنی کتاب عزیز کی خدمت کی یہ توفیق بخشی تو اس کو قبول بھی فرما اور اس کو اپنے غلام کی نجات کا ذریعہ بنا، بس اس کے سوا میں کسی چیز کا متمنی نہیں۔ یہ سطریں جن کی نظروں سے بھی گزریں ان سے اتنا حس ہے کہ وہ اس دعا پر آمین کہیں۔

اس طویل سفر کا بیشتر حصہ میں نے تنہا ہی طے کیا لیکن کبھی کبھی بعض ہم سفر بھی ملتے رہے ہیں، جن کی رفاقت جس حد تک بھی مجھے حاصل ہوئی اس کی مسرت آمیز یاد میرے دل میں باقی ہے۔ اور انشاء اللہ باقی رہے گی۔ ان میں سے جن دوستوں کا ذکر سابق دیا چوں میں ہو چکا ہے ان کے ناموں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بعض دوسرے دوستوں کا شکریہ واجب ہے جن کا ذکر ابھی اس کتاب میں نہیں آیا ہے، حالانکہ خاص اس کتاب کے سلسلہ میں انھوں نے میرا بڑا ہاتھ بٹایا ہے اور میں ان کے اس بے غرضانہ تعاون کا نہایت ممنون ہوں۔ عزیزم غلام صدیقی صاحب سلمہ نے جوان دنوں امریکہ میں زیر تعلیم ہیں، ایک زمانے میں خود میری خدمت بھی میرے بیٹوں سے زیادہ کی ہے اور اس کتاب کے مسودات بھی بڑی محنت اور بڑے سلیقے سے نقل کرتے رہے ہیں۔ برادریم عبداللہ غلام احمد صاحب، فاٹا میں ملازم ہیں، انھوں نے مسودات کی نقل و تیسفیر میں بھی بڑا حصہ لیا ہے اور بہت سی مشکلات حل کرنے میں بھی ان کی ذہانت سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ کسی خاص مشکل کے حل کے سلسلہ میں حوالوں وغیرہ کی تلاش کا کام تو برادریم خالد مسعود صاحب پہلے سے کرتے رہے ہیں، لیکن ادھر بعض ضروری حوالوں کی تلاش میں عزیزم جاوید احمد صاحب نے بھی مدد کی ہے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہ کا نام تو اس کتاب کی تاریخ کا اب ایک حصہ بن گیا ہے۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کے سابق انتظام سے جب میں غیر مطمئن ہوا تو انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے تسلی دی کہ اب آگے کی جلدوں کا انتظام وہ خود کریں گے اور ایک پروگرام کے مطابق کریں گے۔ مجھے ان کے حوصلہ سے



بڑی مسرت ہوئی۔ اگرچہ ان کے تجربہ پر مجھے ابتداء میں اطمینان نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادہ میں برکت دی۔ وہ ٹھیک مقررہ پروگرام کے مطابق اپنا وعدہ پورا کرنے میں کامیاب ہوئے اور نہایت شاندار طریقہ پر کامیاب ہوئے۔

میں ان تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار اور ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سے دین کی کوئی ایسی خدمت لے جو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے سرخوردگی کا باعث ہو۔

والسلام

امین احسن، اصلاحی

لاہور

۹۔ نومبر ۱۹۸۰ء

۳۰۔ ذوالحجہ ۱۴۰۱ھ



تذکرہ قرآن

۷۳

المزمل







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا زمانہ نزول اور عمود

یہ سورہ اور بعد کی سورہ ————— المائدہ ————— دونوں بالکل ہم رنگ و ہم مزاج اور توام ہیں۔ عام مفسرین نے ان کو بالکل ابتدائی سورتوں میں سے شمار کیا ہے لیکن ان کے مطالب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب قریش کے امراء و اغنیاء کی طرف سے دعوت کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت حال سے نہایت منہموم و متفکر رہنے لگے ہیں۔

ایک انسان جب اپنے ماحول میں ہر شخص کی مخالفت اور اس کے طعن و طنز کا ہدف بن کر رہ جائے درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس ماحول ہی کی اصلاح پر مامور ہو تو اس کے غم داغ کا جو حال ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس صورت حال سے قدرتا اس پر خلوت پسندی اور خلوت سے بے تعلقی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اٹھتا ہے تو اپنی چادر لپیٹ کر چلتا ہے تو اس میں لپیٹ کر، بیٹھتا ہے تو اس میں گوشہ گیر ہو کر اور لیٹتا ہے تو اس میں چھپ کر اس لیے کہ تنہا اس کی چادر ہی ہوتی ہے جس کے دامن میں فی الجملہ اس کو اپنے باطن میں غوطہ زن ہونے اور اپنے خالق سے تعلق و تعلق کے لیے سکون و اطمینان ملتا ہے۔

اس کا تھوڑا بہت تجربہ تو ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو خلق و خالق سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھنے والا ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ وہ خلق کے لیے سراپا رحمت و شفقت اور اپنے رب کی ڈالی ہوئی ذمہ داریوں کے معاملے میں نہایت حساس ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جان توڑ مساعی و اصلاح کے باوجود جب دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی مخالفت بڑھتی جا رہی ہے تو ان کو گمان گزرتا ہے کہ مبادا اس میں انہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ یہ چیز ان کے غم و فکر کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو مطعون کر کے اپنے دل کو تسلی دینے کے بجائے خود اپنے اندر خلوت گزریں ہو کر صورت حال کا صحیح حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ذہنی کیفیت میں ان کو اپنی سب سے بڑی غم گسار اپنی چادر ہی محسوس ہوتی ہے جس میں چھپ کر گویا وہ اپنے ماحول سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

چادر میں لپٹنے والے کو عربی میں ”مزنل“ کہتے ہیں۔ اس لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اسی فکر مندی کا سراغ دیا ہے۔ یہ نہایت پیار کا خطاب ہے۔ اس دلنواز خطاب سے مخاطب کر کے آپ کو



وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو اس غم و الم کو دور کر کے آپ کے اندر وہ قوت و عزیمت پیدا کرے گا جو موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ گویا اس سورہ میں حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے آپ کی جو صلاح و فرامانی بھی فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی وہ نسخہ بھی بتایا گیا ہے جو جو صلہ کو بلند اور کبرمت کو مضبوط رکھنے کے لیے نہایت کیا اثر ہے۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱۴-۱۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تاکید کہ شب میں قیام لیل کا اہتمام کرو جس میں قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ اس سے دل کو ثبات اور دماغ کو بصیرت حاصل ہوگی جو آگے کی بھاری ذمہ داریوں کے اٹھانے کا اہل بنائے گی۔ اسی طرح دن میں بھی تسبیح و تہلیل کے لیے بڑی گنجائش ہے۔ تو اپنے رب کے ذکر میں مطمئن اور اس کے دامن رحمت میں پناہ گیر رہو۔ مشرق اور مغرب کا خداوند ہی ہے تو اپنا معاملہ اسی کے سپرد کرو۔ تمہارے اعداء جو کجوا ہیں کرہے ہیں اس کو صبر کے ساتھ نظر انداز کر دو اور ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو۔ ہم ان سے نمٹنے کے لیے تنہا کافی ہیں۔

(۱۵-۱۹) قریش کے لیڈروں کو تہدید و وعید کہ جس طرح ہم نے اپنے دین کی گواہی دینے کے لیے فرعون کی طرف اپنا رسول بھیجا اسی طرح تمہاری طرف بھی ہم نے اپنا رسول بھیجا ہے تو رسول کی نافرمانی کا جو انجام فرعون اور اس کی قوم کے سامنے آیا اس انجام کو یاد رکھو۔ اگر تم نے اسی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام اس سے مختلف ہو۔ اس دن کو یاد رکھو جس کا ہول بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے۔ اس سے آگاہ کرنے کے لیے ہم نے یہ یاد دہانی اتار دی ہے تو جو سلامتی چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کر لے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

(۲۰) آخر میں ایک مدنی آیت جس میں حالات کے تبدیل ہو جانے کے سبب سے اس حکم میں کسی قدر تخفیف کر دی گئی ہے، جو ابتدائی آیات میں دیا گیا ہے، اور اس کسر کے جبر کے لیے بعض ایسے بدلے تبا دیے گئے جو اصل مقصد کی حفاظت کرنے والے اور بدلے ہونے والے حالات کے مناسب ہیں۔



# سورة المزمل

مَكِّيَّةٌ ————— آيات : ٢٠

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الْمُزْمَلُ ① قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ② نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ  
 مِنْهُ قَلِيلًا ③ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ④ إِنَّا  
 سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ⑤ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ  
 وَطَاءً وَأَقْوَمُ قِيلًا ⑥ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا ⑦  
 وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ⑧ رَبُّ الْمَشْرِقِ  
 وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ⑨ وَاصْبِرْ عَلَى مَا  
 يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَبِيلًا ⑩ وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ  
 أُولِيَ النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ⑪ إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ⑫  
 وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ⑬ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَ  
 الْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيرًا مَّهِيلًا ⑭ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ  
 رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا ⑮  
 فَعَصَى فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ⑯ فَكَيْفَ  
 تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ⑰ السَّمَاءُ

آيات  
٢٠-١



ع  
۱۳

مَنْفَطِرٌ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝۱۸ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ  
 شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝۱۹ إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ  
 أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ  
 الَّذِينَ مَعَكَ ۖ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّنْ  
 نَحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ  
 أَن سَيَكُونُ مِنْكُم مَّرْضَىٰ ۖ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ  
 يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۖ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
 فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ  
 وَاقْرَءُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ  
 تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا  
 اللَّهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۲۰

ع  
۱۴

ترجمہ آیات

۲۰-۱

اے چادر میں لیٹنے والے! رات میں قیام کر مگر تھوڑا حصہ۔ آدھی رات یا اس میں  
 سے کچھ کم کر دے یا اس پر کچھ زیادہ کر لے اور قرآن کی تلاوت کر ٹھہر ٹھہر کر۔ ہم تم پر عنقریب  
 ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات میں اٹھنا دل جمعی اور فہم کلام کے لیے  
 نہایت خوب ہے۔ دن میں بھی تمہارے لیے کافی تسلیح کا موقع ہے اور اپنے رب کے نام  
 کا ذکر اور اس کی طرف گوشہ گیر ہو جا۔ وہی مشرق و مغرب کا خداوند ہے، اس کے سوا کوئی  
 معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بنا اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ان کو خوبصورتی  
 سے نظر انداز کر اور ان اہل تنعم جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ اور ان کو کچھ دیر اور



مہلت دے بہاے پاس ان کے لیے بیڑیاں اور دوزخ کی آگ ہے اور حلق میں پھنسنے والا  
کھانا اور نہایت دردناک عذاب۔ اس دن جس دن زمین اور پہاڑ لرزا اٹھیں گے اور پہاڑ  
بھر بھرے ٹیلے بن جائیں گے۔ ۱۴-۱۵

ہم نے تم لوگوں کی طرف ایک رسول بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے فرعون کی  
طرف ایک رسول بھیجا تو فرعون نے رسول کی نافرمانی کی، پس ہم نے اس کو پکڑا نہایت سخت  
پکڑنا تو اگر تم نے بھی کفر کیا تو اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا!  
آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے اور اللہ کا وعدہ شدنی ہے۔ یہ ایک یاد دہانی  
ہے تو جو چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کر لے۔ ۱۵-۱۹

بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم شب میں دو تہائی رات کے قریب یا نصف یا تہائی  
رات قیام کرتے ہو اور ایک گروہ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن  
کا اندازہ ٹھہراتا ہے۔ اس نے جانا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر عذاب کی  
نظر کی تو قرآن میں سے جتنا میسر ہو سکے پڑھ لیا کرو۔ اس کے علم میں ہے کہ تم میں مرض  
بھی ہوں گے اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کے فضل کی طلب میں سفر کریں گے اور دوسرے  
ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھیں گے تو جتنا میسر ہو سکے اس  
میں سے پڑھ لیا کرو اور نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو قرض اچھا دو  
جو کچھ بھی تم اپنے لیے پہلے سے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے پاس اس سے بہتر اور اجر  
میں برتر پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ ۲۰



# الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الْمَزْمِلُ (۱)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے لفظ سے مخاطب فرمایا گیا ہے جس سے آپ کی وہ تصویر سامنے آتی ہے جو اس اندر دنی کی کیفیت کی نگاہ ہے جو سورہ کے زمانہ نزول میں آپ پر مشیر طاری رہتی تھی۔ 'مزمّل' دراصل 'مزمّل' ہے۔ عربیت کے قاعدے کے مطابق 'ت' حرف 'ذ' میں مدغم ہو گئی ہے۔ اسی طرح کا تعریف لفظ 'مذتّر' میں بھی ہوا ہے۔ اس کے معنی عیا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، اپنے اوپر چادر پیٹے رکھنے والے کے ہیں۔ یہ حالت بالعموم ایسے شخص کی ہوتی ہے جو سامنے کے حالات سے فکر مند اور گرد و پیش کے لوگوں کے رویہ سے بددل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایک ایسے عذاب سے ڈرا رہے تھے جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا لیکن لوگوں کی بے گانگی و بے زاری کا یہ حال تھا کہ بات سننا تو درکنار لٹے منہ نہ چنے کو دوڑتے اور آپ کی بے قراری و ہمدردی کو ضبط و جنون قرار دیتے۔ ایسے حالات میں آپ کا تفکر و غم رونا ایک امضی تھا اور فکر و غم کی حالت میں آدمی کی چادر عیا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس کی بہترین نمکسار ہوتی ہے۔ وہ اس میں لپٹ کر جب چاہتا ہے خلق سے منقطع اور خالق سے متصل ہو جاتا ہے۔ یہ امر بیاں ملحوظ رہے کہ چادر اہل عرب کے لباس کا ایک نہایت اہم جزو بھی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ چادر رکھتے بھی تھے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت سے پہلے بھی عیب آپ جستجوئے حقیقت میں سرگرداں تھے، آپ پر اسی طرح کی غلوت گزینی کی حالت طاری رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عیا کہ سورہ مضمیٰ میں اشارہ ہے، آپ کو راہ دکھائی۔ پھر یہی کیفیت آپ پر مزید شدت کے ساتھ اس وقت طاری ہوئی جب آپ کو اپنی مریض قوم کی دوا بیزاری اور طبیب دشمنی کا ذاتی تجربہ ہوا۔ اس تجربہ سے آپ پر جو کیفیت طاری ہوئی لفظ 'مزمّل' اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

بعض مفسرین نے اس خطاب سے یہ مطلب سمجھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے سوئے پڑے تھے کہ آپ کو وحی کے ذریعہ ہدایت ہوئی کہ اسے چادر تان کر سونے والے اٹھا اور نماز پڑھ۔ یہ مطلب اگرچہ اس پہلو سے دلچسپ ہے کہ بعد کی آیات سے بظاہر اس کا جوڑ مل جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارک کے کسی دور میں بھی چادر تان کر غفلت کی نیند سونے والوں میں سے نہیں تھے۔ آپ ہمیشہ کھٹکے کی نیند سوتے اور دن کی طرح آپ کی شب بھی زیادہ تر ذکر و فکر ہی میں گزرتی۔ قرآن کی کسی آیت سے بھی یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ آپ کو کبھی خدا سے غفلت

ایک لفظ نہیں

کا ازالہ



کی بنا پر کوئی تنبیہ فرمائی گئی ہو بلکہ اس کے برعکس آپ کو بار بار اس بات پر نہایت پر محبت انداز میں عتاب ہوا ہے کہ آپ نے اپنے اوپر اس سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے۔ البتہ یہ بات قرآن میں جگہ جگہ ملتی ہے کہ دعوت کی راہ میں جب آپ کو نکلات و معائب سے ساقط پڑا ہے اور آپ اس صورت حال سے فکر مند رہنے لگے ہیں تو آپ کے عزم و حوصلہ کو مضبوط اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے نماز بالخصوص تہجد کی نماز کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بھی یہی صورت ہے۔

قُمِ اللَّيْلُ إِلَّا قَلِيلًا ۖ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ ۖ رَدِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (۲-۴)

لفظ 'مذمل' میں حضور کی جو فکر مندی اور پریشانی مضمر ہے یہ اس کا علاج بتایا جا رہا ہے اور یہ علاج صرف یہیں نہیں بتایا گیا ہے بلکہ جب جب دعوت کی راہ میں آپ کو پریشانیاں پیش آتی ہیں ان کا یہی علاج آپ کو قرآن نے بتایا ہے اور ہم ہر جگہ اپنے علم کے حد تک اس کی حکمت کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں چونکہ اس علاج کی تاثیر اور اس کی قدر و قیمت آگے خود واضح فرمادی گئی ہے اس وجہ سے ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے صرف آیات کی تفسیر پر اکتفا کریں گے جس سے ان شاء اللہ خود یہ بات سامنے آجائے گی کہ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیام لیل میں کیا برکتیں و ولایت فرمائی ہیں اور وہ کن پہلوؤں سے اس کی صرف شدہ قوتوں کو بحال اور اس کے عزم و ایمان کو مضاعف کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

قُمِ اللَّيْلُ إِلَّا قَلِيلًا ۖ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ ۖ رَدِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا

ظاہر ہے کہ رات کا نصف آخر ہے جب آدمی کچھ سوچنے کے بعد اٹھتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے 'نَاسِئَةُ الْيَسْرِ' کے لفظ سے ہو گئی ہے۔ تہجد کے لیے یہی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ثابت ہے اور یہی اصل مقصد کے اعتبار سے سب سے زیادہ بابرکت بھی ہے۔ یہ وقت رات کے نصف کے بعد بھی ہو سکتا ہے، اس سے کچھ کم بھی ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ شب کے کچھ پہر میں اٹھنا ایک کٹھن کام ہے، اس میں دیر سویر کے ہو جانے کا امکان ہے اس وجہ سے وقت کے معاملے میں وسعت رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ مشقت کا موجب نہ ہو۔ اگرچہ الفاظ قرآن سے پوری نصف شب کے قیام کا ادلی ہونا نکلتا ہے لیکن کمی بیشی کی گنجائش الفاظ میں موجود ہے۔

رَدِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا یہ قرآن کے پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا کہ نماز میں اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور قرآن لحن اور کئی سے پڑھتے، آیت آیت پر وقف کا طریقہ فرماتے، کبھی کبھی ایک ہی آیت شدت تاثر میں بار بار دہراتے۔ علاوہ ازیں کوئی آیت قہر و غضب کی



ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے اور جو آیت رحمت کی ہوتی اس پر اداۓ شکر فرماتے۔  
بعض آیتیں جن میں سجدہ کا حکم یا اشارہ ہے ان کی تلاوت کے وقت، فوری امتثال امر کے طور پر  
آپ سجدہ میں بھی گر جاتے۔

”تلاوت قرآن کا یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بھی ہے اور یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم  
سے ماثور و منقول بھی ہے۔ قرآن کے مقصد نزول کے پہلو سے بھی یہی طریقہ نافع ہو سکتا ہے لیکن  
مسلمانوں میں یہ طریقہ صرف اس وقت تک باقی رہا جب تک وہ قرآن کو فکر و تدبر کی چیز اور زندگی کی  
رہنما کتاب سمجھتے رہے۔ بعد میں جب قرآن صرف حصول ثواب اور ایصال ثواب کی چیز بن کے رہ  
گیا تو یہ اس طرح پڑھا جانے لگا جس کا مظاہرہ ہمارے حفاظ کرام تراویح اور شبیہوں میں کرتے ہیں۔  
(اَنَا سُلِّقْتُ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا) (۱۰۰)

یہ اس مقصد عظیم کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے قیام لیل کی یہ ہدایت فرمائی گئی۔ ارشاد  
’قول ثقیل‘ سے مراد ہے کہ ہم عنقریب تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بھاری بات کے تحمل  
کے لیے ایک پیشگی ریاضت اور تیاری کے طور پر آپ کو اس کا حکم ہوا۔ اس بھاری بات سے کیا  
مراد ہے؟ اس کے جواب میں اہل تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں لیکن ان کی بنیاد کسی دلیل پر  
نہیں ہے اس وجہ سے ان کے نقل کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ اساذام؟ اس سے اس  
انذار عام کو مراد لیتے ہیں جس کا حکم اگلی سورہ میں ’يَا أَيُّهَا الْمَدْيَنَةُ قُتْمُ فَأَنْذِرْ‘ (المذثرہ: ۴، ۱۰-۲)  
(۱) پادریں پٹنے والے اٹھا اور انذار کر اور اس کے بعد کی آیات میں دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک  
یہی رائے قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ اسی انذار عام سے بعد میں براءت، ہجرت اور اعلان جنگ  
کے وہ مراحل سامنے آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے شدید ترین مراحل ہیں جن  
میں آپ بھی اور آپ کے ساتھ صحابہ بھی ایسے کڑے امتحانوں سے گزرے کہ ان کے تصور سے بھی  
کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام لیل کا حکم اس جہاد عظیم کی تیاری کے لیے دیا  
گیا جس سے آگے آپ کو اور آپ کے صحابہ کو اقامت دین کی راہ میں سابقہ پیش آنے والا تھا۔ اقامت  
دین کی جدوجہد کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتی ہے۔  
اس کے لیے دوسرے وسائل و ذرائع کے فراہم ہونے سے پہلے صحیح معرفت رب، مستحکم ایمان،  
غیر متزلزل مبرا اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حصول کا واحد ذریعہ  
نماز بالخصوص شب کی نماز ہے بشرطیکہ وہ اس طرح ادا کی جائے جس طرح اس کے ادا کرنے کا حکم  
دیا گیا ہے۔ اسی چٹان پر اقامت دین کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کے بغیر اگر دین کی عمارت کھڑی

اقامت دین

کجدوجہد

کامتیازی

خصوصیت



کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کھڑی ہونے سے پہلے ہی زمین بوس ہو جائے گی۔  
 اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّیْلِ هِيَ اَشَدُّ وُطْأً وَاَقْوَمُ قِيلاً (۶)

یہ اللہ تعالیٰ نے حکمت بتائی ہے اس بات کی کہ آپ کریم میل کا یہ حکم کیوں دیا گیا۔ فرمایا کہ  
 اس لیے کہ یہ وقت سکون قلب و دماغ کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور فہم قرآن کے لیے سب سے  
 زیادہ سازگار و مددگار ہے۔

’نَاشِئَةُ‘ ہمارے نزدیک ’نَشَأُ‘ سے، جس کے معنی اٹھنے کے ہیں ’عَاقِبَةُ‘ اور ’عَافِيَةُ‘  
 کے وزن پر مصدر یا حاصل مصدر ہے۔ نَاشِئَةُ اللَّیْلِ کے معنی ہوں گے قیام میل یا شب خیزی۔ اس لفظ  
 ہی سے یہ بات نکل کر تہجد کا وقت درحقیقت شب میں کچھ سو کر اٹھنے کے بعد یعنی پچھلے پہر کا ہے۔ اس  
 وقت اٹھنا اگرچہ اس اعتبار سے ایک شکل کام ہے کہ اس وقت کی نیند بہت محبوب ہوتی ہے لیکن اس  
 امتحان میں انہیں انکار کیا اب ہر جائے نوا اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی کتاب کے سمجھنے کے لیے اس سے  
 زیادہ بابرکت وقت اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو اس ساعت میمون میں بستر سے اٹھنے کی توفیق  
 دیتا ہے اول تو اس کو اپنے نفس کی خواہشوں پر غلبہ پانے کی ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے  
 لیے اصلاح نفس کی راہ میں فتوحات کے بے شمار دروازے کھول دیتی ہے ثانیاً اللہ تعالیٰ نے، جو  
 رات اور دن کو وجود میں لانے والا ہے، اس وقت کو اپنی رحمتوں کے نزول کے لیے مخصوص فرمایا ہے  
 جن کے دروازے اس کے ان بندوں کے لیے کھلتے ہیں جو اس کی قدر و قیمت پہچانتے اور اس وقت اس  
 کے دروازے پر سائل بن کر حاضر ہوتے ہیں۔

’اَشَدُّ وُطْأً‘ یہ اس وقت اٹھنے کی تاثیر بتائی ہے کہ جب آدمی اس وقت بستر سے اٹھ کر، وضو  
 کر کے، نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کے قدم خوب جھٹتے ہیں۔ قدم خوب جھنا دماغ کی یکسوئی، دل کے اطمینان  
 اور عقل کی بیداری کی تعبیر ہے۔ اگر دماغ پریشان اور قلب بے سکون ہو تو آدمی کے قدم نہیں جھٹتے، کوئی  
 بڑا کام تو درکنار وہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی دلجمعی سے نہیں کر سکتا۔ گویا یہاں ظاہر سے ان کے  
 باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ اس وقت اٹھنا نفس کو  
 اچھی طرح کچلنے والا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں اس معنی کی بھی گنجائش ہے لیکن آگے کے فقرے سے اسے  
 مناسبت نہیں ہے۔ میں نے جو معنی اختیار کیے ہیں وہ دوسرے مفسرین نے بھی لیے ہیں لیکن انھوں نے  
 اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ ثبات قدم درحقیقت قلبی و عقلی یکسوئی و دلجمعی کی تعبیر ہے۔

’وَاَقْوَمُ قِيلاً‘ یعنی یہ وقت چونکہ دماغ کے سکون اور دل کی بیداری کا خاص وقت ہے  
 اس وجہ سے زبان سے جو بات نکلتی ہے تیر ہدف اور اذ دل خیر و بد دل ریزہ، کا مصداق بن کر نکلتی  
 ہے۔ اگر می خود بھی اس کو اپنے دل کی گواہی کی طرح قبول کرتا ہے اور دوسرے سننے والوں کے دلوں پر



بھی اس کی تاثیر بے خطا ہوتی ہے۔ حیات کا جو واقعہ سورہ جن میں بیان ہوا ہے روایات اور قرآن دونوں سے ثابت ہے کہ انھوں نے تہجد ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا اور اس وجہ متاثر ہوئے کہ نہ صرف اس پر ایمان لائے بلکہ اپنی قوم کے اندر اس کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم انسان کے دل کو بھی اسی طرح کے ایک واقعہ نے فتح کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تہجد میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق تلاوت قرآن صرف اپنے ہی نفس کے تہذیب و تزکیہ کے لیے نہیں بلکہ بعض اوقات دوسروں کے ارواح و قلوب کو زندہ کرنے کے لیے بھی ندائے غیب کی حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔

مَا نَلَكَ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۷۲)

عام طور پر لوگوں نے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ دن میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں یعنی دن میں چونکہ دوسرے بہت سے دھندے گھبرے رہتے ہیں، نماز کے لیے دلجمعی کا وقت مشکل ہی سے میسر آتا ہے، اس وجہ سے شب میں تم کو تہجد کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔

لفظ 'سبح' کے اندر از روئے لغت، اس معنی کی گنجائش موجود ہے لیکن ہمارا دل مختلف وجوہ سے اس تاویل پر نہیں جمتا۔

اول وجہ یہ ہے کہ قیام لیل کے لیے پچھلے پہر کا وقت اللہ تعالیٰ نے صرف اس وجہ سے نہیں منتخب فرمایا ہے کہ دن میں آدمی کے سامنے دوسری بہت سی مشغولیتیں ہیں بلکہ قرآن کے متعدد اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں اپنے مزاج و کیفیات کے اعتبار سے یہی وقت ان مقاصد کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے جو قیام شب سے مقصود ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ بات کہنی ہوتی تو اس کے لیے سادہ اسلوب بیان یہ ہوتا کہ رَأَتْ لَكَ فِي النَّهَارِ شَغْلًا كَثِيرًا یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ ہوتے۔ لفظ 'سبح' تیرے بچنے وغیرہ کے معنی میں آتا ہے لیکن شغل اور مصروفیت کے معنی میں یہ ایسا معروف نہیں ہے کہ بغیر واضح قرینہ کے ذہن اس کی طرف منتقل ہو سکے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر لفظ 'سبح' یہاں اس معنی میں ہوتا تو اس کی صفت 'طَوِيلًا' کی جگہ کَثِيرًا یا كَثِيرًا زیادہ موزوں ہوتی۔

ان مختلف وجوہ سے اس تاویل پر دل پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک لفظ 'تسبیح' یہاں اپنے معروف معنی یعنی تسبیح کرنے ہی کے معنی میں ہے اور آیت کی تاویل یہ ہے کہ شب میں تمہیں جس اہتمام نماز کا حکم دیا جا رہا ہے اس کے علاوہ دن میں بھی تمہارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے جس کا اہتمام رکھو۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ حضور دن میں بھی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے



اور سوتے جاگتے اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام رکھنے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے آپ سے دعائیں منقول ہیں۔ آدمی ان کا اہتمام رکھے تو اس کا کوئی قدم بھی ذکر کے بغیر نہیں اٹھ سکتا اور ان کی برکت سے آدمی کے وہ کام بھی عبادت بن جاتے ہیں جو بظاہر دنیا کے کام خیال کیے جاتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ دین میں مطلوب ذکر دوام ہے۔ اس مسئلہ پر اس کے مقام میں بحث ہو۔ دین میں مطلوب چکی ہے۔ جس طرح انسان کی مادی زندگی کے لیے سانس ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے۔ سانس رک جائے تو جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ سے غفلت ہو جائے تو روح پڑ مردہ ہو جاتی ہے۔ دل ذکر کی جھڑی ہی سے زندہ رہتا ہے اور دل کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

یہاں وہ حقیقت بھی پیش نظر رہے جو اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت اور آیات آفاق و انفس میں تدبیر و تفکر بھی ذکر ہی میں شامل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اس کو افضل الذکر کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ اس تفکر ہی سے حقیقت ذکر کے اندر حقیقی منویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ذکر محض ورزش زبان بن کے رہ جاتا ہے۔ زندگی پر اس کا کوئی مفید اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ پر اللہ یُنْ يَذْكُرُونَ اللّٰهُ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (ال عمران - ۲: ۱۹۱) کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

وَ اذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ الَّذِيْ تَبَسَّلُ اِلَيْهِ تَبَسُّلًا (۸)

’تَبَسَّلُ‘ اور ’تَبَسَّلُ‘ دونوں کے معنی القطار الی اللہ کے ہیں یعنی خالق سے کٹ کر رب کے نام میں رحمت میں پناہ گیر ہو جانا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو طریقہ بتایا اس بات کا کہ جب جب لوگوں کی حق بیزارا رحمت میں اور دل آزاری سے دل آزر رہے ہو تو تم ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے نام میں رحمت میں پناہ گیر ہونے کا طریقہ کرو۔ جب تم اس کے نام کے ساتھ اس کو یاد کرو گے تو وہ خود تمہیں اپنی پناہ میں لے لے گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اس کی صفات کی تعبیر ہیں اور ان صفات ہی پر تمام دین و شریعت اور سارے ایمان و عقیدہ کی بنیاد ہے۔ ان صفات کا صحیح علم مستحضر رہے تو آدمی کا استغفار کی پشت پر ایک ایسا شکر گراں اس کے محافط کی حیثیت سے موجود رہتا ہے کہ شیطان کی ساری فوجیں اس کی نگاہ میں پرکاش کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے آپ کو پہاڑوں سے بھی زیادہ مستحکم محسوس کرتا ہے۔ اور اگر خدا کی صفات کی صحیح یادداشت اس کے اندر باقی نہ رہے یا کمزور ہو جائے تو پھر اس کا عقیدہ بے بنیاد یا کمزور ہو جاتا ہے جس کے سبب سے اس کو منافقین کی طرح ہر بجلی اپنے ہی خون



پر گرتی نظر آتی ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ ذِكْرًا (۹)

یعنی اللہ کی پناہ کسی کمزور کی پناہ نہیں ہے بلکہ تمام مشرق و مغرب کے خداوند کی پناہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو اس کا شریک و ہم ہوں یا اس کے ارادوں میں مزامم ہو سکے۔ اس کو ذیل بناؤ گے تو وہ تمھارے لیے کافی ہے۔ وَكَفَى بِاللَّهِ ذِكْرًا (النساء - ۴ : ۸۱)

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَبِيلًا (۱۰)

اپنے جھٹلانے والوں کی بے ہودہ گوئیوں پر صبر کرو اور اپنے موقف پر ڈٹے رہو نہ ان کی باتوں کا غم کرو اور نہ زیادہ ان کے درپے ہو بلکہ ان کو خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔ وہ اپنی اس روش کا خمیازہ خود اٹھائیں گے۔  
مخالفین کی باتوں پر صبر اور اس صبر کا طریقہ

چھوڑنا دوطرح کا ہوتا ہے۔ ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو فضیلت اور لعن طعن کے بعد، عناد و انتقام کے جذبہ کے ساتھ ہو۔ اس طرح کا چھوڑنا عام دنیا داروں کا شیوہ ہے۔ اختیار و صالحین یہ طریقہ نہیں اختیار کرتے۔ وہ خلق کی اصلاح کی کوشش اپنی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگ ان کی ناقدری اور دل آزاری کرتے ہیں تو انھیں غصہ یا نفرت کے بجائے ان کے حال پر افسوس اور ان کی محرومی و بد انجامی پر صدمہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان کے رویہ سے مجبور ہو کر ان کو چھوڑتے تو ہیں لیکن یہ چھوڑنا اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں جلیل جمیل سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہے جن کے اندر خیر کی کوئی رمت ہوتی ہے وہ اس شریفانہ طرز عمل سے متاثر اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں ورنہ کم سے کم انھیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ان کے باطل پر راضی ہونے والا نہیں ہے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ جب تک پیغمبر اپنی قوم کے اندر رہتا ہے قوم کی زیادتیوں کا مقابلہ وہ اسی جلیل جمیل سے کرتا ہے۔ البتہ جب قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کو اعلانِ براءت کے ساتھ چھوڑتا ہے اور اس کا یہ چھوڑنا قوم کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔  
وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا (۱۱)

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے جھٹلانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت سخت دھمکی دی ہے کہ تم ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو اور تھوڑی سی مہلت ان کو اور دو۔ مطلب یہ ہے کہ پھر دیکھو کہ ان کا حشر کیا ہوتا ہے!  
تکذیب کرنے والوں کو سخت دھمکی

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا (۱۱)



سے منٹ لینے دو تمھارے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان جھٹلانے والوں کی تباہی میں کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ان کے اندر تم موجود ہو۔ سنت الہی یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے اندر موجود رہتا ہے اس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا۔ تم چھوڑ دو تو چشم زدن میں ان سرکشوں کا تیا پانچا ہوا جاتا ہے۔ یہ ان ظالموں کی بدبختی ہے کہ وہ تمھارے درپے آزار ہیں۔ ان کے لیے عذاب کے مقابل میں امان کی دیوار نہیں ہو۔ اگر اس امان سے انھوں نے اپنے کو محروم کر لیا تو عذاب سے ان کو کون بچائے گا۔

’أُولَى النِّعْمَةِ‘ کے معنی اربابِ نتم و رفاہیت کے ہیں۔ لفظ ’نِعْمَةٌ‘ رفاہیت و نتم کے معنی میں آتا ہے۔ ’مُكَذِّبِينَ‘ کی اس صفت کے حوالہ سے مقصود ان کے سبب تکذیب کا سراغ دینا اور ان کی ناشکری پر ان کو ملامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نتم و رفاہیت سے بہرہ مند فرمایا تھا تو اس کا حق یہ تھا کہ اپنے رب کے شکر گزار رہتے لیکن اللہ کی بخشش ہوئی خوشحالی ان کے لیے استکبار کا سبب ہوئی اور وہ اپنے رب کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۚ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا (۱۲-۱۳)

یعنی جب ہماری بخشش ہوئی رفاہیت اس دنیا میں ان کے لیے استکبار اور رسول کی تکذیب کا سبب ہوئی تو یاد رکھیں کہ ان کے لیے ہمارے پاس آخرت میں بیڑیاں اور جہنم ہے۔ یعنی بیڑیوں اور زنجیروں کے اندر جکڑ کر جہنم کے اندر جھونک دیے جائیں گے۔

’أَنْكَالٌ‘ جمع ہے ’نِکْلٌ‘ کی۔ اس کے معنی بیڑی کے بھی ہیں اور آہنی لگام کے بھی۔ دوسرے مقام میں ’سَلَاسِلٌ‘ اور ’أَغْلَالٌ‘ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

’وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا‘ یعنی ہم نے ان کو جو تر نوالے بخشے انھوں نے ان کا حق نہیں پہچانا تو یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کو وہ کھانا ملے گا جو ان کے حلق میں پھنس کر رہ جائے گا اور اس عیش کی جگہ ان کو ایک دردناک عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا (۱۴)

یہ اس دن کی یاد دہانی ہے جس دن ان مغروروں کو مذکورہ حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا کہ اس دن یہ زمین اور پہاڑ سب لرزا ٹھیں گے اور امراء کے ایوان و محل نو در کنار پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ وہ بھر بھرے ریت کے تودوں کے ماسد ہو جائیں گے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۖ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۖ

فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا (۱۵-۱۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فدوی ہدایات دینے کے بعد اب یہ قریش کو تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ قریش کو تنبیہ



جس طرح ہم نے فرعون کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیج دیا ہے تاکہ وہ ہمارے خاص شاہد کی حیثیت سے تمہیں بتا دے کہ ہماری پسند اور ہمارے احکام کیا ہیں اور تم نے ان کو قبول کیا تو دنیا اور آخرت میں اس کا کیا صلہ ملے گا اور اگر اس کی نافرمانی کی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تم جس شخص کی تکذیب و توہین کر رہے ہو اس کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کو اچھی طرح جان اور سمجھ لو کہ اس کی تکذیب کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ کوئی سائل یا محض داعی نہیں ہے جس کے رد و قبول کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو بلکہ اللہ نے اس کو تمہارے اوپر حق کی گواہی دینے کے لیے بھیجا ہے اس وجہ سے اس کے ذریعہ سے لازماً حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہونے والا ہے اور یہ فیصلہ اسی طرح ہوگا جس طرح موسیٰ اور فرعون کے درمیان ہوا۔ جس طرح فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے اس کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ اس کو کوئی پناہ نہ مل سکی اسی طرح تمہیں بھی وہ اس طرح پکڑے گا کہ کوئی اس کے پنجہ سے تمہیں چھڑانہ سکے گا۔

‘شَاهِدًا عَلَيْكُمْ’ کے مفہوم کی پوری وضاحت ہم دیکھتے ہیں کہ اَلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ - ۲: ۱۴۳) کے تحت کرچکے ہیں۔

فَكَيْفَ تَقُولُونَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا (۱۷)

یعنی ابھی پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ کبھی نہیں ہوگی۔ اس دنیا میں نہ بھی ہوئی تو آخرت تو بہر حال شدنی ہے تو سوچ لو کہ اگر تم نے رسول کا انکار کیا تو اس دن کے ہول سے کس طرح بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا! بچوں کو بوڑھا بنا دے گا کسی ہول کی شدت اور بے پناہی کی تعبیر ہے۔ ہماری زبان میں بھی برستے ہیں کہ فلاں صدمہ نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ روایات میں بھی آتا ہے کہ حفصہ نے فرمایا کہ شیبۃ ہود و اخواتہا مجھے سورد ہوا اور اس کی ہم جنس سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ عرب شعرائے بھی مختلف اسلوبوں سے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ یہ معروف ہے اس وجہ سے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب کشاف نے بعض شواہد کا حوالہ دیا ہے جو قابلِ اعتماد ہیں۔

اَلسَّمَاءُ مُنْقَطِرَةٌ بِہٖ ۭ مَا كَانَ دَعْدًا مَّفْعُولًا (۱۸)

یعنی روز قیامت کو کوئی آن ہوئی بات نہ خیال کرو۔ آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پھٹ پڑے اور قیامت اس کے اندر سے نمودار ہو جائے اور تم اسی طرح اس سے غفلت ہی میں رہو۔ یہی مضمون سورہ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ثَقُلْتُ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ مَا لَآثَرْتِیْکُمْ  
اَلْاَبْعَثَنَ (الاعراف - ۷: ۱۸۷) وہ تمہارے اوپر چاٹک ہی آدھکے گی۔

یعنی آخرت کوئی محتاج ثبوت چیز نہیں ہے اس کے ظہور کا وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے



علم میں نہیں ہے لیکن اس کے شواہد آسمان و زمین میں اس طرح نمایاں ہیں جس طرح آخری دنوں میں حاملہ کا حمل ہوتا ہے۔ اس کے جننے کا صحیح وقت کوئی نہیں بتا سکتا لیکن ہر آنکھ رکھنے والا جانتا ہے کہ وہ جنے گی۔ اسی طرح قیامت کے آثار نمایاں ہیں اور آسمان اس کے بوجھ سے اس طرح پھٹا پڑ رہا ہے کہ ہر لمحہ اس کا ظہور متوقع ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو صرف اس بنا پر اس سے نجات ہیں کہ ان کو اس کا صحیح وقت نہیں بتایا گیا۔

إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمِنْ شَاءِ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (۱۹)

’ہذیہ‘ سے اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جو قریش کو آخرت کی تذکیر کے لیے سنائی گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب سے پہلے تذکیر و تنبیہ ضروری تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیج کر حجت تمام کر دی۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کر کے اس کی رحمت و رضوان کا مستحق بن جائے اور جس کا جی چاہے وہ اپنی گمراہی پر اڑا رہے اور اس کا انجام دیکھے اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي الثَّيْلِ نِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَنْ لَّنْ نَّحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكَ ۚ فَاقْرَءْ مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَّرْضَىٰ ۚ وَآخَرُونَ يَضِلُّونَ فِي الْأَرْضِ يَنْتَعُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۚ وَأَخَرُونَ يَتَّبِعُونَ مِمَّا فُتِنُوا بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَهُ ۚ فَاقْرَءْ مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرَءُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدْدَهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۚ عَفْوَ رَحِيمٍ (۲۰)

یہ اس سورہ کی آخری آیت ہے۔ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ لیکن اس کا تعلق اسی حکم سے ہے جو ابتدائے سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام میل سے متعلق دیا گیا ہے اس وجہ سے جگہ اس کو اسی سورہ کے اخیر میں ملی تاکہ اس باب کے سابق اور لاحق دونوں حکموں کی نوعیت اور ان کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد ملے۔ اس کی متعدد مثالیں کچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں اور یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب ان کی معنوی مناسبت سے ہے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تحت ہوا ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي الثَّيْلِ نِصْفَهُ وَثُلُثَهُ ۚ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے کہ تمہیں شب میں قیام کا جو حکم دیا گیا تم پر اسے اہتمام کے ساتھ اس کی پابندی کر رہے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ سرگرمیاں



اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور جب اس کے علم میں ہیں تو یہ رائگاں جانے والی نہیں ہیں بلکہ ان کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

”وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ نَبِيٌّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِي تَحْسِبَنَ كَيْ بَعْدَ يَهْ انْ مَسْلَمَانِ كِي تَحْسِبَنَ كَيْ بَعْدَ يَهْ انْ مَسْلَمَانِ“  
 نے آپ کے اتباع کے شوق میں از خود اس حکم کی پابندی اپنے آپ پر لازم کر لی۔ یہ حکم تھا تو، جیسا کہ الفاظ سے واضح ہے، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم ہر اس کام کے لیے سبقت کرتے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کاربند دیکھتے۔ اگرچہ ایمان بالرسول کا حقیقی تقاضا یہی ہے کہ رسول کے ہر نقش قدم کی پیروی کی جائے لیکن رسول کی توبہ برداشت اور دوسروں کی توبہ برداشت میں بڑا فرق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کے لیے اس حکم کی نوعیت میں تبدیلی کر دی، جس کی وضاحت آگے کے ٹکڑے میں آرہی ہے، تاکہ ان کے لیے یہ بوجھ ان کی توبہ برداشت سے زیادہ نہ ہو جائے۔

”وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلَيْنَا اِنْ تَنْ تَحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ فرمایا کہ رات اور دن کو مقدار کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں، زندگی پر کن کن پہلوؤں سے یہ اثر انداز ہوتے ہیں، انسان ان میں سے کس کا کس حد تک محتاج ہے اور اس کو کن حالات و مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے اس علم کی روشنی میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نصف شب یا ثلث یا دوثلث شب کے قیام کی پابندی کا اہتمام نہ کر سکو گے تو جتنا بھی ممکن ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو۔

”فَتَابَ عَلَيْكُمْ“ کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ ”تَابَ“ کا صلہ جب ’علیٰ‘ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی عنایت کی نظر کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

”فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن یہ بات قیام لیل کے سلسلہ میں فرمائی گئی ہے اس وجہ سے مدعا تہجد ہی میں قرآن پڑھنا ہے۔ اگرچہ تلاوت قرآن بجائے خود بھی عبادت ہے لیکن تہجد میں ترتیل کے ساتھ، اس کی تلاوت ہی سے وہ برکتیں ظہور میں آتی ہیں جن کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اہتمام کے ساتھ اس سورہ میں اس کا حکم دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تخفیف و تحقیق عام مسلمانوں کے لیے اس بنا پر ہوئی کہ وہ اس بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اسی اصل حکم پر آخری لمحات حیات تک قائم رہے جو آپ کو دیا گیا۔ عام اہل ایمان کے لیے ایک نفیست کے درجے میں یہ باقی ہے اور یہ بات ہر ایک کے شوق اور حوصلہ پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اس میں کتنا حصہ لیتا ہے۔

”عَلِمَ اَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْغَبٌ لِّاٰخِرُوْنَ يَمُزِّجُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ لَآ اٰخِرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ“



یہ ان امکانات کی طرف اشارہ ہے جو پیش آسکتے ہیں اور جو اس تکفیف کے متقاضی ہوئے۔ تحفہ کے فرمایا کہ تم میں مریض بھی ہوں گے، مختلف دینی و دنیاوی ضروریات کے لیے سفر کرنے والے بھی ہوں گے، دہرہ اللہ کی راہ میں تمہیں جنگ کے لیے بھی اٹھنا ہوگا اس وجہ سے اس سعادت میں حصہ لینے کے لیے یہ کافی ہے کہ تم جتنا وقت بھی پا جاؤ اور جتنا قرآن بھی پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

يُضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ سَ مَرَادٍ مَرْدٍ مَفْرُجٍ جَوْ كَسَى نِيكٍ اِدْرَاعِي

مقصد سے ہوا، عام اس سے کہ وہ طلب علم کے لیے ہو یا حج کے لیے یا تجارت کے لیے۔ تجارتی سفر کے لیے یہ الفاظ قرآن میں جگہ جگہ آئے ہیں۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرَأُوا اللَّهَ قَرُوءًا حَسَنًا۔ یہ اس کسر کے جوہر کی تدبیر بتاتی ہے کہ اگر قیام شب کی برکتوں میں تم پورا پورا حصہ نہیں لے سکتے تو اپنے مکان کے حد تک پہنچ وقت نمازوں کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے کلمہ کو بلند اور دین و ملت کی ہنگامی ضروریات میں فراخ دلی سے خرچ کرتے رہو۔ اس طرح تم اپنے رب کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو۔

وَأَقْرَأُوا اللَّهَ قَرُوءًا حَسَنًا سَ یوں تو ہر وہ اتفاق مراد ہو سکتا ہے جو اللہ کی راہ میں فراخ دلی سے کیا جائے لیکن جب اس کا ذکر ایٹائے زکوٰۃ کے ساتھ ہو تو اس سے خاص طور پر وہ اتفاق مراد ہوتا ہے جو جنگ و جہاد یا کسی اہم ہنگامی ضرورت کے لیے کیا جائے۔

وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ أَجْرًا۔ یہ اتفاق کے لیے ترغیب و تشویق ہے کہ اللہ کی راہ میں جو خرچ کرو گے وہ کسی دوسرے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ہی لیے کرو گے۔ وہ خدا کے ہاں تمہارے ہی کھاتے میں جمع ہوگا اور اس کو نہایت بہتر اور نافع تر شکل میں اپنے رب کے ہاں پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خاصے کا سودا نہیں بلکہ سب سے زیادہ نفع بخش تجارت ہے۔

وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ یعنی اس اہتمام کے علاوہ جو مذکور ہوا، برابر اپنے رب سے اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافی بھی مانگتے رہو اور یہ امید رکھو کہ وہ معاف فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی غفور و رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وہ غلطیوں سے درگزر فرمائے اور اس کی صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ واللہ ہوا الموفق للصواب۔

رحمان آباد

۷۔ نومبر ۱۹۷۸ء

۵۔ ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ







تدبر القرآن

٤٢

المذكر







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ — المذکر — کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ نام بھی دونوں کے بالکل ہم معنی ہیں۔ سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قول ثقیل کے تحتی کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اس میں اس کا واضح الفاظ میں اظہار کر دیا گیا ہے کہ آپ کمر بستہ ہو کر لوگوں کو انداز کریں، مخافتوں کے علی الرغم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہیں۔ دشمنوں کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑیں اور اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں کہ آپ کافر یعنی اس قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو صرف یاد دہانی کر دینا ہے، ہر ایک کے دل میں اس کو اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کو قبول وہی کریں گے جو سنت الہی کے مطابق اس کے قبول کرنے کے اہل ہوں گے۔ جو اس کے اہل نہیں ہیں وہ اس سے بیزار ہی رہیں گے خواہ ان کی ہدایت کے لیے آپ کتنے ہی جتن کریں۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱۔ ۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ کمر بستہ ہو کر لوگوں کے انداز کے لیے اٹھیں۔ اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کریں۔ اپنے دامن دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک رکھیں۔ شرک کی ہر چھوت سے دور رہیں۔ اپنی جدوجہد برابر جاری رکھیں اور اپنے رب کی خاطر تمام مخافتوں کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو برومند کرے گا اور آپ کی دعوت پھلے پھولے گی۔

(۱۱۔ ۱۴) لوگوں کو قیامت کے ہول سے اچھی طرح آگاہ کر دیں کہ وہ دن کافروں کے لیے بڑا ہی سخت ہوگا، اس کو آسان چیز نہ خیال کریں۔ جو اپنے مال و جاہ کے غرور میں مست اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ جو کچھ انھیں دنیا میں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس میں بھی انھیں حاصل رہے گا بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ پائیں گے، وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے تنہا اس دنیا میں آئے۔ مال و جاہ میں سے کوئی چیز بھی ان کے ساتھ نہ تھی۔ پھر اللہ نے ان کو مال و اولاد سے نوازا اور ان کے لیے کامیابیوں کی گونا گون راہیں کھولیں لیکن وہ اپنے رب کے شکر گزار ہونے کے بجائے اس رعونت میں مبتلا ہو گئے کہ جو کچھ انھیں حاصل ہے وہ ان کا پیدائشی حق ہے، جس طرح یہ بیاں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس سے بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہوگا۔



حالانکہ ان کا یہ زعم بالکل باطل ہے۔ اس میں پھنس کر وہ ہماری آیات کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تو یاد رکھیں کہ اس کی پاداش میں انھیں ایک بڑی ہی سخت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

(۱۸-۲۵) قریش کے متمرّدین نے قرآن اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے جو بہانا تراشا اور جس استکبار کے ساتھ اس کا اظہار کیا اس کی تصویر اور ان کی بدبختی پر اظہارِ افسوس کہ انھوں نے قرآن کا بہت ہی غلط انداز دیکھا، وہ اس کو پیغمبر کی جادو دبیانی کا کرشمہ اور اس کے انذار کو بالکل ناقابلِ التفات سمجھے حالانکہ اس کی ایک ایک بات حقیقت ہے جو ان کے سامنے آئے گی۔

(۱۶-۳۱) اس دوزخ کی تصویر جس سے اٹکل کے تیرہ لکے چلانے والوں کو سابقہ پیش آئے گا۔ ساتھ ہی ایک برسرِ موقع تنبیہ کہ یہ مستکبرین چونکہ مہر دانی کے زعم میں بھی مبتلا ہیں اس وجہ سے دوزخ کا جو حال ان کو سنایا گیا ہے اس کی بعض باتوں کو وہ مذاق کا بدنہ بنالیں گے، کہیں گے بھلا اس طرح کی باتیں بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ حالانکہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ خاص حکمت سے بیان فرما رہا ہے جس کے اندر صلاحیت اور علم کی طلب ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، رہے وہ جو جہل کے باوجود غرورِ مہر دانی میں مبتلا ہیں وہ ان کے سبب سے فتنہ میں مبتلا ہوں گے اور اپنی عاقبت برباد کریں گے۔

(۳۲-۴۸) قیامت کی ایک آفاقی دلیل اور اس کی تکذیب کرنے والوں کی جہالت پر اظہارِ تعجب کہ وہ اس کائنات کے اس سب سے بڑے حادثہ سے کس طرح سنجت ہیں! قرآن لوگوں کو اس سے آگاہ کر رہا ہے تاکہ جو اس کے لیے تیار کی گئی ہیں وہ کر لیں اور جو منہ موڑنا چاہتے ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے کہ وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دن ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہوگا۔ اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی جہنم میں لے جائے گا۔ اس دن کسی کی بھی سعی و سفارش ذرا بھی کسی کو نفع نہ پہنچائے گی۔ اس دن کی کامیابی صرف اصحابِ ایمین کو حاصل ہوگی۔ وہ جنت میں رحمان گئے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے وہ دوزخ والوں سے معلوم کریں گے کہ وہ دوزخ میں کیوں پڑے تو وہ ان سے جو تعبیریں بر ملا اپنے ان جرائم کا اعتراف کریں گے جو ان کی اس بد انجامی کے سبب ہوئے۔

(۴۹-۵۲) قرآن سے بدکنے والوں کے حال پر تعجب۔ ان کے بدکنے کے اصلی اباب کی طرف اشارہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ ان لوگوں کی پروا نہ کریں۔ آپ کا کام صرف یاد دہانی ہے۔ جو لوگ اس یاد دہانی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے وہ اپنا حشر خود دیکھیں گے۔ اس سے فائدہ دہی اٹھائیں گے جو سنتِ الہی کے سخت اس کے سزاوار ہوں گے۔



# سورة المدثر

مَكِّيَّةٌ ————— آيات : ٥٦

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِرُ ① قُمْ فَأَنْذِرْ ② وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ⑥ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ⑦ فَإِذَا نُفِخَ فِي النُّافِثِ ⑧ فَذَلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ⑨ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ⑩ ذُرْنِي وَهَرَبْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ⑪ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ⑫ وَبَنِينَ شُهُودًا ⑬ وَمَهَّدْتُ لَهُ تَهِيدًا ⑭ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ⑮ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ⑯ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ⑰ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ⑱ فَقَتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ⑲ ثُمَّ قَتَلَ كَيْفَ قَدَّرَ ⑳ ثُمَّ نَظَرَ ㉑ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ㉒ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ㉓ فَقَالَ إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْتَرُ ㉔ إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ㉕ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ㉖ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرٌ ㉗ لَا تُبْقَى وَلَا يُنْذَرُ ㉘ كَوَاحِلُ لِلْبَشَرِ ㉙ عَلَيْهَا تِسْعَةُ عَشْرَ ③٠ وَمَا جَعَلْنَاهُ أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ㉚ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ

آيات  
١-٦



كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزِدَّ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا  
 وَلَا يَوْتِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ  
 إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ ٣١ كَلَّا وَالْقَمَرِ ٣٢ وَالْيَلِ إِذَا  
 أَدْبَرَ ٣٣ وَالصُّبْحِ إِذَا أَصْفَرَ ٣٤ إِنَّهَا لِأَحَدَى الْكُبَرِ ٣٥ نَذِيرًا  
 لِلْبَشَرِ ٣٦ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ٣٧ كُلُّ نَفْسٍ  
 بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ٣٨ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ٣٩ فِي جَنَّةٍ  
 يَتَسَاءَلُونَ ٤٠ عَنِ الْجُرُمِ ٤١ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ٤٢  
 قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِينَ ٤٣ وَلَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمُسْكِينِ ٤٤  
 وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ٤٥ وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ٤٦  
 حَتَّى أَتَانَا الْيَقِينُ ٤٧ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ٤٨  
 فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ ٤٩ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ ٥٠  
 فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ٥١ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ  
 يُؤْتِيَ صُحُفًا مَنشُورَةً ٥٢ كَلَّا ٥٣ بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ٥٤  
 كَلَّا إِنَّهُ تَذَكُّرَةٌ ٥٥ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ٥٥ وَمَا  
 يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ٥٦ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَى وَ  
 أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ٥٦



اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب ہی کی کیریائی کی  
 منادی کر اور اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی کو چھوڑ اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے  
 منقطع نہ کر۔ اور اپنے رب کی راہ میں ثابت قدم رہ۔ ۱-۷۴

پس جب صبر پھونکا جائے گا تو وہ وقت نہایت کٹھن وقت ہوگا! کافروں پر  
 آسان نہ ہوگا! چھوڑ مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا۔ اور اس کو بخش مال  
 فراوان۔ اور بیٹے دیے حاضر باش اور اس کے لیے خوب راہ ہموار کی۔ پھر وہ یہ توقع  
 رکھتا ہے کہ میں اس کے لیے اور زیادہ کروں گا۔ ہرگز نہیں! وہ تو ہماری آیتوں کا  
 دشمن نکلا۔ میں اس کو عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔ ۸-۷۴

اس نے سوچا اور ایک بات بنائی۔ پس ہلاک ہو، کیسی بات بنائی! پھر ہلاک ہو،  
 کتنی غلط بات بنائی! پھر اس نے نظر دوڑائی۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔  
 پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔ پس بولا یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے!  
 یہ تو محض انسانی کلام ہے! ۱۸-۷۵

میں اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کروں گا۔ اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے!  
 نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔ چٹری کو جھلس دینے والی۔ اس پر انہیں فرشتے مقرر  
 ہوں گے۔ ۲۶-۷۶

اور ہم نے دوزخ پر نگران تو فرشتوں ہی کو بنایا ہے اور ہم نے ان کی یہ تعداد نہیں  
 بیان کی مگر اس لیے کہ یہ آزمائش بنے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا تاکہ امتین حاصل  
 کریں وہ جن کو کتاب عطا ہوئی اور اہل ایمان اس سے اپنے ایمان کو بڑھائیں اور اہل کتاب



اور اہل ایمان تنک میں نہ پڑیں۔ اور تاکہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفر کرنے والے کہیں کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے! اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ باب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور تیرے رب کے شکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور یہ ماجرا محض انسانوں کی یاد دہانی کے لیے ہے۔ ۳۱۔

ہرگز نہیں، شاید ہے چاند اور رات جبکہ وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے اور صبح جب روشن ہو جائے کہ یہ ماجرا ان بڑے ماجروں میں سے ہے جو انسان کی تنبیہ کے لیے سنایا گیا۔ ان کے لیے جو تم میں سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا چاہیں۔ ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گرو ہو گا۔ صرف دہننے والے اس سے متشنی ہوں گے، وہ باغوں میں ہوں گے، پوچھ گچھ کر رہے۔ ہوں گے مجرموں کے باب میں۔ سوال کریں گے، تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ جواب دیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے اور نہ غریبوں کو کھلانے ہی تھے اور کٹ جھٹیاں کرتے تھے اور ہم جزاء و سزا کے دن کو جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ یقین کی ساعت آگئی۔ ۳۲۔ ۳۳۔

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی۔ ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یاد دہانی سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں! گویا کہ وہ بد کے ہوئے گدھے ہوں جو شیر سے ڈر گئے بھاگے ہوں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیے جائیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاد دہانی ہے تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ — وہی اہل تقویٰ اور وہی سزاوارِ مغفرت ہیں۔ ۴۸۔ ۵۶۔



## الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۖ قُمْ فَأَنْذِرْ (۱-۲)

’مَدَّ ثَوْرٌ مَزْمَلٌ‘ دونوں کے معنی جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک ہی ہیں۔ ’مَدَّ ثَوْرٌ ذِئْبَارٌ‘ سے ’مَزْمَلٌ‘ اور بے جو اس چادر کے لیے آئنا ہے جو سونے والا اپنے اوپر لے لیا کرتا ہے۔

چار۔ پیٹے رکھنا، جیسا کہ ہم نے سابق سورہ میں واضح کیا، آدمی کی فکر مندی کی ایک علامت ہے۔ کی بلاغت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء بُعْثت میں جو مشاہدات و تجربات ہوئے اول تو وہ خود ہی گراں بار کرنے والے تھے پھر جب آپ نے ان کا اظہار اپنے خاندان والوں کے سامنے کیا اور انھوں نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا تو آپ کی فکر مندی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں آپ زیادہ تر چادر پیٹے ہوئے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے جس طرح ایک فکر مند انسان رہتا ہے۔ آپ کی اسی فکر و پریشانی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پیار سے آپ کو ’مَزْمَلٌ‘ اور ’مَدَّ ثَوْرٌ‘ سے خطاب فرمایا تاکہ خطاب ہی سے آپ کو تسلی مل جا۔ اُسے کہ رب کریم آپ کے حال سے اچھی طرح واقف ہے اور جب اس نے اس شفقت سے مخاطب فرمایا۔ بے تودہ آپ کی پریشانی دور بھی فرما۔ اُسے گا۔ چنانچہ سابق سورہ میں آپ کو ’مَزْمَلٌ‘ سے خطاب کر کے قیامِ اہل کی تاکید فرمائی گئی جس میں اس فکر و پریشانی کا علاج بھی تھا اور اس مہم کے لیے تیاری بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

’قُمْ فَأَنْذِرْ‘ یہ اس مہم کا بیان ہے جس کی طرف کچھ پی سورہ میں ’إِنَّا سُلِّفْنَا عَلَيْكَ قَوْلًا‘

’ثَقِيلًا‘ (۵) ہم تم پر آگے ایک بھاری ذمہ داری ڈالنے والے ہیں) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ یہ کلمہ جو بنی یعنی کمر بستہ ہو کر اٹھو اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی قوم کو انداز کرو۔ مخالفت و مزاحمت، حالات کی نامساعدت اور ماحول کی اجنبیت کی پروا نہ کرو۔ جب تم ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری راہ آسان کرے گا اور غیب سے تمہاری تائید کے اسباب فراہم ہوں گے۔ سابق سورہ میں یہ اشارہ ہم کر چکے ہیں کہ ’إِنَّا سُلِّفْنَا عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا‘ (۵) سے اسی اندازِ عام کے حکم کی طرف اشارہ ہے جو یہاں دیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے ’قَوْلًا ثَقِيلًا‘ سے خودی کو مراد لیا ہے لیکن وحی تو اس سے پہلے بھی نازل ہو چکی تھی تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ ہم عنقریب تم پر ایک قولِ ثقیل نازل کریں گے؟ البتہ انداز کا یہ حکم آپ کے لیے بلاشبہ ایک بہت ہی بھاری حکم تھا۔ مگر اور وظائف کے سرِ واردوں کے کانوں میں توجہ کی اذان دینا اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ آپ اللہ کے رسول ہو کر آئے ہیں، اگر انھوں نے آپ کے انداز کی تکذیب کی تو اس کے عذاب کی زد میں آجائیں گے کوئی سہل کام نہیں تھا۔



اس بھاری ذمہ داری سے آپ کا ہر اس محسوس کرنا ایک امفطری تھا۔ چنانچہ ابتداءً آپ نے اپنے کام کو اپنے خاص خاندان والوں ہی تک محدود رکھا اور ان پر بھی نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اپنے بعض مشاہدات و تجربات کا اظہار فرما کر ان کا رد عمل معلوم کرنا چاہا جو نہایت مخالفانہ صورت میں سامنے آیا۔ چنانچہ اس دور میں آپ پر نہایت شدید فکر مندی کی حالت طاری رہی۔ جس کی تصویر 'مذمل' اور 'مذشہ' کے الفاظ سے ہمارے سامنے آتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو مبعوث فرمایا تھا وہ ہونا تھا چنانچہ پہلے (سورہ فزل میں) آپ کو اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ہدایت ہوئی پھر اس سورہ میں کمر باندھ کر انذار عام کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم ہوا۔

وَبَلَّغْ فِکَیْرُ (۳)

یہ اس انذار کا پہلا حکم ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے یعنی صرف اللہ ہی کی کبریائی۔ یکتائی کا اعلان۔ مفعول کی تقدیم سے یہاں حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا جو بھی کبریائی کے مدعی ہیں یا جن کی کبریائی کا بھی دعویٰ کیا جاسکتا ہے وہ سب باطل، تم صرف اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کرو۔ ایک جاہلی معاشرہ میں یہ اعلان ساری خدائی سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن دین کی بنیاد چونکہ اسی کلمہ پر ہے اس وجہ سے ہر نبی کو بے درنگ یہ اعلان کرنا پڑا۔

وَشِیَابُکَ فَطَهَّرُ (۴)

لفظ 'شِیَابُ' جمع ہے 'ثَوْبُ' کی جس کے معنی کپڑے کے ہیں لیکن اس کے معنی دامن کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ کلام عرب کے شواہد سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مفہوم میں بھی آتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں 'دامن دل' سے تعبیر کرتے ہیں۔ امرء القیس کا مشہور شعر ہے۔

وَاَنْ تَلْکَ قَدْ سَاوَتْکَ مِنْیْ خَلِیْقَۃَ

فَلِیْ شِیَابِیْ مِنْ شِیَابِکَ تَنْسَلُ

اس شعر میں شامین نے 'شِیَابُ' کو دل ہی کے معنی میں لیا ہے اور یہ معنی اس صورت میں لیے جا سکتے ہیں جب اس کو بطریق استعارہ 'دامن دل' کے مفہوم میں سمجھا جائے۔ امرء القیس ہی کا مصرعہ ہے۔

شِیَابِیْ بَنِیْ عَوْفٍ طَهَّارِیْ نَقِیَّةَ

لفظ 'شِیَابُ' کے اس مفہوم کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ تم بالکل بے خوف ہو کر اپنے رب

سے اگر میری کوئی حرکت تجھے بری ہی لگی ہے تو میرے دامن دل کو اپنے دامن دل سے جدا کر دے تو جدا ہو جائے گی۔  
سے بنی عوف کے دامن بالکل پاک صاف ہیں۔



کی کبریائی اور وحدت کی منادی کرو۔ مخالفین خواہ کتنی خاک بازی کریں اور کتنا ہی زور لگائیں لیکن نرم اپنے دامن دل پر نجاست شرک کا کوئی چھینٹا نہ آنے دو۔ یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں مشرکوں کو نجس اور شرک کو نجاست سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ ہدایت آپ کو اس لیے فرمائی گئی کہ بعد کے مراحل میں قریش کے لیڈروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ آپ کی سب باتیں مان لیں گے بشرطیکہ آپ بھی ان کے معبودوں کا کوئی مقام تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات نہایت سختی سے رد فرمادی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کو نہایت تاکید کے ساتھ یہی ہدایت ہوئی کہ توحید بنیاد دین ہے، اس باب میں آپ کوئی لچک ہرگز قبول نہ کریں: **وَدَّوْنَاؤُنَّا هُنَّ** **فَيَذْهَبُونَ** (العنکبوت - ۲۸، ۲۹) (وہ چلے جاتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم ہو جائیں) اور اسی مضمون کی ایک سے زیادہ آیتوں میں اس صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کی ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے مشرکین پر گویا یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ شرک ایک ایسی نجاست ہے جس کا کوئی چھینٹا بھی اللہ کا رسول اپنے دامن پر گوارا کرنے والا نہیں ہے۔

كَالْمُزْجِجِ نَافِثًا هُجُجًا (۵)

’رُجْزُ‘ ’رُجْزُ‘ اور ’رُجْزُ‘ سب قریب المخرج اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا استعمال اس گندگی کے لیے ہوتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت میں ارتعاش اور گھبراہٹ پیدا ہو۔ یوں تو اس سے ہر قسم کی گندگی مراد ہو سکتی ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر شرک کی گندگی کے لیے آیا ہے اور مقصود اسی مضمون کی تاکید ہے جو **وَدَّوْنَاؤُنَّا هُنَّ** کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اپنے دامن کو شرک کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شرک کی ناپاکی سے دور رہو۔

اس ہدایت کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ جس طرح دورِ اسلام میں طاہر و مطہر رہے اسی طرح جاہلیت میں بھی شرک کے ہر شائبہ سے پاک رہے۔ مقصود صرف کفار و مشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو مندران کے پاس آیا ہے اس کا موقف ان کے دینِ شرک کے معاملہ میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۶)

’مَنْ‘ کے معنی جس طرح احسان کرنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی چیز کو کاٹ دینے کے بھی آتے ہیں۔ تاہم کلام سورہ تلم میں فرمایا ہے: **وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ** (۳) (اور بے شک تمہارا ہے ایک کبھی کی ایک شکل نہ منقطع ہونے والا صلہ ہے) یعنی جس انذار و تبلیغ کی تمہیں ہدایت کی جا رہی ہے اس کو برابر جاری رکھنا۔ یہ خیال ترک کر کے کہ اب کافی انذار کیا جا چکا، مزید کی ضرورت نہیں رہی، اس عمل کو منقطع نہ کر بیٹھنا۔ اور اس کا مل



تمہارے رب کی طرف سے جو حکم دیا جا رہا ہے۔ اس پر اس وقت تک قائم و دائم رہو جب تک رب ہی کی طرف سے اس باب میں کوئی اور ہدایت تمہیں نہ ملے۔

’تَشْكُرُوْا‘ یہاں نہیں کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو اس پر جزم آنا تھا۔ اگرچہ بعض قاریوں نے اس کو جزم کے ساتھ بھی پڑھا ہے لیکن متواتر قراءت صرف صحیف کی ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کو نعمتہ کے ساتھ ہی پڑھنا اولیٰ ہے اور اسی کے مطابق اس کی تاویل بھی ہونی چاہیے۔ اس صورت میں یہ لفظ یا تو حال کے محل میں ہو گا یا اس کو نقل جملہ کی حیثیت دینی پڑے گی۔ میرے نزدیک یہ حال کے مفہوم میں ہے۔

لفظُ اسْتِكْشَرْتُ دُومندوں میں مردف سے۔ ایک کسی چیز کو زیادہ کرنے اور زیادہ چاہنے کے معنی میں دوسرے کسی چیز کو زیادہ سمجھ لینے یا زیادہ گمان کر لینے کے معنی میں۔ پہلے معنی کے لیے لفظ دَوَّوْ كُنْتُ اَعْلَمَ الْغَيْبِ لَا اسْتَكْشَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (الاعراف: ۱۸۰) والی آیت میں ہے۔ دوسرے معنی کی وضاحت لغت نے یوں کی ہے: استكشروا الشيء راہ كثير اذ عده كثير (استكشروا الشيء کے معنی ہوں گے کسی چیز کو زیادہ خیال کیا یا شمار کیا) صاحبِ اقرب الی وارد نے اسی معنی کو پہلے لیا ہے۔ میرے نزدیک آیت میں یہ اسی معنی میں آیا ہے۔ مطلب، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ ہو گا کہ انذار کا یہ فرض بغیر کسی دفعہ اور قطع کے برابر جاری رکھو، کبھی یہ گمان کر کے چھوڑ نہ بیٹھنا کہ کافی انذار ہو چکا، اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہدایت اس لیے فرمائی گئی کہ رسول جس فرضِ انذار پر مامور ہوتا ہے اس کے متعلق سنتِ الہی جیسا کہ جگہ جگہ ذکر کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اگر قوم اس کے انذار کی پروا نہیں کرتی تو ایک خاص مدت تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو لازماً ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ مہلت اتمامِ حجت کے لیے ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم کو اس کے لیے کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے کام میں لگاں ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس یہ ہدایت نہ آجائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب وہ قوم کو اس کی تقدیر کے حوالہ کر کے اس علاقے سے ہجرت کر جائے۔ اگر رسول بطورِ خود یہ گمان کر کے قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تو اندیشہ ہے کہ حالات کا اندازہ کرنے میں اس سے اسی طرح کی غلطی صادر ہو جائے جس طرح کی غلطی حضرت یونس علیہ السلام سے صادر ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ فرمائی اور ایک سخت امتحان سے گزرنے کے بعد ان کو پھر قوم کے پاس انذار کے لیے واپس بھیجا اور اس دوبارہ انذار سے اللہ تعالیٰ نے ان کی پوری قوم کو ایمان کی توفیق بخشی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کی عجلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں یہ آگاہی دے دی کہ تم جس فرض پر مامور کیے جا رہے ہو اس میں برابر لگے رہنا، کبھی از خود یہ سمجھ کر چھوڑ



نہ بیٹھا کہ اب وہ فرض کافی حد تک ادا ہو چکا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فیصلہ تمہارے کرنے کا نہیں بلکہ ہمارے کرنے کا ہے۔ 'فَاَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ' (القصہ - ۶۸ : ۷۸) (پس صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور ٹھپلی والے کے مانند نہ بن جانا) اور اس مضمون کی دوسری آیت میں آپ کو صبر و ثبات کی تعلیم دی گئی ہے اور یہاں بھی آگے والی آیت میں یہی مضمون آ رہا ہے۔

ہمارے مفسرین نے عام طور پر اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم کسی پر کوئی احسان اس خیال سے نہ کرنا کہ اس کا بدلہ اس سے زیادہ احسان کی صورت میں حاصل کرو، اگرچہ آیت کے الفاظ سے یہ مطلب نکالا جاسکتا ہے لیکن سوال کلام کے موقع محل کا بھی ہے۔ آخر اس سیاق و سباق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت کرنے کا کیا موقع ہے! ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات سے آیت کے دونوں لفظوں کے مفہوم معین کرنے میں مسامحت ہوئی۔ ہم نے ان کی وضاحت کر دی ہے جس سے آیت کا صحیح مفہوم واضح ہو گیا ہے اب اس پر مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَلِرَبِّكَ فَاَصْبِرْ د)

اس کا مفہوم دی ہے جو آیت 'وَاَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا' (المطہ - ۵۲ : ۵۸) اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو، تم ہماری آنکھوں میں ہو، کا ہے۔ 'صَبْرُ' کے ساتھ جب 'ل' آئے تو اس کے معنی صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں حضور کو جو ہدایت ہوئی۔ ہم اسی سے متعلق یہ ہدایت بھی ہے کہ اپنے کام کو کافی سمجھ کر کسی مرحلہ میں تھوڑے بیٹھنا بلکہ صبر و استقامت کے ساتھ اس میں لگے رہنا اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرنا۔ اسی استقامت پر تمہاری کامیابی اور قوم پر انعام حجت کا انحصار ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَاءْنَاكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ قَدْ كُنَّا فِي الْأَوَّلِينَ غَافِلِينَ (۸ - ۱۰)

یہ ذکر ہے انذار کے اصل موضوع کا جس سے غفلت ہی تمام برائیوں کی بڑے نبی صلی اللہ علیہ وسلم انذار کا کی دہشت سے قریش کی مخالفت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ قیامت کو نہ مانتے تھے نہ ماننا چاہتے تھے۔ وہ اول تو اس کو نہایت متبع اور بعید از ارکان سمجھتے تھے اور اگر کسی درجے میں مانتے تھے تو اپنی دنیوی کامیابیوں کو دلیل بنا کر یہ دعوے کرتے تھے کہ قیامت ہوئی تو جس طرح ان کو یہاں سب کچھ حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی حاصل ہوگا اور اگر خدا نے ان پر ہاتھ ڈالا تو ان کے معبود اپنی سفارش سے انہیں بچا لیں گے نہ پایا کہ اس ہولناک دن سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دو کہ جب حضور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا ہی کٹھن ہوگا۔

عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ نَاصِرٍ ۚ (یعنی انہوں نے اس کو بہت آسان سمجھ رکھا ہے لیکن کافروں کے لیے



یہ دن آسان نہیں ہوگا۔

اوپر والی آیت میں مثبت پہلو سے کہنے کے بعد وہی بات منفی پہلو سے بھی فرمادی جس میں ان احمقوں پر نہایت بلیغ طنز بھی ہے جو اس کو ایک ناقابلِ اہتمام دن سمجھ کر نچیت بیٹھے تھے کہ جب وہ آئے گا تو دیکھ لیں گے۔ فرمایا کہ وہ کوئی آسان دن نہیں ہوگا، بڑا ہی کٹھن دن ہوگا۔ اس کے لیے جو کچھ کیا جاسکتا ہے آج ہی کیا جاسکتا ہے۔ جس نے آج نہیں کیا وہ ہمیشہ کے لیے پکڑا گیا اور اس طرح پکڑا گیا کہ اس کو کوئی بھی چھڑانے والا نہ بنے گا۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۖ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۖ وَبَنِينَ شُهُودًا ۖ  
وَمَهَدْتُ لَهُ نَاصِيَةً ۖ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ (۱۱-۱۵)

یہ نیک اور طائف کے ان بر خود غلط لیڈروں کو نہایت تیز و تند لہجہ میں تنبیہ ہے جو اپنی خوشامی  
رہنمائی کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت اور خدا کے منظور نظر ہونے کی دلیل سمجھتے اور یہ توقع رکھتے تھے  
کہ آخرت ہوئی تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں، جیسا کہ ان کو ڈرایا جا رہا ہے، بلکہ ان کو یہاں جو کچھ  
حاصل ہے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ ایسے سر بھروں کا معاملہ تم ہمارے  
اوپر چھوڑو۔ ہم ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ تم ان کی فکر میں زیادہ پریشانی نہ اٹھاؤ۔

”ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا“ یہ وہم اسلوب بیان ہے جو سابق سورہ میں بالکل اسی موقع و محل  
میں ہیں الفاظ گزر چکا ہے: ”وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِيَ النَّفْسَةِ وَمَهَلُمَّ قَلِيلًا (المزمل ۳۰: ۱۱)“  
وہاں اس اسلوب کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

”خَلَقْتُ وَحِيدًا“ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اس کے  
ساتھ نہ اس کا مال و جاہ ہوتا ہے نہ اس کا لاڈلے شکر۔ یہ چیزیں ملتی ہیں تو خدا کی عنایت سے ملتی ہیں اور  
یہ اسی وقت تک ساتھ رہتی ہیں جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ ان کا حق یہ ہے کہ انسان ان کو پا کر  
اپنے رب کا زیادہ سے زیادہ شکر گزار بنے نہ کہ اس گھنڈ میں مبتلا ہو جائے کہ وہ خدا کا بڑا چہیتا ہے اور  
آخرت ہوئی تو وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا۔ یہ مضمون دوسری جگہ اس طرح ادا ہوا ہے: ”وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا  
فُرَادًى كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام ۴-۹۴)“ اور تم ہمارے پاس آئے تین تنہا جس طرح ہم  
نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔

مطلب یہ ہے کہ تم اس بر خود غلط مغرور کو جو دنیا میں آیا تو اسی طرح جس طرح ہر شخص اپنی ماں  
کے پیٹ سے تنہا آتا ہے لیکن ہم نے اس کو مال و جاہ عنایت کیا تو وہ اپنے کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگا  
اور اب اس کو آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے تو وہ اس رعونت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ آخرت میں اس  
سے بھی زیادہ کا حق دار ٹھہرے گا۔



یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ ہے یا مکر اور طائف کے عام دو متندوں انفرادی خاص کا ذہن بیان ہو رہا ہے؟ مفسرین نے اس سے قریش کے لیڈروں میں سے ولید بن مغیرہ کو مراد لیا ہے۔ ذہنیت کی طرف لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ ذہن صرف ولید بن مغیرہ ہی کا نہیں بلکہ قریش کے تمام سرداروں اور دولت مندوں کا تھا اور قریش ہی کی کیا خصوصیت ہے آج بھی جن کو مال و جاہ حاصل ہو جاتا ہے ان کے اندر یہی خناس سما جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہی بالوفیق ہوتا ہے جو اس فتنہ سے محفوظ رہتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سمجھنا تو صحیح نہیں ہے کہ یہ آیتیں ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں البتہ ان آیات میں جس ذہن اور جس کردار کی تصویر ہے اس کا ایک مصداق اس کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہم مقدمہ کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ سلف جب کسی آیت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارے میں ہے تو اس سے ان کی مراد لازماً یہی نہیں ہوتی کہ خاص اسی کے بارے میں نازل ہوئی بلکہ با اوقات اس سے ان کا مقصود آیت کے ایک مصداق کی طرف اشارہ کر دینا ہوتا ہے۔ یہ مضمون صرف یہیں نہیں بیان ہوا ہے بلکہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے مقصود متمر دین کی عام ذہنیت کی طرف اشارہ کرنا ہے نہ کسی خاص شخص کی طرف۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں حرف 'مَنْ' استعمال ہوا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کے لیے ضمیریں بھی دونوں ہی طرح آسکتی ہیں۔

وَجَعَلْتُ لَكَ مَالًا مَسْدُودًا یعنی جب وہ دنیا میں آیا تو نہ مال کے ساتھ آیا نہ اولاد کے ساتھ بلکہ اسی طرح بے سرد سامان اور بے خدم و حشم آیا جس طرح دوسرے آتے ہیں۔ یہ اللہ کا اس کے اوپر احسان ہوا کہ اس نے اس کو پھیلایا ہوا مال دیا۔ پھیلایا ہوا مال سے مراد یہ ہے کہ کہیں اس کے باغ میں کہیں اس کے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں کہیں جائز روں کے گائے اور لیڈر ہیں، کہیں رقبے، تجارتی آرٹھتیں اور دکانیں ہیں۔ اس زمانے کے سرمایہ دار ہر ملک کے بنکوں میں اپنے حساب کھولتے اور ہر ملک کی کمپنیوں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں ان کو بھی اسی ذیل میں شمار کیجیے۔

وَبَيْنَ شُهُودًا مال کے ساتھ اللہ نے اس کو بیٹھے بھی دیے جو ہر مجلس، ہر مقام اور ہر محاذ پر اس کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور اس کے پھیلے ہوئے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے والے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں خاندانی عصبیت و جمعیّت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔

مدافعت و مقابلہ کا تمام تر انحصار اس پر تھا۔ قوم و قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی کو حاصل ہوتا جس کے بیٹے زیادہ اور کنبہ بڑا ہوا اور بیٹے ایسی صلاحیت و قابلیت رکھنے والے ہوں کہ ہر ضرورت کے موقع پر باپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو سکیں۔ لفظ 'شُھود' اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

وَمَهَّدْتُ لَكَ تَهَيُّدًا یعنی اس طرح مال و اولاد دے کر اس کے لیے عزت و وقار اور امارت



سیادت کے حصول کے لیے اچھی طرح راہ ہموار کر دی۔

’ثُمَّ يَكْفِئُكَ آتٌ أَزِيدُ‘ یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق تو یہ تھا کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار و فرمانبردار بندہ بنتا لیکن ہوا یہ کہ وہ نعمتیں پا کر اکڑنے اور اترنے والا بن گیا۔ جب اس کو ڈرایا جاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جو ناشکروں اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہوگا تو وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر فی الواقع کوئی ایسا دن آیا تو اس دن وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا جو اس کو یہاں حاصل ہے۔

كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عِثْدًا (۱۶)

یہ اس قسم کے بر خود غلط لوگوں کے زعم باطل کی نہایت شدت کے ساتھ تردید ہے۔ فرمایا کہ ان کا یہ خواب ہرگز پورا ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ نے ان کو جو نعمتیں دیں نہ ان کے حق کی حیثیت سے دیں نہ ان کے حاصل ہونے میں ان کی تدبیر یا ان کے تدبر کو کوئی دخل ہے بلکہ محض اپنے فضل و کرم سے یہ امتحان کرنے کے لیے دیں کہ دیکھے وہ اپنے رب کے شکر گزار و فرمانبردار رہتے ہیں یا خود مبرا مغرور اور خدا کے باغی اور زمین میں فساد برپا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اس امتحان سے ثابت ہو گیا کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ کی آیتوں کے دشمن بن گئے۔ ’آیات‘ سے مراد بحیثیت مجموعی قرآن اور خاص طور پر اس کی وہ آیتیں ہیں جو عذاب دنیا اور عذاب آخرت سے ڈرانے والی اور اس امر واقعی سے آگاہ کرنے والی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ اس دنیا میں کوئی معترف ہے اور نہ آخرت میں اس کے سوا کوئی مولیٰ و مرجع بنے گا۔

مَا دُعِفَتْ صُعُودًا (۱۷)

’ارْهَاقُ‘ کے معنی کسی مشقت میں ڈالنے کے ہیں اور ’صُعُودُ‘ کسی ایسی چوٹی یا گھاٹی کو کہتے ہیں جس کو عبور کرنا نہایت دشوار ہو۔

یہ مزا بیان ہوئی ہے اس انعام کی ناقدری کی جس کی طرف اوپر دَمَهَّدَتْ لَهٗ تَسْهِيدًا کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ نعمتیں پا کر چونکہ وہ انہی کے پرستار بن کر رہ گئے اور اصل منعم کو بھول کر اپنے نفس ہی کی بندگی میں اس طرح لگ گئے کہ اس کی کسی خواہش کا بھی مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے اس وجہ سے ان کو آخرت میں ایک نہایت بڑی مشقت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

یہاں نیکی اور بدی کی یہ فطرت پیش نظر رہے کہ ان دونوں کا امتیاز تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس امتحان میں بھی اس کو ڈال دیا کہ بدی کی لذتیں تو عاجل رکھی ہیں اور تلخیاں اس کی آخرت میں سامنے آئیں گی۔ برعکس اس کے نیکی کی مشکلیں نقد ہیں اور نفع اس کا سید ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں قدم قدم پر اس کو نفس کی مزاحمت کے سبب سے



چڑھائیاں چڑھنی اور گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں اور بدی کی راہ اختیار کرے تو اس کی لذت تو اس کو نقد نقد ملتی ہے اور اس کے انجام بد کا معاملہ اس کے نزدیک موہوم ہوتا ہے۔ اس کشش کے سبب سے اکثر میت اس راہ کو اختیار کر لیتی ہے۔ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ صرف وہی کرتے ہیں جن کے اندر صبر اور عزیمت ہو اور اس وصف کو پیدا کرنے کے لیے آدمی کو ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں۔

سورہ بلد میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے :

وَهَذَا يَوْمُ النَّجْدَيْنِ ۚ فَلَا أَفْخَمُ  
الْعُقَبَةَ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعُقَبَةُ ۚ  
فَلَكُ رَقَبَةٌ ۚ أَوْ رَاضِعٌ فَيَوْمِ  
ذِي مَسْجَةٍ ۚ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۚ  
أَوْ مِلْكِيًّا ذَا مَثْرَبَةٍ ۚ ثُمَّ كَانَ  
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ  
وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۚ

اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کی راہیں  
سمجھا دیں۔ پس اس نے گھاٹی پار کرنے کا  
حوصلہ نہ کیا اور تم کیا سمجھو کہ گھاٹی کیا ہے !  
غلام کی گردن چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں  
کسی قرابت مندی تمیم یا کسی خاک نشین مسکین  
کو کھلانا۔ مزید برآں یہ کہ وہ بنے ان لوگوں  
میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک

دوسرے کو صبر اور رحمت کی تلقین کی۔

(البلد - ۹۰ : ۱۰ - ۱۷)

قرآن نے آخرت کی فوز و فلاح کا حق دار صرف انہی کو ٹھہرایا ہے جو دنیا میں نیکی کی راہ کے عقبات کو پار کرنے کا حوصلہ کریں گے۔ جو یہاں ان کو پار کرنے کی ہمت نہیں کریں گے ان کو دوزخ کے عقبات سے سابقہ پیش آئے گا جن کو پار کرنے پر وہ مجبور کیسے جائیں گے لیکن وہ ان کو پار نہ کر سکیں گے۔

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۖ فَقَتَلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۖ ثُمَّ نَبَذَهُ ۖ  
ثُمَّ جَسَّ وَتَبَرَّ ۖ ثُمَّ أَدْبَرَ ۖ فَتَتَبَعَهُ فَتَوَلَّىٰ  
وَتَوَلَّىٰ ۖ فَكَرِهَ النَّاسُ ۚ فَقَالَ إِنِّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُوشِرُ ۖ وَإِنَّ هَذَا  
إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۱۸ - ۲۵)

آیت ۱۶ میں یہ جو فرمایا ہے کہ وہ ہماری آیات کا شدید معاند ہے یہ اسی عناد کی تصویر کھینچی گئی ہے اور غور سے دیکھیے کہ کیسی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے۔

معاندین قرآن  
کے عناد کی تصویر

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ - یعنی جب قرآن اس کو سنا یا گیا تو اس نے اپنا رد عمل فوری طور پر ظاہر کرنے کے بجائے کچھ دیر غور کرنے کا تکلف کیا تاکہ دیکھنے والوں پر یہ اثر پڑے کہ ان کا لیڈر مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ وَقَدَّرَ یعنی غور کرنے کے بعد جو رائے اس کے



ذہن میں آئی اس کو اس نے اپنے ذہن میں اچھی طرح تولد کیا کہ وہ ایسی بات کہے جو دلوں میں اتر جائے اور ہر شخص پکاراٹھے کہ جو رائے ظاہر کی گئی ہے نہایت صائب ہے۔

’فَقِيلَ كَيْفَ قَدَرَهُ ثُمَّ قِيلَ كَيْفَ قَدَرَهُ‘ لیکن وہ غارت ہو کر اس نے قرآن کا کتنا غلط انداز کیا! اور پھر غارت ہو کر اس نے کتنی بے ہودہ رائے قائم کی۔ رائے کے ذکر سے پہلے دوبرتہ اس تاکید کے ساتھ اس پر لعنت سے مقصود اس کی رائے کی شہادت کا اظہار بھی ہے اور سننے والوں کو متنبہ کرنا بھی کہ جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے تو وہ اسی طرح پاگلوں کی سی باتیں کرتا اور گہر کو پیشینہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے برابر کوئی دوسرا نہیں ہے۔

’ثُمَّ نَظَرُوا ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَ ثُمَّ أَدْبَوْا سُبُكًا‘ یہ اس کے اس متکبرانہ انداز کی تصویر ہے جو اس نے رائے ظاہر کرتے ہوئے اختیار کیا۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے ایسی مکمل تصویر کھینچی ہے کہ اگر اس کے بعد اس کی رائے کا ذکر نہ بھی ہوتا جب بھی ایک اداسناں نہایت آسانی سے سمجھ لیتا کہ یہ انداز کس رائے کی غمازی کر رہا ہے۔ فرمایا کہ پہلے تو اس نے تفکر سے ہر اٹھا کر لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا تاکہ ان کے موڈ کا اندازہ کر سکے کہ اس رائے کے اظہار کے لیے ساعت ساز گار ہے یا نہیں۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا تاکہ دیکھنے والوں کو اس کے اس انداز ہی سے پتہ چل جائے کہ اس غور و فکر کے بعد اس نے قرآن کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ نہایت ہی مایوس کن ہے۔ پھر وہ نہایت استکبار کے ساتھ پیٹھ پھیر کر وہاں سے کچھ بڑبڑاتا ہوا چل کھڑا ہوا۔

’فَقَالَ إِنَّ هَذَا آيَاتُ سِحْرٍ شَوْءٌ إِنَّ هَذَا إِلَّا تَشْوِيلُ الْبَشَرِ‘ اگرچہ اوپر کی تصویر و تمثیل کے بعد کسی مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی بلکہ اداؤں اور حرکتوں ہی نے سارا انداز کھول دیا تھا تاہم قرآن نے اس کے الفاظ بھی نقل کر دیے کہ وہ کیا زہر اگلتا ہوا نہایت استکبار کے ساتھ پیچھے مڑا۔ فرمایا کہ اس نے کہا کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے اور یہ محض بشری کلام ہے۔

قریش کے لیڈروں کی زبان سے قرآن کو جادو کہنے کی وجہ اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت اور اس کی بے پناہ تاثیر و تسخیر کا انکار جب ان کے لیے ممکن نہیں رہا تو اس کے خلاف انھوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ جادو ہے تاکہ عوام کے دلوں پر اس کے الہامی و خدائی کلام ہونے کا رعب جو بیٹھتا جا رہا تھا اس کا ٹوڑ کریں۔ اس کو جادو کہہ کر وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اس کے اندر جو تاثیر و تسخیر ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ آسمان سے اتر ہوا کلام ہے بلکہ یہ محض الفاظ و زبان کی جادوگری ہے اور یہ کوئی ایسی نادر چیز نہیں ہے جو پہلی مرتبہ ظہور میں آئی اور قرآن ہی کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ یہ پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

قرآن کو جادو

کہنے کا ایک سبب



تھائے اس ملک میں اس سے پہلے بھی ایسے خطیب و شاعر گزر چکے ہیں جن کے کلام میں یہ جادو موجود تھا لیکن ان کو نہ کسی نے خدا کا فرستادہ مانا نہ انہوں نے خود کو کوئی فرستادہ ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے کلام کو کسی نے کلام الہی سمجھا تو اسی کلام کی کیا خصوصیت ہے کہ اس کو خدائی ہونے کا درجہ دے دیا جائے! 'إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ' یعنی یہ محض بشری کلام ہے۔ اس کے ساحرانہ اسلوب بیان کو جتنی اہمیت چاہو۔ ہم کو اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش نہ کرو۔

سَأُصْلِبُ سَقْرَهُ وَمَا آدْرُكَ مَا سَقَرُهُ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ (۲۶-۲۸)

یہ انجام بیان ہوا ہے اس قسم کے متکبروں کا۔ فرمایا کہ ہم اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کریں گے۔ 'وَمَا آدْرُكَ مَا سَقَرُهُ' یہ اس دوزخ کی ہولناکی کا اظہار ہے کہ تم کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے! یعنی کوئی اس کو معمولی چیز نہ سمجھے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ یہاں سے نہیں ہو سکتا۔ اس کو وہی جانیں گے جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔ قیمت بے وہ جو اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارے! اس طرح کا خطاب عام ہوتا ہے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ 'لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ' ابقی علیہ کے معنی ہوتے ہیں اس نے اس پر ترس کھا یا اور رحم کیا۔ یہاں اگرچہ صلہ مذکور نہیں ہے، اس کے اظہار کا موقع نہیں تھا، لیکن یہ فعل استعمال یہاں اسی معنی میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دوزخ ایسی ظالم چیز ہوگی کہ نہ کسی پر ذرا ترس کھائے گی کہ اس کے عذاب میں کچھ تخفیف ہو جائے نہ کسی کو نظر انداز کرے گی کہ وہ اس سے بچ نکلے۔ یعنی نہ اس سے رحم کی کوئی امید نظر انداز کیے جانے کی۔ وہ بالکل بے رحم بھی ہوگی اور پوری طرح چوکس بھی!

كَوَاخِةً لِلْبَشَرِ (۲۹)

'بَشَرٌ' جسم کی کھال کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کے شعلوں کی لپٹ کا یہ حال ہوگا کہ دور ہی سے مجرموں کی کھالوں کو تھپس دے گی۔ دوسرے مقام میں 'نَزَّاعَةً لِّلشَّوْىِ' (المعارج - ۷۰: ۱۶) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ جہنم کی شدت تمازت کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو مجرموں پر اصل مقام عذاب تک پہنچنے سے پہلے ہی پڑنے شروع ہو جائیں گے۔ مقصود یہ دکھانا ہے کہ جس عذاب کی ابتدا یہ ہوگی اس کی انتہا کا اندازہ کون کر سکتا ہے!

عَلَيْهَا تَسْعَةُ عَشْرَ (۳۰)

فرمایا کہ اس کے اوپر انیس مامور ہوں گے۔ یہاں انیس کا معدودہ مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیت آیات متشابہات میں اشارہ موجود ہے کہ یہ فرشتے ہوں گے۔ یہاں ان کے ذکر میں ابہام سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کی مزاجی خصوصیات، ان کی شکلیں اور ان کی قوتیں بالکل اس ڈیوٹی سے مناسبت رکھنے والی ہوں گی جس پر وہ مامور ہوں گے۔ مجرم ان کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ کر لیں گے کہ یہ کسی پر نہ رتی برابر ترس کھانے والے ہیں اور نہ



ان کے چنگل سے چھوٹ سکنے کا کوئی امکان ہے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد انیس ہونے میں کیا حکمت ہے اور بالفرض ان کی تعداد انیس ہی ہے تو اس اہتمام سے اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا جواب آگے والی آیت میں خود قرآن نے دیا ہے لیکن اس جواب سے پہلے ایک فردی تمہید ذہن نشین کر لیجیے۔

وہ یہ کہ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس کے دلائل عقل و فطرت اور آفاق و انفس میں موجود ہیں اور قرآن نے پوری وضاحت سے وہ بیان کر دیے ہیں۔ رہیں جنت و دوزخ کی تفصیلات تو ان کی نوعیت تشابہات کی ہے جن کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ اس نے ان کو تشبیہات تشبیہات کے پیرایہ میں سمجھا دیا ہے جن سے ہم فی الجملہ ان کا تصور رکھ کر سکتے ہیں لیکن ان کی اصل حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اگر آدمی ان کی اصل حقیقت جاننے کے درپے ہو تو وہ فتنہ میں پڑ جاتا ہے اور اس سے کچھ کرنا تو درکنار وہ اس اصل حقیقت کا بھی منکر بن جاتا ہے جس کی بنیاد عقل و فطرت کے قطعی دلائل پر ہوتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں ایک عاقل کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے اس کو ماننے اور یہ ایمان رکھنے کہ ان کی اصل حقیقت اس دن واضح ہوگی جس دن یہ سامنے آئیں گی۔ اس نکتہ کی وضاحت قرآن نے سورۃ آل عمران میں یوں کی ہے:

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ  
الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ  
هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ  
مُتَشَبِهَاتٌ لِّمَا مَّا الَّذِينَ  
فِي قُلُوبِهِمْ ذَلِيلٌ فَيَتَّبِعُونَ  
مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ  
الْفِتْنَةِ وَالْبِغَاءِ تَأْوِيلُهُ  
وَلَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ  
وَالَّذِينَ سَخِرُوا فِي الْأَعْلَامِ  
يَقُولُونَ أَمَّا بِهٖ  
كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا

وہی خدا ہے جس نے تم پر کتاب اتاری ہے جس میں  
(عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی) محکم آیات ہیں جن کو  
اصل کتاب کی حیثیت حاصل ہے اور کچھ تشابہ آیات  
بھی ہیں (جن میں کوئی بات تشبیہی رنگ میں سمجھائی گئی  
ہے) تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی اور  
اس کی اصل حقیقت کی دریافت کے زعم میں اس  
کی تشابہات ہی کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ اس  
کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔  
رہے وہ لوگ جن کے قدم علم میں خوب جھپٹے ہیں  
ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان  
لائے۔ یہ تشابہات بھی محکمات ہی کی طرح ہمارے

(آل عمران - ۷: ۳)

رب ہی کے پاس سے نازل ہوئی ہیں۔

اس قسم کے کج رویہ ذہن کے لوگ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ قریش کے لیڈروں اور اہل کتاب کے



مفسدین میں بھی ایسے لگے موجود تھے اس وجہ سے قرآن نے جب انیس فرشتوں کا ذکر کیا تو برسرِ موقع تنبیہ بھی فرما دی (جو آگے آ رہی ہے) کہ اگرچہ فتنہ پسند طبیعتیں اس کو فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنائیں گی لیکن اللہ تعالیٰ اس قسم کے حقائق اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے ان لوگوں کے علم میں اضافہ ہو جو علم کے طالب ہیں اور جن کے اندر فتنہ جوئی کا ذوق ہے اور ان کا کھوٹا بھر کر سامنے آئے۔ اس تمہید کو سامنے رکھ کر آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَذَكَّةَ مِمَّا جَعَلْنَا عَدُوَّ لَهُمْ لَا فِتْنَةَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا  
لَيَسْتَنفِثَنَّ الَّذِينَ أَتَوْا الْكِتَابَ وَيَزِدُّوا الَّذِينَ آمَنُوا أَيُّمَانًا دَلَّابِ الَّذِينَ أَتَوْا الْكِتَابَ  
وَالْمُؤْمِنُونَ لَا يُلْقُونَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَا ذَا آدَاءَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا  
كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنِ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ  
وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْبَشَرِ (۳۱)

یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، برسرِ موقع ایک تنبیہ ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ آیت بہت بعد میں مدینہ کے دور میں نازل ہوئی۔ سابق آیت سے حرفِ عطف کے ساتھ اس کا اتصال قرینہ ہے کہ یہ ساتھ ہی نازل ہوئی ہے۔ بعد میں نازل ہونے والی آیتیں، جو اپنے سابق حکم کے ساتھ ملائی گئی ہیں، ان کا انفصال ہر جگہ نمایاں ہے۔ سورہ قمر میں اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ..... (۲۰) والی آیت مدنی دور کی آیت ہے چنانچہ سابق آیت سے اس کا انفصال نمایاں ہے۔ اس کو خوفِ ربط کے ذریعہ سے مربوط نہیں کیا لیکن یہاں حرفِ عطف کے ذریعہ سے مربوط ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ آیت بھی ساتھ ہی نازل ہوئی اور مقصود اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مفسدین کے ذہن سے فی الجملہ آگاہ کر دینا ہے کہ جب تمہاری زبان سے وہ اس کی باتیں سنیں گے تو طرح طرح سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کریں گے لیکن تم ان کی یادہ گوئیوں کی پروا نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ یہ باتیں اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے اہل ایمان کے علم میں اضافہ ہو اور جن کے اندر فتنہ جوئی کی بیماری ہے ان کا کھوٹا بھر کر سامنے آجائے۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَذَكَّةَ مِمَّا جَعَلْنَا عَدُوَّ لَهُمْ لَا فِتْنَةَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا  
یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے کارخانہ کائنات کے تمام شعبوں پر فرشتوں ہی کو مامور فرمایا جنوں اور شیاطین کو نہیں مامور کیا، اسی طرح دوزخ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور کیا۔ کسی دوسری مخلوق کو نہیں کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی پیدا کی ہوئی پاکیزہ مخلوق ملائکہ ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے تاکہ کسی گوشے میں سرِ مو کوئی بات اس کے منشا کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ دوزخ کے جہیل خانہ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور فرمایا ہے۔

اس فقرے میں نہایت لطیف طریقہ سے ان فتنہ پردازوں کا جواب بھی دے دیا جو بات بنا



سکتے تھے کہ یہ لو، جب مجرموں کے ساتھ فرشتے بھی دوزخ میں ہوں گے تو پھر کیا ڈر ہے، جس طرح وہ گنہگاروں کے ہم بھی گزار لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی دل لگی کی باتیں وہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن با رکھیں کہ جیل پر مامور افسروں اور جیل کے قیدیوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اس کا پتہ ان کو اس وقت چلے گا جب دوزخ کے جیل اور اس پر مامور فرشتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اللہ انہ  
زندگی کے ہر  
شعبہ امتحان  
رکھے ہیں

وَمَا جَعَلْنَا عَذَابَ الْآفِئَةِ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ۖ يَوْمَ ان فرشتوں کی تعداد کے ذکر کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس کے اظہار سے مقصود یہ ہے کہ ان کی تعداد کا مسئلہ قیامت کے مکروں کے لیے ایک آزمائش بنتے اور اس کی آڑ لے کر وہ جو کچھ اس کے خلاف کہنا چاہیں کہہ لیں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر گوشے میں امتحان رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے مردوں کی مخفی برائیاں اور اچھوں کی ستورنکیاں ظہور میں آتی ہیں۔ یہ امتحان نہ ہوں تو انسان کی مخفی صلاحیتیں اجاگر ہو سکتیں نہ نیک اور بد کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ چنانچہ جنت اور دوزخ کی تفصیلات کے ذیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی حقیقتوں کا ذکر فرمایا جو مکروں کے لیے نقتہ بن گئیں۔ مثلاً نبی علیہ السلام نے معراج کے جو مشاہدات بیان فرمائے یا دوزخ کے اندر قرآن نے زقوم کا جو ذکر کیا تو مخالفین نے ان کو موضوع بحث بنا کر طرح طرح سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مذاق اڑایا اور جنت و دوزخ کا بھی۔ سورہ بنی اسرائیل میں اس کی طرف یوں اشارہ ہے :

دَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْمَا الَّتِي أَرَبْنَا  
الْآفِئَةَ ثَلَاثًا وَالشَّجَرَةَ  
الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۚ

اور ہم نے جو روایات کو دکھائی تو اسی لیے دکھائی  
کہ وہ مخالفوں کے لیے آزمائش بنے۔ اسی طرح  
اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی

دینی اسوۂ میلہ ۱۷ : ۶ ہے۔

شیاطین جن دانس کو حق کے خلاف نقتہ برپا کرنے کے اس طرح کے مواقع اللہ تعالیٰ جو دیتا ہے اس کی حکمت بھی قرآن میں جگہ جگہ واضح فرمادی گئی ہے۔ سورہ حج میں فرمایا ہے :

لِيَجْعَلَ مَا يُلْفِي الشَّيْطَانَ فِئْتَةً  
لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ  
قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي  
شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۚ وَلَيَعْلَمَ الَّذِينَ  
أَدُّوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ

اللہ یہ موقع اس لیے دیتا ہے کہ شیاطین جو  
کچھ حق کے خلاف کہیں وہ ان لوگوں کے لیے نقتہ  
بنے جن کے دلوں میں روگ ہے یا جن کے دل سخت  
ہو چکے ہیں اور یہ ظالم بہت دور کے جھگڑے میں پڑ  
چکے ہیں اور تاکہ وہ لوگ جن کو علم عطا ہوا ہے جان

لیں کہ یہ جو قرآن نے بتایا ہے یہی حق ہے۔ (الحج - ۲۲ : ۵۳-۵۴)

سورہ حج کی اس آیت کے تحت اس مسئلہ پر ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ وضاحت مطلوب ہوتو







جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، ابتدائی کمی سورتوں میں سے ہے جب کہ اہل کتاب سے براہ راست سابقہ پیش نہیں آیا تھا چنانچہ جن لوگوں نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی انھوں نے بتائی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اچھے اہل کتاب مسلمانوں ہی کے علم میں تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کا ذکر اہل ایمان کے ہر اول دستہ کی حیثیت سے کیا تاکہ پہلے ہی سے ان پر واضح ہو جائے کہ اس نئی بعثت کے دور میں انھیں کیا رول ادا کرنا، اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ان کی کیا جگہ ہے، آگے انھیں کن حالات سے گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو محکم رکھنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار فرما رہا ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھیں کس طرح بیدار رہنا چاہیے۔

وَلَيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۖ

حاسد یہود

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ حاسد یہود اور کفر کا پران مشابہات کا کیا اثر پڑے گا۔

الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ سے عام طور پر لوگوں نے منافقین کو مراد لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ مَرَضٌ قرآن میں لفاق ہی کے لیے آیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ حسد اور کینہ کی تعبیر کے لیے بھی آیا ہے اور ایسے مواقع میں اس سے مراد یہود ہوا کرتے ہیں اس لیے کہ ان کو بنی اسمعیل پر بھی حسد تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی۔ اس حسد کی تفصیل سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اوپر اچھے اہل کتاب کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب ان کے مقابل میں حاسد یہود کے رویہ کا ذکر آ رہا ہے اور ساتھ ہی اَلْكَافِرُونَ کے لفظ سے کفار قریش کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ یہ دونوں گروہ ان مشابہات کے بارے میں ایک ہی روش اختیار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا۔

ان کا اس قول کی وضاحت سورہ بقرہ کی آیت ۲۶ کے تحت ہم کر چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں سن کر وہ ناک بھوں چڑھائیں گے اور متکبرانہ انداز میں کہیں گے کہ بھلا اس طرح کی تشبیہات سے اللہ کی مراد کیا ہے! یعنی یہ باتیں لایعنی ہیں اور اللہ تعالیٰ لایعنی باتیں نہیں کرتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی باتیں منسوب کر رہا ہے (العیاذ باللہ) وہ بھی لایعنی اور اس کا دعوائے رسالت محض افتراء ہے۔

كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنِ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ یعنی اس طرح کی آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈال کر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت نصیب کرتا ہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی وضاحت جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔ جن کو وہ گمراہی کا مستحق پاتا ہے ان کو گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی سنت



کے تحت ہدایت کے مترادف ہوتے ہیں ان کو ہدایت بخشتا ہے۔ بالکل اسی سیاق و سباق میں سورہ بقرہ میں یوں فرمایا گیا ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ  
أَنَّهُ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ رَبِّهِمْ مَوْعِدًا  
الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا  
أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۖ يُضِلُّ  
بِهِ كَثِيرًا ۚ يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا  
وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۚ

جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہی حق  
ہے ان کے رب کی جانب سے۔ رہے  
وہ جنہوں نے کفر کیا تو وہ کہیں گے کہ بھلا اس  
طرح کی تشبیہ سے اللہ کی کیا مراد ہو سکتی ہے!  
اللہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت  
دیتا ہے اور وہ اس سے گمراہ ابھی کو کرتا ہے

جو نافرمان ہوتے ہیں۔

(البقرہ - ۲: ۲۶)

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ إِلَّا الْهُنُوءُ۔ یہ ان نکتہ چینیوں کے غور و سہ سے دانی پر ضرب نکتہ چینیوں

لگاتی ہے کہ وہ اس زعم میں نہ رہیں کہ اس کائنات کے تمام بھیدوں کو وہ جانتے ہیں یا ان کے پاس اتنا علم اور اتنی عقل ہے کہ ان کو جان سکتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ زعم بالکل باطل ہے۔ تیرے رب کی فوجوں کو اس دانی پر ضرب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہی جانتا ہے کہ اس کی افواج کتنی ہیں، اس میں کس یونٹ کی صلاحیتیں کیا ہیں، کون سی جنگی کن اسلحہ سے لیس ہے اور کون اور کتنے افسر کس محاذ پر مامور ہیں۔ نہ کوئی ان ساری باتوں کو جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رموز سلطنت میں سے جن بھیدوں سے آگاہ کر دے انسان کو چاہیے کہ ان کی قدر کرے اور ان کو اپنے خزانہ علم میں بیش بہا نافذ سمجھے۔ اس گھنٹہ میں نہ مبتلا ہو کہ خدا کی کائنات اتنی ہی ہے جتنی اس نے دیکھی ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دور کے دانش فروشوں نے بھی قرآن کی جن باتوں پر شبہات وارد کیے ہیں یا جن کی من مانی تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے، اسی غرور و ہمہ دانی میں مبتلا ہو کر کی ہے۔ جو باتیں ان کو اپنی محدود عقل کی گرفت سے باہر محسوس ہوئیں ان کا یا تو انکار کر دیا، اگر انکار کی جرأت ہوئی، ورنہ ان کی کوئی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو انکار سے بھی کسی قدم آگے نہ ہوئی۔

وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ۔ یہ مقصد بتایا ہے قیامت کے احوال پر مشتمل ان آیات

کا۔ فرمایا کہ یہ انداز کرنے والی آیتیں ہم نے نکتہ چینی کے لیے نہیں نازل کی ہیں بلکہ لوگوں کی تذکیر و تنبیہ کے لیے نازل کی ہیں تاکہ جو اس ابدی عذاب سے بچنا چاہتے ہیں وہ اس کے ظہور سے پہلے تباہی کر لیں۔ اللہ نے باد و ہانی سنا کر خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے پاس خدا کے آگے کوئی عذر نہیں ہوگا۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ نیک و بد سے لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے۔ بالجبر



ہدایت کی راہ پر چلا دینا اس کی سنت کے خلاف ہے۔

’جی‘ کا مرجع عام مفسرین نے ’سقر‘ کو سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک اس کا مرجع وہ آیات مندرجہ ہیں جن میں ’سقر‘ کے احوال سنائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ ’ذکوی‘ یعنی یاد دہانی ہونے کی حیثیت و حقیقت ان آیات ہی کو حاصل ہے نہ کہ ’سقر‘۔

كَلَّا وَالْقَمَرِۦۙ فَلَيْلٍۭۙ اِذَا دَبَّرَۙ وَالصُّبْحِۙ اِذَاۤ اَسْفَدَۙ (۳۲-۳۴)

یہ آفات کی چند نشانیوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس قیامت اور دوزخ سے لوگوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے وہ اس کائنات کے عظیم حوادث میں سے ہے اور اس کا ظہور قطعی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں تدریج و ترتیب ہے۔ جب اس کا وقت آجائے گا تو وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اپنے وقت سے پہلے نہیں ظاہر ہوگی۔ اس کے ظہور میں تاخیر سے یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ ظاہر ہوگی ہی نہیں حماقت ہے۔ رات میں اگر کوئی صبح کے لیے جلدی کرے تو اس کی جلد بازی کے سبب سے صبح اپنے وقت سے پہلے نہیں آئے گی۔ یہی حال قیامت کا ہے۔ اس کا بھی ایک وقت مقرر ہے۔ ٹھیک اسی وقت پر ظاہر ہوگی۔

’كَلَّا وَالْقَمَرِۦۙ‘ آفات کی نشانیوں میں سے پہلے چاند کی قسم کھائی ہے اور اس سے پہلے ’كَلَّا‘ کے ذریعے سے مخاطب کے زعمِ باطل کی پوری شدت سے تردید فرمادی ہے۔ قسم سے پہلے حرف نفی کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اس طرح کے مواقع میں مکمل گویا مخاطب کے خیال کی تردید میں اتنا توقف بھی نہیں کرنا چاہتا کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ شدتِ نفرت کے اظہار کے لیے اس کی تردید ہی سے کلام کا آغاز کرتا ہے اور پھر یقیناً قسم اپنی دلیل بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ اور اس نوع کی تمام قسمیں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ دفاحت کرتے آ رہے ہیں، بطور شہادت یا بالفاظ دیگر اس دعوے کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہیں جو ان کے بعد مذکور ہوا ہے۔ یہاں مخاطب، جیسا کہ موقع و محل سے واضح ہے، مکذبین قیامت ہیں اور ان کا جو شبہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ قیامت آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔ ان کے سامنے چاند کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس طرح وہ درجہ بدرجہ ہلال سے بدرجہ بدرجہ بکریاں تک پہنچتا ہے اس طرح تم بھی مختلف اطوار و مراحل سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک دن اس مقام تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے اور اپنے رب کے عدل کامل کے ظہور کا مشاہدہ کرو گے۔ جس طرح چاند کے سفر کے لیے منزلیں مقرر ہیں، ان کو طے کیے بغیر اس کا ظہور کامل نہیں ہوتا، خواہ اس کے لیے کوئی کتنی ہی جلد بازی کرے، اسی طرح اس دوزخ و جزا و سزا کے لیے بھی منزلیں مقرر ہیں جن سے گزرے بغیر اس کا ظہور نہیں ہوگا۔ کائنات



کے نظام میں بہترین اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسروں کی طلب و تمنا اور ان کی عجلت یا تاخیر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ دن آٹے کا ضرورہ اس کے آٹے بغیر اس دنیا کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہوگا لیکن یہ اسی وقت آٹے کا جب اللہ تعالیٰ کی تقویم میں اس کا مقررہ وقت، مٹ اور سیکنڈ کے فرق کے بغیر پورا ہو جائے گا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے چاند کے طلوع و غروب اور اس کے عروج و محاق سے دین کے مختلف حقائق پر استنبہاد کیا ہے جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی بعض اہم چیزیں آئیں گی جن کی ہم ان شاء اللہ وضاحت کریں گے۔ یہاں اس کے تدریجی ارتقاء کا پہلو پیش نظر ہے اور مقصود قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معین پروگرام ہے جس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو دہی جانتا ہے۔ جو چیز اس کے عدل کا بدیہی متقاضی ہے اس کا ظہور تو لازماً ہوگا لیکن ہوگا اپنے وقت پر۔ سورۃ الشقاق میں بھی چاند کی قسم وارد ہوئی ہے اور ہمارے نزدیک وہاں بھی اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا ہے:

وَالْقَمَرُ إِذَا اتَتْ لَا تُرَكَّبُ حَبًّا وَلَا نَجْمًا (الشقاق - ۸۲، ۸۱، ۸۰ - ۱۹)

شاید ہے چاند جب کہ وہ کامل ہوتا ہے کہ تم بھی درجہ بدرجہ بڑھو گے۔

یعنی خدا کے مقرر کردہ روز جزاء و سزا کے لیے تمہاری حاضری تو لازمی ہے لیکن جس طرح چاند درجہ بدرجہ اپنے آخری نقطہ پر پہنچتا ہے اسی طرح یہ دن بھی اپنے مراحل طے کر کے ظہور میں آئے گا۔  
 'حَالِيْلٌ اِذَا دُبُرُهُ دَا لَصْبَحٍ اِذَا اَسْفَرُوْا' چاند کے بعد یہ رات کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ پیچھے پڑتی ہے اور صبح کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ ہویدا ہوتی ہے یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں صبح کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا لیکن وقت آتا ہے کہ صبح نمودار ہو جاتی ہے وہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جس کی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے لیکن وقت آئے گا کہ یہ تاریکی کا نور ہوگی اور قیامت اچانک نمودار ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ جو ہر روز رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی دکھاتا ہے اور کسی کو بھی اس کائنات کے اس عظیم انقلاب پر تعجب نہیں ہونا وہ جب چاہے گا قیامت کو بھی اسی طرح نمودار کر دے گا اور اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آگئی۔

بالکل یہی قسم، معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ، انذار قیامت کی تائید ہی کے مقصد سے سورۃ النکویر میں یوں آئی ہے:

شاید ہے رات جب کہ جانے لگتی ہے اور

حَالِيْلٌ اِذَا دُبُرُهُ دَا لَصْبَحٍ اِذَا اَسْفَرُوْا

شاید ہے صبح جب کہ وہ سانس لیتی ہے۔

تَنفَسٌ هَ (النکویر - ۱۸ : ۱۷ - ۱۶)



اس کائنات اس تفسیر میں جگہ جگہ ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنائی ہے کہ اس کے ہر گوشہ میں کسی نہ کسی شکل میں قیامت کا یہ ہرسل برابر ہوتا رہتا ہے تاکہ انسان قیامت کی دلیل کو اس کے باب میں جو شبہ بھی لاحق ہو اس کو دور کرنے کے لیے اسے اپنے گرد و پیش ہی سے کوئی ایسی مثال مل جائے جو اس کے دل کو مطمئن کر دے بشرطیکہ اس کے اندر سلامت روی اور حق کی طلب ہو۔

إِنَّهَا لِأَحَدَى الْكُتُبِ ۖ نَزَّلْنَا لَئِلَّا يُشَقَّ (۳۵-۳۶)

یہ مذکورہ بالا قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ یعنی قرآن کی یہ آیات جو دوزخ کے ہول سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں، سنہی مذاق کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس کائنات کے عظیم اسوال و حوادث میں سے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ان کو اپنے مذاق کا موضوع بنائیں۔

لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَبَّلَ رَأْدِيَّتًا خَرَد (۳۷)

یعنی اس ہولناک دن سے سابقہ پیش آنے سے پہلے لوگوں کو اس سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ جب یہ آئے تو کوئی یہ غدر نہ کر سکے کہ اس کو اس سے آگاہ نہیں کیا گیا ورنہ وہ اس کے لیے تیاری کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعہ سے اتمام حجت کر دیا۔ رہا اس کو رد یا قبول کرنا تو یہ لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو اپنی عاقبت کی خبر چاہے گا وہ اس کو قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے گا اور جس کی ثبات آتی ہوئی ہوگی وہ اعراض و استکیبار کی روش اختیار کرے گا اور پیچھے ہٹ جائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۳۸)

یعنی قانون الہی یہ ہے کہ جس طرح معلول اپنی علت کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا۔ جزا و سزا کے دن اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی اس کو ہلاک کرے گا۔ اگر کوئی حسب و نسب اور شرک و شفاعت کے بل پر اس دن کی آفتوں سے چھوٹنے کے زعم میں مبتلا ہے تو وہ یاد رکھے کہ اس طرح کی کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہے۔

إِلَّا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ۖ فِي جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ عَنِ الْمُجْرِمِينَ (۳۹-۴۰)

اس دن نجات و نلاح صرف اصحاب الیمین کو حاصل ہوگی۔ اصحاب الیمین کی تفصیل اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کو پیش نظر رکھ کر زندگی گزار لی اور جن کے اعمال نیکانے ان کے دہتے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک نہ صرف اپنی نیکیوں کا پورا پورا صلہ پائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے بھی ان کو نوازے گا۔ یہ لوگ بہشت کے باغوں میں ہوں گے اور وہاں آپس میں ان مجرموں کے انجام سے متعلق سوال و جواب کر رہے ہوں گے جن سے دنیا میں ان کو سابقہ رہا۔

اس سوال و جواب کی نوعیت سورۃ صافات کی مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوتی ہے



اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپس میں سوال و جواب کرتے کرتے کس طرح وہ دوزخ میں پڑے ہوئے مجرمین کو بھی مخاطب کرنے اور ان کے دوزخ میں پڑنے کا سبب معلوم کرنے کا موقع نکال لیں گے۔ فرمایا ہے:

فَاتَّبَعْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ  
يَتَسَاءَلُونَ ۚ قَالُوكَ أَهْلُ  
مِنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قِوْيُنٌ ۚ  
لَقَوْلُكَ إِنَّا لَمُصَدِّقِينَ ۚ  
عَمَّا إِذَا مَا تَأْتُوا كُنَّا نُبَاطِلُ  
وَعِظًا مَّاءٍ إِنَّا لَمَدِينُونَ ۚ  
قَالَ هَلْ أَنتُمْ مُطَّلِعُونَ ۚ  
فَاتَّبَعْنَا فَرَاكَ فَيَسْأَلُ  
الْجَحِيمِ ۚ

پس اہل جنت ایک دوسرے کی طرف سوال  
جواب کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں  
سے ایک کہے گا، دنیا میں میرا ایک ساتھی  
تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق  
کرنے والوں میں سے ہو! بھلا جب ہم مر  
کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا جزا اور  
منزاکے لیے اٹھائے جائیں گے! کہیں گے  
بھلا جھانک کر دیکھو تو سہی! تو وہ جھانک  
کر دیکھے گا تو اس مجرم کو دوزخ کے بیچ میں  
دیکھے گا۔

(الشعیت - ۲۷ : ۵۰ - ۵۵)

مَا سَأَلَكُمْ فِي سَقَرٍ (۲۲)

یعنی اہل جنت آپس میں مجرموں سے متعلق سوال و جواب کرتے کرتے اہل دوزخ کو مخاطب کر کے ان سے بھی پوچھ لیں گے کہ بتاؤ تمہیں دوزخ میں کیا چیز لگے گی!

قَالُوا لَوْ نَدْرُكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۚ وَلَوْ نَدْرُكُ نَطْعُمُ الْمُسْكِينِ ۚ وَكُنَّا نَخُوضُ  
مَعَ الْخَائِضِينَ ۚ كُنَّا نَكْذِبُ بَيْنَ يَدَيِ الْوَدَّيْنِ ۚ حَتَّىٰ أَتَيْنَا الْيَقِينَ (۲۳-۲۴)

اہل دوزخ ان کے جواب میں اعتراف کر لیں گے کہ ہمارے اعمال ہی ہمیں یہاں لانے والے بنے ہیں۔ تصور سارا ہمارا اپنا ہی ہے، کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

اہل دوزخ  
کا اعتراف

سب سے پہلے وہ اپنے اس جرم کا اعتراف کریں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ امر بہاں ملحوظ رہے کہ دین کے عقائد میں جس طرح توحید کو سب پر تقدیم حاصل ہے اسی طرح اعمال میں نماز کو سب پر تقدیم حاصل ہے۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اسی عمل کی دعوت دی ہے اور اس کے اہتمام اور اسی کے ترک پر دین کو منحصر بنایا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنے عدم انفاق کا اعتراف کریں گے کہ وہ مسکینوں کو کھلانے کے روادار نہ تھے۔ اعمال میں نماز کے بعد دوسرا درجہ انفاق کا ہے اور انہی دونوں پر تمام اعمال صالحہ کی غماز قائم ہے۔ ہم جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت کو چکے ہیں کہ نماز بندے کا تعلق خالق سے استوار کرتی ہے۔



اور زکوٰۃ (انفاق) اس کو خلق سے جوڑتی ہے اور انہی دو کی استواری پر آدمی کے دین کی استواری کا انحصار ہے۔

اس کے بعد وہ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ قیامت اور جزا و سزا کے باب میں جس طرز کی نکتہ چینیاں اور موثکافیاں دوسرے کرتے تھے اسی طرح کی موثکافیاں کرنے والوں میں وہ بھی رہے ہیں اور انہی موثکافیوں کی آڑ لے کر انھوں نے جزا و سزا کے دن کو جھٹلایا یہاں تک کہ موت آگئی اور اس نے ان تمام چیزوں کا یقین دلا دیا جن کے بارے میں وہ شکوک پیدا کرتے رہے تھے۔

لَا تَنْفُضُ مَعَ الْخَائِضِينَ سے اشارہ اس طرح کی باتوں کی طرف ہے جس کی ایک مثال دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد کے بارے میں اور پرگزرجکی ہے۔

نَحْضُ فِي الْحَدِيثِ كَمَا مَعْنَى هِيَ كَمَا بَاتَ فِي بَيْنِ مَيْكِهْ نَكَالَتِ نَكَالَتِ كَمَا بَاتَ كَمَا بَاتَ كَمَا بَاتَ اس کو فتنہ اور حق سے انحراف کے لیے بہانہ بنا لینا۔

حَتَّى أَتَيْنَا الْيَقِينَ کے اصل معنی تو یقین ہی کے ہیں لیکن چونکہ موت کے بعد تمام مابعد الموت حقائق آدمی پر روشن ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے یقین پر مجبور ہو جاتا ہے اس وجہ سے موت کو بھی یقین سے تعبیر کرتے ہیں جس طرح ایک شے کے لازم سے خود اس شے کو تعبیر کر دیتے ہیں۔

یہاں مجرموں کے جو اعتراضات نقل ہوئے ہیں وہ اس حقیقت کے اثبات کے لیے نقل ہوئے ہیں جو اوپر کُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے تاکہ جو نادان اپنے خاندان اپنے حسب و نسب اور اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر جزا و سزا کا مذاق اڑا رہے تھے ان کے کان اور ان کی آنکھیں کھلیں اور ان پر یہ حقیقت خود ان کے ہم مشرکوں کی زبان سے واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اعمال کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (۲۸)

یہ ان کے مزعومہ شفعاء اور ان کی مفروضہ شفاعت کی نفی فرمائی ہے کہ نہ وہاں ان کے مزعومہ شفعاء ہوں گے اور نہ ان کی شفاعت۔

مشرکین کی زبردستی

شفاعت کی نفی

یہاں کلام عربیت کے اسلوب پر ہے جس کو نفی انشائی بنی لازمہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ امرء انقیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف میں کہا ہے کہ لَا يَهْتَدِي بِمَنَارِهِ اس کے منارہ سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں منارے ہیں ہی نہیں کہ ان سے رہنمائی حاصل کی جاتے۔ مشرکین کو اپنے جن شفعاء پر ناز تھا ان کے متعلق قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ لَا هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمِيَتْهُنَّ هَآؤُلَئِمْ وَأَبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ (النجم۔ ۵۳: ۲۳) یہ



تو محض فرضی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، ان کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔

فَسَاءَ لَهُمْ عَنِ الشَّذِّكَوَةِ مُعْرِضِينَ (۴۹)

یہ ان کے حال پر تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ ان کو تو اپنے رب کا شکر گزار ہونا تھا کہ اس نے جوار و اعراض کرنے مزار کے یوم بوعود سے پہلے ان کی یاد دہانی اور اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب بھی دلوں کے نازل کر دی اور ایک رسول بھی بھیج دیا لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ وہ اس یاد دہانی سے فائدہ اٹھانے میں تعجب کے بجائے اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

مُعْرِضِينَ، ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ یہ اسلوب عربیت میں معروف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں سچھے گزر چکی ہیں۔

كَانَهُمْ حُرٌّ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۖ فَذُتْ مِنْ قُسُورَةٍ (۵۰-۵۱)

یہ ان کی وحشت زدگی کی مثال ہے۔ فرمایا کہ ان کا حال ان بد کے ہوتے گدھوں کا ہے جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ قُسُورَةُ شیر کو کہتے ہیں۔ گدھے اور گورخ و غیرہ شیر کی آواز سن کر بھاگے ہوں تو وہ بڑی مشکل سے فرار پکڑتے ہیں۔ کسی طرف سے ذرا بھی کھٹکا ہو تو وہ اس طرح بھاگتے ہیں گویا شیر ہی آگیا۔ فرمایا کہ یہی حال ان لوگوں کا ہے۔ یہ اس یاد دہانی سے ایسے سہے ہوئے ہیں کہ اس کا ایک حرف بھی سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک حقیقت جب اتنی واضح ہو کہ آدمی کا دل اس کے انکار پر بھی مطمئن نہ ہو اور اس کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو تو اس سے اس کے گریز و فرار کی شکل یہی ہوتی ہے جو اس مثال میں واضح فرمائی گئی ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش ہر وقت رہتی ہے کہ کسی طرف سے اس کے کانوں میں کوئی ایسی آواز نہ پڑنے پائے جو اس حقیقت کو یاد دلادے۔

كُلُّ يَرْيِدُ كُلُّ امْرُؤٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّوتَىٰ صُحُفًا مِّنْشَرَّةٍ (۵۲)

یعنی اس یاد دہانی سے فرار کے لیے انھوں نے یہ بہانہ بنایا ہے کہ اگر خدا کو کوئی کتاب ہی اتارنی تھی تو انہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کیوں اتاری گئی! ایسا کیوں نہ ہو کہ ہمیں بھی کھلے ہوئے بہانے صحیفے پکڑا دیے جاتے! آخر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا کیا دشوار تھا! یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقام میں یوں بیان ہوئی ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ آيَةٌ قَالُوا  
لَنْ نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ  
مَا أُوتِيَ رَسُولُ اللَّهِ ط

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو  
وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر اس وقت تک ایمان  
نہیں لانے کے جب تک کہ ہمیں بھی اسی طرح



اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۚ  
 نہ ملے جس طرح اللہ کے رسولوں کو ملے —  
 اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت سے  
 کن کو سرفراز کرے! (الانعام - ۶ - ۱۲۴)

كَلَّا بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِذَةَ (۵۳)

اصل حقیقت  
 یعنی نہ ایسا ہوتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کے گریز کی علت یہ نہیں ہے جو یہ ظاہر  
 کر رہے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت کے وقوع کے متوقع نہیں ہیں۔ 'يَخَافُونَ' یہاں  
 'يَجُودُونَ' کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کے شواہد اس کے محل میں  
 ہم پیش کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ آخرت سے نچنت ہیں اور ان کی دلی خواہش یہی ہے کہ اس  
 سے نچنت ہی رہیں، اس کی فکر ان کے عیش کو مکدر کرنے نہ پائے تو ان کو کوئی نشانی بھی قائل نہیں کر  
 سکتی۔ ان کی طلب کے مطابق ان کو کھلے صحیفے بھی پکڑا دیے جائیں جب بھی وہ کوئی نہ کوئی بات  
 بنا ہی لیں گے۔

كَلَّا إِنَّهُ تَذَكُّرٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ ذَكُّهُ (۵۴-۵۵)

یہ ان ہٹ دھرموں سے اظہار بے نیازی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیغم قسلی ہے مطلب  
 یہ ہے کہ اس طرح کے ضدیوں کی زیادہ ماز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک یاد دہانی ہے جو انھیں  
 کر دی گئی۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور سیدھی راہ اختیار کرے۔ اگر وہ اس سے فائدہ  
 نہیں اٹھائیں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے، نہ اللہ کا کچھ بگاڑیں گے نہ رسول کا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ  
 ہے کہ وہ پکڑنے سے پہلے لوگوں کو یاد دہانی کر دیتا ہے تاکہ اس کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور  
 رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس یاد دہانی کو لوگوں تک پہنچا دے۔ لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینا نہ  
 رسول کی ذمہ داری ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ ان لوگوں کے دلوں میں اپنی ہدایت اتار  
 جو اس سے بیزار ہیں۔

وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْغُفْرَةِ (۵۶)

ہدایت کے  
 باب میں  
 سنت الہی  
 یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں  
 اس نے پسند فرمائی ہے اور جو اس کتاب میں جگہ جگہ زیر بحث آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت انہی کو بخشتا  
 ہے جو اپنے سمیع و بصیر اور نوا کی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں، جو فطرت کے نور کی قدر کرتے ہیں، جو آفاق  
 انفس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں اور ہر اس بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کان کھلے رکھتے ہیں جو  
 معقول ہو اگرچہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے کتنے ہی خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ہر شئی اس کی حکمت کے  
 تحت ہے۔ وہ انہی کو ہدایت بخشتا ہے جو ہدایت کی تذکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو اس کی قدر نہیں



کرتے ان کو ہدایت دنیا تو درکنار اللہ تعالیٰ ان کی وہ صلاحیت بھی سلب کر لیتا ہے جو فطرت کی راہ سے ان کو حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ اس باب میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشاد کا حوالہ ہم جگہ جگہ دے چکے ہیں۔

هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ۔ مفسرین نے عام طور پر ہُو کا مرجع اللہ کو قرار دیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ ہی تقویٰ کا سزاوار ہے اور مغفرت کا اہل ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا تعلق خَمْنٌ شَاءَ ذَكَرَهُ سے ہے۔ 'مَنْ' واحد جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے فیمیں دونوں قسم کی استعمال ہو سکتی ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کون اس قرآن سے یاد دہانی حاصل کرے گا اور اس کے صلہ میں اللہ کی معفرت کا سزاوار ٹھہرے گا اور کون اس سے محروم رہے گا۔ فرمایا کہ جن کے اندر خدا کا خوف ہو گا وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہ مغفرت کے اہل ٹھہریں گے۔ رہے وہ جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں وہ اس سے محروم ہی رہیں گے اور جب وہ اس سے محروم رہیں گے تو خدا کی مغفرت سے بھی محروم رہیں گے۔ سورہ بقرہ کے آغاز میں هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کا فیض کن لوگوں کو پہنچتا ہے اور کون لوگ اس سے محروم رہتے ہیں۔ اس سنتِ الہی کی تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔ تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں۔ انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو تقویٰ ودیعت فرمایا ہے اور جس کا ذکر فَالْتَمِسْهَا جُودَهَا وَتَقْوَاهَا رَاسُخًا میں ہے، یہاں اس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ آگے والی سورہ میں ان شاء اللہ اس فطری تقویٰ کی پوری وضاحت آپ کے سامنے آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَىٰ إِحْسَانِهِ۔

رحمان آباد

۱۸۔ دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۷۔ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ







مَدِيرُ فَرَان

٤٥

القيمة







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ بھی، گروپ کی سابق سورتوں کی طرح، انداز قیامت کی سورہ ہے۔ سابق سورہ کا غنا اس مضمون پر ہوا ہے کہ اس یاد دہانی سے اعراض کرنے والوں کے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا جو شعور اللہ تعالیٰ نے دلالت فرمایا ہے یہ سرگشتگان دنیا اس کو ضائع کر بیٹھے ہیں۔ سنت الہی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو زندہ رکھتے ہیں ان کو مزید ہدایت و روشنی نصیب ہوتی ہے اور جو اس کو ضائع کر بیٹھتے ہیں وہ ایسے اندھے بہرے بن جاتے ہیں کہ ان پر کوئی تذکیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔

اس سورہ میں اسی حقیقت کو اچھی طرح مبرا بن کر دینے کے لیے نفسِ لوامہ کی، جو ہر انسان کی فطرت کے اندر دلالت ہے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اور اس کو قیامت کے ثبوت میں ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ انسان کے اندر ایک مخفی زاجر کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کو، جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔ انسان کے اندر اس کا پایا جانا نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ اس دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسئول بنا کر نہیں چھوڑا گیا کہ چاہے وہ نیکی کرے یا بدی اس کے خالق کو اس سے کچھ بحث نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے اندر اس طرح کے کسی زاجر کو بٹھانے کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ انسان ایک عالمِ اصغر ہے اس کے اندر نفسِ لوامہ کا پایا جانا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس عالمِ اکبر کے اندر بھی ایک نفسِ لوامہ ہے جس کو قیامت کہتے ہیں۔ وہ ایک دن ظہور میں آئے گی اور ان تمام لوگوں کو ان کی بد اعمالیوں پر سرزنش کرے گی جنہوں نے اپنے اندر کے مخفی زاجر کی تنبیہات کی پروا نہ کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کی عدالتِ کبریٰ کا ایک عکس ہر انسان کے اپنے وجود کے اندر نفسِ لوامہ کی عدالتِ صغریٰ کی شکل میں موجود ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوتے ہیں کہ جو شخص کوئی برائی کرتا ہے وہ کہیں پس پردہ نہیں کرتا بلکہ خدا کی عدالت کے دروازے پر اور اس کے مقرر کیے ہوئے کوتوال کے روبرو کرتا ہے۔ چنانچہ نفسِ لوامہ کی شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ بَلٰی یُزِیْدُ الْاِنْسَانُ لَیْقَعْدَ اَمَامَهُ (۵) بلکہ انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے، اسی حقیقت کی وجہ سے



آگے کی آیات میں یوں فرمائی ہے کہ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَلَئِنْ لَّمْ يَرَوْا آيَاتِنَا مُعَازِرَةً (۱۵-۱۶)  
(بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جدید فلسفہ اخلاق کے ماہروں نے بھی چند بنیادی نیکیوں کا نیکی ہونا اور چند معروف برائیوں کا برائی ہونا بطور اصول موضوعہ تسلیم کر کے اپنی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اگرچہ وہ یہ نہیں بتا سکے کہ ان نیکیوں کا نیکی یا ان برائیوں کا برائی ہونا انھوں نے کہاں سے جانا جس کے سبب سے ان کی ساری عمارت بے بنیاد رہ گئی ہے لیکن یہ حقیقت انھیں تسلیم ہے کہ بنیادی نیکیوں اور بنیادی برائیوں کے شعور سے انسان محروم نہیں ہے۔ قرآن نے اس سورہ میں اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نہ صرف نیکی اور بدی کا شعور و دعوت فرمایا ہے بلکہ اس کے اندر ایک مخفی زاجر (ضمیر) بھی رکھا ہے جو برائیوں کے ارتکاب پر اس کو سزائے کر تا اور نیکیوں پر اس کو شاباش دیتا ہے اور پھر اسی نفسیاتی حقیقت پر اس نے قیامت اور جزا و سزا کی دلیل قائم کی ہے کہ جس فاطر نے ہر انسان کے نفس کے اندر اس کی بد عملی پر سزائے اور اس کی نیکی پر تحسین کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس مجموعی کائنات کے لیے کوئی ایسا دن نہ لائے جس میں اس پوری دنیا کا محاسبہ ہو اور ہر شخص اپنی نیکیوں کا صلہ اور اپنی بدیوں کی سزا پائے۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۶) قیامت کی قسم خود قیامت کی قطعیت پر اور انسان کے اندر نفسِ لوامہ کے وجود سے قیامت کے حق میں ایک نفسیاتی شہادت اور اس حقیقت کا انکشاف کہ جو منکرین اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مکرھپ اور گل سٹر جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ممکن نہیں ہے، ان کا یہ خیال خود ان کے اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف ہے۔ ان کی مثال اس بے باک چور کی ہے جو کوٹوال کے سامنے چوری کرتا ہے۔

(۷-۱۵) قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب کہ آج تو یہ ایک بدیہی حقیقت کو جھٹک رہے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی ہولناکی محلجہ برپا ہوگی تو کہیں گے کہ اب کہاں بھاگیں! حالانکہ اس وقت کسی کے لیے خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ہر ایک سے اس دن اس کے ایک ایک عمل کی بابت پرسش ہونی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان سے مخفی نہیں ہے اگرچہ وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے کتنی ہی سخن سازیاں کریں۔

(۱۶-۱۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جلد باز کے اجتناب کی ہدایت اور صبر کی تلقین کہ مخالفین خواہ



کتنی ہی جلدی مچائیں لیکن تم ان سے متاثر ہو کر قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو بلکہ جس رفتار سے یہ اتار رہا ہے اس کو اطمینان سے اخذ کرو اور لوگوں تک اس کو پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حکمت و معلومت کے تحت نازل فرما رہا ہے اور اس کے جمع و ترتیب، حفاظت و صیانت اور اس کی توضیح و تبیین ہر چیز کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لی ہے۔ ان معاملات میں کسی پہلو سے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲۵-۲۶) منکرین قیامت کو ملاست کہ تمہاری یہ ساری سخن سازیاں کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو خود اپنے ضمیر کے خلاف محض اس وجہ سے کہہ رہے ہو کہ تم اس دنیا کا عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو حالانکہ آخرت ایک حقیقت ہے۔ اس دن بہت سے چہرے شاداب اور اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے اور بہتوں کے چہرے بگڑے ہوئے اور وہ یگانہ کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹتی ہے۔

(۲۶-۵۰) کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے گا۔ ہر ایک کو موت کی جان کنی سے سابقہ پیش آنا ہے اور اسی بے بسی و بے کسی کے حال میں اپنے رب کی طرف جانا ہے۔ بد قسمت ہے وہ جس نے نہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا نہ نماز پڑھی بلکہ جرب اس کو یاد دہانی کی گئی تو نہایت رعونت سے منہ موڑ کر اپنے لوگوں میں چل دیا۔ ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس خدا نے انسان کو منی کے ایک قطرہ سے وجود بخشا اور اس کا تسویہ کر کے گوناگوں صفات سے اس کو آراستہ کیا اس کے لیے اس کے مرکب جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔







## سُورَةُ الْقِيَمَةِ

مَكِّيَّةٌ ————— آيات : ۲۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ ① وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ②  
 أَيْحَسِبُ الْإِنْسَانُ أَنَّ نَجْمَ عِظَامِهِ ③ بَلَىٰ قَدِيرِينَ عَلَىٰ  
 أَنَّ تُسَوَّىٰ بَنَانُهُ ④ بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ⑤  
 يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَمَةِ ⑥ فَإِذَا بَرَقَ الْبَصَرُ ⑦ وَخَسَفَ  
 الْقَمَرُ ⑧ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ⑨ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ  
 أَيْنَ الْمَفْرُجُ ⑩ كَلَّا لَا وَزَرَ ⑪ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ⑫  
 يُنَبِّئُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ⑬ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ  
 نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ⑭ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ⑮ لَا تَحْرِكْ بِهِ لِسَانَكَ  
 لِتَعْجَلَ بِهِ ⑯ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ⑰ فَإِذَا قُرَأْنُهُ فَاتَّبِعْ  
 قُرْآنَهُ ⑱ تَمَرَّنْ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ⑲ كَلَّا بَلْ تُجِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ⑳  
 وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ㉑ وَجْهَ يَوْمَئِذٍ نَاضِرٌ ㉒ إِلَىٰ رَبِّهَا  
 نَاضِرٌ ㉓ وَجْهَ يَوْمَئِذٍ بِاسِرَةٍ ㉔ تَنْظُرُ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا  
 فَاقِرَةٌ ㉕ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ㉖ وَقِيلَ مَنْ سَكَّتَ رَأْقٍ ㉗

آیات  
۲۰-۱



وَلَقَدْ أَفْرَاقُ ۝۳۸ وَالْتَفَتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝۳۹ إِلَى دَمِكَ  
 كَوْمِيزِ السَّاقِ ۝۴۰ فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى ۝۴۱ وَلَكِنْ كَذَبَ  
 وَتَوَلَّى ۝۴۲ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَى أَهْلِهِ يَتَمَطَّى ۝۴۳ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۝۴۴  
 ثُمَّ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۝۴۵ أَيْحَسِبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۝۴۶  
 أَلَمْ يَكُنْ نَطْفَةً مِّنْ مَّتًى يُمْنَىٰ ۝۴۷ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ  
 فَسَوَّىٰ ۝۴۸ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝۴۹ أَلَيْسَ  
 ذَٰلِكَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۝۵۰

ترجمہ آیات

۲۰-۱

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں روزِ محشر کی اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر  
 کی! کیا انسان نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر پاویں گے! ہاں،  
 ہم جمع کریں گے اس طرح کہ اسی کے پورے پورے کو ٹھیک کر دیں گے۔ بلکہ انسان اپنے  
 (ضمیر کے) آگے شرارت کرنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے قیامت کب ہوگی؟ ۱-۷

پس جب نگاہیں خیر ہو جائیں گی اور سورج گھٹنا جائے گا اور سورج اور چاند  
 اکٹھے کر دیے جائیں گے تو اس وقت انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں! — ہرگز نہیں،  
 کہیں پناہ نہیں! اس دن تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانا ہوگا۔ اس دن انسان کو تباہ  
 جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ  
 ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ ۷-۱۵

اس کو جلدی سیکھ لینے کے لیے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ۔  
 ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے



کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔ ۱۶-۱۹  
 ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ اس دنیا ہی سے عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز  
 کیے ہوئے ہو۔ کتنے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی رحمت کے متوقع  
 اور کتنے چہرے اس دن ادا اس ہوں گے، گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے  
 والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔ ۲۰-۲۵

ہرگز نہیں، جب کہ جان ہنسی میں آ پھنسے گی اور کہا جائے گا اب کون ہے جھگڑ  
 پھونک کرنے والا! اور وہ گمان کرے گا کہ بس وقت چل چلاؤ گا ہے اور پیٹلی پٹلی  
 سے لپٹ جائے گی اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہو گا۔ ۲۶-۳۰  
 پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا  
 اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے! ۳۱-۳۵  
 کیا انسان گمان رکھتا ہے کہ وہ بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا! کیا وہ محض  
 ٹپکائی ہوئی منی کی ایک بوند نہیں تھا! پھر وہ بنا خون کی ایک پھٹکی اور اللہ نے اس  
 کا خاکہ بنایا اور اس کے نوک پلک سنوارے۔ پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ!  
 کیا وہ خداوند قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے! ۳۶-۴۰



## الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا أُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ (۱)

قسم سے پہلے  
لا کے استعمال  
کی نوعیت

عربی کے اس اسلوب کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ قسم سے پہلے جب اس طرح 'لا' آیا کرتا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہوتی ہے اس کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں اسی طرح ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ آپ جس کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنی چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: نہیں۔ خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے۔ اس اسلوب قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ مکمل کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے توقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار فرما سکتا ہے بعض لوگوں نے سن لیا کہ زائد اور بعضوں نے اس کو فعل سے متصل مانا ہے لیکن یہ دونوں راہیں عربیت کے خلاف ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ اس کتاب میں اس کی تردید کی ہے۔ استاد امام رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر سورۃ قیامت میں اس پر وضاحت سے بحث کی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس کی مراجعت فرمائیے۔

یہاں قسم کا مقسم علیہ مذکور نہیں ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔

مقسم علیہ کے  
حذف کی بلا

ایک یہ کہ یہاں مقسم علیہ تناو واضح ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا قسم خود اپنے مقسم علیہ پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس کی متعدد مثالیں کچھ سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ سورۃ ق اور سورۃ ص ہیں وَالْقُرْآنِ الْجَمِیدِ اور وَالْقُرْآنِ ذِی الْبُرْجَانِ کی قسمیں بھی اسی طرح مقسم علیہ کے بنیائی ہیں۔ اس طرح کی قسموں سے مقصود مخاطب پر بیظا ہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی تردید یا تکذیب کر رہا ہے وہ خود اپنی صداقت پر ایسی شاہد عدلی ہے کہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد نفسِ لوامہ کی جو قسم ہے وہ قیامت کے حق ہونے پر ایسی بدیہی دلیل ہے کہ اس کی تکذیب جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی، آدمی کے خود اپنے قلب و ضمیر کی تکذیب کے ہم معنی ہے اس شہاد کے ہوتے قیامت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہ جاتی بلکہ وہ بجائے خود دعویٰ اور دلیل قسم اور مقسم علیہ دونوں کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۲)

نفسِ لوامہ کی

یہ دوسری قسم ہے اور اس کا مقسم علیہ بھی مذکور نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مقسم علیہ خود قسم کے اندر ہی مضمر ہے مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر نفسِ لوامہ کا وجود شاہد ہے کہ قیامت حق ہے۔ گویا اس دوسری قسم نے قسم ہی کے پیر میں دعویٰ اور دلیل دونوں کی وضاحت کر دی اور اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ قیامت کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے اس کا بکس ہر انسان کے اپنے باطن کے اندر موجود ہے وہ اس کو دیکھتا بھی ہے اگرچہ اس کی تردید میں کتنی ہی دلیل بازیاں کرے۔

شہاد قیامت پر



نفسِ توازن سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفسِ انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور و ولایت فرمایا ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کے لیے ضابطہ یہ بٹھرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہوگا۔ سورۃ شمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا  
فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا  
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهَا  
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا

اور شاہد ہے نفس اور اس کی تشکیل۔

پس اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور

نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے

فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا

وہ نامراد ہوا۔

(الشمس - ۱۰-۱۱-۱۲)

اپنی تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفسِ اتارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَمَا أَبْرَأُ نَفْسِي جِرَاتِ  
النَّفْسِ لَا مَارَةَ بِالسُّوءِ

اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا۔

نفس بڑا ہی برائی کی راہ سمجھانے والا

ہے۔

(یوسف - ۱۲: ۵۳)

لیکن یہ نفسِ نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی، اگر اس سے کوئی برائی صادر ہو جاتی ہے، ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفسِ توازن سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے کہ آدمی برا اپنے رب اور روزِ جزاء و سزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اس کی خواہشوں کو قائم رکھنے سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفسِ توازن اس کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ و انابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفسِ مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تربیتِ نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ سے جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں نَاصِيَةُ مُؤْمِنَةٍ



کا مقام حاصل ہوگا جو نفس انسانی کی معراج ہے۔

بدی کے بدی اس تفصیل سے واضح ہوا کہ بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر درجہ اول ہونے کا شوق سے ودیعت ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے حسد سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا لیکن قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو چھپانے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش ظاہر ہے کہ اسی کے اندر موجود وجہ سے اسے کرنی پڑی کہ اس کے گناہ ہونے کا اسے احساس ہوا۔ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو اس کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر ہی کرتا ہے۔ اگر اس گناہ کے معاملے میں وہ اپنے نفس کو الاؤنس بھی دیتا ہے تو یہ بھی اپنی فطرت کے خلاف دیتا ہے اس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو برائی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ بردوں کے ضمیر کو ٹٹویے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر بھی احترام اور عزت نیکی ہی کے لیے ہے اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ انسان نے جب سے معاشرتی و اجتماعی زندگی کی کوئی شکل اختیار کی ہے اس کے اندر اس نے حق و انصاف کے قیام کے لیے لازماً ایک نظام بھی قائم کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض برائیوں نے معاشرے پر ایسا غلبہ پالیا ہے کہ نیکیاں ان کے نیچے دب گئی ہیں، لیکن معاشرے کا مجموعی ضمیر اس پر کبھی راضی نہیں ہوا بلکہ اس کے اندر ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے معاشرے کے اندر وہی فریضہ انجام دیا ہے جو ہر صحیح الفطرت انسان کے اندر اس کا نفس تو امر انجام دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے یعنی نیکی کی کوئی رتی سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے تو قانون قدرت نے اس معاشرے کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے درہو جانے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے، تو اس کے لیے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک شتر بے ہمار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے لیکن کوئی اس سے باز پرس کرنے کا حق نہیں رکھتا، اگر انسان شتر بے ہمار ہے تو یہ نفس تو امر اس کے اندر کہاں سے آگھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سزائش کے لیے انسان کے اندر یہ غلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لیے وہ ایک ایسی عدالت کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمال خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟ ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا



ہوا ہے، وہ شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازماً ایک پریشک کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو اس کی بدلیوں کی سزا ملے گی اگر اس نے یہ بدیاں کماٹی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا اگر اس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اسی دن کی یاد دہانی ہی کے لیے خالق نے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تاکہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک علم اصغر ہے جس کے اندر اس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے، اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت سب کو پہچان لیتا ہے۔ سقراط کا مقولہ مشہور ہے کہ اے انسان! تو اپنے کو پہچان!

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۚ سُبْحَٰنَ عِزِّ ذَا الْجَلَالِ ۚ

بَنَاتُہ (۳-۴)

اگرچہ لفظ 'انسان' عام ہے لیکن روئے سخن قریش کے انہی منکرین قیامت کی طرف ہے جن حقیقت کے شبہات کھلی سورتوں میں زیر بحث آئے ہیں۔ ان سے اظہارِ بیزاری کے لیے بات عام لفظ سے فرار کے لیے فرمادی ہے۔ فرمایا کہ قیامت کو ثابت کرنے کے لیے یہ شہادت تو ہر انسان کے اپنے اندر ہی موجود منکرین قیامت ہے۔ اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ لوگ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ ان کے کسبِ مہارت اور مٹر گل مبانے کے بعد ہم ان کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر پائیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ چیز ان کو بعید از امکان نظر آئی ہے اور اس بنا پر وہ اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف قیامت کو جھٹلا رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہم ان کی ہڈیوں کو صرف جمع ہی نہیں کریں گے بلکہ اس قدرتِ دہکال کے ساتھ جمع کریں گے کہ ان کے جوڑے جوڑے پورے پورے کو ٹھیک کر دیں گے۔ 'بنان' انگلیوں کے پور کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر جزو بھی ایسا نہ ہوگا جس کے جمع کرنے اور جوڑنے سے ہم تادم رہ جائیں۔

قَدِ دِیْنٌ ۚ حَالٌ دَاقِعٌ ۚ نَجَّجَ ۚ کِی ضَمِیْرُ جَمْعِ سَے۔

بَلْ یُرِیْدُ الْإِنْسَانُ لِنَفْسِهِ ۖ مَا مِثْلُہ (۵)

یعنی قیامت کا انکار اس بنا پر کہ ہڈیوں کو جمع کرنا ان کو بعید از امکان نظر آتا ہے محض حقیقت سے فرار کے لیے سخن سازی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام بن چکے ہیں کہ ان کی پیروی میں وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے محتجب کے سامنے شرارت کرنا چاہتے ہیں جو کہیں دور نہیں بلکہ خود ان کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی مثال اس چور کی ہے جو کو توال کی موجودگی میں چوری کرے۔

اَمَّا مِثْلُہ کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ دیا ہے کہ انسان اپنی آگے کی زندگی میں برابر



اپنے گناہوں پر چار ہٹنا چاہتا ہے اس وجہ سے قیامت کے انکار کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن یہ مطلب لینے میں نہ نفسِ لوامہ کی شہادت سے اس کا کوئی تعلق واضح ہوتا اور نہ اس میں انسان پر اس کے اس رویے کے خلاف کوئی حجت ہی قائم ہوتی۔ اپنے آگے سے مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور اپنے نفسِ لوامہ کے ردِ برد، اس کی تذکیر و تنبیہ کے علی الرغم شرارتیں کرنا چاہتا ہے۔ قیامت کی سب سے بڑی شہادت انسان کے نفس کے اندر ہی موجود ہے لیکن جو شخص خود اپنی تردید و تکذیب کے لیے اٹھ کھڑا ہو اس کا کیا علاج ہے!

اس میں دلیل کا پہلو یہ ہے کہ قیامت پر حجت قائم کرنے کے لیے تو انسان کا ضمیر ہی کافی ہے لیکن جو شخص دردِ گویم پر دئے تو، کی جسارت کرنے پر تلا بیٹھا ہو اس کا منہ نہیں بند کیا جاسکتا۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جو شخص اپنے نفسِ لوامہ یا دوسرے نغظوں میں اپنے ضمیر کے خلاف کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ردِ بردِ برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ ضمیر و حقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کا مقرر کردہ محتسب اور قاضی ہے تو جس نے اس کے آگے برائی کی اس نے خدا ہی کے آگے برائی کی۔

يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۶)

یہ منکرینِ قیامت کی جسارت اور ڈھٹائی کا بیان ہے کہ باوجودیکہ خدا کا محتسب خود ان کے اندر ہی موجود ہے اور وہ اس کو محسوس بھی کر رہے ہیں لیکن جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ قیامت کہاں ہے؟ وہ کب آئے گی! اگر اس کو آنا ہے تو کیوں نہیں جاتی! ہم اس کے ڈرا دے سنتے سنتے تو تھک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا، نہ آئی تو اب ہم ان ڈرا دوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس سے ڈرا رہے ہیں وہ اس کو لا کر ہمیں دکھائیں تو ہم اس کا حق ہونا مانیں گے۔ محض زبانی دھونس سے ہم ماننے والے نہیں ہیں۔

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَتَحَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْتَ الْمَقَرُّ (۷-۱۰)

یعنی آج تو وہ اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں گویا اس کے مقابلہ کے لیے ہر قسم کی تیاری کیے بیٹھے ہیں لیکن جب اس کی ہولناکی سے سابقہ پیش آئے گا تو کہیں گے، اب کہاں بھاگیں؟ قیامت کے دکھا دیے جانے کا مطالبہ چونکہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ ہے اس وجہ سے اس سے تو یہاں تعرض نہیں کیا لیکن اس کی ہولناکی کے بعض پہلو ان کے سامنے رکھ دیے۔ فرمایا کہ اس دن لگا ہیں خیر ہو جائیں گی، چاند گہنا جائے گا، سورج اور چاند، جو آج اپنے الگ الگ مداروں میں گردش کر رہے ہیں، ان کی حد بندیاں ٹوٹ جائیں گی اور وہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔



یہ قیامت کے دن کے احوال ہیں جن کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس جہان میں ان کی اصل حقیقت کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ جو دن ایسی بلبل کا ہوگا کہ چاند اور سورج اپنے مداروں سے ہٹ کر ایک ہی مدار میں جا پڑیں گے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل کا کوئی شائبہ تمھارے اندر ہے تو اس سے بچاؤ مانگو اور اس کی آفتوں سے بچنے کی جو راہ دکھائی جا رہی ہے اس کو اختیار کرو نہ کہ اس کے لیے جلدی مچاؤ۔

یہ امریاں واضح رہے کہ یہاں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں وہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صرف اس کا ہلکا سا تصور دینے کے لیے بیان ہوئے ہیں اور یہ اس کے بے شمار احوال میں سے صرف چند ہیں۔ آگے اسی گروپ کی سورتوں میں اس کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے اور وہ بھی اس کے بے شمار پہلوؤں میں سے صرف چند ہی ہوں گے اس لیے کہ زبان ان کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہے۔

كُلًّا لَا ذَرَّةَ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَ الْمُنْتَظَرِ (۱۱-۱۲)

یہ جواب ہوگا ان کے قول اَیْنَ الْمَفْعَرُ کا۔ یعنی وہ پکاریں گے کہ اب کہاں بھاگیں! ان کو جواب ملے گا کہ ہرگز نہیں، اب کوئی ٹھکانا اور بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف سب کا ٹھکانا ہوگا۔ روزِ مرقی تمام راہیں فرار کی اس دن بند ہو جائیں گی۔

يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَ يُخْرِجُهُ بِمَا قَدَّمَ مَرَدًّا خَرَدًا (۱۳)

یہ مقصد بیان ہوا ہے اس دن کے آنے کا۔ فرمایا کہ اس دن ہر شخص کو آگاہ کیا جائے گا کہ قیامت اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگاہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس دن اس کے سارے کاموں کی غایت اعمال کے نتائج سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ دنیا کی زندگی میں جو بدیاں اس نے کھائیں وہ بھی اس کے سامنے آجائیں گی اور جن نیکیوں سے منہ موڑا ان کے نتائج بھی سامنے آجائیں گے۔ قرآن میں جا بجا یہ تصریح ہے کہ اس دن آخرت سے غافل رہنے والے اپنے سر پیش گئے کہ کاش ہم نے آج کے دن کے لیے فلاں اور فلاں کام کر لیے ہوتے اور یہ بھی کہیں گے کہ کاش ہم نے رسولوں کے انداز سے انحراف نہ کیا موتا بلکہ ان کی دعوت پر ایمان لاتے ہوتے۔ قَدْ مَرَدَّا خَرَدًا کے الفاظ ان کے تمام اعمالِ بد اور ان کی ساری کوتاہیوں و کج رویوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آخرت کی نیریز مندی کے لیے انسان کو بہت سے نیک کام کرنے اور بہت سے برے کام چھوڑنے پڑتے ہیں لیکن جو لوگ آخرت سے غافل یا اس کے منکر ہوتے ہیں وہ ان کاموں سے تو غافل یا منحرف رہتے ہیں جو وہاں کے لیے زائدِ راہ کا کام دینے والے ہیں اور جو دنیا کی آخرت میں تباہی کا باعث بننے والی ہوتی ہیں، ساری زندگی وہ انہی کا ذخیرہ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے ہی محروموں کے لیے تذکرہ و تنبیہ ہے۔



كَلِ الْإِنْسَانِ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَلَوْلَا لَقْنَىٰ مَعَاذِ رَبِّكَ (۱۵-۱۴)

انسان خود اپنے ادھر گواہ ہے۔ یہ اسی بات کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر بَلْ یُرِیدُ الْإِنْسَانُ لِیَفْجُرَ أَمَامَهُ کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ وہاں مخالفین قیامت کے سوال کَبِشْرُ آيَاتِ یَوْمِ الْقِیَمَةِ کے تعلق سے کلام کا رخ تصویر قیامت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اصل سلسلہ کلام پھر عود کر آیا اور بات پوری کر دی گئی۔ فرمایا کہ انسان قیامت سے گریز کے لیے کتنے ہی پہلے بنائے لیکن وہ اپنے نفس پر خود محبت اور گواہ ہے۔ بَصِيرَةٌ عَلَىٰ نَفْسِهِ کے معنی ہوں گے شَهِدٌ عَلَىٰ نَفْسِهِ (رو اپنے ادھر خود گواہ ہے) اس کی دلیل اوپر بیان ہو چکی ہے کہ انسان کے اندر اس کا نفس لڑا مر قیامت کا شاہد ہے، اس کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی ضمیر کے آئینے میں اس کی صورت دیکھ سکتا ہے۔

”مَعَاذِ رَبِّكَ جَمْعُ سَعْدٍ ذُو“ کی۔ یہ دراصل مَعَاذِ رَبِّكَ ہے۔ اس میں ’ی‘ زیادہ ہو گئی ہے جس طرح متناکیر میں زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے معنی جھوٹے عنایات اور لا طائل بہانوں کے ہیں۔ عربی میں مثل ہے اَلْمَعَاذِ ذُو مَکَاذِبَ بَعْضُوں نے اس کو معاذ کی جمع بتایا ہے۔ جس کے معنی اہل یمن کی بولی میں پر وہ کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے، اہل یمن کی بولی میں نہیں اترتا ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجَاجِلَ بِهِ ۚ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ فَإِذَا قُرْآنُهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ فَتُحَدَّثَ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۱۶-۱۹)

آیات کا پس منظر یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخفی لغین کی جلد بازیوں اور ان کے نت نئے مطالبات کے مقابل میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اندازِ عیام کی جو بھاری ذمہ داری ڈالی تھی اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کے پاس واحد سہارا وحی الہی ہی کا سہارا تھا۔ آپ کی مثال محاذ پر مامور سپاہی کی تھی اور آپ کوئی بھی قدم اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ مخالفین آپ کو زچ کرنے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات و مطالبات پیش کر کے آپ کو سپاہ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ ادھر ان کا ایک مطالبہ مذکور ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس قیامت سے ڈرا رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اگر اس کا آنا قطعی ہے تو وہ اکیوں نہیں جانتی! اسی طرح قرآن میں ان کا یہ مطالبہ بھی مذکور ہوا ہے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو وہ پورا کا پورا بیک دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ غرض ہر طرف سے آپ پر نئے نئے قرآنی سوالات کی بارش تھی اور ہر سوال کے اطمینان بخش جواب کے لیے آپ کو برابر وحی الہی کا انتظار رہتا۔ اسی سے آپ کے قلب کو قوت، آپ کی روح کو حیات تازہ، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام



حاصل ہوتا۔ چنانچہ قرآن اور احادیث دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کہیں حکمت الہی کے تحت وحی کے نزول اور جبریل امین کی آمد میں کچھ زیادہ وقفہ ہو جاتا تو آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ اسی شوق و اضطراب کا اظہار آپ سے اس وقت بھی ہوتا جب جبریل امین آپ پر وحی القادر فرماتے۔ آپ ایک پُر شوق طالب کی طرح چاہتے کہ جلد سے جلد ساری وحی سن لیں اور اس کو اچھی طرح محفوظ بھی کر لیں کہ بنا داساں ابرنیاں کا کوئی قطرہ ضائع ہو جائے۔ اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آیات پر غور فرمائیے۔

”لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ“۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عجلت و بے قراری کے نزول وحی کے سے دو کا گیا ہے جو آپ پر اس وقت طاری ہوتی جب وحی آتی۔ اگرچہ شوق و عجلت وقت آنحضرت کا مضمون ادب کے پامال مضامین میں سے ہے لیکن اس عجلت و بے قراری کی تعبیر کون کر سکتا کہ شوق و غم ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت طاری ہوتی ہوگی جب ایک طویل وقفہ کے انتظار کے بعد اور مخالفین کی اثر خائوں کے طوفان کے اندر حضرت جبریل امین اللہ تعالیٰ کے نام و پیام کے ساتھ نمودار ہوتے رہے ہوں گے۔ ایک بچہ بھوکا ہو اور ماں اس کو چھاتی سے لگائے تو وہ چاہتا ہے کہ ماں کی چھاتی کا سارا دودھ ایک ہی سانس میں سٹپ لے۔ صحرا کا مسافر پیاس سے تڑپ رہا ہو اور طویل انتظار کے بعد اس کو پانی کا ڈول مل جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ پورا ڈول ایک ہی دفعہ پیٹ میں انڈیل لینا چاہتا ہے۔ ایک فراق زدہ کو جدائی کی کٹھن گھڑیاں گوارنے کے بعد نامہ محبوب مل جائے تو وہ چاہے گا کہ ایک ہی نظر میں اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالے۔ اگرچہ یہ مثالیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ناقص ہیں، تاہم ان سے کچھ اندازہ اس شوق، اس عجلت اور اس اضطراب کا کیا جاسکتا ہے جن کا اظہار آپ کی طرف سے بے اختیار اس وقت ہونا رہا ہوگا جب آپ وحی سے مشرف ہوتے رہے ہوں گے۔

اس کا سبب کوئی ایک نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متعدد تھے۔ مثلاً

- یہ کہ آپ جس فریضہ منصبی پر مامور تھے اس کا سارا پروگرام اسی سے معلوم ہوتا تھا۔
- آپ کی عقل، ایمانی اور روحانی زندگی کا تمام تر انحصار اسی پر تھا۔
- حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رہنمائی اسی سے ملتی تھی۔
- دشمنوں کے نئے نئے اعتراضات و مطالبات کے فیصلہ کن جوابات اسی کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے۔
- علم کا غیر معمولی شوق اور اس کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کا صحیح احساس بھی اس کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔



ان میں سے ہر محرک ایک پاکیزہ محرک ہے لیکن حکمت الہی کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن جس تدریج سے نازل ہو رہا ہے اسی طرح نازل ہو۔ چنانچہ آپ کو بار بار اس معاملے میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ سورہ اٹھ کی آیات ۱۱۴-۱۱۵ میں بھی آپ کو اسی طرح کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ وہاں ہم اس کے بعض خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً اسی بات کا ذکر ہے لیکن موقع و محل کے تقاضے سے آپ کو یہ اطمینان بھی، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہو رہا ہے، یہاں دلا دیا گیا کہ آپ قرآن کی حفاظت و صیانت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ اس کے جمع و ترتیب، اس کو سنانے، یاد کرانے اور اس کے محتاج و ضاحت مقامات کی وضاحت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ جتنا جتنا قرآن اترتا جائے اس پر آپ قناعت کریں۔ نہ اس کے اتارے جانے کے لیے کسی عجلت و اضطراب کا اظہار کریں، نہ اس کی حفاظت کے باب میں کسی تشویش میں مبتلا ہوں۔ ان باتوں کو اپنے رب پر چھوڑیں۔ ہر کلام اپنے صحیح وقت پر، ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

رَأَتْ عَلَيْكَ جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشویش کو رفع فرمایا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ چونکہ ایک عظیم آسمانی خزانہ آپ کی تحویل میں دیا جا رہا تھا اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کو اپنی امانت میں لینے ہوئے آپ ایک ایک لفظ کو اس طرح محفوظ کرنے کی کوشش کرتے کہ کوئی خوف ضائع نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ اس کو محفوظ کرنے اور اس کو سنانے کی ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

لفظ جمع یہاں ایک جامع لفظ ہے۔ اس سے مراد اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشرہ موتیوں کو ایک لڑھی میں پرونا بھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں کس ترتیب سے آپ جمع کرائیں۔ چنانچہ اس رہنمائی کی روشنی میں آپ نے الگ الگ سورتوں میں، ان کے مواقع کی تعمین کے ساتھ، جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی۔

قرآن کے جمع

ترتیب اور اس

کی حفاظت

کا وعدہ

اس کے علاوہ مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تا کہ کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات مبارک کے آخری رمضان میں آپ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا، اسی کی طرف قرآن ۱۸ کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔

”فَإِذَا قُرْآنُكَ خَاتَمَ قُرْآنَهُ“ یعنی تم اپنی طرف سے قرآن کے اتارے جانے کے لیے کوئی جلدی نہ کرو۔ یہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑو۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق جتنا چاہے گا نازل فرمائے گا اور اس کی حفاظت اور اس کے جمع و ترتیب کا اہتمام بھی فرمائے گا۔ تمہاری ذمہ داری



صرف یہ ہے کہ ہم جتنا قرآن سنا چکیں اس کے سنانے کی پیروی کر دو۔ اسی کو پڑھو، اسی پر عمل کرو اور اسی کی دعوت دو۔ جو لوگ پورے قرآن کو بیک دفعہ نازل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے مطالبہ کی کوئی پروا نہ کر دو۔

ثُمَّ لَنَعْلَمَنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ اسی سلسلہ میں مزید اطمینان یہ بھی دلا دیا کہ اگر قرآن کے کسی مقام میں کسی وضاحت کی ضرورت ہوگی تو اس کے باب میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کی ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ہے۔ جب وقت آئے گا تو یہ کام بھی ہم کر دیں گے۔ یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جو کسی سابق حکم کی توجیح و تبیین یا اس کے نسخ یا تکمیل کے طور پر نازل ہوئیں۔ ان توضیحی آیات کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ان کے بعد بالعموم کَذِبُكُمُ بَيِّنٌ۔ اللہ کے الفاظ سے قرآن نے یہ رہنمائی بھی دے دی ہے کہ یہ اسی وعدے کی تکمیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اَنَّا نَعْلَمَنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ کے الفاظ میں فرمایا ہے۔

ان آیات کے تحت اس اذام رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصے بھی ہم نقل کیے ات اذام  
کے بعض اذام دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

”مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات میں جس عجلت کا ذکر ہے اس کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ تھا کہ مبادا قرآن کی کوئی بات ضائع ہو جائے۔ ہم کو اس رائے سے اختلاف نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے جس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔“

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ محسوس فرماتے کہ یہ ایک عظیم ذمہ داری اور بہت بڑی امانت ہے جو آپ کے سپرد کی جا رہی ہے، اس میں کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی ہونی یا اس کا ایک حرف بھی ضائع ہونا تو آپ کو اس کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی آپ کو یہ تنا بھی تھی کہ اس میں اضافہ ہو، شاید آپ کی قوم اس کے کسی حصہ کی برکت سے راہ یاب ہو جائے۔ معاذ کے یہ دونوں ہی پہلو نہایت واضح تھے چنانچہ اس سورہ میں آپ کو جو تسلی دی گئی اس میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے۔“

قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح فرمایا ہے مثلاً

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ

اور یہ کتاب عزیز ہے جس میں باطل نہ

اس کے آگے سے راہ پاسکتا ہے اور

نہ اس کے پیچھے سے

ہم ہی نے اس یاد دہانی کو نازل کیا ہے

(سُورَةُ السَّجْدَةِ - ۴۱ : ۴۱-۴۲)

دوسرے مقام میں ارشاد ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ



(العجد - ۹۱۱۵)

لوریہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کسی کمی بیشی یا تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ یہ باتیں اس وعدہ حفاظت کے منافی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ادھر کی آیتوں میں فرمایا ہے چنانچہ اسی امر پر پوری امت متفق ہے کہ قرآن بالکل محفوظ ہے۔ اُمایہ کے متعلق جو مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علماء کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضیٰ شریعہ الطائف محمد بن حسن طوسی، ابو علی طبری صاحب مجمع البیان، محمد بن علی بن بابویہ قمی، سب نے اس بے ہودہ خیالی کی، پوری شدت کے ساتھ، تردید کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا بعینہ وہی قرآن ہے جو مابین الفتن امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن ایک حرف بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جو شخص ہم سے یہ منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں، وہ جھوٹا ہے۔ اس باب میں ان کے ہاں جو روایات ہیں ان کے بارے میں سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ اُمایہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان کے اختلاف کا تمام تردید در چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ ان روایات کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات کا انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت سے ثابت ہے۔

آیت زیر بحث سے مولانا علیہ الرحمۃ نے جو استنباط کیے ہیں وہ یہ ہیں :

- قرآن حضور کی زندگی ہی میں جمع کر کے، ایک خاص ترتیب پر آپ کو سنا دیا گیا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قرأت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا، جیسا کہ دیا گیا ہے: فَإِذَا قَرَأْتَهُ تَتَّبِعْ قُرْآنَهُ (پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کرو)۔
- آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد جس طرح آپ کو قرآن سنا یا جائے اسی طرح آپ اس کو پڑھیں..... اس حکم کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنا یا ہو جس پر اس کی آخری قرأت ہوئی۔ اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ آخری قرأت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔

- یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں بھی بیان فرمادیں جو تعمیم و تخصیص یا تخفیف و تکمیل کی نوعیت کی تھیں۔



آگے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ ساری باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ اس خاص ترتیب پر آپ کو سنائی گئی ہوں۔ صحابہؓ اسی ترتیب پر قرآن سنتے اس کو محفوظ کرتے اور اس کی پابندی کرتے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ آیتوں کو مخصوص سورتوں میں، معین مقامات پر کھواتے، اور صحابہؓ اس حکم کی تعمیل کرتے۔ پھر جب کوئی توفیقی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں اس کے معین مقام میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو اصول ملحوظ رکھے جاتے: یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملا دی جاتیں جن کی وہ تشریح کرتیں یا سورہ کے آخر میں رکھ دی جاتیں اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔

”ان توفیقی آیات کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے تدبر سے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ خود ان آیات کے اندر ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ توفیق و تشریح کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً ان کے ساتھ بالعموم اس طرح کے الفاظ ہیں: كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ (اس طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول رہا ہے)۔“

اسی طرح یہ بات بھی صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ آخر میں حضرت جبریلؑ نے پورا قرآن، اس کی اصلی ترتیب کے مطابق آپ کو سنایا۔ اس سے نظام قرآن کے باب میں بہت سے شبہات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔“

كَلَّا بَلْ تُجِوُّنَ الْعَاجِلَةَ ۖ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (۲۰-۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کے بعد پھر کلام اپنے اصلی سلسلہ سے جڑ گیا۔ مکذبین قیامت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قیامت کے بارے میں تمھارا یہ رویہ اس بنا پر نہیں ہے کہ اس کی کوئی دلیل تمھارے سامنے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت تو خود تمھارے اپنے قلب و ضمیر ہی کے اندر موجود ہے۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ تم دنیا اور اس کی مرغوبات سے عشق رکھتے ہو اور اس نقد کو چھوڑ کر آخرت کے نسیہ کے لیے بازی کھیلنے کا حوصلہ تمھارے اندر نہیں ہے۔

”تَذَرُونَ الْآخِرَةَ“ کے معنی ہیں آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو، مطلب یہ ہے کہ آخرت تم مکذبین قیامت سے مخفی نہیں ہے لیکن دنیا نقد ہے اس وجہ سے اس پر فریفتہ ہو اور آخرت نقد نہیں ہے اس وجہ سے اس سے جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کر رہے ہو۔



وَجُودًا يَوْمَئِذٍ نَّاصِدَةً ۖ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ وَجُودًا يَوْمَئِذٍ بِاسْرَةٍ ۚ  
تَنْظُرُ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاِذَرَةٌ (۲۲-۲۵)

اصل حقیقت یعنی دنیا کے پیچھے آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو تو کر دیکھیں اس حقیقت کو نہ بھولو کہ جس کو نظر انداز کر رہے ہو وہ آگے رہے گی اور اس دن صورت حال بالکل مختلف ہوگی۔ جنہوں نے اس کو سامنے رکھ کر زندگی گزار لی ہوگی ان کے چہرے تو اس دن تروتازہ اور شاداب ہوں گے، وہ اپنے رب کی رحمتوں سے متوقع ہوں گے اور جنہوں نے اس کو نظر انداز کر کے زندگی گزار لی ہوگی ان کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے اور وہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ یہ جنت یا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے کے حالات کی تصویر ہے۔ مستحقین جنت جب دیکھیں گے کہ ہر قدم پر ملائکہ سلام و تحیت اور اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا غیر مقدم کر رہے ہیں تو اپنے روشن مستقبل کے تصور سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ متوقع ہوں گے کہ اب رب تعالیٰ کی اس کامل رحمت و عنایت کے ظہور کا وقت آگیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس کفار کے ساتھ قدم قدم پر جس طرح کا معاملہ ہوگا اس سے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی کہ اب اس کمر توڑ دینے والی مصیبت سے دوچار ہونے کا وقت آگیا جس سے ان کو آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے اس کو نظر انداز کیے رکھا۔

اِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے معنی ہیں وہ اپنے رب کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہوں گے۔  
نَظَرُ کے بعد جب اِلَىٰ کا ملہ آتا ہے تو اس کے معنی جس طرح کسی چیز کی طرف دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہونے کے بھی آتے ہیں۔ ماہرین لغت نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے، جس سے اس کو عنایت کی توقع ہو، یہ کہے کہ اِنَّا نَنْظُرُ اِلَىٰ اللّٰهِ تَعَالٰی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اللہ کے فضل اور اس کے بعد آپ کی عنایت کے متوقع ہیں۔

کلام کا سیاق و سباق بھی یہاں اسی معنی کے حق میں ہے۔ دوزخ میں جانے والوں کی ذہنی حالت کیفیت تَنْظُرُ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاِذَرَةٌ کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے یعنی وہ حالات دیکھ کر یہ گمان کر لیں گے کہ اب ایک کمر توڑ دینے والی مصیبت ان پر ٹوٹنے والی ہے۔ اور اس گمان کے سبب سے ان کے چہروں پر بدحواسی طاری ہوگی۔ ان کے اس گمان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے رب کی سب سے بڑی رحمت کے ظہور کے متوقع ہوں گے اور اس توقع کے سبب سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے۔



‘اَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقْدَرُ’ کی تالیف زخم شری نے یوں بیان کی ہے: ‘اِی یفعل بها فعل  
ہو فی شد تھا فاقدرہ’ (یعنی اس کو ایسی سزا ملنے والی ہے جس کی شدت کو توڑ دینے والی ہے)۔  
اگرچہ اس کے سوا بھی اس کی تالیف کی بعض صورتیں ممکن ہیں لیکن میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی بعض  
مشابہتیں آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔

‘فَاقْدَرُ’ ایسی صیغہ کو کہتے ہیں جو ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑ دینے والی ہو۔

‘اِی دَبَّهَا نَاطِقًا’ سے بعض لوگوں نے رویت باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک رویت باری کے  
جیسا کہ اس کی تاویل اور اس کے موقع و محل سے واضح ہے، یہ آیت اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والی نہیں  
ہے۔ بلکہ یہ بالکل ہی دوسرے موقع و محل کی آیت ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے رویت باری تعالیٰ کی مخالفت  
کی ہے اور اس مخالفت کے جوش میں ‘اِی’ کے معنی ہی بدل دیے ہیں، ان کی رائے بھی ہمارے نزدیک بالکل غلط  
ہے۔ رویت باری تعالیٰ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں تو ہمارا ایمان، ایمان بالغیب  
ہے، ہم اپنے رب کو اس کی آیات اور نشانیوں کی ادھاری سے دیکھ سکتے ہیں لیکن آخرت میں ہمارا  
ایمان بالمشاہدہ ہوگا اور ہر حقیقت کے باب میں ہمیں حق یقین کا مرتبہ حاصل ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ اس  
مشاہدہ کی نوعیت کیا ہوگی تو اس کی حقیقت اس دنیا میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ چیز متشابہات میں داخل  
ہے اور متشابہات میں تحقق جائز نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ، ہی جانتا ہے کہ اس مشاہدے کی نوعیت  
کیا ہوگی؟

كُلَّ اِذَا بَلَغَتِ السَّوَاتِقِ ۝ وَ قِيلَ مَنْ يَكْتُمُ ذٰلِكَ ۝ وَ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقِ ۝ وَ اَلْتَفَّتِ  
السَّانِیَ بِالسَّاقِ ۝ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَ یَبْذُرُ الْمَسَاقِ (۲۶-۳۰)

عیش دنیا کے متوالوں کو یہ موت کی جان کنی اور اس وقت کی بایر سہولت کی یاد دہانی ہے عیش دنیا کے  
کہ قیامت کو بعد از اسکان نہ سمجھو۔ وہ لازماً آٹھے گی اور تمہیں خدا کی طرف اس دن سفر کرنا ہوگا جب  
تمہاری ساری جولانیاں ختم ہو جائیں گی اور بے بسی کا یہ حال ہوگا کہ پنڈلی سے پنڈلی لپٹی ہوئی ہوگی۔ اور آخرت کی  
بہتر ہے کہ اس سے پہلے کہ جان ہنسل میں آ پھنسے اور پنڈلی پنڈلی سے پٹ کے رہ جائے خدا کی طرف یاد دہانی  
بھاگو اور اس سفر کے لیے کچھ سامان کر لو۔

ان آیات کے تحت استاد امام علیہ الرحمۃ نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح تحقیق پر مبنی ہے۔ ان کی تفسیر قرآن کے  
سے ہم اس کا ضروری خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔ چند نکات

‘بَلَغَتِ السَّوَاتِقِ’ میں ضمیر نفس کے لیے ہے جو یہاں محذوف ہے۔ اس حذف کی مثال سورۃ

واقعہ میں بھی ہے۔ فرمایا ہے: ‘كُلَّ اِذَا بَلَغَتِ الْخُلُقُومُ رَاقِدَةً’ (۸۳: ۵۶) (کیوں نہیں جب  
کہ جان ساق کو پہنچ جاتی ہے!) اس طرح کا حذف عربی میں معروف ہے اس وجہ سے نفس کا ذکر



فردی نہیں ہوا۔ کلام عرب میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ قائم طائی کہتا ہے۔

امادی ما یغنی الشراء عن الفقد اذا حشوت يوماً وضاق بها الصدر

(اے مادیہ! مال آدمی کے کیا کام آئے گا جب جان سینے میں پھنسے گی)

اس میں 'حشوت' کا فاعل نفس ہے لیکن اسی قاعدے کے مطابق جو مذکور ہمارے اس کو حذف کر دیا۔ قرآن مجید میں بھی اس حذف کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً مَا تَرَبَّ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ ذَا بَنَةٍ (فاطہ۔ ۵۵) (اور زمین کی پشت پر کوئی جاندار جیتا نہ چھوڑا) اس میں دیکھ لیجیے ضمیر کا مرجع 'الارض' ہے جو محذوف ہے۔

وَقِيلَ مَنْ مَكَّنَ ذَاكَ (ہور پکاریں گے، ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا!) یہ فقرہ صورت حال کی شدت و نزاکت کی تعبیر کے لیے ہے اور مچھولی کا صیغہ یہاں غایت درجہ بلیغ ہے۔ گویا ایسا سخت وقت ہوگا کہ کوئی شخص قائل کی طرف توجہ کرنے والا نہیں ہوگا، یا یوں کہو کہ اس قول کی اہمیت خود قائل کی ذات سے بالکل بے پروا کر دے گی۔ ہر شخص کی زبان پر بس یہی کلمہ ہوگا۔ نکرہ سے پہلے 'مَنْ' یا تو شدت طلب کے لیے آتا ہے یا غلبہ یاس کی تعبیر کے لیے۔ طرفہ کا شعر ہے:

اذا القوم قالوا من فتى خلت اننى عینت فلوا کسل ولعابتل

(جب قوم پکارتی ہے کہ ہے کوئی جوان! تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ ان کا اشارہ میری ہی طرف ہے، پھر میں کسی سستی اور بوردے پن کا اظہار نہیں کرتا)۔

اب دیکھیے کہ یہاں آیت کا کیا منشا ہے اور یہ اسلوب کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے ہمارے نزدیک یہاں دو تاویلوں کا احتمال ہے اور ان دونوں میں فرق محض ظاہری ہے۔ پہلی تاویل یہ ہے کہ جب موت کی بے ہوشی طاری ہوگی اور جان سینے میں گھٹنے لگے گی تو تیمار دار گھبرا کر لپکاریں گے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا جو اس جاں بلب کا علاج کرے!

دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ بس اب معاملہ آخر ہو چکا! اب کون اس کو شفا دے سکتا ہے! یہ اظہار یاس کا فقرہ ہے اور یہ بین کر مرض کو یقین ہو جائے گا کہ بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ مشہور شاعر غسان نے اس ضمن میں کوئی ادا کیا ہے:

لكن سهام المنايا من یصبن له لعینة طب ذی طب ولا داق  
لاجرو موت کے تیر تر ازاد ہو گئے اس کو نہ کسی طبیب کی غذاقت شفا دے سکتی نہ کسی جھاڑ پھونک



دائے کی جھاڑ بھونک،

یہ دوتا ویس ہو سکتی ہیں۔ ہم نے دونوں سامنے رکھ دی ہیں۔ جو چاہا ہوا اختیار کر سکتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک دوسری تاویل نظم کلام سے زیادہ لگتی ہوئی ہے۔

وَالْتَقَتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

”پنڈلی سے پنڈلی لپٹنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی چل نہ سکے گا۔ یہ حالت شدتِ ضعف و بے بسی کے سبب سے ہوگی۔ آدمی جب تک زندہ اور طاقت ور ہے ہر میدان میں جولانیاں کرتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پنڈلیاں باہم دگر لپٹ گئی ہیں۔“

.....

ضعف و بے بسی کی تعبیر کے لیے التفاق ساق (پنڈلی کا لپٹ جانا) نہایت موزوں

تعبیر ہے۔ مدعا کلام کا یہ ہے کہ جب معالجِ مرضی سے بالوس، اعزہ و اقربا و دستِ بردار، فرما نبردار اعضاءِ قابو سے باہر ہو جائیں گے اور ایک بھاری بوجھ کے ساتھ اس کو رب کی طرف جانا ہوگا، سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا، تو اسی وقت اس کا کیا حال ہوگا؟

بعض لوگوں نے ’ساق‘ کے معنی ’شدتِ امر‘ کے لیے ہیں۔ لیکن یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کو عربی زبان سے کوئی مس نہیں ہے۔ یہ لوگ اجزاء اور مجموعہ کی دلالت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ کشف عن الساق اپنی مجموعی صورت میں سرگرمی، مستعدی اور آمادگی کے مفہوم کے لیے عربی میں معروف ہے مگر جب یہ دونوں لفظ الگ الگ آئیں گے تو ’کشف‘ کے معنی کھولنے اور ’ساق‘ کے معنی پنڈلی کے ہوں گے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ الگ الگ بھی اسی مفہوم کو ادا کریں۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ ’ساق‘ سے مراد دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کرنے والوں کو کچھ وہم ہوا ہے۔ اگر روایت صحیح ہے تو اس کو بیان واقعہ سمجھنا چاہیے نہ کہ ’ساق‘ کی تعبیر۔

پنڈلی لپٹنے کا ٹھیک مطلب سمجھ لینے کے بعد اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ السَّاقِ (اس دن تیرے رب کی طرف چلنا ہوگا) کا حسن موقع آپ سے آپ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ گویا اس سفر کی تیاریوں میں انسان سے جو غفلت ہوئی ہے یہ اس پر اس کو سرزنش ہے کہ وہ برابر دنیا ہی کی طلب میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ اسی تک دود میں اس کی تمام طاقت نچر چکی اور اس کو جانا ہے اپنے رب کے پاس تو وہ یہ سفر کس طرح طے کرے گا؟



فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى وَلَا وَلِيْنَ كَذِبٌ وَتَوَلَّيْتُ ثُمَّ ذَهَبْتُ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّوْا  
أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ثُمَّ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ (۳۱-۳۵)

سفر دشوار اور زاد و زاد کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ انھوں نے خدا کی راہ میں اتفاق کیا نہ نماز پڑھی اور نہ ایک ہی دو چیزیں کچھ نہیں اس سفر میں کام آنے والی تھیں۔

‘صَدَقَ’ کے بعد بِالْحُسْنٰی کا لفظ برہنہ ہے وضاحت قرنیہ محذوف ہے۔ سورہ لیل میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے: ‘فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ’ وَصَدَقَ بِالْحُسْنٰی فَسَيَكُونُ لِلْيُسْرٰی (الیل ۵: ۹۲-۹۴) (پس جس نے اپنا مال راہِ خدا میں دیا اور اپنے رب سے ڈرا اور آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی تو اس کو ہم سبج راہ چلائیں گے) یہ امر واضح رہے کہ خدا کی راہ میں اتفاق ان لوگوں کے لیے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جو آخرت اور اس کی جزائے حسن کے قائل نہ ہوں۔ یہ گھاٹی وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جن کے دل مطمئن ہوں کہ دنیا میں جو کچھ وہ خرچ کریں گے آخرت میں ایک زوال خیزانہ کی صورت میں وہ ان کو ملنے والا ہے۔ آخرت کی جزا کا اعتقاد ہی ہے جو آدمی میں اتفاق کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، جو اس کو جھٹلانے والے ہوتے ہیں ان کی مٹھی اتفاق کے لیے کبھی نہیں کھلتی۔ سورہ لیل کی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ہی یہ حقیقت اس طرح واضح فرمائی گئی ہے: ‘فَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی’ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَيَكُونُ لِلْيُسْرٰی (الیل ۸: ۹۲-۹۴) (اور وہ جس نے بخیلی کی اور بے پروا ہوا اور جزائے حسن کی تکذیب کی تو ہم اس کو ایک کٹھن راہ چلائیں گے)۔

ان آیات کی روشنی میں ‘فَلَا صَدَقَ’ کا مفہوم یہ ہو گا کہ اس نے نہ آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی اور نہ اپنے رب کی راہ میں خرچ کیا۔ گویا اس لفظ کے اندر تکذیبِ آخرت اور بنیالت دونوں کا مفہوم مضمون ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ وَلَا صَلَّى (اور نہ اس نے نماز پڑھی) گویا اتفاق اور نماز دونوں کا اصل محرک جزائے اعمال کا اعتقاد ہے اور جب یہ اعتقاد ہی معدوم ہے تو ان کے وجود پذیر ہونے کا کیا امکان باقی رہا۔

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہوتی آرہی ہے کہ نماز اور اتفاق ہی دین کے وہ بنیادی اعمال ہیں جن پر پوری شریعت قائم ہے۔ اب اس آیت سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں کا انحصار آدمی کے عقیدہ آخرت پر ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ محکم نہ ہو گا وہ ان کا اہتمام نہیں کر سکتے۔

‘وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّیْ’ یہاں ‘صَدَقَ’ کے مقابل میں اور ‘تَوَلَّیْ’ یہاں ‘صَلَّى’ کے مقابل ہے۔ یعنی ہر ناتو یہ پہلے تھا کہ وہ رسول اور آخرت کی تصدیق کرتا اور خدا کی راہ میں اتفاق کرتا۔



اور نماز پڑھتا لیکن اس نے تکذیب اور اعراض کی روش اختیار کی۔

لَتَذْهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ نَبَاطٌ بِمَا اس اعراض کی تصویر بھی ہے اور غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اعراض کی اس میں اس کا سبب بھی بیان ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر مال و اولاد کا گھنڈا ہوتا ہے تصویر اور ان کو خدا اور آخرت سے ڈرایا جائے تو یہ تذکیر ان پر کارگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی رفاہیت و جمعیت کو اس کا سبب اپنی روش کے صحیح اور کامیاب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان لوگوں کی نصیحتیں خاطر میں نہیں لاتے جو ان کی روش میں کسی غلطی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ ان سے اثر پذیر ہونے کے بجائے اکڑتے ہوئے اپنے اہل و عیال کی طرف چل دیتے ہیں کہ جب ہمیں یہ سب کچھ حاصل ہے تو یہ ہماری اقبال مندی کی دلیل ہوتی یا خرابی کی! خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ انھیں لوگوں کے دماغوں کے اندر ہے جو خود تو ہر چیز سے محروم ہیں لیکن ہمیں ڈراوے سارے ہیں کہ ہم تباہی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں، مختلف سلولوں سے، بار بار بیان ہوئی ہے کہ اہل ایمان کی روش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے اندر برابر خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں کہ مبادا اس گٹھ کی گھمبائی کا حق ادا نہ ہو سکے اور وہ خدا کی کسی پکڑ میں آجائیں۔ اہل ایمان کے اس احساس ذمہ داری کا اظہار قرآن میں یوں ہوا ہے اَنَّا كُنَّا قُلُوبًا فِي اَهْلِنَا مُتَحِقِّينَ (طور ۵۲: ۲۶) ہم پہلے سے اپنے اہل و عیال کے باب میں ڈرنے لے رہے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس رویہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے سینے خوب خدا سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اہل و عیال کو اپنے لیے سرمایہ فخر و نمازش اور ان کو اپنی اقبال مندی کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کے دماغ پر وہی نشہ سوار ہوتا ہے جو سورہ کہف میں ایک باغ دانے کے قصہ میں بیان ہوا ہے کہ مَا أَظُنُّ اَنْ تَبِيدَ هَذِهِ اَبَدًا (الکہف ۱۸: ۲۵) (میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا)۔ اسی طرح کے لوگوں کی ذہنیت سورہ مطففین میں بدین الفاظ بیان ہوئی ہے: فَادْاُ الْقُلُوبِ اِلٰی اٰهْلِہِمُ انْقَبَبُوْا فِکَہِیْنَ (المطففین ۸۳: ۳۱) (اور جب وہ اپنے اہل کی طرف لوٹتے ہیں تو گمن ہو کر لوٹتے ہیں)۔

اَوَّلٰی نَدٰی فَاَدٰی لَا تُعَادٰی لَکَ فَاَدٰی: اَوَّلٰی نَفْطُ دِل سے ہے جو جبراً اظہارِ حشر و ملامت اور اظہارِ نفرت و غضب کے لیے آتا ہے۔ اس معنی میں یہ کلام عرب میں بکثرت آیا ہے۔ غنار کا مشہور شعر ہے:

ہممت بنفسی کل الہموم فَاَدٰی لِنَفْسِی اَوَّلٰی لہا

(میں نے اپنے نفس کے بارے میں طرح طرح کے ارادے کر ڈالے ہیں انوس ہے میرے نفس پر، انوس ہے!)

معلوم نہیں بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ سنراوار کس طرح کر دیا ہے۔ یہ عربیت کے بھی خلاف ہے

اور سیاق و سباق سے بھی بے جوڑ ہے۔



اوپر سے کلام غائب کے اسلوب میں آ رہا تھا، اس آیت میں اسلوب خطاب کا آگیا۔ اسلوب کی یہ تبدیلی افسوس اور نفرت کے اظہار میں شدت پر دلیل ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۚ أَلَمْ يَكُنْ لَطْفَةً مِنْ رَبِّهِ لِيُمْسِي ۚ  
تُؤْكَنَّ عِلْقَةً فَخَلَقَ نَسَوًى ۚ فَجَعَلَ مِنْهُ الْتَوَجِينَ الذِّكْرَ وَالْأُنثَى ۚ أَلَيْسَ  
ذَلِكَ بِقَدِيرٍ عَلَى أَنْ يَخْرُجَ الْمَوْتَى (۳۶-۴۰)

اب اسی مضمون پر سورہ کو ختم فرمایا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ شروع میں فرمایا ہے: أَيَحْسَبُ  
الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۚ بلی اُتْرَکَ دینَ عَلٰی اَنْ تُسَوٰی بِنَانِهٖ اُس کے بعد کلام انسان کی خود سری  
دیدہ و دانستہ حق پرستی اور ہول قیامت کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب آخر میں اسی سوال کو لے کر اس  
کا جواب دیا کہ جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر تعجب کر رہے ہیں کیا وہ یہ گمان کیے بیٹھے  
ہیں کہ انسان غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا! اگر غیر مسئول چھوڑ دیا جانا خدا کے عدل اور اس کی حکمت کے  
منافی ہے تو خدا کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ کیا وہ خود اپنی خلقت  
کے مراحل پر غور نہیں کرتے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو رحم میں ٹپکا دی جاتی ہے۔  
'یُمسٰی' مجہول کا صیغہ عدم اعتناء و اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ٹپکا دینے والا ایک بوند ٹپکا کر  
الگ ہو جاتا ہے، پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ بوند کہاں اور کس حال میں ہے۔ بعد کے سارے تصرفات  
اس پر قدرت کرتی ہے اور تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر وہ اپنی صنعت گری سے اس کو مختلف مراحل سے  
گزارتی ہے۔ پانی کی پوند خون کی ایک پھٹکی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ پھر اس کا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ پھر  
اس کے نوک پلک سنوارے جاتے ہیں۔ بالآخر قدرت اس کو مرد یا عورت بنا کر وجود میں لاتی ہے۔ ان  
تمام مراحل میں قدرت کا مرقم ہی اس پر سارے تصرفات کرتا ہے۔ کسی اور کا ہاتھ اس میں شریک  
نہیں ہوتا۔ اب غور کرو کہ جس خدا نے اپنی قدرت، حکمت اور صنعت گری کی یہ شانیں تمہارے وجود  
کے اندر تمہیں مشاہدہ کرائی ہیں کیا وہ تمہارے مرجانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر  
نہیں ہو گا!

اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی توفیق بخشی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

والله الحمد في الدنيا والاخرة۔

رحمان آباد

۱۹ جنوری ۱۹۷۹ء

۱۹ صفر ۱۳۹۹ھ



تذکرہ قرآن

۷۶

الدَّهْرُ







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— القیمۃ ————— کی توام ہے۔ سابق سورہ جس مضمون پر ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ اُس کی آخری چار اور اس کی ابتدائی تین آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دونوں نے ایک حلقہ اتصال کی شکل اختیار کر لی ہے اور یہ چیز توام سورتوں میں بالعموم نمایاں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

دونوں کا عمود بالکل ایک ہی ہے، البتہ ہنج استدلال اور طریق بحث دونوں میں الگ الگ ہے۔ پہلی میں قیامت کی دلیل انسان کے اندر نفس کوامہ کے وجود سے پیش کی گئی ہے اور اس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر سمع و بصر کی جو صلاحیت، ودیعت فرمائی ہے اور اس کو خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو قابلیت بخشی ہے اس کا بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں ان لوگوں کو داد ملے جنہوں نے ان اعلیٰ صلاحیتوں کا حق پہنچانا اور اپنے پروردگار کے شکر گزار رہے اور وہ لوگ اپنے اندھے پن کی سزا بھگتیں جنہوں نے ان کی ناقدری کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ اگر یہ جزاء و سزا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک العیاذ باللہ شاکر اور کافر دونوں برابر ہیں۔

بعض مصاحف میں اس سورہ کو مدنی ظاہر کیا گیا ہے لیکن پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی ایک آیت کے بھی مدنی ہونے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ سورتوں کے کی یا مدنی ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے اصلی کسوٹی ان کے مطالب و مضامین ہیں۔ آگے مطالب کا تجزیہ بھی آپ کے سامنے آئے گا اور آیات کی تفسیر بھی۔ ان سے واضح ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے اس کو مدنی خیال کیا ہے ان کے خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱۔) انسان کی خلقت سے متعلق اس بدیہی حقیقت کی طرف اشارہ کہ ایک دور اس پر ایسا گزر رہا ہے جب



اس کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو عدم کی ظلمت سے نکالا اور وجود کی روشنی بخشی۔ پھر اس کی تخلیق کا سلسلہ پانی کی ایک بوند سے جاری فرمایا۔ اس بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے وہ اس درجے تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ سننے سمجھنے والی ہستی بن جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو خیر و شر دونوں کے راستے دکھا کر اس کا امتحان کرتا ہے کہ وہ شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کفر کی۔

(۲۲-۲۳) خیر و شر کا امتیاز دے کر خالق نے انسان پر جو انعام فرمایا ہے اس کے لازمی تقاضے کا بیان۔ بلا جہاں ان لوگوں کے انجام بد کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے اس شرف کی نافرمانی کر کے کفر کی راہ اختیار کر رہے تھے پھر اس عظیم صلہ کا بیان جس سے اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو نوازے گا جنہوں نے اس کے انعام کی تدریج اور اپنی زندگی جزاء و سزا کو پیش نظر رکھ کر گزارا۔

(۲۴-۲۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کہ تم ناشکروں اور ناکاروں کے اعتراضات و مطالبات کی پروا نہ کرو۔ جس رب نے تمہارے اوپر قرآن نازل کیا ہے اس پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہر شکل آسان کر دے گا۔ حصول صبر و استقامت کے لیے نماز اور ذکر الہی کی تاکید اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ کفار کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ دنیا کے نقدِ عاجل کو آخرت کے نسیم پر قربان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اس بیماری پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے وہ قیامت کے خلافت طرح طرح کے شبہات گھڑ رہے ہیں حالانکہ ان پر واضح ہے کہ تم جس چیز سے ان کو ڈرا رہے ہو وہ ایک حقیقت ہے اور ہمارے لیے یہ ذرا مشکل نہیں ہے کہ جس طرح ہم نے ان کو پہلے پیدا کیا اسی طرح ان کے جوڑ بند ٹھیک کو کے دوبارہ اٹھا کھڑا کریں۔

(۲۹-۳۱) مخالفین کو تنہید کہ اللہ کا رسول جو آگاہی تمہیں دے رہا ہے اس سے متعلق اس کی ذمہ داری صرف لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمہارا اپنا کام ہے۔ رسول یا دہانی کے بعد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ قبول ہدایت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی ایک معین سنت ہے۔ اس کے قبول کرنے والے تم میں سے وہی نہیں گے جو اس سنت کے تحت اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔ جو اس کے سزاوار نہیں ہوں گے وہ اپنے کفر پر اڑنے رہیں گے اور جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم اور اس کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔



# سُورَةُ الدَّهْرِ

مَكِّيَّةٌ \_\_\_\_\_ آيات: ٣١

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ①  
 إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ② نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا  
 بَصِيرًا ③ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ④ إِنَّا أَعْتَدْنَا  
 لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلًا وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا ⑤ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَشَرِبُونَ مِنْ  
 كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ⑥ عَيْنًا يَشْرِبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا  
 تَفْجِيرًا ⑦ يُوفُونَ بِالْإِذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ⑧  
 وَيُطْعَمُونَ أَطْعَامًا عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ⑨ إِنَّمَا  
 نُطْعِمُكُمْ لُؤْلُؤًا مِّنْهُ لَنُرِيدَ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ⑩  
 إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَتَطِيرًا ⑪ فَوَقَّعْنَاهُم مِّنْهُم  
 شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّعْنَاهُمْ نَضِيبًا وَسُرُورًا ⑫ وَجَزَّاهُمْ بِمَا  
 صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ⑬ مُّتَكِينِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَرَوْنَ  
 فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمَهَرِيرًا ⑭ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذُلَّتِ  
 قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ⑮ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِانِيَّةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَ

آيات

٣١-١



ترجمہ مفہوم بغیر  
الالف فی الوصل  
فیہما دتن علی  
الاول بالالف و  
علی الثانی بغیر  
الالف ۱۲

اَکُوَابٍ کَانَتْ قَوَارِيرًا ۝۱۵ قَوَارِيرًا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ۝۱۶  
وَلْيُسْقَوْنَ فِيهَا کَاْسًا کَانَ مِنْ اَجْهَارِ نَجَبٍ ۝۱۷ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى  
سَلْسَبِيلًا ۝۱۸ وَيُطَوَّبُ عَلَيْهِمْ وَلَدًا اِنْ مَخَلَدُوْنَ ۝۱۹ اِذَا رَاٰتِهِمْ  
حَسِبَتْهُمْ لُذُلًا مَّثُوْرًا ۝۲۰ وَاِذَا رَاٰتِ تَمَرًا رَاٰتِ نَعِيْمًا وَمُلُکًا  
کَبِيْرًا ۝۲۱ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ مِنْ سُندُسٍ خُضْرٍ وَاَسْتَبْرَقٌ زَهْرًا ۝۲۲  
اَسَاوِرٌ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقَمَهُمْ رُبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝۲۳ اِنْ هَذَا کَانَ  
لَكُمْ جَزَاءً وَّکَانَ سَعِيْکُمْ مُشْکُوْرًا ۝۲۴ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ  
الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝۲۵ فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اِثْمًا  
اَوْ کُفُوْرًا ۝۲۶ وَاذْکُرْ اَسْمَ رَبِّکَ بُکْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۲۷ وَمِنْ اٰیٰتِ  
فَاَسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِيْلًا ۝۲۸ اِنَّ هٰؤُلَاءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَ  
وَیَذَرُوْنَ وَّرَآءَهُمْ یَوْمًا تَقِيْلًا ۝۲۹ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا  
اَسْرَهُمْ ۝۳۰ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا اَمْثَلَهُمْ تَبْدِيْلًا ۝۳۱ اِنَّ هٰذِهِ  
تَذْکِرَةٌ ۝۳۲ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ اِلٰی رَبِّهِ سَبِيْلًا ۝۳۳ وَمَا تَشَاءُوْنَ  
اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِيْمًا حَکِيْمًا ۝۳۴ یُدْخِلُ  
مَنْ یَّشَآءُ فِی رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۳۵

ع  
۱۹

ع  
۲۱

ترجمہ آیات

۳۱-۱

کیا گزرا ہے انسان پر کوئی وقت، زمانے میں، ایسا جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ  
تھا! ہم نے انسان کو پیدا کیا پانی کی ایک مخلوط بوند سے۔ اس کو لٹٹے پلٹتے رہے  
یہاں تک کہ ہم نے اس کو دیکھنے سننے والا بنا دیا۔ ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔ چاہے وہ



شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ ۱-۳

ہم نے کفر کرنے والوں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔  
ہاں، وفادار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں چشمہ کہ نور کی ملونی ہوگی۔  
اس چشمہ سے اللہ کے خاص بندے پیئیں گے اور اس کی شاخیں نکال لیں گے جدھر جدھر  
چاہیں گے۔ یہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے رہے ہیں جس کا ہول ہم گیر  
ہوگا اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے رہے ہیں۔ خود اس کے حاجت مند ہونے  
ہوئے، (اس جذبہ کے ساتھ کہ ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں،  
نہ تم سے کسی بدے کے طالب ہیں نہ شکریہ کے، ہم اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے  
دن سے اندیشہ ناک ہیں جو نہایت عبوس اور سخت ترش رو ہوگا۔ تو اللہ نے ان کو اس دن  
کی آفت سے بچایا اور ان کو نازگی اور سرور سے نوازا۔ اور انھوں نے جو صبر کیا اس کے  
صلہ میں ان کو جنت اور یشمیں لباس عطا فرمایا۔ ٹیک لگائے ہوں گے اس میں تختوں پر۔  
نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے نہ سردی کے۔ باغ جنت کے سلٹے ان پر  
جھکے ہوئے اور اس کے خوشے بالکل ان کی دست رس میں ہوں گے۔ اور ان کے سامنے  
چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ شیشے چاندی کے ہوں گے۔ ان  
کو انھوں نے نہایت موزوں اندازوں کے ساتھ سجایا ہوگا۔ ۴-۱۶

اور وہ اس میں ایک اور شراب بھی پلائے جائیں گے جس میں ملونی چشمہ زنجبیل  
کی ہوگی۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جو سببیل سے موسوم ہے اور ان کی خدمت میں غلمان  
گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ ایک ہی بن پر رہیں گے۔ جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کو بھرے



ہوئے موتی گمان کرو گے۔ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر سندس کا سبز اور استبرق کا لباس ہوگا اور وہ چاندی کے گنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ بے شک یہ تمھارے عمل کا صلہ ہے اور تمھاری سعی مقبول ہوئی! ۱۷-۲۲

ہم ہی نے تم پر قرآن نہایت اہتمام سے اتارا ہے تو صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کی بات کا دھیان نہ کرو۔ اور صبح و شام اپنے رب کے نام کی یاد رکھو اور رات میں بھی اس کو سجدہ اور اس کی تسبیح کرو رات کے طویل حصہ میں۔ ۲۲-۲۶

یہ لوگ صرف دنیا سے عاجل سے محبت رکھتے اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے اور جب ہم چاہیں گے ٹھیک ٹھیک انہی کے مانند بدل دیں گے۔ یہ ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کر لے اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۲۷-۳۱



## الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَكُوفٍ مِّنْ شَيْءٍ مَّا ذُكِّرُوا (۱)

ہل کے معنی مفسرین نے استفہام کے بجائے عام طور پر 'قد' کے لیے ہیں لیکن کام عرب میں اس معنی کے لیے استفہامی سلوب مجھے کوئی نظیر نہیں ملی۔ بعض مثالیں جو اس معنی کی شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں ان پر میں غور کر لیا ہے۔ میرے کی بدعتیں نزدیکان میں بھی 'هَلْ' استفہام ہی کے لیے ہے۔ البتہ استفہام جس طرح ہماری زبان میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے اسی طرح عربی میں بھی اس کے مختلف مفہوم ہوتے ہیں۔ ان سب کی وضاحت کے لیے یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ پچھلی سورتوں میں اس کے بعض پہلو زبیر بحث آچکے ہیں اور بعض کے لیے آگے کی سورتوں میں موزوں مواقع آئیں گے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ استفہام کا ایک بلن موقع استعمال وہ بھی ہے جب مخاطب کسی ایسی بات کا اقرار کرنا ہو جس کی نوعیت ہو تو ایک بدیہی حقیقت کی لیکن مخاطب اس کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس سے منحرف ہو۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ کوئی ماں اپنے نافرمان بیٹے سے یوں کہے کہ کیا تجھے یاد نہیں کہ تو ایک مغموم گشت کی صورت میں میری گود میں ڈالا گیا تھا، میں نے اپنا خون دودھ بنا کر تجھ کو پلایا اور پاں پوس کر جوان کیا! اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ محض ایک سادہ خبر یہ جملہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سے معانی مضمین ہیں مثلاً، اس میں بیٹے کو ایک عظیم حق کی یاد دہانی ہے جو اس پر عائد ہوتا ہے اور جس سے اس کے لیے الکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کا رویہ اس کے منافی ہے۔

- اس میں ملامت، غصہ، رنج اور اظہارِ حسرت کے بھی گونا گوں پہلو ہیں۔
- اس میں نہایت مبنی بر حقیقت گلہ و شکوہ بھی ہے اور نہایت مؤثر اپیل بھی۔
- یہ سارے مفہوم اس آیت سے پیدا ہوتے ہیں جو اس جملہ کے اندر ہے۔ اگر اس کو الگ کر کے جملہ کو سادہ خبر یہ اسلوب میں کر دیجیے تو یہ تمام معانی ہوا ہو جائیں گے۔ بالکل یہی حال زبیر بحث آیت کا بھی ہے۔ اس میں جو 'هَلْ' ہے اس کے اندر بہت سے معانی مضمین ہیں جو آگے مضمون کے تدریجی ارتقا سے کھائیں گے۔ اگر اس کو آپ 'قَدْ' سے بدل دیں تو یہ آیت ان مطالب کی تمہید کے لیے بالکل ناموزوں ہو جائے گی جو آگے آرہے ہیں۔
- ملاقات کے ایک قصیدے کا مطلع ہے :

هل غاد الشواء من متروم ام هل عرفت الداد بعد توهم

کیا شاعروں نے شام، یومیہ کوئی خلا چھوڑ دیا تھا یا تجسس کے بعد تم نے منزل جاناں کا سراغ پایا ہے!!  
یہ ایک بہترین مطلع ہے اور اس کا سارا حسن اس کے خاص قسم کے استفہامیہ اسلوب میں مضمین ہے اگر اس 'هَلْ' کو 'قَدْ' سے بدل دیجیے تو یہ حسن بالکل غائب ہو جائے گا۔ شاعر خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے پوچھ رہا ہے کہ آج یہ قصیدہ کہنے کا



دلوں میں کیوں ابھرا ہے؟ کیا شاعری میں غلارہ گیا تھا جس کو آج بھر دینے کا ارادہ ہے یا منزلِ جانان کے آثار نے آتشِ عشق بھڑکا دی ہے جس کا حق ادا کرنا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ہیں۔ شاعری میں بھی ایک بہت بڑا غلارہ گیا تھا جس کو اس قصیدے سے پورا کرنا ہے اور منزلِ جانان کے سراغ کا مضمون بھی اب تک کے شاعروں کی ساری خوفناکیوں اور مضمون آفرینیوں کے باوجود پہنوز تشنہ ہی تھا، آج اس کا بھی حق ادا کر دینا ہے یہاں اس مطلع کے محاسن کی وضاحت مقصود نہیں ہے، دکھانا صرف یہ ہے کہ اسلوب اور اسلوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ باعتبار وزن تو یہ شعر لفظ 'قد' سے بھی پورا ہو جاتا لیکن معنی کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جاتی۔

آیت زیر بحث کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے۔ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے یہ سوال ان کے سامنے رکھا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب اس کا وجود کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا بلکہ وہ پانی، کیچڑ، مٹی کے اندر ریگنے والی ایک حقیر مخلوق تھا۔ لیکن اسی حقیر مخلوق کو قدرت نے مختلف مراحل سے گزرا اور اس کی صلاحیتوں کو تربیت دے کر ایسے مرتبہ پر پہنچا دیا کہ وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ و اشراف بن گیا! اس سوال سے مقصود انسان کی قوتِ فکر کو حرکت میں لانا ہے کہ وہ سوچے کہ آخر قدرت نے اس پر یہ اہتمام کیوں صرف فرمایا؟ اس کو ان اعلیٰ صلاحیتوں سے کیوں نوازا؟ کیا محض اس لیے کہ وہ کھائے پیے اور ایک دن ختم ہو جائے! کیا ان صلاحیتوں سے متعلق اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ کیا جس نے اس اہتمام سے اس کو وجود بخشا اس کا کوئی حق اس پر قائم نہیں ہوتا؟ یہ سوالات ہر اس شخص کے اندر پیدا ہونے چاہئیں جو اپنے وجود پر غور کرے۔

اپنا وجود انسان سے سب سے زیادہ قریب بھی ہے اور اس کی ہر چیز انسان کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ آیت کے استفہامیہ اسلوب نے اس کو فکر کو بیدار کرنا چاہا ہے کہ انسان کی نظروں سے خدا اور جہل ہے تو اس کا اپنا وجود تو ادھیل نہیں ہے وہ خود اپنے اندر خدا کی قدرت و حکمت اور اس کے عدل و رحمت کی نشانیاں دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ غور کرے تو یہ حقیقت بھی اس پر روشن ہو جائے گی کہ ہر چیز اس نے قیامت ابھی دیکھی نہیں لیکن خود اس کے نفس کے اندر قیامت کے شواہد اور اس کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ بالکل ہٹ دھرم اور کج رو نہ ہو۔

رَاٰنَا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَسْجَاجٍ ۖ ثُمَّ نَبْتَلِيْهِ ۖ فَجَعَلْنٰهُ سَبِيْعًا ۭ بَصِيْرًا (۲)

انسان کو تربیت  
عورت کی دعوت

اور پر کی آیت میں انسان کے اس تاریک ماضی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو زندگی کے نقطہ آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ اب یہ اس کی پیدائش کے ان مختلف اطوار کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کا ہر پیاد



اس کے سامنے ہے اور جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت اشارہ کر رہی ہے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے، اسی بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر قدرت اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ سننے سمجھنے اور عقل و ہوش رکھنے والے انسان کی شکل اختیار کر لیتی ہے، انسان غور کرے کہ جس خدا نے پانی کی ایک بوند پر اتنے عجیب کرشمے دکھائے ہیں کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا اور پھر اس مات پر بھی غور کرے کہ جس خدا نے علیم حکیم نے پانی کے ایک حقیر قطرے کو سمیع و بصیر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا اور اس کو خیر و شر اور شکر و کفر میں امتیاز بخشا، کیا اس نے یہ ایک کارِ عبث کیا ہے کہ وہ باز پرس اور جزا و سزا کا کوئی دن نہیں لائے گا۔

مِنْ تَطْفِئَةِ أَشْجٍ میں لفظ 'اشج' جمع ہے 'مشج' اور 'مشج' کی۔ اس کے معنی ملی جلی اور مخلوط چیز کے ہیں۔ 'اشج' اگرچہ جمع ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوصف مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آتے ہیں۔ لفظ کے مخلوط ہونے سے اس کا مختلف قوی و عناصر سے مرکب ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے اور مرد و عورت کے لفظوں کا امتزاج بھی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جہاں مختلف عناصر اور متضاد طبائع اور مزاجوں کا امتزاج ہو وہاں ان کے اندر ایسا اعتدال و توازن برقرار رکھتا کہ پیش نظر مقصد کے مطابق صالح نتیجہ برآمد ہو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ کام ایک حکیم و تدبیر کی نگرانی میں ہو۔ کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر اس طرح کے حکیمانہ کام کا وقوع ممکن نہیں ہے۔

'نَبْتَدِيهِ' کہ عام طور پر لوگوں نے بیان علت کے مفہوم میں لیا ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو آواز دینے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن یہ علت کے مفہوم میں ہوتا تو اس پر لام علت آنا تھا حالانکہ یہ حال کی صورت میں کام مفہوم ہے اور حال کا مفہوم علت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حال ہی کے مفہوم میں ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع و بصیر مخلوق کے درجے تک پہنچا دیا۔

'ابتداء' کے معنی لغت میں جانچنے پر کھنسنے کے ہیں۔ آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ اور ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر ایک طور سے گزار کر دوسرے طور میں لے جانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔ اصحاب تادیل میں سے بھی بعض لوگوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

انسان کی تخلیق جن اطوار و مراحل سے گزار کر مرتبہ تکمیل تک پہنچی ہے ان کی وضاحت قرآن میں

مختلف اہل

جگہ جگہ ہوئی ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ

اے لوگو! اگر تم مرنے کے بعد اٹھنے چاہتے ہو

میں شک میں ہو تو اس بات پر غور کرو کہ ہم

رَبِّبْنَا مِنَ الْبَعْثِ فَنَبِّئَا



نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر پانی کی ایک بوند سے  
پھر خون کی ایک پھٹکی سے پھر گوشت کی ایک بوٹی  
سے، کوئی تمام اور کوئی ناتمام، تاکہ ہم تم پر اپنی  
قدرت و حکمت اچھی طرح ظاہر کر دیں۔ پھر ہم جن  
میں ٹھہرتے ہیں جتنا چاہتے ہیں ایک مدت معین  
تک پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر  
ہم تم کو پروان چڑھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔

مَخْلَقَتُكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ  
نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ  
مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ  
مُخَلَّقَةٍ لَعَلَّيْنِ لَكُمْ ذِكْرٌ  
فِي الْأَرْحَامِ مَا أَنْتَ بِأَعْلَى  
أَجَلٍ مُسَمًّى تَعْرِضُكُمْ فِطْرًا  
لَعَلَّيْنِ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (الحج-۲۲: ۵)

انہی اطوار و مراحل کی تفصیل سورہ مومنوں میں یوں آئی ہے۔

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے  
پھر ہم نے اس کو رکھا پانی کی ایک بوند کی صورت  
میں ایک محفوظ ٹھکانے میں۔ پھر ہم نے پانی  
کی اس بوند کو خون کی پھٹکی کی شکل دی پھر  
خون کی پھٹکی کو مضغہ گوشت بنایا پھر گوشت  
میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ  
پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری  
مخلوق کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ پس بڑی  
ہی بابرکت ذات ہے اللہ، بہترین پیدا

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ  
سُلْطَةٍ مِنْ طِينٍ ۖ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ  
نُطْفَةً فِي تَوَارِمٍ مَكِينٍ ۖ ثُمَّ خَلَقْنَا  
النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ  
مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ  
عِظْمًا فَنَكَّسُوهُ الْعِظْمَ لَحْمًا  
ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ  
فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ  
الْمُخْلِقِينَ ۝

(المؤمنون-۲۳: ۱۲-۱۴)

کرنے والے کی یہ

ان آیات میں جن اطوار و مراحل کی تفصیل ہے انہی کی طرف بالا جمال آیت زیر بحث میں اشارہ  
فرمایا ہے اور انہی مراحل۔ شے درجہ بدرجہ گزارنے کے لیے لفظ تَبْتَدِيهِ آیا ہے جس سے یہ بات نکلی  
کہ اس قطرے کو گہر ہونے تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑے ہیں اور ہر مرحلہ میں قدرت نے اس کو اچھی  
طرح جانچا پرکھا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اس کے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا ہوگئی یا نہیں؟  
فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا یہ اس تمام اہتمام و تدبیر کا خلاصہ سامنے رکھا ہے کہ یا تو انسان پانی،  
مٹی، کیچڑ اور نطفہ کی شکل میں بالکل کُفْلٌ یَكُنْ شَيْئًا مَذْکُورًا قابل ذکر چیز کا مصداق تھا یا وہ  
دور یا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سمیع و بصیر کی اعلیٰ صفات سے متصف مہستی بنا دیا۔ سورہ مومنوں کی محو کہ بالآیت  
میں اسی چیز کی طرف تَعْرِضُكُمْ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ کے الفاظ سے اشارہ  
فرمایا ہے۔



‘سَمِيعٌ بَصِيرٌ’ انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ انہی صفات کے بغیر سے انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کا امتحان کرے کہ وہ خیر کی راہ اختیار کرے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا شر کی راہ اختیار کر کے ناشکر اور کافر نعمت بن جاتا ہے۔ پھر اس سے لازماً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو اپنے سمیع و بصیر کی صلاحیتوں کی قدر کریں وہ اس کا صلہ پائیں اور جو ان کی ناقدر بنیں وہ اس کی سزا اٹھائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس سارے اہتمام کا مقصد کیا جو انسان کی پیدائش کے لیے قدرت نے کیا!

سمیع و بصیر

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (۳)

کا اثر

یہ انسان کو سمیع و بصیر بنانے کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ پھر ہم نے اس کو راہ سجدی۔ راہ سمجھانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو نیکی اور بدی کی راہ سجدی، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البعد - ۹۰ : ۱۰) (اور ہم نے اس کو دونوں راہیں سجدی دیں) سورہ شمس میں فرمایا ہے: فَاتَّخِذْهُمَا ضُجُودًا وَتَفْقُوهَا (الشمس - ۹۱ : ۸) پس اس کو اس کی بدی اور پرہیزگاری الہام کر دی ان دونوں راہوں کے سمجھا دیے جانے کے سبب سے انسان خود اپنے اوپر خیر اور شر کا گواہ بن گیا اور اس کے پاس بدی کی راہ اختیار کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔ اس حقیقت کی طرف سابقہ سورہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ ذَٰلَ الْفَقْرُ مَعَاذَ يَوْمَ ۚ (القيمة - ۵ : ۴-۱۵) (بلکہ انسان اپنے اوپر خود گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اختیار کی

‘إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا’ یہ انسان کے اختیار و ارادہ کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نیکی و بدی کا امتیاز دے کر اس کو اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو نیکی کی راہ اختیار کرے، چاہے تو بدی کی راہ چلے۔ اگر نیکی کی راہ اختیار کرے گا تو وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنے گا اور اس کا انعام پائے گا اور اگر بدی کی راہ اپنائے گا تو وہ ناشکر بنے گا اور اس کی سزا اٹھائے گا۔

نعمت

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلًا وَأَغْلَلَٰ ذَسْعِيرًا (۴)

خیر اور شر میں

یہ خیر اور شر میں امتیاز بخشہ جانے کا لازمی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو شکر و کفر و نون کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت بخشی ہے تو ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں کو انعام سے نوازے جو شکر گزاری کی راہ اختیار کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو کفر کی راہ چلیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس صلاحیت کا دیا جانا لا حاصل رہا ورنہ انھیں اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کی شانِ حکمت سے یہ بعید ہے کہ وہ کوئی عیب کا کام کرے۔

اختیار کا لازمی

نتیجہ

کافروں کو

فرمایا کہ چونکہ ہم نے انسان کو شکر اور کفر کا امتیاز بخشا ہے اس وجہ سے ہمارے ہاں شکر اور کافر کافروں کو دوزخ کیساں نہیں ہوں گے بلکہ ہم ان کے ساتھ الگ الگ معاملہ کریں گے۔ ناشکر دل کے لیے ہم نے بنجیریں سزا



طوق اور بھر کئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ان کے پاؤں میں زنجیریں پہنائی جائیں گی، گردنوں میں آہنی طوق ڈالے جائیں گے اور پھر ان کو گھسیٹ کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَشَرِبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَتْ مِرَاجُهَا كَافُورًا ۖ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۵-۶)

شکر گزاروں کو انعام  
یہ کافروں کے مقابل میں شاکر بندوں کے صلہ کا بیان ہوا ہے اور ان کو ابرار سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ بُسْر کی اصل روح الیحدی عہد و ذمہ ہے اور لفظ 'شکر' کی اصل حیثیت نعمت کے خن کو پہچاننا اور اس کو ادا کرنا ہے۔ ان دونوں میں واضح قدر مشترک موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بوندے اس کی نعمتوں کا حق پہچانتے اور اس کو ادا کرتے ہیں وہی راصل اس کے دنا دار بندے ہیں۔

لفظ 'کَأْسٍ' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ ظرف اور منظور یعنی شراب اور جام شراب دونوں معنوں میں آتا ہے۔

'مِرَاجُ' کے معنی ملوئی کے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اوقات لذت، خوشبو یا ان کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے بعض چیزیں ان کے استعمال کے وقت ملائی جاتی ہیں۔ شراب میں بھی اس طرح کی ملوئیوں اور بعض دوسرے لوازم کا ذکر عرب شعرا کرتے ہیں۔ اہل جنت کی شراب میں یہ ملوئی چشمہ کافور کے آبِ زلال کی ہوگی۔

'كَافُورٌ' سے مراد یہاں معروف کافور نہیں ہے۔ قرآن نے خود وضاحت فرمادی ہے کہ یہ جنت کا ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر اللہ کے خاص بندے شراب نوش کریں گے اور اس چشمہ کے پانی کی ملوئی سے اس کے کیف و سرور کو دو چند کریں گے۔ رہا یہ سوال کہ اس کا نام کافور کیوں رکھا گیا ہے تو ناموں سے متعلق اس طرح کا سوال اگرچہ پیدا نہیں ہوتا تاہم ذہن اس طرف جاتا ضرور ہے کہ اسم اور شئی میں کوئی مناسبت ہوگی۔ یہ مناسبت کس نوع کی ہے؟ اس کا تعلق مناسبات سے ہے۔ اس کی اصل حقیقت اس دن اور انھیں خاص بندوں پر کھلے گی جن کو اس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوگی۔

بِجُوشِ  
بے نوشی کا  
اہتمام  
'لَشْرَبُ بِهَا' میں 'ب' میرے نزدیک ظنیہ ہے جس طرح 'يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ' اور 'يُخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ' میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چشمہ اللہ کے خاص بندوں کی بزمِ نوشی کے لیے مخصوص ہوگا۔ عباد اللہ سے مراد وہی ابراہیم جن کا ذکر اوپر ہوا۔ انہی کو یہ خاص شرف حاصل ہوگا کہ ان کی بے نوشی کے لیے اللہ تعالیٰ ایک مخصوص چشمہ کا بھی اہتمام فرمائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بے نوشی اور لبِ جو میں بڑی مناسبت ہے۔



”يُفَعِّرُونَهَا تَفْعِيرًا“ تَفْعِيرُ کے معنی کسی چشمہ کی بہت سی شاخیں نکال نکال کر ان کے جال بچھا دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس چشمہ پر پہنچنے کے لیے اہل جنت کو کوئی شدید حال نہیں کرنا پڑے گا بلکہ جو جہاں چاہے گا اس کی شاخیں نکال لے گا اور اس کی لذتوں اور اس کی سیر سے بغیر کسی زحمت سفر کے خوش وقت اور شاد کلام ہوگا۔

يُؤْفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (۷)

یہ ان کے وہ اوصاف و اعمال بیان ہو رہے ہیں جن کے سبب سے ان کو رب کریم کی طرف سے یہ سرفرازی بخش جائے گی۔

کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لینے کو نذر کہتے ہیں۔ ان دن دار بندوں (ابرار) کے اوصاف میں ان کو یہ ہیں ایسا نذر کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان نذروں کے پورے کرنے کا بھی اہتمام رکھیں گے جو انھوں نے بطور خود اپنے ادب و واجب کی ہوں ان سے ان نیکیوں کے بدرجہ اولیٰ اہتمام ہوگی کی توقع ہے جو ان کے رب نے ان پر واجب ٹھہرائی ہیں۔ ہمارے مفسرین نے اس لفظ کے مفہوم کو وسیع کر کے تمام نیکیوں پر حاوی کر دیا ہے، خواہ بندے نے اپنے ادب پر وہ نذر عائد کی ہوں یا اللہ تعالیٰ کی طرف عائد کی گئی ہوں۔ لیکن یہ اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے تجاوز ہے۔

یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ نذر کی اہمیت سابق ادبیاں میں بھی بہت رہی ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا بڑا اہتمام تھا۔ جو لوگ کوئی نیک کام کرنا چاہتے، خواہ وہ حج و عمرہ کے قسم کی ہو یا قرآنی پہلے نذر کی اتفاق کے نوع کی، وہ اس کی نذر مانتے اور اہتمام سے اپنی نذر پوری کرتے۔ عربوں کے نذر اس اہمیت کی وجہ زیادہ تر ان کی امتیت تھی۔ دین کے طریقے ان کو واضح طور پر معلوم نہیں تھے اس وجہ سے ان کے اندر کے نیک لوگ نذروں کے ذریعہ سے اس خلا کو بھرتے۔ اسلام کے آجانے کے بعد جب شریعت کے تمام اصول و فروع لوگوں کو معلوم ہو گئے تو اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ وہ نذریں جو مشرکانہ نوعیت کی تھیں وہ تو بالکل ہی ختم کر دی گئیں۔ جو نذریں تکلیف مالا یطاق نوعیت کی تھیں وہ بھی یا تو ممنوع قرار پائیں یا ان کی اصلاح کر دی گئی۔ یہ سوره چونکہ اس دور کی ہے جب شریعت کے احکام و آداب لوگوں کو تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے اس میں اس کا ذکر خاص اہمیت سے ہوا۔ بعد میں جب شریعت کا پورا ایشاق نازل ہو گیا تو اس کا دائرہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہایت محدود ہو گیا۔

”وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا“ کے معنی عام اور ہمہ گیر کے ہیں۔ یہ ان کے اندیشہ آخرت کا بیان ہے کہ وہ ہمیشہ اس دن کی پکڑ سے ڈرتے رہے ہیں جس کی آفت عام دہمہ گیر ہوگی۔ یعنی اس دن بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، راعی اور رعایا یہاں تک کہ عابد اور معبود سب کو اس کے



ہوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مَشَكِيئًا وَبِئْسَ مَا وُاسِيًا (۸)

غریبوں کی خدمت  
یہ خلق کے ساتھ ان کے رویہ کا بیان ہے کہ وہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی ضرورتیں، خود اپنی ضرورتیں نظر انداز کر کے پوری کرتے ہیں۔ لفظ اطعام محمد و معنی میں نہیں ہے۔ زندگی کی دوسری ناکرہ ضروریات کا اہتمام بھی اس میں شامل ہے۔ قرآن میں یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

’عَلَىٰ حُبِّهِ‘ میں ضمیر کا مرجع عام طور پر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ وہ مسکینوں اور یتیموں کو اللہ کی محبت میں کھلاتے پہناتے ہیں۔ اگرچہ قاعدہ زبان کی رو سے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن شواہد قرآن کے پہلو سے میں ان لوگوں کے قول کو ترجیح دیتا ہوں جو اس کا مرجع طعام کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی ضرورت پر مسکینوں اور یتیموں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس قول کو ترجیح دینے کے مختلف وجوہ ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ابرار کا کردار بیان ہو رہا ہے اور ’یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ کرے جو اس کو خود عزیز ہو۔ خواہ اس وجہ سے عزیز ہو کہ وہ بذات خود قیمتی ہے یا اس وجہ سے کہ وہ اس کا ضرورت مند ہے چنانچہ فرمایا ہے: ’لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ‘ (الاعسان - ۳: ۹۲) (تم اللہ کی وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ یہی حقیقت دوسرے لفظوں میں یوں واضح فرمائی گئی ہے: ’وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ‘ (الحشر - ۵: ۹) (اور وہ اپنے اوپر غریبوں اور مسکینوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں)۔

• دوسری وجہ یہ ہے کہ ان ابرار کا صلہ آگے آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ بیان ہوا ہے: ’وَجَزَاءُ سَيِّئَاتِهِمْ فِيهَا صَبْرٌ وَاجِدٌ وَجَدٌ‘ (اولیٰ ان کو اللہ نے ان کے صبر کے صلہ میں جنت اور حیرت سے نوازا۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی واحد چیز یہی ہے کہ وہ یتیموں اور مسکینوں کو خود ضرورت مند ہونے کے باوجود کھلاتے پہناتے رہے ہیں۔ اگر ’عَلَىٰ حُبِّهِ‘ کی تاویل اس سے مختلف کر دی جائے تو یہاں ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی حالانکہ کلام اس کا مقتضی ہے۔ اس وضاحت نے ’عَلَىٰ حُبِّهِ‘ کے ضمیر کا مرجع خود متعین کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جو اتفاق عزیز و مطلوب مال میں سے، خود اپنی ضرورت کو قربان کر کے ہوتا ہے، درحقیقت وہی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے خدا کی محبت کا مضمون خود اس کے



اند ر پیدا ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں مسکین و یتیم کے ساتھ اسیر کا ذکر زمانہ نزول کے حالات کے اعتبار سے ہوا ہے۔ اس زمانہ میں کسی جرم یا مطالبہ میں گرفتار قیدی عموماً اپنی مایحتاج لوگوں سے سوال کر کے پوری کرتے تھے۔ قاضی ابویوسف کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں کے زمانے تک یہی حال رہا ہے اب جیل کے نظام میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اس وجہ سے اس اتفاق کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی لیکن اب بھی قیدیوں اور ان کے متعلقین کی امداد کی ایسی بہت سی صورتیں ہیں جن میں اتفاق اسی حکم میں ہوگا۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا وَرَأَيْنَا تَحَافُتًا

ذِينَ يَوْمًا عَبَّوْا قُمَطِيرًا (۹-۱۰)

یہ ان کے اس اتفاق کے باطنی محرک کا بیان ہے کہ وہ جس کی مدد کرتے ہیں نہ اس سے اپنے اس اتفاق کا کوئی معاوضہ چاہتے نہ اس بات کے خواہشمند ہوتے کہ وہ ان کا ممنون احسان اور شکر گزار ہو بلکہ وہ صرف اپنے رب کی رضا جوئی اور آخرت کے خوف سے ایسا کرتے تھے۔

یوم آخرت کی صفت یہاں 'عَبَّوْا' اور 'قُمَطِيرًا' کے معنی ترش روا اور دکھے پھینکے کے ہیں۔ قُمَطِيرًا اسی مضمون کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید آیا ہے یعنی وہ دن ایسا کھڑا، اکل کھرا اور ترش مزاج ہوگا کہ اس میں کوئی بچہ کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن سابقہ ہر ایک کو اپنے اعمال سے پیش آنے گا۔ خدا کی رحمت صرف انہی لوگوں کی طرف متوجہ ہوگی جنہوں نے اس کی رضا جوئی میں مسکینوں اور یتیموں کی سرپرستی اور ہمدردی کی ہوگی اور اپنی ضروریات نظر انداز کر کے ان کی احتیاج پوری کرنے پر اپنا مال صرف کیا ہوگا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ بات وہ تو لا ہر اس شخص سے کہیں بھی جس کی مدد کریں بلکہ یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان کے اتفاق کے باطنی محرک کی تعبیر ہے کہ وہ جن عاجز مندوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں صرف للہ و فی اللہ خرچ کرتے، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخرت کے خوف کے سوا کوئی اور غرض ان کے سامنے نہیں ہوتی۔

فَوَقَّعَهُمُ اللَّهُ شُرَازِدًا الْيَوْمِ وَلَقَّعَهُمْ نُصْرَةً وَسُودًا (۱۱)

یہ ان کا صلہ بیان ہوا کہ چونکہ وہ اس 'عَبَّوْا' اور 'قُمَطِيرًا' دن سے اندیشہ ناک رہے اور اس کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنا محبوب مال انھوں نے خرچ کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو اس کی آفتوں سے محفوظ رکھے گا اور اس دن جب سب کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے ان کے چہرے ہشاش بشاش اور مسرور ہوں گے۔

وَجَزَّاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا (۱۲)



میر کی منت  
کا مد  
اور چونکہ انھوں نے صبر کیا اس وجہ سے ان کو جنت اور حویر کا صلہ عطا ہوگا۔ 'بِمَا صَبَرُوا'  
سے اشارہ ان کے اس میر کی طرف ہے جس کا ذکر اور پُر وِطْ مِوْنِ الطَّعَامِ عَلٰی حَبِثِکَ الفاظ سے ہوا ہے۔  
خود بھوکے ہوتے ہوئے اپنے آگے کی رکابی دوسرے بھوکے کے آگے وہی سر کاٹے گا جس کے اندر  
میر کی صفت ہوگی۔

'جنت' ان کو اس لیے ملے گی کہ اس کے پھل کھائیں اور اس کے عیش دوام سے بہرہ مند ہوں  
اور حویر اس لیے کہ اس کے لباس پہنیں۔ مکان، غذا اور لباس تینوں چیزیں اس کے اندر آئیں۔  
مُنْکِبِیْنَ فِیْہَا عَلٰی الْاَرَآئِکَ لَا یَبْذُوْنَ فِیْہَا شَتْمًا وَلَا ذُمًّا یُبْرَا (۱۳)

'سورج' اور ذُمُّ یُبْرَا نہ دیکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے  
بالکل محفوظ جنت کے تختوں پر براجمان ہوں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہوگی مگر  
اس میں حدت و تمازت نہ ہوگی۔ اسی طرح وہاں کا موسم ہمیشہ خوش گوار، معتدل اور پرہیزگار رہے گا،  
خزاں کی نحوست اور بادِ مہر کے آزار سے ان کو کبھی سابقہ نہیں پیش آئے گا۔  
وَدَانِیَّةٌ عَلَیْہُمْ ظِلُّلُہَا وَذَلَّتْ قُطُوفُہَا تَذِلُّ لَآ (۱۴)

یعنی ان کے باغوں کے سائے بالکل ان کے سردوں پر پھیلے ہوئے ہوں گے اور پھلوں کے  
خوشے اس طرح نکل رہے ہوں گے کہ بالکل ان کی دسترس کے اندر ہوں گے۔ کسی چیز کے حاصل  
کرنے کے لیے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑے گی۔  
وَلِطَافٌ عَلَیْہُمْ بِاَنِیَّةٍ مِّنْ فَضْلَةٍ ذَاکُوَابٍ کَانَتْ قَوَارِیْرًا  
مِّنْ فِغْفَہٖ قَدَّارُوہَا تَقْدِیْرًا (۱۵-۱۶)

یعنی ان کے سامنے ہر وقت چاندی کے ظروف اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے  
اور یہ شیشے بھی دیکھنے میں شیشہ ہوگا، حقیقت میں یہ بھی چاندی ہی کے جوہر سے بنا ہوگا۔  
قَدَّارُوہَا تَقْدِیْرًا یعنی یہ ظروف اور پیالے مختلف شکلوں، مختلف پیمانوں اور رنگ  
الگ اندازوں کے بنے ہوں گے اور خدا نے ان کو نہایت قرینہ اور حسنِ سلیقہ سے الگ الگ خانوں  
میں سجاکر رکھا ہوگا تاکہ حالات، وقت، ضرورت اور مطلوبِ شے کی مناسبت سے جس قسم کے سیٹ  
کی ضرورت ہو، پیش کر سکیں۔ لفظ تقدیر ان تمام معانی پر حاوی ہے۔ اردو میں مجھے کوئی لفظ ایسا  
نہ مل سکا جو ان تمام کا احاطہ کر سکے۔

وَلِیَقْوُنَّ فِیْہَا کَأَسَاکَانَ مِّنْ اَجْہَازٍ مُّجَبَّلَہٗ عِیْنًا فِیْہَا تُسَبِّحُ سَلْسَبِیْلًا (۱۷-۱۸)  
اور چشمہ کا نور کا ذکر ہوا۔ یہ ایک دوسرے چشمہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ایک اور شہاب  
بھی ان کو پلائی جائے گی جس میں چشمہ زنجبیل کی ملوثی ہوگی۔ یہ بھی جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ  
زنجبیل اور  
سلسبیل



ہے جس کا دوسرا نام سلسبیل ہے۔ ناموں سے متعلق ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ ان میں لغوی مفہوم کا اعتبار نہیں ہوتا۔ ذنب بیل کے مشور معنی تو سونٹھ کے ہیں لیکن نام بادیٰ مناسبت بھی رکھے جاتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کی لفظی ہی چیزوں کے نام قرآن میں مذکور ہیں لیکن ان ناموں سے ان کے مستحق حقیقت کا صحیح علم ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ناموں سے آگاہ کر دیا۔ ان شاء اللہ ایک دن ان کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ اس چشمہ کا دوسرا نام سلسبیل ہے۔ زجاج کے نزدیک اس کے معنی رواں دواں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی محض اس کی روانی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے جو اس کے گونا گوں اوصاف میں سے صرف ایک ہے۔

وَيُطَوِّفُ عَلَيْهِمْ وَلَدَانِ مَخْلُودُونَ جَاذَارَاتُهُمْ حَبِيبَتُهُمْ لَوْلَا مَثُورًا (۱۹)

یہ ان کی خدمت اور ان کے آگے جام پیش کرنے والے غلمان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا غلمان اور ان کے اوصاف کہ یہ غلمان ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے۔ مَثُور کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس وصف کے ذکر سے مقصود دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ایک اس بات کی طرف کہ نوخیز چھوکرے ہوں گے اس وجہ سے خدمت میں نہایت چاک و چوبند، چست اور سرگرم ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے جس سے ان کی مستعدی بھی برابر قائم رہے گی اور اپنے مخدوموں کی خدمت میں برابر رہنے کے سبب سے ان کے مزاج، عادت اور ذوق سے بھی اچھی طرح آشنا ہوں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حسن خدمت میں تجربہ کو بڑا دخل ہے۔ بوڑھے خادم میں تجربہ ہوتا ہے لیکن اس کی مستعدی ختم ہو جاتی ہے۔ نئے خادم میں مستعدی ہو سکتی ہے لیکن تجربہ اور ذوق سے نا آشنائی کے سبب سے آنا کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اہل جنت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے خادم مہیا کیے ہیں جن کی ہر خوبی دائمی ہوگی۔

جَاذَارَاتُهُمْ حَبِيبَتُهُمْ لَوْلَا مَثُورًا۔ یہ ان کے جمال، ان کی لطافت، ان کی خوش ادائی اور ان کی خوش لباسی کی تصویر ہے کہ جب تم ان کو دیکھو گے تو یہ گمان کرو گے کہ گویا ہر طرف موتی بکھرے ہوئے ہیں۔

وَاِذَا رَاٰتِ شَعْرًا وَاٰتِ نَعِيْمًا وَّمَلَكًا كَبِيْرًا (۲۰)

یعنی جب دیکھو گے اور جہاں دیکھو گے وہیں ایک عظیم نعمت اور ایک عظیم بادشاہی کا جلوہ نظر آئے گا۔ گویا ہر قدم پر ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٌ خُضْرٌ رَّاسِبٌ زَوْجُهُمْ اَسَاوِدٌ مِنْ فِضَّةٍ

وَسَقَمُهُمْ دَبْهُمُ شَرَابًا طَهُوْرًا (۲۱)



’عَالِی‘ میرے نزدیک حال کے محل میں ہے اور مراد اس سے اہل جنت کے بالائی کپڑے —  
عباد اور قبا وغیرہ — ہیں۔

اہل جنت کا  
لباس

ان کے بالائی جامے سبز سندس اور استبرق کے ہوں گے۔ سندس اور استبرق ایران کے بنے ہوئے مشہور ریشمی کپڑوں کے نام تھے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں کے درمیان باریک اور دبیر کا فرق کیا ہے لیکن یہ تحقیق غیر ضروری ہے۔ یہاں مراد جنت کے سندس اور استبرق ہیں جن کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اہل عرب، ایران اور مصر ہی کے تمدن سے اس زمانہ میں زیادہ آشنائے اس وجہ سے جنت کی نعمتوں کی تمثیل کے لیے زیادہ تر انہی کی تمدنی چیزوں کے نام مستعار لیے گئے۔ اس دور کے سلاطین سندس اور استبرق کی عبا تیں زیب تن کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن کے اوپر کے جامے سندس اور استبرق کے ہوں گے ان کے زیریں جامے اور بھی نرم و نازک ہوں گے۔ یہاں اہل جنت کے بالائی لباس کا تصور دے کر بات ختم کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے قیاس کر لو کہ آوردہ کیا کچھ پہنیں گے۔

’وَجَلُواْ اَسَادِرَ مِنْ خِصْفَةٍ‘ اس زمانے کے سلاطین سونے اور چاندی کے کنگن بھی پہنتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو چاندی کے کنگن بھی پہنائے جائیں گے۔ یہاں چاندی کے کنگنوں کا ذکر ہے۔ سورۃ کہف میں سونے کے کنگنوں کا ذکر ہے: ’يَحْلُوْنَ فِيْهَا اَسَادِرٌ مِنْ ذَّهَبٍ يَّغْلِبُ سَوْنَ ثِيَابًا‘ (۳۱)۔ (وہ اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سندس کے سبز لباس)۔ بعینہ یہی بات سورہ حج آیت ۲۳ اور سورہ فاطر آیت ۳۳ میں فرمائی گئی ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تنوع کے اظہار کے لیے ہے کہ اہل جنت جب چاہیں گے سونے کے کنگن پہنیں گے اور جن کا جی چاہے گا چاندی کے پہنیں گے۔ تنوع پسندی اور اختلاف مذاق ایک فطری چیز ہے جنت میں ہر شخص کے ذوق اور اس کے انتخاب کا پورا لحاظ ہوگا۔ ’لَهُمْ مَّا يَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ‘ (۵۰: ۳۵) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین نے عام طور پر یہی توجیہ کی ہے لیکن میرا ذہن ایک اور طرف بھی جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اہل جنت کے مراتب میں، جیسا کہ سورہ واقعہ میں تفصیل سے آپ پڑھ چکے ہیں، فرق ہوگا۔ ایک گروہ سابقون اولون اور مقربین کا ہوگا۔ دوسرا طبقہ اصحابِ یمن کا۔ ان دونوں طبقوں کی جنتوں اور نعمتوں میں فرق ایک قدرتی امر ہے۔ قرآن کے اس فرق کو واضح بھی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس فرق کی بنا پر قرآن نے کہیں سونے کا ذکر کیا اور کہیں چاندی کا۔

’وَسَقْمُهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا‘ اس ٹکڑے میں بھی ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ اوپر آیت ۵ میں ارشاد ہے: ’اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا‘ واللہ کے وفادار

ایک خاص

نکتہ



بندے ایک ایسی شراب میں سے پئیں گے جس میں چشمہ کا نور کی ملوثی ہوگی) اس کے بعد آیت، میں فرمایا: وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِنْهَا زُجْجِيلًا (اور وہ اس میں ایک ایسا جام پلائے جائیں گے جس میں چشمہ زنجبیل کی ملوثی ہوگی) اور یہاں ارشاد ہوا کہ وَسَقَّوْهُمْ رَبُّهُمْ شَدِيدًا بِالْهُوْرَاءِ (اور ان کا پروردگار ان کو ایک شراب طہور پلائے گا) عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے اس فرق کو سمجھ سکتے ہیں جو ان تینوں اسلوبوں — يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ، يَسْقَوْنَ كَأْسًا، سَقَّوْهُمْ رَبُّهُمْ — میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فرق کیوں ہے؟ میرے نزدیک یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ یہ ابراہیم و رجبہ بدرجہ قرب الہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں گے کہ خود رب کریم ان کو شراب طہور کا جام پلائے گا! یہ شراب طہور کیا ہے؟ اس کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جاسکتا اس وجہ سے اس کے لیے قرآن نے کوئی اس طرح کا تمثیلی اسلوب اختیار نہیں کیا جس طرح کا اسلوب اوپر چشمہ کا نور اور چشمہ زنجبیل کے لیے اختیار فرمایا۔ اس کو صرف رب کریم ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ اس مشک بو، مہر بند شراب خالص کی طرف اشارہ ہے جو مقررین کے لیے خاص ہے اور جس کا ذکر سورہ مطففین میں نہایت اہتمام سے

میں الفاظ ہوا ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ دَحِيقِ مَخْلُومٍ ۝	اور وہ مہر بند شراب خالص کے جام پلائے
خِشْمُهُ مُسْكٌ ۝ وَفِي ذَلِكَ	جائیں گے۔ اس کی مہر مشک کی ہوگی اور یہ
فَلَيْتَنَّا نَسِي الْمُنْتَفِسُونَ ۝	ہے ایسی چیز کہ اس کی طلب میں طالبین
وَمِنْ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّهِ ۝	یا ہم دیگر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے
عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا	کی کوشش کریں اور اس میں ملوثی چشمہ تسنیم
الْمُقَرَّبُونَ ۝	کی ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس پر مقررین خاص

(المطففین - ۸۶ : ۲۵ - ۲۸) مے نوشی کریں گے۔

إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا (۲۲)

یعنی یہ سب کچھ پاکر پروردگار کی طرف سے ان کو یہ داد بھی ملے گی کہ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہے، اللہ کے نزدیک تمہاری سعی مقبول ٹھہری! اس کے لیے تمہیں کسی دوسرے کی سعی و سفارح کا ممنون احسان نہیں ہونا پڑا۔ اس میں ان لوگوں پر ایک تعریف بھی ہے جو اپنے موعومہ دیوتاؤں کی سفارشوں کے بل پر جزا اور سزا سے غافل رہے حالانکہ وقت پر ان میں سے کوئی بھی ان کے کام نہ آئے گا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ۝ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطْعَمْ







یہاں مشکوکہ کے مذکورہ جثیت سے لفظ اِثْمُ آیا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔  
 یہ لفظ حقوق تلف کرنے والے کے لیے آتا ہے۔ حقوق دو طرح کے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔  
 حقوق العباد تلف کرنے والوں کے لیے معروف لفظ اِثْمُ ہے اور حقوق اللہ نہ ادا کرنے والے کے لیے معروف  
 کفور ہے۔ اگرچہ یہ دونوں صفتیں لازم ملزوم سی ہیں، جو حقوق العباد کا منکر ہو گا وہ حقوق اللہ ادا کرنے والا بھی نہیں  
 بن سکتا، تاہم اشخاص کے رجحانات و میلانات کے اعتبار سے یہ بیماری ان کے اندر ذرا مختلف شکلوں میں نمایاں  
 ہوتی ہے۔ بعض کے اندر خست، بنیاست اور طبع مال و مساوت قلب پیدا کر دیتی ہے جو ان کو نیکی کا دشمن بنا دیتی  
 ہے۔ بعض کے اندر انانیت، خود پرستی اور استکبار پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔ قریش  
 کے اندر ان دونوں کرداروں کے نمونہ علی الترتیب الاولیٰ اور ابو جہل تھے۔ ان دونوں طرح کے کرداروں کو  
 سامنے رکھ کر یہاں وَلَا تُطِيعْهُمْ اِثْمًا اَوْ كُفْرًا کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے اس حقیقت  
 کی طرف کہ تمھارے مخالفوں میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ یا تو وہ طبع دنیا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اس وجہ  
 سے تمھارے دشمن ہیں یا ان کے سروں پر انانیت کا بھرت سوار ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دے  
 رہا ہے اور یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی باتوں کو کوئی اہمیت دی جائے۔ ان کا  
 مرض لا علاج ہے۔

وَإِذْ كُنَّا نَسْمُو رَبَّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۖ وَمِنَ الْيَتَامَىٰ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ اللَّهِ وَاسْبِغْ لَهُ لَبَدًا طَوِيلًا (۲۵-۲۶)

اور جس صبر کی تلقین فرمائی ہے یہ اس کا نسخہ بتایا ہے کہ صبح و شام اپنے رب کے نام کو یاد رکھو۔ صبر کا نسخہ  
 صبح و شام احاطہ وقت کے مفہوم میں بھی برے جاتے ہیں اور لفظ ذکر یہاں عام ہے جو نماز اور ذکر و دام و دلو  
 پر شامل ہے۔ وَاسْبِغْ لَهُ لَبَدًا طَوِيلًا کے الفاظ سے تہجد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل پچھلی سورتوں  
 میں گزر چکی ہے۔ خاص طور پر سورہ نزل کی تفسیر میں اس کے تمام اطراف زیر بحث آئے ہیں۔

إِنَّ هَؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا (۲۷)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے آپ کے مخالفین کی اصل بیماری کا پتہ دیا ہے کہ یہ لوگ تمھارے  
 انداز پر جو شبہات اُٹا کر رہے ہیں محض اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کی سخن سازی ہے۔ ان کی  
 اصل بیماری یہ ہے کہ اس دنیا کی لذتِ عاجل کے پرستار ہیں۔ آخرت کی خاطر وہ اس نقد کو چھوڑنے کا حوصلہ  
 نہیں رکھتے، خواہ آخرت کا دن کتنا ہی کھٹن کیوں نہ ہو اپنی اس دنیا پرستی کو چھپانے رکھنے کے لیے وہ  
 قیامت پر بعض بناوٹی قسم کے شبہات کا اظہار کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ تاثر دے سکیں کہ یہ لوگ غلطی بات  
 جو نہیں مان رہے ہیں تو اس کا سبب محض ضد اور انانیت نہیں بلکہ اس کے کچھ وجوہ ہیں۔

نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذْ آسَيْنَا بَدَلًا لَّهُمْ تَبْدِيلًا (۲۸)

یہ ان مخالفین کے لیے دھمکی بھی ہے اور اس میں قیامت پر ان کے سب سے بڑے شبہ کا جواب بھی ہے۔



ان کا سب سے بڑا شبہ، جو قرآن میں بار بار نقل ہوا ہے، یہی تھا کہ مرنے اور مٹی میں زلزل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائیں! فرمایا کہ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم نے ہی ان کے جوڑ بند اور رگ پٹھے مضبوط کیے تو جب ہم ہی نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس سے وہ انکار نہیں کر سکتے تو ہم جب چاہیں گے پھر ان کے رگ پٹھے اذ سر نو مضبوط کر کے ان کو اٹھا کھڑا کریں گے۔ جب پہلی بار ہم کو اس کام میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوسری کام ہمارے لیے دوبارہ کیوں مشکل ہو جائے گا۔

’مَشَدَّاسْرًا‘ کے معنی ہڈیوں اور اعصاب کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جوڑنے کے ہیں۔ ’بَدَلْنَا مَثَلَهُمْ‘ میں جس مثلیت کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد یہی جوڑ بنداز سر نو درست کرنے میں مثلیت ہے۔

إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمِنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (۲۹)

یہ ان لوگوں سے اظہارِ بے نیازی ہے کہ یہ آگاہی جو سنائی جا رہی ہے محض ان لوگوں کی خیر خواہی کے لیے سنائی جا رہی ہے۔ اس میں نہ اللہ کا کوئی نفع ہے اور نہ رسول کی کوئی ذاتی غرض اس میں مضمر ہے۔ جس کا جی چاہے اس کو قبول کر کے اپنے رب کی راہ اختیار کرے ورنہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ کتاب آگاہ کر رہی ہے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۖ يَذْخُلُ مَنْ يَشَاءُ فِي دَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۳۰-۳۱)

یہ اس سنتِ الہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے توفیقِ ایمان کے باب میں مقرر کر رکھی ہے اور جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کلام اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع و بصر سے کام لیتے اور خیر و شر، حق و باطل کے درمیان امتیاز کی اس صلاحیت کی تدرک کرتے ہیں جو اس نے ان کے اندر دلالت فرمائی ہے اور جس کی طرف آیات ۳-۴ میں اشارہ فرمایا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنی یہ صلاحیتیں ضائع کر کے اندھے بہرے بن جاتے ہیں تو ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے لیے خدا نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور اس جہنم میں وہ اس وجہ سے پڑیں گے کہ انھوں نے اپنے اوپر خود ظلم کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنایا۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد لله على احسانه۔

رحمان آباد

۱۳ فروری ۱۳۹۹ھ

۱۵۔ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ



تذکرہ

۷۷

المُرسلت







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اپنے عمود، تمہید اور طرز استدلال کے اعتبار سے چھٹے گروپ کی سورہ ذاریات سے اور اپنے اسلوب بیان اور مزاج میں سورہ رحمان سے مشابہ ہے۔ سورہ ذاریات میں، بطریق قسم، ہواؤں کے عجائب تصرفات سے عذاب اور قیامت پر استدلال کیا گیا ہے اور عمود اس کا اَنَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ذَاتُ الْبَيِّنَاتِ لَوَاقِعٌ ہے۔ اسی طرح اس سورہ میں بھی ہواؤں کے عجائب تصرفات کی بطور شہادت قسم کھا کر فرمایا ہے کہ اَنَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (بے شک جس چیز کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ ایک امر شدنی ہے)۔

مزاج اور اسلوب کلام میں سورہ رحمان سے اس کی مشابہت یوں ہے کہ جس طرح وہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے، آیت فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ اس میں بار بار آئی ہے، اسی طرح اس سورہ میں آیت دَلِيلٌ يُّؤْمِنُ يَلْمِزُكَ يَتْلُو آيَاتِیْ دس بار آئی ہے۔ ترجیع والی سورتوں کے باب میں، یہ اصولی حقیقت سورہ رحمان کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان میں خطاب بالعموم ان ضدی اور مہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو ایک واضح حقیقت کو محض کابریت اور انانیت کی بنا پر، جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں ایسے لوگوں کے کان اور آنکھیں کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ متکلم صرف اپنے دلائل بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر دلیل کے بعد بطور تنبیہ ان کے جرم اور انجام سے ان کو آگاہ بھی کرتا رہے۔ مخاطب کے اس مزاج کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو جس طرح مریض کے مزاج سے ناواقف معالج کی دوا بے اثر رہ جاتی ہے اسی طرح مخاطب کے مزاج سے نا آشنا متکلم کا کلام بھی بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔ مخاطبوں کے مزاج کا اختلاف ایک امر فطری ہے اس وجہ سے اس کا لحاظ بلاغت کلام کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اس نکتہ سے نا آشنا ہیں وہ قرآن کی اس نوع کی ترجیعات کو تکرار پر محمول کرتے ہیں حالانکہ کلام کے

۱۔ جس عذاب کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ سچی ہے اور جزاء و سزا ایک امر شدنی ہے۔

۲۔ تب ہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔



اداسناس جانتے ہیں کہ قرآن میں ہر ترجیع اپنے محل میں انگشتی پر نگینہ کا حسن رکھتی ہے۔  
 سابق سورہ سے اس کے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں استدلال کی اصل بنیاد نفس انسانی  
 کی شہادت پر ہے۔ فطرت کے اندر خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو صلاحیت و ولایت ہے اس کی اساس  
 پر جزاء و سزا کو ثابت کر کے ایک روز جزا سے ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اس بدیہی حقیقت کو  
 جھٹلائیں اور ان لوگوں کو بشارت دی گئی ہے جو اپنے باطن کی گواہی قبول کریں اور اپنی زندگیاں  
 اس کے تقاضوں کے مطابق سنواریں۔ اس سورہ میں اصل استدلال آفاق کے آثار و شواہد سے ہے۔  
 کسی نفسی دلیل کا حوالہ ہے تو محض اشارۃً۔ گویا نوعیت استدلال دونوں میں الگ الگ ہے، موضوع  
 کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ مزاج میں یہ فرق بالکل واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ  
 سابق میں بشارت کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں انداز کا۔ اس کی سب سے بڑی شہادت اس کی  
 ترجیع سے ملتی ہے۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۷-۱) ہواؤں کے عجائب تصرفات کی شہادت اس بات پر کہ لوگوں کو جس عذاب دنیا  
 اور عذاب آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کوئی آن ہونی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب چاہا  
 اپنی ہواؤں اور بادلوں ہی کے ذریعہ سے پھٹی قوموں کو یہ کرشمہ دکھایا ہے اور جب چاہے گا قریش  
 کو بھی یہ کرشمہ دکھا دے گا۔ اگر وہ سلامتی چاہتے ہیں تو خدا کی رحمت اور نعمت کے جو آثار ان کے  
 آگے پیچھے موجود ہیں ان سے سبق حاصل کریں۔ خود اپنے لیے اس کو دعوت دینے کی جرات  
 نہ کریں۔

(۸-۱۵) ہول قیامت کی اجمالی تصویر جس میں یہ دکھایا ہے کہ اس آسمان و زمین کی بڑی سے  
 بڑی چیز بھی غیر فانی اور اٹل نہ سمجھو، نہ کوئی شے بذات خود قائم ہے نہ خود مختار ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے  
 حکم سے قائم اور اسی کے اذن سے حرکت و عمل کرتی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اللہ تعالیٰ آسمان و  
 زمین کے سارے نظام کو درہم برہم کر دے گا۔ اسی دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمے کی رو بکاری  
 ہے۔ یہ دن بڑا ہی اہم دن ہوگا۔ اسی دن فیصلہ ہوگا کہ رسولوں نے لوگوں کو کیا بتایا اور ان کی قوموں  
 نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔

(۱۶-۱۹) قریش کے سامنے تاریخ ماضی کا درس سوائیہ صورت میں کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ  
 ہم نے اگلی قوموں کو ہلاک کیا اور بعد میں آنے والی قوموں میں سے بھی جنہوں نے ان کی روش بدیہی کی تقلید



کی۔ ہم نے ان کو بھی انہی کے پیچھے چلتا کیا؛ اگر یہ واقعہ ہے اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو آخر آج کے مجرموں کے معاملے میں ہماری یہ سنت متواتر کیوں بدل جائے گی۔

(۲۴۰-۲۴۱) انسان کے وجود اور اس کی خلقت کے مراحل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، ربوبیت اور اس کی حکمت کی طرف اشارہ جس سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کا اپنا وجود شاید ہے کہ اس کے خالق کے لیے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ایسا ضرور ہو گا اور اس دن ان لوگوں کی خرابی ہے جو اس کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں۔

(۲۵-۲۸) جو جیتے ہیں اور جو مرتے ہیں وہ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی زمین پر جیتے اور مرتے ہیں۔ اسی کے اندر خدا نے ان کی پرورش کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ نہ خدا کے احاطہ قدرت سے کوئی باہر ہے نہ اس کی پرورش سے کوئی مستغنی۔ یہ صورت حال شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو ضرور جمع کرے گا۔ اس دن ان لوگوں کے لیے خرابی ہے جنہوں نے اس کی قدرت و ربوبیت کی شان نہیں پہچانی اور دنیا کی سرستیوں میں کھوئے روز جزاء و سزا کو جھٹلاتے رہے۔

(۲۹-۳۲) اس عذاب کی تصویر جس سے ان مکذبین کو آخرت میں سابقہ پیش آنا ہے۔

(۳۵-۴۰) مکذبین کی بے بسی و بے کسی کی تصویر۔

(۴۱-۴۵) اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی نائز المرامی کی تصویر۔

(۴۶-۵۰) قریش کے اشکبار پران کو دھکی اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار۔







## سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ

مَكِّيَّةٌ ————— آيات: ٥٠

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ① فَالْعَصْفَاتِ عَصْفًا ② وَالنَّشْرِاتِ ③  
 نَشْرًا ④ فَالْفِرْقَاتِ فِرْقًا ⑤ فَالْمَلَقَاتِ ذِكْرًا ⑥ عَذْرًا أَوْ نَذْرًا ⑦  
 إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ ⑧ فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ⑨ وَإِذَا السَّمَاءُ  
 فُرِجَتْ ⑩ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ⑪ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِيتَتْ ⑫  
 لَا إِلَهَ يَوْمَ أُحِيتْ ⑬ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ⑭ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الْفَصْلِ ⑮  
 وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ⑯ أَلَمْ نُهَبِكِ الْأَوَّلِينَ ⑰ ثُمَّ نُنَبِّعُهُمْ  
 الْآخِرِينَ ⑱ كَذَلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ⑲ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ⑳  
 أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ㉑ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ㉒ إِلَى  
 قَدَرٍ مَعْلُومٍ ㉓ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَدِيرُونَ ㉔ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ  
 لِلْمُكَذِّبِينَ ㉕ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ㉖ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا ㉗  
 وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَاهِجَاتٍ وَأَسْقَيْنَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا ㉘  
 وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ㉙ انْطَلِقُوا إِلَى مَا كُنْتُمْ بِهِ تَكْذِبُونَ ㉚  
 انْطَلِقُوا إِلَى ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ㉛ لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي عَنْكُمْ

آيات  
٥٠-١



اللَّهُبِ ۝۳۱ ۝ أَنهَاتَرْمِي بِشَرِّكَ كَالْقَصْرِ ۝ ۳۲ ۝ كَانَهُ جِبَلَتْ صُفْرًا ۝ ۳۳ ۝  
 وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ ۳۴ ۝ هَذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ ۝ ۳۵ ۝ وَلَا  
 يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ۝ ۳۶ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ ۳۷ ۝ هَذَا  
 يَوْمُ الْفَصْلِ ۝ جَمَعْنَاهُمْ وَأَوَّلَيْنِ ۝ ۳۸ ۝ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ  
 فَكِيدُوا ۝ ۳۹ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ ۴۰ ۝ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ  
 فِي ظُلُلٍ وَعُيُونٍ ۝ ۴۱ ۝ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ۝ ۴۲ ۝ كُلُوا وَاشْرَبُوا  
 هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ۴۳ ۝ إِنَّا كَذَّبْنَاكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ ۴۴ ۝  
 وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ ۴۵ ۝ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا مِّنْكُمْ  
 مُّجْرِمُونَ ۝ ۴۶ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ ۴۷ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ  
 ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ۝ ۴۸ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ ۴۹ ۝ فَبِأَيِّ  
 حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ۝ ۵۰ ۝

ج ۲۲  
 ترجمہ آیات

شاید میں ہوا نہیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبارِ اندھاد  
 اور شاید میں ہوا نہیں پھیلانے والی (بادلوں کو)۔ پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا۔ پھر  
 ڈالتی ہیں یاد دہانی اتمامِ حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو۔ بے شک جو وعدہ تم سے  
 کیا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ ا۔ ۷

پس جب کہ تارے بے نشان کر دیے جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا،  
 پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے اور رسولوں کے لیے وقت مقرر ہوگا — کس دن  
 کے لیے وہ ٹائے گئے ہیں! — فیصلہ کے دن کے لیے! اور تم کیا سمجھے کیا ہے فیصلہ



کا دن! تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۸-۱۵

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ان کے پیچھے پھلوں کو نہیں لگاتے رہے ہیں؟ ہم مجرموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔ ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے

لیے! ۱۶-۱۹

کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا؟ پس ہم نے اس کو رکھا ایک محفوظ مقام میں۔ ایک معین مدت تک۔ پس ہم نے اس کو ٹھہرایا اور ہم کیا ہی خوب ٹھہرانے والے

ہیں! خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۲۰-۲۴

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ رکھنے والی نہیں بنایا زندوں اور مردوں کو؟ اور گاڑے اس میں پہاڑ اونچے اور پلایا تم کو پانی خوشگوار؟ — ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے

والوں کے لیے! ۲۵-۲۸

چلو اس کی طرف جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔ چلو تین شاخوں والے سایہ کی طرف۔ جس میں نہ چھاؤں ہے نہ شعلوں کی لپٹ سے بچاؤ۔ وہ آگ اونچے محلوں کی طرح شعلے پھینکتی ہوگی — زرد اونٹوں کی مانند — اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی

ہے! ۲۹-۳۴

وہ دن منہ سے بات نکلنے کا نہ ہوگا اور نہ ان کو اجازت ہوگی کہ کوئی عذر

پیش کر سکیں۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۵-۳۷

یہ ہے فیصلہ کا دن۔ ہم نے تم کو بھی اور اگلوں کو بھی جمع کر لیا۔ تو تمہارے پاس

کوئی داؤد ہے تو وہ ہم سے کر دیکھو۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۸-۴۰



بے شک اللہ سے ڈرنے والے سالیوں، چشموں اور اپنی چاہت کے میوؤں کے عیش  
میں ہوں گے۔ کھاؤ پیو اس آتنا اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ہم خوب کاروں کو اسی طرح  
صلہ دیتے ہیں۔ اس دن ہذا کی ہے جھٹلانے والوں کے لیے! ۴۱-۴۵

تم بھی کچھ دن کھا برت لو، تم تو ہو گنہگار۔ اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں  
کے لیے۔ ۴۶-۴۷

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اپنے رب کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔ اس دن  
جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔ ۴۸-۴۹

اب اس کے بعد وہ بھلا کس چیز پر ایمان لائیں گے!! ۵۰

---



الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْمُؤَسَّلَاتِ عَوْفًا (۱)

مُؤَسَّدَت کے معنی چھوڑی ہوئی کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے ملائکہ کو بھی مراد لیا ہے لیکن بعد کی صفات جیسا کہ واضح ہو گا، اس سے ابا کرتی ہیں۔ اس خیال کا بنیاد صرف اس غلط فہمی پر ہے کہ یہاں ”قسم“ کے لیے ہے اور عام خیال کے مطابق قسم کسی مقدس چیز کی ہونی چاہیے جس سے انھوں نے ”مُؤَسَّدَت“ سے فرشتوں کو مراد لیا۔ لیکن ہم جگہ جگہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بیشتر شہادت یعنی دعوے پر دلیل کی نوعیت کی ہیں۔ یہ قسم بھی اسی نوع کی ہے جس طرح سورہ ذاریات میں ہواؤں کی قسم عذاب اور جزاء و سزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے اسی طرح یہ قسم بھی وعدہ عذاب و تیامت کے شُذنی ہونے پر کھائی گئی ہے۔

لفظ ”مُؤَسَّدَت“ گھوڑے کی ایال کے بالوں کے لیے آتا ہے جو بیشنی پر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس معنی کے لیے یہ ایک معدوم لفظ ہے۔ . . امرؤ القیس کا مشہور شعر ہے :

نہش باعراۓ الجیاد اکفت      اذا نحن قمنا عن شواء مضہب

(جب ہم شکار کا کپڑا گارفت کھا کر اٹھتے تو گھوڑوں کی ایال میں اپنے ہاتھ پونچھ لیتے)

گھوڑوں کی ایال پکڑ کر ان کو روکا بھی جاسکتا ہے اور اس کو چھوڑ کر ان کو جولانی کے لیے چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔ آیت میں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور ان کے آندا کرنے کو ان کی ایال چھوڑ دینے سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر نہایت بلیغ ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ہوائیں نہ خود کار ہیں نہ خود مختار بلکہ ان کی پیشانی خدا کی مٹھی میں ہے۔ جب وہ چاہتا ہے ان کو روک لیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔ فرمایا ہے: **يَمَّا مِنْ دَائِثَةٍ إِلَىٰ ذَٰلِكَ أَلِجْنَاهَا** (ہود - ۵۶ : ۱۱) (نہیں ہے کوئی جاندار مگر وہ اس کی پیشانی کے بال کو پکڑے ہوئے ہے)۔

فَالْعَصْفُ عَصْفًا (٢)

عَصَفٌ کے معنی گھٹا اور اندھا دھند چلنے کے ہیں۔ فرمایا ہے: حَتَّىٰ اِذَا كُنْتُمْ فِي  
الْفُلِّ وَجَدْتُمْ فِيْهِمْ سَوِيْحَ طَيِّبَةٍ وَفِرْحُوْا بِهَا جَاؤُهَا دِيْحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ النَّوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ  
(یونس - ۲۱: ۱۰) یہاں تک کہ جب تم گشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان کو لے کر چلتی ہیں موافق ہوا  
کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں دفعۃً نمودار ہو جاتی ہے بادِ تندہ اور ان کو گھیر لیتی ہیں موجیں  
ہر جانب سے۔



یہ ان ہواؤں کا دوسرا مرحلہ بیان ہوا ہے کہ چھوڑے جانے کے بعد وہ بگٹ ہو کر اندھا ہونے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو تند ہو کر بالآخر طوفان اور عذاب بن جاتی ہیں اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ان کے عجائب تصرفات کی تاریخ قرآن میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اور آج بھی ان کی تباہ کاریوں کے تجربات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

وَالنَّشْرُ نَشْرًا (۲)

ابرحمت والی ہوائیں 'نَشْرُ' کے معنی پھیلانے، چھینٹنے، ابھارنے، اگانے کے ہیں۔ یہ لفظ ان تمام معانی میں، قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو ابررحمت لاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں 'نَشْرُ' کے مختلف پہلو موجود ہیں۔ یہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر ان کو فضا میں پھیلاتی ہیں، پھر اپنے رب کی رحمت کو چھینٹتی اور نباتات لگا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی ہیں۔ فرمایا ہے: اَلَّذِي يُنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قُتِلُوا وَيَنْشُرُ حِمْلَهُ (الشوریٰ: ۴۸: ۲۸) اور وہی ہے جو نازل کرتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ اس سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلتا ہے (اپنی رحمت)۔

ادپر کی قسم تو جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، طوفانی ہواؤں کی ہے اور یہ قسم ابررحمت والی ہواؤں کی ہے جن پر زندگی کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔

یہاں زبان کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ 'عَصِفَتْ' کو 'الموسلت' پُرْف کے ساتھ عطف کر کے اس کی تدریجی ترقی کو واضح کر دیا۔ اس کے برخلاف اس آیت میں حرف عطف 'و' آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سابق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مستقل وصف ہے۔

فَالْمُفْرِقَاتِ فُرْقًا (۴)

یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ ذاریات میں 'فَالْمُفْرِقَاتِ فُرْقًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے یعنی یہ ہوائیں فرق و امتیاز کرتی ہیں۔ کبھی بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں کبھی ان کو اڑا کر لے جاتی ہیں۔ ایک علاقہ کو جل بھیج کر دیتی ہیں، دوسرے کو نشہ چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ خود کا خود مختار نہیں بلکہ ایک بالا تر قوت کے تابع فرمان ہیں۔ یہ فرق و امتیاز چونکہ 'نَشْرُ' کے ذریعہ سے اور اس کے بعد نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے عطف 'ف' کے ذریعہ سے ہوا۔

فَالْمُلْقَاتِ ذِكْرًا (۵)

یہاں بارش کے ساتھ ساتھ یہ لوگوں پر یاد دہانی بھی آتا رہتی ہے۔

یہاں جن باتوں کی تذکرہ کرتی ہے وہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں چند نمایاں پہلو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔



- یہ آسمان وزمین میں توفیق کے پہلو سے توحید اور اللہ ہی کی شکر گزاری کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- اس کے اندر خدا کی ربوبیت کی جوشان ہے وہ خدا کے آگے مسئولیت کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- مردہ زمین کو زندہ کر کے یہ بعثت اور حشر و نشر کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- کسی کے لیے رحمت اور کسی کے لیے عذاب بن کر یہ خدا کے اختیارِ مطلق اور اس کے عذاب و ثواب کی یاد دہانی کرتی ہے۔

عَذْرًا أَوْ تَذَرًا (۶)

یہ مقصد بیان ہوا ہے ان کرشموں کا جو ہواؤں کے تصرفات سے ہر انسان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ کرشمے اللہ تعالیٰ لوگوں پر اتمامِ حجت یا ان کو بیدار کرنے کے لیے دکھاتا ہے۔ اذ، یہاں تقسیم کے لیے ہے یعنی ان لوگوں پر حجت تمام ہو جاتی ہے جو غفلت کی سرستی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو یاد دہانی حاصل ہوتی ہے جو یاد دہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سورہ اعراف میں مصلحین کے ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے جس سے اس عَذْرًا اَوْ تَذَرًا کی وضاحت ہوتی ہے:

وَاذْقَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا لَا يَهْتَفِئُوْنَ اَوْ مَعَذِرْتُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَتُنَا إِلَىٰ رَبِّنَا وَلَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

اور جب کہ ان سے ایک گروہ نے کہا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جن کو اللہ تعالیٰ یا تو بڑا کڑ دینے والا ہے یا ایک سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ تمھارے رب کے حضور

معذرت کے لیے در اس لیے بھی کہ شاید وہ ڈریں۔ (الاحقاف - ۷: ۱۶۴)

یعنی یہ لوگ اگر ہماری نصیحت نہ مانیں گے تو ہم اپنے فرضِ نصیحت سے سبکدوش ہو جائیں گے، ہم پر کوئی ذمہ داری عند اللہ باقی نہیں رہے گی۔ پھر ذمہ داری ان کی ہوگی اور یہ قیامت کے دن اپنی گمراہی کے لیے کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے اور اگر ہماری بات مان کر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بن گئے تو یہی مقصود ہے۔ یہ چیز ان کے لیے بھی باعثِ برکت و رحمت ہوگی اور ہمارے لیے بھی۔

اِنَّمَا تَعِدُّوْنَ كَوَاقِعَ (۷)

یہ مذکورہ قسموں کا تقسیم علیہ ہے۔ فرمایا کہ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کے رہے گی۔ تَعِدُّوْنَ، یہاں عام ہے، اس میں وعدہ اور وعید دونوں شامل ہے لیکن یہ سورہ، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، انداز کی ہے اس وجہ سے یہاں وعید کا پہلو غالب ہے یعنی جس عذاب اور قیامت سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ اٹل ہے، اس سے تمھیں سابقہ پیش آکے رہے گا۔

عذاب اور قیامت پر ہواؤں کے تصرفات کی شہادت گونا گوں پہلوؤں سے پچھلی سورتوں میں بیان



ہو چکی ہے تفصیل مطلوب ہو تو سورہ ذاریات کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب اور قیامت کے مذبذب کو ہواؤں کے تھفات کی طرف توجہ دلا کر متنبہ فرمایا ہے کہ اپنی قوت و سطوت پر زیادہ ناز نہ فرماؤ۔ اللہ عذاب لانا چاہے تو اسے کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا ہے۔ جس ہوا کی لائی ہوئی بارش سے جیتے ہو اسی کے پیچ ذرا سے ڈھیلے چھوڑ دے تو چشم فردن میں تھما کی ہستی کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ اس دنیا میں کتنی ہی قومیں گزری ہیں جن کو ہوا ہی نے خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ۖ وَإِذَا السَّمَاءُ فُجِّرَتْ ۖ وَإِذَا الْجِبَالُ سُفِفَتْ (۸-۱۰)

ان آیتوں میں قیامت کی پہل کی تصویر ہے کہ اس دن اس کائنات کی وہ چیزیں جو بہت عظیم بڑی ہی پر شوکت اور بالکل غیر فانی اور لازوال نظر آتی ہیں اور جن کو دیکھ کر تم گمان کرتے ہو کہ بھلا ان کو ان کی جگہ سے کون ہلا سکتا ہے وہ بالکل بے نشان اور بے حقیقت ہو کے رہ جائیں گی۔ جو ان کے لئے سوتے طوفانوں سے بڑے بڑے شہروں، محاذوں اور قلعوں کو جس طرح بے نشان ہوتے دیکھا ہے اسی طرح اس دن ایسی پہل برپا ہوگی کہ ستارے بے نشان ہو جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا اور زمین کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

’طمس‘ کے معنی کسی چیز کو مٹا دینے اور بے نشان کر دینے کے ہیں۔ فرمایا ہے: مِنْ تَبْلِ أَنْ تَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا (النساء: ۴۰) (قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور ان کو ان کے پیچھے پھیر دیں)۔ فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ کے معنی ہوں گے، پس جب کہ ستارے بے نور اور بے نشان کر دیے جائیں گے۔ یہی بات دوسرے مقام میں: فَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ (التکویر: ۸۱-۸۲) اور: وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (الانفطار: ۸۲) کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔

’وَإِذَا السَّمَاءُ فُجِّرَتْ‘ یعنی یہ آسمان جس میں کہیں کسی شگاف اور دراڑ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، جو بالکل ٹھوس اور محکم نظر آتا ہے قیامت کے دن پھٹ جائے گا۔ قرآن کے دوسرے مقام میں فرمایا ہے: وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا (اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے دروازے بن کے رہ جائے گا)۔ سورہ انفطار میں فرمایا ہے: وَإِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (الانفطار: ۸۲-۸۳) (اس دن کو یاد رکھو جس دن آسمان پاش پاش ہو جائے گا)۔

’وَإِذَا الْجِبَالُ سُفِفَتْ‘ کے معنی ریزہ ریزہ کر دینے، پس دینے، پرانڈہ کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: وَانْظُرْ إِلَىٰ إِلَهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُخْرِقَنَّكَ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّكَ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (طہ: ۲۰-۲۱) (اور اپنے اس دیوتا کو، جس پر تو متکلف رہا ہے، دیکھ، ہم اس کو جلا دیں گے پھر اس کو ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں بکھیر دیں گے)۔



خود پہاڑوں سے متعلق، منکرین قیامت کے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے: **وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَحْيٰلِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝۲۰** اور وہ تم سے پہاڑوں کی بات سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو، میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کر دے گا اور زمین کو صفا چٹ چھوڑ دے گا۔ بعض مقامات میں یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ توڑہ ریگ (کثیب مہیل) اور مراب کے مانند ہو جائیں گے۔

اوپر کی دو آیتوں میں آسمان کا حشر بیان ہوا تھا، اس آیت میں زمین پر جو کچھ گزرے گی اس کی طرف اشارہ ہے۔ زمین کی چیزوں میں استحکام اور وسعت و عظمت کے اعتبار سے، سب سے زیادہ اونچا درجہ پہاڑوں ہی کا ہے۔ چنانچہ کفار قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ سوال بھی کرتے کہ قیامت آئے گی تو ان پہاڑوں کا کیل بنے گا، کیا ان کو بھی وہ توڑ پھوڑ دے گی! یہاں پہاڑوں کا انجام بیان کر کے گویا اس پوری زمین کا حشر بیان کر دیا کہ جب پہاڑوں پر، جن کو لوگ اٹل خیال کرتے ہیں یہ گزرے گی تو دوسری چیزوں کا جو حال ہو گا اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

وَإِذَا الرُّسُلُ أَقْبَتَتْ (۱۱)

یہ اس اصل ہونہ کی کا بیان ہے جس کی تمہید کے طور پر اوپر کی ہونہا کیاں بیان ہوئی ہیں یعنی اس دن رسولوں کے لیے وقت مقرر ہو گا۔ ان کے لیے وقت مقرر کرنے سے مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ ایک مقررہ وقت پر وہ دربار الہی میں حاضر ہو کر اپنی قوموں کی موجودگی میں یہ بتائیں کہ جس فریضہ انڈا پر وہ مامور کیے گئے تھے وہ انھوں نے انجام دیا یا نہیں؟ اگر انجام دیا تو قوموں نے ان کو کیا جواب دیا؟ قرآن کے دوسرے مقامات میں رسولوں کے اس مقصد کے لیے جمع اور بارگاہ الہی میں ان کی قوموں کے روئے سے متعلق سوال کیے جانے اور ان کے گواہی دینے کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت ۱۰۹: **يَوْمَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرُّسُلَ يَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ قَالُوا لَا عِشْوَةَ لَنَا بِكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ** کے تحت ہم اس کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمہ کی رو بکاری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کی حاضری کے لیے بھی وقت مقرر فرمائے گا اور ان کی قوموں کی حاضری کے لیے بھی سمن جاری ہوگا۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورہ اعراف کی آیت ۶۰ کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

’اَقْبَتَتْ‘ دراصل ’دُقِئَتْ‘ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ عربی زبان میں الفاظ کے اندر اس فیصلہ کے دن طرح کا تصرف ہو جایا کرتا ہے۔ ’الرُّسُلُ اُقْبَتَتْ‘ کے معنی ہوں گے رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح کہتے ہیں ابخنی خادماً یعنی ابغ لی خادماً **لَا يَوْمَ اُحْبِلَتْ هٰذَا الْفَصْلُ (۱۲-۱۳)** جب اس دن کے ذکر تک بات پہنچ گئی تو اس کی



عظمت و عظمت کے بیان کے لیے یہ سوال مخاطبوں کے سامنے رکھ دیا کہ کچھ سمجھے کہ کس عظیم دن پر ہم نے ان رسولوں کی پیشی کو ٹھالا ہے! اس کے بعد خود ہی جواب دیا ہے کہ نہ جانتے ہو تو کان کھول کر سن لو کہ

لَيَوْمٍ الْقَفْصِلِ فَيَصِلُهُ كَيْفَ دُنِ بِرَّالْأَسْرِ لَعْنِي دَهْ دُنِ بِرَّالْأَسْرِ عَدَالَتِ كَالْوَقِ هُوَ كَا۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْقَفْصِلِ (۱۴)

یہ اسلوب کلام، جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی عظمت و عظمت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ جس طرح لَآئِي يَوْمٍ مَرَّاحِلَتْ کے سوال سے اس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح اس سوال سے اس دن کے فیصلہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا اس کی عظمت دو بار یاد دلادی گئی۔

وَنُيْلُ يَوْمٍ مِّنْ يَّوْمَيْنِ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۱۵)

یہ اس دن کے فیصلہ کے نتیجے کا بیان ہے کہ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جو اس کے ٹھالانے والے بنے رہے!

یہ آیت جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، اس سورہ میں بار بار آئے گی اور ہر جگہ اپنے مابقی سے زبان کا  
ایک اسلوب  
گہرے ربط کے باوصف، اس کی حیثیت بالکل مستقل ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو اس شرط کا جواب قرار دیا ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے لیکن یہ رائے عربیت کے خلاف ہے۔ اگر یہ جواب شرط کے محل میں ہوتی تو اس پر 'ف' آتی تھی (الآنکہ جواب جملہ تعبیر یا ظرفیہ ہو) مثلاً فرمایا ہے: فَإِذَا انْقَرَفَ النَّاسُ وَرُفُّوا فَنُيْلُ يَوْمٍ مِّنْ يَّوْمَيْنِ لِّلْمُكَذِّبِينَ (المذکورہ: ۴-۸-۹) دوسرے مقام میں ہے: يَوْمَ تَمُورُ أَسْمَاءُ وَتُمُوْرُ الْوَقْدِ وَتُكْسِرُ الْجِبَالُ سَيْرًا فَنُيْلُ يَوْمٍ مِّنْ يَّوْمَيْنِ لِّلْمُكَذِّبِينَ (الطور: ۵۴-۹-۱۱) اس قائلے کی وضاحت ہم نے اس لیے ضروری سمجھی کہ اس جملہ کو جواب شرط مان کر اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کی تاویل صحیح نہیں ہوگی۔ آگے اس کے مواقع پر اس کی وضاحت ان شاء اللہ ہو جائے گی۔ یہاں جواب شرط مخدوف ہے جس طرح إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۖ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۖ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۖ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۖ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۖ يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْكَافِرُونَ (الانشقاق: ۸۴-۱-۴) میں مخدوف ہے۔ جواب کے مخدوف ہونے ہی کی وجہ سے یہ آیت اتنے گونا گوں پہلوؤں کی جامع بن گئی ہے کہ اس سورہ کے تقریباً ہر پیرے کے بعد یہ آتی ہے اور ہر جگہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

أَلَمْ نُهَبِكِ الْأَوَّلِينَ ۖ ثُمَّ نُنَجِّيهِمْ بِالْآخِرِينَ ۖ كَذَلِكَ نَقُصُّ بِالنُّجُومِ مِثْنَ

وَنُيْلُ يَوْمٍ مِّنْ يَّوْمَيْنِ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۱۶-۱۹)

یہ اسی دوسرے کی تائید میں جو انہما تَوَعَّدُونَ كَوَاقِعُ (۶) کے الفاظ میں اوپر مذکور ہوا، تاریخ میں آفاقی شواہد کے آفاقی شواہد کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اگلوں کو ہلاک کیا اور







قائم کی ہے۔

انسان کے اندر خیر و شر کے انبیاز کی جو صفت و دبیت فرمائی ہے اس سے ایک روز عدل کے لازمی ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔

یہ مطالب یوں تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر قریب ہی کی دو سورتوں ————— القیسمۃ اور الدھر ————— کے مطالب پر آپ ایک نظر ڈالیں تو ان تمام نکات کے شواہد آپ کو مل جائیں گے۔

مکرین قیامت  
کے شبہ کا جواب

’اَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ ؕ فَجَعَلْنٰہُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ؕ اِلٰی قَدَرٍ مَّعْکُوْمٍ‘  
یہ مکرین قیامت کے اس شبہ کا جواب ہے جو مرکھپ اور مرکل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے متعلق وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کو براہ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے حقیر پانی کی ایک بوند سے تم کو پیدا کیا ہے؛ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا تو جب تم خود اپنے وجود کے اندر علانیہ مشاہدہ کرتے ہو کہ تمہارے خالق نے حقیر پانی کی ایک بوند کو انسان بنا کے کھڑا کر دیا تو تمہارے مرکھپ جانے کے بعد اگر وہ تمہیں از سر نو پیدا کرنا چاہے تو یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن یا مشکل ہو جائے گا۔ پہلی بار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری بار!

’مَہِیْنٌ‘ کے معنی حقیر و ناچیز کے ہیں۔ اس صفت کے لانے سے مقصود ایک تو یہ دکھانا ہے کہ انسان کی تخلیق کسی ایسے میٹرل سے نہیں ہوئی ہے جو نادار الوجود یا کیا ب ہو کہ اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن یا دشوار ہو جائے۔ وہ ایک بے قیمت اور حقیر چیز سے پیدا ہوا ہے جس کا نہایت وافر وجود قدرت کے پاس موجود ہے۔ دوسرے اس سے خالق کی عظیم و بے نہایت قدرت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک بوند کو انسان بنا دے سکتا ہے اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

’فَجَعَلْنٰہُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ‘۔ یہ ان حیرت انگیز تصریحات کی طرف اشارہ ہے جو اس حقیر قطر کو گہر بنانے پر قدرت صرف کرتی ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کو ایک محفوظ دامن میں جگے قرار میں رکھواتے ہیں۔ ’قَرَارٌ‘ سکون اور جگہ سکون دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یہاں یہ جگہ قرار کے معنی میں ہے اور اشارہ اس سے رحم کی طرف ہے جس کو قدرت نے خاص اسی مقصد کے لیے ایک گوشہ مامن بنایا ہے۔ لفظ ’مَکِیْنٌ‘ جب جگہ کی صفت کے لیے آتا ہے تو اس سے ایسی جگہ مراد ہوتی ہے جو اندیشوں، خطرات اور مداخلت غیر مطلوب سے بالکل محفوظ دامن ہو۔

’اِلٰی قَدَرٍ مَّعْکُوْمٍ‘ یعنی ایک مہین وقت تک ہم اس کو ایک محفوظ گوشہ میں رکھواتے ہیں تاکہ جو صلاحیتیں اس کے اندر پیدا کرنی مقصود ہیں وہ اپنے لیے جگہ بنالیں۔ پھر یہ ہماری ہی قدرت و حکمت ہے



کہ اس مدتِ معین کے بعد اس کو اس گوشہٴ مامون سے باہر لاتے ہیں۔

فَقَدْ رَآنَا فَنَعَمَ الْفِتْوَىٰ ۖ مِيرے نزدیک اس میں پہلا لفظ قد ہے اور دوسرا قدرت سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عجائبِ قدرت کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ دیکھ لو، انسان کی پیدائش میں ہم نے اپنے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں اور ہم کتنی اعلیٰ اور بہتر قدرت رکھنے والے ہیں! مطلب یہ ہے کہ جب ہماری قدرت کی یہ اعلیٰ شانیں انسان کی خلقت میں ظاہر ہیں تو ہم اس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہیں گے تو اس سے کیوں عاجز رہ جائیں گے!

اس کے بعد آیت ترجیح ہے اور اس کا موقع یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیے جانے پر جو شبہات وارد کیے جا رہے ہیں ان کی تردید کے لیے تو خود ان کی خلقت ہی کافی ہے۔ ایک دن وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور وہ دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہی خسروئی کا دن ہوگا۔ سورہ صافات میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے :-

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ  
يَنْظُرُونَ ۚ وَقَالُوا لَئِذَا هَذَا يَوْمُ  
الَّذِينَ هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ  
بِهِ تَكْتُمُونَ ۚ (الصفت - ۱۹۰، ۲۱)

وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی کہ دفعۃً وہ  
تاکنے لگیں گے۔ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی!  
یہ تو جزاکا دن آگیا! ہاں یہ وہی فیصلہ کا دن  
ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۖ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا ۖ وَجَعَلْنَا فِيهَا دُرًا  
سَمِيًّا ۖ وَاسْقَيْنَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا ۖ وَبِئْسَ لِلظَّالِمِينَ كِتَابًا

یہ اسی یوم الفصل پر اس اہتمام ربوبیت سے دلیل قائم فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کا  
پرورش کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے۔ یہ دلیل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے اور ہم ہر جگہ اس  
کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کے  
لیے جو اہتمام فرمایا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے زمین و آسمان کو جس طرح مسخر کر کے اس کی  
خدمت میں لگا رکھا ہے اس کا لازمی اور بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر مستول اور شربے مہار بنا کر نہ چھوڑے  
رکھا جائے بلکہ ایک ایسا دن بھی آئے جس میں اس سے پرسش ہو کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا کیا یا  
نہیں۔ پھر جس نے ادا کیا ہو وہ انعام پاٹے اور جس نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس کفران  
نعمت کی سزا بھگتے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۖ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا ۖ كَفَتْ ۖ کے معنی جمع کرنے اور اکٹھا کرنے  
کے ہیں۔ عربی میں فَعَالٌ کا وزن اس چیز کے لیے بھی آتا ہے جس سے فعل انجام پذیر ہو اس وجہ سے  
’کفَات‘ کے معنی جمع کر لینے والی کے ہوں گے۔ اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت پیدا ہو گئی



ہے اور اس کے بعد مفعول لانا جائز ہوا۔

یہ ربوبیت اور احاطہ کے دو گونہ پہلوؤں سے معاد اور روز جزا و سزا کی دلیل بیان ہوئی ہے۔  
ربوبیت سے استدلال زیادہ وضاحت سے آگے مالی سورہ میں ہے جو اس کے معنی کی حقیقت رکھتی  
ہے۔ فرمایا ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مَهْدًا ۖ وَ  
الْجِبَالَ أَوْتَادًا ۖ وَخَلَقْنَاكَ أَزْوَاجًا ۖ  
وَجَعَلْنَا نَوْمَكَ سَبَاتًا ۖ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ  
لِبَاسًا ۖ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۖ  
وَبَنَدْنَا فَوْقَكَ سَبْعًا شِدَادًا ۖ وَجَعَلْنَا  
سِرَاجًا وَهَّاجًا ۖ إِنَّا وَهَّجْنَا مِنْ  
الْمُخْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۖ لِنُخْرِجَ  
بِهِ حَيًّا وَنَبَاتًا ۖ وَجَنَّةٍ أَلْفَاظًا ۖ  
إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۖ

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ نہیں بنایا، پہاڑوں  
کو منجھیں نہیں بنایا، اور تم کو جوڑے جوڑے  
نہیں پیدا کیا، تمھاری نیند کو دافع کلفت نہیں  
بنایا، رات کو پردہ پوش اور دن کو دقت  
مماش نہیں بنایا اور تمھارے اوپر سات  
محکم آسمان نہیں بنائے اور ایک روشن چراغ  
نہیں بنایا اور بدلیوں سے دھڑ دھڑاتا پانی  
نہیں برسایا تاکہ اس سے اگائیں غلے اور  
نباتات اور گھنے باغ؛ بے شک یہ چیزیں

(النبا - ۷۸ : ۷۹ - ۸۷)

احاطہ کے پہلو کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں 'أَحْيَاءُ' کے ساتھ 'أَمْوَاتًا' کا بھی ذکر فرمایا۔  
یعنی یہ زمین جس طرح اپنی آغوش میں تمام زندوں کو لیے ہوئے ہے اسی طرح تمام مردوں کو بھی اپنے  
اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جو مرتے ہیں وہ اس کے حدود سے کہیں باہر نہیں چلے جاتے بلکہ اس کے اندر  
دفن ہوتے ہیں۔ قدرت الٰہی کو اسی زمین کی تحویل میں بطور امانت دے دیتی ہے جس کے گہوارے  
میں وہ پیدا ہوتے اور پلتے ہیں۔ یہ اہتمام قدرت نے اسی لیے فرمایا ہے کہ جب لوگوں کو جمع کرنے  
کا وقت آئے تو وہ زمین کو حکم دے کہ جو کچھ اس کی تحویل میں ہے اس کو حاضر کرے اور وہ فوراً اس  
حکم کی تعمیل کرے گی۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۖ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۖ'  
(الانشقاق - ۸۴ : ۸۵ - ۸۶) (اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ  
اس کو باہر نکال کر فارغ ہو جائے گی)۔ اسی بات کی طرف اشارہ سورہ زلزال میں 'وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ  
أَنْفُسَهَا' (۲) کے الفاظ سے فرمایا ہے۔ ان آیات سے اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے  
کہ جو مرتا ہے وہ کہیں ناپید نہیں ہو جاتا ہے بلکہ زمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب  
چاہے گا اس کو اسی زمین سے، جس سے اس کو پیدا کیا، پھر اٹھا کھڑا کرے گا۔ چنانچہ سورہ طہ  
میں فرمایا ہے: 'مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ' (۵۵) (اسی



زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم پھر تم کو لوٹا دیتے ہیں اور پھر اسی سے تم کو دوسری بار نکالیں گے۔

ان تمام آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو ایک اور واضح تر حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ انسان اصلاً زمین ہی کے رحم سے پیدا ہوا ہے اور جب وہ مرنا اور دفن ہوتا ہے تو گویا مرنے کا نہیں بلکہ اسی رحم میں واپس لوٹا دیا جاتا ہے جس سے پیدا ہوا ہے تو جب اس کا پہلی بار پیدا ہونا کسی کے نزدیک کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے تو اس کا دوسری بار پیدا ہونا کیوں تعجب انگیز ہو جب کہ بطنِ زمین میں اس کا تخم موجود ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا رِجَالًا مِّنْ نَّسْلِكُمْ مَّا فَسَّاتْنَا: یہ اسی ربوبیت کے مضمون سے متعلق ہے جو اَللّٰهُ يَجْعَلُ الْاَرْضَ كَيْفَا تَاۡتٰی بیان ہوا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ انسان کی رہائش و پرورش کے لیے زمین کو گہوارہ بنانے میں پہاڑوں کے وجود کو بڑا دخل ہے اور سورہ نبا کی جس آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی فرمایا ہے کہ اَللّٰهُ يَجْعَلُ الْاَرْضَ مِهْدًا ۝۱۰ قَالِ جِبَالٌ اَدْتَاۡدَا (کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو گہوارا بنایا ہے اور اس گہوارے کو متوازن رکھنے کے لیے اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں؟) دوسرے مقام میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ دَاۡلُفٰی فِی الْاَرْضِ رَاۡیٰۤی اَنْ تَمِیۡدَ بِكُمۡ لَقَمٰنَ (۱۰:۳۱) اور اس نے زمین میں پہاڑوں کے ٹکڑے ڈال دیے کہ مبادا وہ تمہارے سمیت کسی جانب کو لڑھک جائے۔

پہاڑوں کے ایک اور نفع کی طرف بھی اشارہ فرمایا جو ربوبیت کے پہلو سے بڑی اہمیت رکھنے والا ہے۔ وہ یہ کہ ان پہاڑوں کی باندی ہواؤں اور بادلوں کو کنٹرول کرنے اور پانی کے قدرتی ذخائر جمع کرنے میں بڑی موثر ہے۔ انسان شیریں پانی کا محتاج ہے اور یہ نعمت مہیا کرنے کے لیے قدرت نے یہ اونچے پہاڑ بنائے ہیں جو اسی کے بنانے کے ہیں کوئی دوسرا ان کو بنانے پر قادر نہیں ہے۔

اس طرح کلام درجہ بدرجہ ایک یوم الفصل اور روز جزاء و سزا کے ثبوت تک خود پہنچ گیا۔ اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ الفاظ میں بھی اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر کو حذف کر کے ترجیع والی آیت سامنے رکھ دی۔ فرمایا: دُوۡیۡلٌ یُّؤَمِّدُ لِّلْمُکَذِّبِیۡنَ یعنی جو لوگ خدا کی ربوبیت اور اس کے احاطہ قدرت کے اتنے بدیہی شواہد کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کے دن سے نچپتا اور اس کو جھٹلانے والے بنے ہوئے ہیں اس دن ان کی تباہی ہے۔

اِنۡطَلِقُوۡا اِلٰی مَا کُنْتُمْ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ (۲۹)

اور پر والی آیت میں آپ نے دیکھا کہ اس فیصلہ کے دن کا مشاہدہ آفاق و انفس کے آثار و شواہد



کے اندر کرایا گیا ہے۔ اب چند آیتوں میں اس کی تصویر سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ جو چیز نگاہوں سے اوجھل ہے اس کا مشاہدہ ایک حاضر و مشہود چیز کی طرح منکرین کر لیں۔ چنانچہ اسلوب کلام ایسا اختیار فرمایا ہے کہ زیادہ چیز سامنے موجود ہے اور ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اب تک جس چیز کو جھٹلاتے رہے ہیں اس کی طرف چلیں اور اس کا مزہ چکھیں۔ فرمایا کہ چلو اس چیز کی طرف جس کو اب تک جھٹلاتے رہے ہو۔

اَنْطَلِقُوا اِلٰى ظِلِّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ (۳۰)

’اَلٰی مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَكْذِبُوْنَ‘ کے الفاظ میں جو ہر ناک چیز چھپی ہوئی تھی یہ اس سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ان تین شاخوں والے سایہ کی طرف چلو۔ ’ظِلُّ‘ کے معنی تو سایہ کے ہیں لیکن یہاں ظاہر ہے کہ اس سے مراد معروف سایہ نہیں بلکہ دھوئیں کا سایہ ہے۔ سورہ واقعہ آیات ۴۲-۴۴ میں فرمایا ہے: ’وَّظِلِّ مِّنْ يَّحْشُمُہٗ لَا بَارِدٌ وَلَا جَرِيمٌ‘ (اور سیاہ دھوئیں کا سایہ، نہ ٹھنڈا نہ نفع بخش)۔

دھوئیں کے اس سائے کی صفت ’ذی ثلاث شعب‘ آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھواں ان کے آگے تمام سمتوں میں پھیلا ہوا ہوگا، صرف وہی سمت اس کی آفت سے محفوظ ہوگی جس سے یہ مکذبین جیسا کہ لفظ ’اَنْطَلِقُوا‘ سے واضح ہے، کھدیڑ دیے جائیں گے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بعد ان کے لیے دھواں ہی دھواں ہوگا۔

اس ٹکڑے کی تائید میں بعض اصحاب علم نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت؛ (۲) مخلوق سے بے پروائی؛ (۳) روز جزا کا انکار۔ انہی تین خصلتوں کے مطابق عذاب کی تین شاخیں ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو چھالیں گی۔ یہ نکتہ لطیف ہے لیکن یہ تینوں خصلتیں باہم دگر باہم لازم و ملزوم بھی ہیں اور یہ تمام کفار میں مشترک بھی نہیں۔ ان کی بنیاد پر کفار کی الگ تنگ درجہ بندی کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمتیں بہر حال چار ہی ہوتی ہیں تو جب وہ اس سمت سے نکال دیے جائیں گے جو اس دھوئیں کے عذاب سے محفوظ ہوگی تو تین سمتیں بچ رہتی ہیں اور یہ تینوں اس دھوئیں کے احاطہ میں ہوں گی۔ گویا اس کے بعد وہ ہر طرف سے دھوئیں کے عذاب میں ہوں گے۔

لَا ظَلِيلٌ وَلَا يُغْنِي مِنَ النَّارِ (۳۱)

یہ برسرِ موقع ایک مغالطہ کو رفع کیا ہے جو لفظ ’ظِلُّ‘ سے پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اس سایہ میں نہ چھاؤں ہوگی نہ شعلوں کی لپیٹ سے وہ بچاؤ کرنے والا بنے گا۔ یہی بات ذرا مختلف الفاظ میں سورہ واقعہ کی اس آیت میں فرمائی گئی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ فرمایا ہے: ’وَّظِلِّ مِّنْ يَّحْشُمُہٗ لَا بَارِدٌ وَلَا جَرِيمٌ‘ (سیاہ دھوئیں جن کا سایہ نہ ٹھنڈا نہ فیض بخش) گویا دھوئیں کے اذیت بخش پہلو تو اس کے اندر سامنے ہوں گے لیکن نفع بخش پہلو، جن کی توقع ہو سکتی تھی، ان کی نفی کر دی گئی۔



إِنَّهَا شَرُّ مِ بَشَرٍ كَالْقَصْرِ (۳۲)

’انہا‘ میں ضمیر کا مرجع وہ آگ ہے جو دھوئیں کے ذکر سے بطور اس کے لازم کے مفہوم ہوتی ہے۔ فرمایا کہ وہ گنبد کے برابر چنگاریاں اور شعلے پھینک رہی ہوگی۔ ’قصر‘ کی قرارت اور معنی میں بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے لیکن ہم نے اپنی اس کتاب میں ہر جگہ متوازن قرأت ہی کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ محل اور گنبد ہی گئے معنی میں ہے اور یہ نہایت عمدہ تشبیہ ہے آگ کے کسی بڑے الاؤ سے اٹھتے شعلوں کی۔ یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور ان کے رنگ کی دی گئی ہے۔ محل بالعموم بلند جگہوں پر بنائے جاتے ہیں۔ دوسرے دیکھیے تو وہ چمکتے ہوئے نظر آئیں گے اور ادھر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف ہوگا۔

كَأَنَّهُ جِمَلَتٌ صُفْرٌ (۳۳)

یہاں ضمیر کا مرجع ’بشر‘ ہے اور رعایت لفظ کی گئی ہے۔ ’مشدر‘ اسم صفت ہے۔ مذکر، مؤنث واحد اور جمع سب کے لیے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں یہ جمع کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اس کی تشبیہ جمالۃ صفر سے دی گئی ہے۔ ’جمالۃ‘ اوٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ صفرة (زردی) کی قید اس لیے لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ملگجے زرد رنگ کے اوٹوں کے رنگ سے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ آگے دہی آیت ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا موقع محل بالکل واضح ہے کہ جس دن اس ہوناک منظر سے سابقہ پیش آئے گا اس دن ان تکذیب کرنے والوں کی تباہی ہے۔

هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ ۚ وَلَا يُؤْذِنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ۚ وَبَلْ يَوْمَئِذٍ

لِلْمُكَذِّبِينَ (۳۵-۳۶)

روزِ قیامت کی ہوناکی کی تصویر کے بعد یہ مجرموں کی بے بسی اور دماندگی کی تصویر ہے کہ آج تو قیامت کی تکذیب میں ہر ایک آگے بڑھ بڑھ کر طلاق سانی کا ثبوت دے رہا ہے لیکن اس دن سب کی زبانیں بے بسی لنگ ہوں گی، کسی کے منہ سے بات نہ نکلے گی۔ آگے کی سورہ میں جو اس کی مثنیٰ ہے فرمایا ہے: وَلَا يَسْكُونَ مِثْلَهُ خَطَايَا (الباء۔ ۷۸: ۳۷) (اس دن مجرمین اس سے خطاب نہ کر سکیں گے۔)

قرآن میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس دن مجرموں کے مونہوں پر مہر کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے اعضاء کو ناطق بنادے گا جو ان کے تمام جرائم کی گواہی دیں گے۔

’وَلَا يُؤْذِنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ‘ یعنی نہ تو وہ خود زبان کھولنے کی جرأت کریں گے اور نہ ان کو یہ اجازت

ملے گی کہ ان کے پاس کوئی غدر ہو تو اس کو پیش کریں۔

’وَبَلْ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ‘ ان کی اس بے بسی کے بیان کے بعد دہی آیت ترجیع ہے اور



اس کا موقع محل بالکل واضح ہے کہ جب حال یہ ہو کہ نہ وہ خود کوئی بات زبان سے نکالنے میں پہل کر سکیں گے اور نہ ان کو کوئی عذر پیش کرنے کی اجازت ہی ملے گی تو ہلاکی اور تباہی کے سوا ان کے لیے کیا چیز باقی رہی!

هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۖ جَمَعْتُكُمْ وَالْاَدْلِيْنَ ۚ فَاِنْ كَانَ نَكْثُكُمْ كَيْدُ دُوْنٍ  
وَبَلُّ يَوْمِيذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۳۸-۴۰)

یہ ان مجرموں کو براہ راست خطاب کر کے ارشاد ہر گاہ کہ تم جس یوم الفصل کی تکذیب کرتے رہے تھے آج اس کی عدالت تمہارا فیصلہ سنانے کے لیے قائم ہو گئی۔ دیکھ لو، ہم نے تم کو بھی جمع کر لیا اور تمہارے اگلوں کو بھی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ کفار جب قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ بھی کہتے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو اس دن ہمارے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟ وہ اس طنز یہ سوال سے قیامت کو ناممکن سے ناممکن تر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ بھلا یہ بات کس طرح تصور کی جاسکتی ہے کہ ہمارے تمام اسلاف بھی ایک دن قبروں سے اٹھائے جائیں گے! ان کے اسی سوال کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ جَمَعْتُكُمْ دَاوَاْدِلِيْنَ ہم نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ کر دکھایا، تم بھی ہمارے سامنے موجود ہو اور تمہارے اگلے بھی! فَاِنْ كَانَ نَكْثُكُمْ كَيْدُ دُوْنٍ یعنی دنیا میں تو تم نے ہمارے رسول کو شکست دینے کے لیے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ اگر کوئی اور چال باقی رہ گئی ہو تو وہ بھی آزما دیکھو۔ یہاں تمہارے اگلے پچھلے سب موجود ہیں۔ اگر وہ مدد کریں تو ان کی مدد بھی حاصل کرو۔

یہاں اس امر پر نگاہ رہے کہ رسول کے انذار کی تکذیب کے لیے کفار نے جو کوششیں کیں ان کو اللہ تعالیٰ نے کَيْدٌ یعنی چال سے تعبیر فرمایا۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم بار بار واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اس راہ میں ان کی ساری بھاگ دوڑ محض اپنی سیادت کو بچانے کے لیے تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سچی ہے لیکن اپنی نفس پرستی اور انانیت کے سبب سے اس کے قبول کرنے پر وہ تیار نہیں ہوئے بلکہ طرح طرح کے شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اپنے عوام کو انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ جو کر رہے ہیں دلیل کے ساتھ کر رہے ہیں اور ان کا مقصد اپنے آبائی دین کا تحفظ ہے۔ حالانکہ یہ محض ان کی چال تھی۔

وَبَلُّ يَوْمِيذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ آگے وہی آیت ترجیع ہے جو اوپر ہر پرے کے بعد آئی ہے اور اس کا موقع محل بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس مطالبہ کے بعد، جو مذکور ہوا، ان کی بے بسی ان پر بالکل واضح ہو جائے گی اور وہ اس تباہی سے دوچار ہوں گے جو اس تکذیب کے نتیجہ میں ان کے سامنے آئے گی اور جو بہت بڑی تباہی ہوگی۔

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِيْ ظُلُمٍ لَّيْلٍ وَعَيُوْنٍ ۚ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (۴۱-۴۲)



اس یوم الفصل میں مجرموں کا جو فیصلہ ہوگا وہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا کہ وہ ایک ایسی آگ متقیوں کا  
کی طرف بھیجے جائیں گے جس کا دھواں ان کو ہر طرف سے گھیر لے گا۔ ان کے مقابل میں ان متقیوں کا انعام  
اکرام بیان ہو رہا ہے کہ وہ سالیں پیموں اور اپنی پسند کے میوؤں میں ہوں گے۔ اس اسلوب بیان میں  
جب نعمتوں کا بیان ہوتا ہے تو اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں ان کو ہر طرف سے  
گھیرے ہوئے ہوں گی۔ قرآن میں بھی یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اور کلام عرب میں بھی اس  
کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۳)

یہ ان کو خوش خبری دی جائے گی کہ اب چین سے کھاؤ پیو۔ تمہارا یہ کھانا پینا اس آنے والا اور  
ہر غل و غش سے پاک ہوگا۔ یہ تمہارے ان اعمال کا صلہ ہے جو تم نے دنیا میں کیے۔ اس میں یہ اشارہ ہے  
کہ ناشکروں نے دنیا میں جو کھا یا پیا وہ ان کے لیے آخرت میں راس آنے والا نہیں بنے گا بلکہ وہ ان  
کے لیے تباہی کا سبب ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اس کھانے پینے کا حق نہیں ادا کیا لیکن تمہارا  
یہاں کھانا پینا اس آنے والا بنے گا اس لیے کہ تم اپنے حقوق و فرائض سے سبکدوش ہو کر آئے ہو۔  
'هَنِيئًا' کے معنی راس آنے اور سازگار ہونے کے ہیں۔ یہ مفعول سے حال پڑا ہوا ہے جو فعل  
سابق سے مفہوم ہو رہا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: 'فَكُلُوا وَهَنِيئًا مَرِيئًا' (النساء - ۴: ۴)  
جس میں ذوالحال واضح ہے۔ ذوالحال سے حال پڑنا عربی زبان میں معروف ہے۔ مثلاً مسافر کے لیے  
کہتے ہیں: دامشدا مہدیا۔

إِنَّا كَذَبْنَاكَ فَجُزِيَ الْمُحْسِنِينَ (۴۴)

یہ آیت اوپر کی آیت ۸ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'كَذَبْنَاكَ لَفَعَلٍ بِالْمُجْرِمِينَ'  
(ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں) یہاں اس کے مقابل میں فرمایا کہ ہم خوب کاروں کو اسی طرح  
دیا کرتے ہیں۔ لفظ 'مُحْسِنِينَ' کی تحقیق اس کے فعل میں گزر چکی ہے۔

وَيُلَى يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ الْكَذِبُ بَيْنَ (۴۵)

یہ آیت ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔ ایک طرف تو خوب کاروں کے لیے یہ  
عیش و اوداں ہوگا، دوسری طرف منکرین اس عذاب میں جھونکے جائیں گے، جس کی تفصیل اوپر بیان  
ہوئی۔ تصور کیجیے اس بعد کا جو دونوں کے درمیان ہوگا! جبہ آنے سے سانسے یہ دونوں انجم نمایاں  
ہوں گے تب اپنی بدبختی کا ان لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا جنھوں نے عیش و دنیا پر رنجیدہ کر اس کے انجام  
کا اندازہ نہیں کیا۔

كُلُوا وَتَمَتُّوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مَجْرُمُونَ ۚ وَيُلَى يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ الْكَذِبُ بَيْنَ (۴۶-۴۷)



قریش نے یہ خبر سنی تو انہیں قریش کے لیڈروں سے خطاب ہے۔ اور جو باتیں فرمائی گئی ہیں اگرچہ وہ بھی انہی کو براہ راست کے لیے فرمائی گئی ہیں لیکن وہ اصولی رنگ میں ہیں۔ یہ ان کو براہ راست مخاطب کر کے آگاہ کیا ہے کہ خطاب اس دنیا میں جو عیش و تم کو حاصل ہے اس سے اس معاملہ میں نہ رہو کہ آخرت ہوئی تو یہی کچھ تمہیں دیا بھی حاصل ہوگا۔ تمہارا یہ عیش چند روزہ ہے۔ آخرت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے خوب کاربند ضروری ہے اور تم ہونا بیکار۔ مجرموں کو وہی ملے گا جس کی تفصیل شادی گئی۔

وَبَلَّغْ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ لَا يَتَذَكَّرُونَ اِنَّهُمْ كَانُوا فِي سَبِيلِ الْمَوْتِ وَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ

کے لیے اس دن بڑی تباہی ہے جس کا اندازہ اس دنیا میں نہیں کیا جاسکتا۔

وَإِذْ أَنذَرْنَاهُمْ أَزْكَوٰٓءَ لَا يَرْكَعُوْنَ هَٰٓؤُلَآءِ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۴۸-۴۹)

ان کو تنبیہ کرنے کے بعد پھر خطاب کی جگہ غائب کا اسلوب آگیا جس میں ان کو ملامت ہے کہ یہ بدبخت لوگ اپنی موجودہ رذائیت کو اس بات کی دلیل تو بنائے بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے عیش ہی عیش ہے لیکن جب ان کو اس عیش و رذائیت کا حق ادا کرنے کے لیے خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جاتی ہے تو نہیں جھکتے بلکہ اکڑتے ہیں۔ رکوع سے یہاں نماز کی تعبیر فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کا سب سے اعلیٰ مظہر اور کبر و غرور کی سب سے بڑی تباہی ہے۔

اس کے بعد آیت ترجیع ہے جس کا موقع بالکل واضح ہے کہ جو بر خود غلط اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی آرزو میں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔ وہ دن آتے گا کہ یہ دیکھیں گے کہ وہاں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے!

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جو سورۃ قلم میں گزر چکی ہے کہ قیامت کے دن اس طرح کے متکبرین سجدہ کرنے کے لیے بلائے جائیں گے لیکن انہوں نے دنیا کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا اس وجہ سے اس دن بھی وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ثابت کر دے گی کہ یہ بھی متکبرین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ اسی نرا کے مستحق ہیں جو متکبرین کے لیے خاص ہے۔

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ لَّعَنَآ يَوْمَئِذٍ الْمُنْكَرِينَ (۵۰)

یہ ان منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار ہے کہ جب یہ اس نذر پر ایمان نہیں لارہے ہیں جس کو قرآن اتنے واضح دلائل کے ساتھ سنارہا ہے تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے! مطلب یہ ہے کہ نہ کوئی چیز حسن استدلال میں قرآن سے بڑھ کر ہو سکتی نہ عینی بیان اور قوت تاثیر و تسخیر میں، تو جب یہ ان کی عقلوں اور ان کے دلوں پر اثر انداز نہ ہو سکا تو اس سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے جو اثر انداز ہو سکے گی؟ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔ یہ دلیل اور بیان سے سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس وقت مانیں گے جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ



ہیں گے لیکن اس وقت کا مناسب سود ہوگا۔

‘بَعْدَہ’ کا مطلب بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اس دن کے آجانے کے بعد یہ لوگ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ ان کے نزدیک مدعا یہ ہے کہ اس انذار پر ایمان لانے کا نفع ہے تو آج ہے، جب وہ دن آجائے گا تو اس دن ایمان لائے تو کیا، نہ لائے تو کیا، اس وقت تو سب ہی ایمان لائیں گے لیکن اس سے کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا اگرچہ اس تاویل کا بھی احتمال ہے لیکن قرآن کے نظائر سے زیادہ واضح تائید اسی تاویل کی نکلتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: ‘فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ’ (الجماعہ صفحہ ۲۱۴) اور اللہ اور اس کی آیات سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے؟ احتمال اگرچہ دونوں ہی تاویلوں کی صحت کا ہے اور اصل مدعا میں بھی کچھ زیادہ بعد نہیں ہے لیکن اس تاویل میں وسعت زیادہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلیہ اوسع واحکم۔  
بتوفیق ایزدی ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَا لِحَمْدِ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَاٰخِرًا۔

رحمان آباد

۸۔ مارچ ۱۹۷۹ء

۸۔ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ







مَدِيرُ فَرَاغ

٤٨

الْبَابُ







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— المرسلات ————— کی توام سورہ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ جس طرح اس میں آفاقی، تاریخی اور انفسی دلائل سے یہ حقیقت ثابت کی گئی ہے کہ اس دنیا کے با مقصد و با غایت ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ ایک دن ختم ہوا اور اس کے بعد ایک ایسا فیصلہ کا دن آئے جس میں نیکو کاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے اور جو مجرم ہوں وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اسی طرح اس سورہ میں بھی ایک یوم الفصل کا اثبات فرمایا ہے جس میں خدا کے باغی اپنی سرکش کی سزا بھگتیں گے اور خدا ترس اپنی خدا ترسی کا انعام پائیں گے۔ استدلال اس میں خدا کی ربوبیت کے آثار و شواہد سے ہے جس سے آسمان و زمین کا چپہ چپہ معمور ہے۔

لب و لہجہ دونوں سورتوں کا بالکل ایک ہی ہے۔ کلام استفہام اقراری کے انداز میں شروع ہوا ہے جو ان متکبرین و مکذبین کو خطاب کرنے کے لیے مخصوص ہے جو بالکل بدیہی حقائق کو جھٹکانے کے درپے ہوں۔ دلائل کے پہلو بہ پہلو زبرد ملامت اور تہدید و تریخ ہر آیت میں نمایاں ہے۔ اہل ایمان کے لیے جو بشارت ہے وہ بھی گویا ان مکذبین کی تہدید ہی کے پہلو سے آئی ہے کہ وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے انجام بد کا موازنہ کر لیں۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۵) منکرین قیامت کی ان چھ میگیٹیوں پر زبرد توہین جو قیامت کا ذکر سن کر نہایت سفہانہ انداز میں وہ آپس میں کرتے۔ ان کو آگاہی کہ یہ خبر وہ خبر ہے کہ ان کے اندر عقل کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو اس کی فکر ان کو راتوں کی نیند سے محروم کر دیتی چہ جائیکہ وہ اس کا مذاق اڑائیں۔

(۶-۱۷) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، رحمت، حکمت اور قدرت کی ان نشانیوں پر غور کرتے کی دعوت جو زمین سے لے کر آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور جو شہادت دے رہی ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس



دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسئول بنا کر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کی عدالت کے لیے ایک دن مقرر ہے جو لازماً اس کے رہے گا۔

(۱۸-۳۰) ہولِ قیامت اور سرکشوں کے انجام کی تصویر، جس میں دکھایا ہے کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی اٹل یا خدا کے کنٹرول سے باہر نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کے حکم کے تابع ہے۔ جب وہ چاہے گا ایسا صورت پھونکے گا کہ سب قبروں سے نکل کر فوج در فوج اس کی طرف چل پڑیں گے۔ آسمان، زمین، دریا اور پہاڑ سب متزلزل، پراگندہ اور منتشر ہو جائیں گے۔ جہنم اس دن گھات میں ہوگی۔ وہی تمام سرکشوں کا ٹھکانا بنے گی۔ اس میں دکھ کی ساری چیزیں جمع ہوں گی لیکن لذت و راحت کا کوئی نشان بھی نہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور ہر شخص کا ہر عمل رجسٹر میں لکھا ہوا موجود ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا کہ جو انجام تھائے سامنے آیا ہے وہ تمہارے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اب اس کا منہ اچکھو۔

(۳۱-۳۶) اس دن خدا ترسوں کو جو صلہ ملے گا اس کی طرف اشارہ کہ وہ اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے عمل کے صلہ سے بھی محروم نہیں رہیں گے بلکہ اپنی ہر نیکی کا اجر پائیں گے۔ حق کی خاطر انھوں نے منافقین کے جوہر کے اور طعنے سے ان سب کا ان کو اجر ملے گا اور ان کو ایسی پاکیزہ سوسائٹی نصیب ہوگی جس میں ان لنوایات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوگا جن سے ان کو دنیا میں سابقہ رہا۔

(۳۷-۴۰) ان لوگوں کو تنبیہ جو باطل شفاعت کے بل پر اس دن کی ہولناکیوں سے نچنت ہیں۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہ دن اگر رہے گا تو جو اپنے رب کی پناہ کا طالب ہے وہ اس کی راہ اختیار کرے۔ اللہ کے ہاں کوئی اس کی اجازت کے بغیر کسی کے لیے سفارش کا مجازہ نہیں ہوگا اور اجازت کے بعد جو زبان کھولے گا وہ بالکل سچی بات کہے گا، کسی غلط بیانی کی جرأت کوئی نہیں کر سکے گا۔ اس دن ہر ایک کو اس کے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور کافروں کے پتے حسرت کے سوا کچھ پڑنے والا نہیں ہے۔



# سُورَةُ النَّبَا

مَكِّيَّةٌ \_\_\_\_\_ آيات: ٤٠

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ① عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيمِ ② الَّذِي هُمْ فِيهِ آيَاتٌ  
 مُّخْتَلِفُونَ ③ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ④ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ⑤ أَلَمْ  
 نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهْدًا ⑥ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ⑦ وَخَلَقْنَاهُكُمْ  
 أَزْوَاجًا ⑧ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ⑨ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ⑩  
 وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ⑪ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ⑫  
 وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ⑬ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً  
 ثَجَّاجًا ⑭ لَنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ⑮ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ⑯  
 إِنَّ يَوْمَ الْفُصْلِ كَانَ مُتِفًا ⑰ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ  
 أَفْوَاجًا ⑱ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ⑲ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ  
 فَكَانَتْ سَرَابًا ⑳ إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ㉑ لِلطَّاغِينَ  
 مَابًا ㉒ لِبِشِينٍ فِيهَا أَحْقَابًا ㉓ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا  
 شَرَابًا ㉔ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ㉕ جَزَاءً وَفَاقًا ㉖ إِنَّهُمْ  
 كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ㉗ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَابًا ㉘ وَكُلَّ



۱۳۰ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۝۲۹ فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۝۳۰  
 إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝۳۱ حَدَاقًا وَاعْنَابًا ۝۳۲ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝۳۳  
 وَكَأْسًا دِهَاقًا ۝۳۴ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِدًا ۝۳۵ جَزَاءُ  
 مِمَّن رَزَّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا ۝۳۶ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا  
 الرَّحْمَنُ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۝۳۷ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ  
 صَفًّا ۖ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝۳۸  
 ذَلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَا بَاءًا ۝۳۹ إِنَّ  
 أَنْذَرَكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا ۖ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ  
 وَيَقُولُ الْكَافِرُ لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا ۝۴۰

ترجمہ آیات  
۴۰-۱

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں؟ اس بڑی خبر کے بارے  
 میں جس میں کوئی کچھ کہہ رہا ہے کوئی کچھ! ہرگز نہیں، وہ عنقریب جان لیں گے، پھر ہرگز  
 نہیں، وہ جلد جان لیں گے!! ۱-۵

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو منجھیں نہیں بنایا؟ تم کو جوڑے جوڑے  
 نہیں پیدا کیا؟ تمہاری بنید کو دافعِ کلفت نہیں بنایا؟ رات کو تمہارے لیے پردہ اور  
 دن کو وقتِ معاش نہیں بنایا؟ تمہارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور اس  
 کے اندر ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ اور کیا ہم نے پانی سے لبریز بدلیوں سے  
 موسلا دھار پانی نہیں برسایا کہ اس کے ذریعہ سے اکائیں غلہ اور نباتات اور گھنے  
 باغ؟ — بے شک فیصلہ کے دن کا وقت مقرر ہے! ۶-۱۷



جس دن صور بھونکا جائے گا تو تم آؤ گے فوج در فوج اور آسمان کھولا جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلا دیے جائیں گے تو وہ بالکل سراب بن کر رہ جائیں گے۔ بے شک جہنم گھات میں ہے۔ سرکشوں کا ٹھکانا۔ اس میں رہیں گے مدتہائے دراز۔ نہ اس میں کوئی ٹھنڈک نصیب ہوگی، نہ گرم پانی اور پیپ کے سوا کوئی پینے کی چیز۔ بدلہ ان کے عمل کے موافق۔ یہ لوگ محاسبہ کا گمان نہیں رکھتے تھے اور انہوں نے ہماری آیتوں کی بے دریغ تکذیب کی اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر شمار کر رکھا ہے۔ تو چکھو، اب تمہارے عذاب ہی میں ہم اضافہ کریں گے۔ ۱۸-۳۰

بے شک خدا ترسوں کے لیے فائز المرامی ہے۔ باغ اور انگور۔ اٹھتی جوانیوں والی ہم سنیں، اور چھلکنے جام۔ نہ اس میں بک بک سنیں گے نہ بہتان طرازی۔ یہ تیرے رب کی طرف سے صلہ ہو گا بالکل ان کے عمل کے حساب سے۔

آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین کی ساری چیزوں کے رب رحمان کی طرف سے جس کی طرف سے یہ کوئی بات کرنے کا اختیار نہ رکھیں گے جس دن جبریل اور فرشتے صفت کھڑے ہوں گے کوئی بات نہیں کرے گا مگر جس کو رب رحمان اجازت دے اور وہ بالکل ٹھیک بات کہے گا یہ دن شدنی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا بنالے۔ ہم نے تم کو ایک قریب آ جانے والے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے، جس دن آدمی اپنی اس کمائی کو دیکھے گا جو اس نے آگے کے لیے کی ہوگی اور کافر کہے گا کاش، میں مٹی ہوتا! ۳۱-۳۴



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ (۱)

”عَمَّ“ دراصل ہے ”تَوْعَنًا“ لیکن عام استعمال میں جس طرح بعض حروف کی آواز دب جاتی ہے اسی طرح ”عَمَّا“ سے بھی ”الف“ ساقط ہو گیا ہے اور یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔

”تَسْأَلُ“ کے معنی آپس میں کسی چیز سے متعلق پوچھ گچھ کرنے کے ہیں۔ پوچھ گچھ دریافتِ حال

شکریہ قیامت

اور تحقیق کے لیے بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات محض سخن گستری اور استہزاء کے لیے بھی یہاں یہ استہزاء

کا استہزاء

کے مفہوم میں ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو جب انذارِ قیامت

پر مشتمل سورتیں سنائیں تو لب و لہجہ کی حوارت، اندازِ بیان کی سطوت و ہیبت اور دلائل کی قطعیت نے

ان کا چرچا بہت جلد ہر حلقہ میں پھیلا دیا۔ قریش نے اپنے عوام کو اس کے اثر سے بچانے کے لیے

جہاں بہت سی احمقانہ تدبیریں اختیار کیں وہاں یہ اچھی تدبیر بھی اختیار کی کہ اپنی مجالس میں اس

کو اپنے مذاق اور طبع آزمائی کا موضوع بنالیا تاکہ لوگوں پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ چیز کسی سنجیدہ غور و فکر

کے لائق نہیں ہے بلکہ محض خیالی ہوا ہے جس سے متاثر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب لوگ مرکزِ شغل جائیں گے تو وہ از سر نو زندہ کیے جائیں! بعض نے

اس پر گہرا لگاؤ کیا بھلا ہمارے اگلے بھی اٹھائے جائیں گے جو نہیں معلوم کب پونہ زمین ہوئے

اور ان کی قبروں کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا! تیسرے نے پر زور لہجہ میں اس کی تائید کی کہ ناممکن

ناممکن، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ سب محض خیالی باتیں ہیں۔

دوزخ اور اس کی آگ کالیوں مذاق اڑاتے کہ خوب ہوگی وہ آگ جس میں پانی بھی ہوگا اور خشت

بھی! دوسرا اس نکتہ پر اس کو دوا دیتا کہ بھلا یہ باتیں کسی کی عقل میں سماتے والی ہیں۔

جب قرآن نے ان کو آگاہ کیا کہ دوزخ پر انیس سرہنگ مامور ہوں گے تو اس کو انھوں نے

اپنی طبع آزمائی کا موضوع بنالیا۔ کوئی بولا کہ اگر اتنے ہی ہوں گے تو ان میں سے اتنوں سے تو میں تنہا

منٹ لینے کے لیے کافی ہوں۔ دوسرے نے ڈینگ بانکی کہ پھر کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے، باقی

سے نمٹنے کے لیے میں کمزور نہیں ہوں!

غرض قیامت اور اس کے احوال سے متعلق جو باتیں بھی ان کو سنائی گئیں ان سے سبق لینے کے

بجائے انھوں نے ان کو مذاق میں اڑا دینے کی کوشش کی تاکہ ان کے عوام ان سے متاثر نہ ہونے پائیں۔



ان کی اسی طرح کی باتوں کو یہاں 'تساءل' سے تعبیر فرمایا ہے اور نہایت تیز و تند انداز میں پوچھا ہے کہ یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کیا کر رہے ہیں۔

اس سوال سے اس سورہ کا آغاز اس کے مزاج کا پتہ دے رہا ہے کہ اس میں ان کو بتایا جائے گا کہ جس چیز کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ مذاق اڑانے اور سنہی دل لگی کی چیز نہیں بلکہ وہ سوچیں تو ان کے لیے سر پیٹنے اور خون کے آنسو بہانے کی چیز ہے۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِي هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۲-۳)

نبا کسی بڑے واقعہ یا اہم خبر کو کہتے ہیں۔ اس آیت سے پہلے اگرچہ حرف استفہام لفظاً مذکور نہیں ہے لیکن منشا یہ بھی اسی استفہام کے تحت ہے جو پہلے آیا ہے۔ اس کی نہایت واضح مثال سورہ انشراح میں موجود ہے۔ فرمایا ہے: 'اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ' (الانشراح ۱۰۴-۲) کیا ہم نے تمہارے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تمہارے بوجھ کو اتار نہیں دیا؟ یہاں 'وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ' کا ٹکڑا دیکھ لیجیے لفظاً استفہام کے تحت نہیں ہے بلکہ بالکل سادہ خبریہ اسلوب میں ہے لیکن منشا یہ اسی کے تحت ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔ اسی سورہ میں بھی آگے اس کی مثالیں آ رہی ہیں۔ مترجمین عام طور پر اس اسلوب نہیان سے نا آشنا ہیں اس وجہ سے وہ اس طرح کے انشائیہ جملوں کا ترجمہ خبریہ اسلوب میں کر دیتے ہیں جس سے کلام کا اصل زور واضح نہیں ہوتا اس لیے کہ انشاء اور خبر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اس بے دردی اور جبارت سے اس عظیم خبر کا مذاق اڑا رہے ہیں جو قیامت اور درجہ اولیٰٰ و ستر سے متعلق ان کو سنائی جا رہی ہے؟ یہ خبر تو ایسی ہے کہ حق تھا کہ اس کی فکر خواب و خور کی لذت سے ان کو محروم کر دیتی لیکن یہ ایسے شامت زدہ ہیں کہ اس سے ڈرنے اور اس کے لیے تیاری کرنے کے بجائے اس کو اپنے طنز و مذاق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔

الَّذِي هُمْ فِيْهِ يُخْتَلَفُوْنَ۔ لفظ اختلاف، بیک وقت دو معنوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک

مکرین قیامت

اختلاف رائے کو دوسرے تناقض نکر کو اور یہ دونوں معانی غور کیجیے تو معلوم ہوگا لازم و ملزوم ہیں اختلاف رائے تناقض فکر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر مکرین عرب سے متعلق ہم جگہ جگہ اس حقیقت کا اظہار کر چکے ہیں کہ قیامت کے باب میں وہ نہایت شدید قسم کے تناقض نکر میں مبتلا تھے۔ ایک گروہ ان کے اندر اس کا کلمہ کھلانے کا کرتا تھا اور دوسرا جس کی تعداد زیادہ تھی، صریح انکار کے بجائے اس پر مختلف قسم کے شبہات وار کرتا تھا۔ ان کا گمان تھا کہ اول تو اس کا ہونا ہی بہت مستبعد اور بعید از قیاس ہے۔



اور ہوٹی بھی تو اس کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا لوٹنا ہمارے دیوتاؤں کی طرف ہوگا جو ہمیں خدا کی پکڑ سے بچالیں گے اور اگر خدا سے سابقہ پڑا بھی تو اتنی بے شمار مخلوق کے ساتھ اعمال و اقوال کو کون جان سکتا ہے کہ وہ ان کا حساب کرنے بیٹھے۔ یہ اس خبط میں بھی مبتلا تھے کہ جب اس دنیا میں ان کا حال اچھا ہے جو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں اچھے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو عزت و سرفرازی اس نے ان کو اس دنیا میں دے رکھی ہے قیامت میں ان کو اس سے محروم کر دے۔

ان غلط خیالات کے ساتھ ساتھ وہ بہت سے ایسے صحیح عقائد کا اقرار بھی کرتے تھے جن سے ان باطل خیالات کی نفی ہوتی تھی لیکن قیامت اور جزا و سزا کو ماننا ان کی خواہش کے خلاف تھا اس وجہ سے وہ قرآن کی بار بار کی تذکیر کے بعد بھی اپنے فکری تناقض کا جائزہ لینے اور اس کو دور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے حالانکہ عقل اور فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان کو زندگی کے کسی ایسے معاملے میں اگر ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہو جس میں اس کی ابدی فلاح یا ابدی ہلاکت کا راز مضمر ہے تو ان لوگوں کی بات توجہ سے سننے جو اس کے تضاد و فکر سے اس کو آگاہ کر رہے ہوں تاکہ ہلاکت سے محفوظ رہے۔ یہ درحقیقت اس کی اپنی ضرورت ہے نہ کہ یا دہانی کرنے والوں کی۔ قرآن نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن ان کو جس عظیم واقعہ کی خبر دے رہا ہے اس کے بارے میں ان کا فکری تناقض اور کسی ذہنی الجھن میں مبتلا رہنا کسی طرح ان کے لیے خوش انجام نہیں ہے۔ یہ ابدی ہلاکت یا ابدی سعادت کا معاملہ ہے۔ قرآن کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے اس تضاد و اختلاف سے نکلنے کی ان کو راہ دکھائی ہے۔ حق تھا کہ وہ اس کی قدر کرتے لیکن انھوں نے اپنی بدیہی سے اس کو تفریح طبع کا موضوع بنا لیا ہے۔

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۖ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ (۵۰-۴۹)

یہ نہایت زوردار الفاظ میں ان کو تنبیہ ہے کہ جو لذتِ خواب وہ دیکھ رہے ہیں یہ ہرگز پورے ہونے والے نہیں ہیں۔ قرآن جس انجام سے ان کو آگاہ کر رہا ہے وہ عنقریب ان کے سامنے آکے گا۔ یہاں حمد کی تکرار محض دعوے کو مؤکد کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بیانِ حقیقت کے لیے ہے۔ اللہ کے رسولوں نے، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مقامات میں لکھ چکے ہیں، اپنی قوموں کو بیک وقت دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ اول اس عذاب سے جو سنتِ الہی کے مطابق ہر اس قوم پر لازماً آیا ہے جس نے رسول کی تکذیب کر دی ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جس میں وہ قیامت کے دن مبتلا ہوگی۔ ان دونوں عذابوں کو سامنے رکھ کر اس تنبیہی کلمہ کو دوبار دہرایا ہے۔

اَلْمَوْجِعِلِ الْاَرْضِ ۖ مِهْدًا ۙ وَ الْبِحَالِ ۙ اَوْ تَادَا ۙ وَ الْخَالِقِ ۙ اَوْ اَجَا ۙ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ

مکرمین کو

تنبیہ



سُبَّانَا ۖ وَجَعَلْنَا الْيَلَّ لِبَاسًا ۖ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۖ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا  
بَشَادًا ۖ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۖ وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۖ  
لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۖ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۖ إِنَّ يَوْمَ الْقِيَامِ كَانَ مِيقَاتًا (١٤٠-١٤١)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ان آثار کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس کی قدرت، آئینہ ربوبیت، حکمت، رحمت، ربوبیت، توحید، قیامت اور ایک روز جزا و سزا کے لازمی ہونے پر ایسی واضح حجت طے استدلال ہیں کہ کوئی سلیم الفطرت ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ آخر میں یہ نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَاتٍ مِّتَقَاتًا جو شخص بھی ان نشانیوں پر غور کرے گا وہ اس اعتراف پر مجبور ہوگا کہ اس کے بعد ایک فیصلہ کا دن ضرور آئے گا اور اس کا وقت اس کائنات کے خالق کے نزدیک معین ہے۔

اَلْوَنَجَّعِلِ الْاَرْضَ مَهْدًا لَا قَائِلَ لَهَا اَوْتَادًا۔ سب سے پہلے زمین اور اس کے پہاڑوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان اگر روزِ جزاء و نمر کو جھٹلاتا ہے تو کیا وہ ربوبیت کے اس اہتمام پر غور نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے، بغیر کسی استحقاق کے، کر رکھا ہے کہ زمین کو اس کے لیے گہوارے کی طرح قرار دے سکون کی جگہ بنایا ہے اور اس میں پہاڑوں کی میٹھیں ٹھونکی ہیں تاکہ یہ اپنی جگہ پر برقرار رہے، کوئی تزلزل اس میں نہ پیدا ہونے پائے۔

زمین کے اندر پہاڑوں کے ٹکراؤ اور زمین کے مختلف حکمتوں کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں۔ سابق سورہ میں بھی اس کی ایک عظیم مصلحت کی طرف اشارہ ہے۔ بعض مقامات میں اس کی یہ حکمت بھی بتائی ہے کہ زمین میں پہاڑ اس لیے گاڑے ہیں کہ وہ تمہارے سمیت کسی طرف لڑھک نہ جائے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اگر غور کرے تو یہ سمجھنے سے وہ قاصر نہیں ہے کہ جو رب اس زمین کے گہوارے میں اس اتہام سے اس کی پرورش کر رہا ہے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسا دن نہ لائے جس میں ان لوگوں کو انعام دے جنہوں نے اس کی ربوبیت کا حق پہنچا یا اُداس کو ادا کیا ہو اور ان لوگوں کو سزا دے جنہوں نے اس کی ناشکری اور نافرمانی کی ہو۔ ربوبیت کے ساتھ مسئولیت لازمی ہے۔ ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوٹے کہ اس کائنات کے خالق کے نزدیک شکر گزار اور نابکار دونوں برابر ہیں۔ یہ ایسی بھونڈی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

وَحَلَقْنَاهُ أَزْوَاجًا۔ اگرچہ اسلوب کلام باعتبار الفاظ خبریہ ہو گیا ہے لیکن معنایہ اللہ  
تَجَعَلَ الْأَرْضَ مِهْدًا اُہی پر معطوف ہے۔ اس کی وضاحت اپر آیت ۱-۲ کے تحت ہو چکی ہے۔

لَهُ وَآتَىٰ فِي الْأَرْضِ رِوَاسِيًا أَنْ قَمَيْدَ بِكُمْ رَالْعِجَلِ - ١٤ : ١٥ (اور زمین میں اس کے پہاڑوں کے  
منگڑال دیے کہ مبادا وہ تمہارے سمیت رطھک جائے۔)



یہ اشارہ ہے اس سب سے بڑے سامان تسلی کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں آدمی کے لیے مہیا کیا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے تمہیں تنہا نہیں پیدا کیا بلکہ تمہارے ساتھ تمہاری ہی جنس سے تمہارا جوڑا بھی بنایا تاکہ وہ تمہارے لیے طمانیت اور سکینت کا ذریعہ بنے۔ یہ امر واضح رہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے اور یہ جوڑے آپس میں ایسی گہری وابستگی رکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی تنہا اپنے مقصد تکمیل تک کو پورا نہیں کر سکتا۔ ان میں بظاہر تو نسبت غنّین کی ہے لیکن قدرت نے ان کے اندر ایسے ظاہری و باطنی داعیات رکھے ہیں کہ وہ باہم مل کر رہنے ہی میں سکون و راحت پاتے اور ایک برتر مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت جس طرح اس دنیا کے تمام اعضاء میں ہے اسی طرح میاں اور بیوی کے درمیان بھی ہے۔ اس چیز کی طرف قرآن نے سورۃ روم (۳۰) آیت ۲۱ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا تَتَزَكَّوْنَ اَلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان اس نے محبت اور نرم گساری رکھی)۔ اعضاء کے اندر اس توانی و سازگاری کو قرآن نے توحید اور قیامت کی دلیل کی حیثیت سے جگہ جگہ پیش کیا ہے جس کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

”وَجَعَلْنَا لَكُمْ نِسَابًا“۔ نسبت اور نسبت کے اصل معنی تو کاٹنے کے ہیں لیکن یہاں یہ دفع کلفت اور راحت و سکون کے معنی میں ہے۔ نیند کو نسبت اس وجہ سے کہا کہ یہ حرکت و عمل کے تسلسل کو منقطع کر کے کلفت سے نجات دیتی اور راحت و سکون حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے جس سے قوی تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

”وَجَعَلْنَا لَكُمْ لِبَاسًا“۔ رات کو تمہارے لیے لباس بنایا۔ رات کے لباس ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح لباس آدمی کو اپنے اندر چھپا لیتا اور سکون و اطمینان بخشتا ہے اسی طرح شب کی چادر بھی اس کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے جس سے وہ غل انداز ہونے والی چیزوں سے محفوظ ہو کر سکون حاصل کرتا اور از سر نو میدان عمل میں اترنے کے لیے صلاحیت بہم پہنچاتا ہے۔

”وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا“۔ اور دن کو حصول معاش کی سرگرمیوں کا وقت بنایا۔

ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانے سے مقصد یہ ہے کہ جو شخص بھی ان پر غور کرے گا اس میں بصیرت ہوگی تو وہ لازماً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ رات اور دن نہ از خود چکر کر رہے ہیں اور نہ ان کا یہ چکر بالکل بے غایت و بے مقصد ہے بلکہ ایک حکیم و تدبیر پروردگار اپنی خدمت کے لیے ان کو اس سرگرمی کے ساتھ معروف کیے ہوئے ہے تاکہ لوگ ان کی خدمت سے نائدہ اٹھائیں اور اپنے اس رب کے شکر گزار رہیں جس نے ان کی معاش و معیشت اور راحت و آسائش کے لیے یہ عظیم اہتمام فرمایا ہے۔



ساتھ ہی یاد رکھیں کہ ربوبیت کا یہ اہتمام مستلزم ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جس میں وہ دیکھے کہ کس نے اس دنیا میں آنکھیں کھول کر زندگی گزاری اور کون اندھے بہرے بنے رہے اور پھر دونوں کے ساتھ ان کے رویے کے مطابق معاملہ کرے۔

وَبَنَدِیْہِ اَفْوَقَکُمْ سُبْعًا مَّشْدَادًا۔ زمین کی نشانیوں کے بعد آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی۔  
فرمایا اب اوپر دیکھو ہم نے تمہارے اوپر سات محکم آسمان بنائے۔ آسمان کا ذکر اگرچہ یہاں الفاظ میں نہیں ہے لیکن جو صفات مذکور ہیں وہ خود دلیل ہیں کہ مراد آسمان ہی ہے۔ 'مشداد' سے مراد وہی بات ہے جو سورہ ملک میں یوں فرمائی گئی ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طَبَاقًا مَّا تَرٰی فِیْ  
خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفْوِیْطٍ مَّا رَجَعَ الْبَصَرُ  
ہَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ اَرْجِعِ الْبَصَرَ  
کَرْتِیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَارِسًا وَّ  
ہُوَ حَیْرٌ (الملك - ۶۷: ۳-۴)

جس نے پیدا کیے سات آسمان بہتہ بہتہ۔ تم خدا کے  
رحمان کی کاریگری میں کوئی غلط نہیں پا سکتے۔ تو نگاہ  
دور اندہ کہیں اس میں کوئی تشکاف دیکھتے ہو! پھر نگاہ  
دور اندہ دوبارہ۔ نگاہ ناکام ہو کر تمہاری طرف پلٹ  
آئے گی اور وہ تھک ہوئی ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ تم اس ناپیدا کنارہ چھت کو جہاں تک دیکھو گے اس کو محکم اور بالکل بے غلط پاؤ گے۔  
کسی گوشے میں کسی ادنیٰ نقص کی بھی نشاندہی نہیں کر سکتے۔

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا۔ اور آسمان میں ہم نے ایک روشن چراغ رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد  
سورج ہے۔ یہی سورج اس دنیا میں روشنی، حرارت اور قوت کا ذریعہ ہے۔ یہ نہ ہو تو یہ سارا عالم تیز و تا  
ہو جائے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ آسمان اور زمین میں الگ الگ دیوتاؤں کی حکمرانی نہیں ہے  
بلکہ دونوں میں ایک ہی خدا ہے قادر و قیوم کی حکومت ہے درہان میں یہ سازگاری کس طرح وجود میں آئی  
کہ آسمان کا سورج زمین والوں کی اس طرح خدمت گزاری کرتا۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً مُّتَجٰجًا۔ مُعْصِرٰتٌ بَادِلُوْنَ کِی صَفَتْ کے لیے معروف ہے۔  
یہ صفت پانی سے لبریز بادلوں کے لیے بھی آتی ہے اور پانی نچوڑنے والی بدلیوں کے لیے بھی۔ دونوں صورتوں  
میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔

مَآءٌ مُّتَجٰجٌ۔ زوردار، کثیر اور موسلا دھار بارش کو کہتے ہیں۔

بارش سے قرآن نے اپنے تمام بنیادی و عادی پر دلیل قائم کی ہے جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ یہاں  
اگرچہ آسمان و زمین کے توافقی کے پہلو سے توحید کی دلیل بھی اس میں موجود ہے لیکن خاص طور پر ربوبیت کا  
پہلو زیادہ نمایاں ہے جو مسئولیت اور جزاء و سزا کی نہایت اہم دلیلوں میں سے ہے۔

لِنُخْرِجَ بِہِ حَبًّا وَّ نَبَاتًا وَّ ذٰلِجٰتٍ اَلْفَافٌ۔ فرمایا کہ آسمانوں سے یہ بارش ہم اس لیے برساتے



ہیں کہ اس سے تمہارے لیے غلے اور تمہارے مویشیوں کے لیے گھاس اور سبزے اکائیں اور مزید بڑاں گھنے بلخ۔  
 'إِنَّ يَوْمَ الْفُصْلِ كَانَ مِيقَاتًا' یہ اوپر کی ساری بحث و تفصیل کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے  
 کہ یہ اہتمام ربوبیت اور آسمان سے لے کر زمین تک یہ انتظام پرورش صاف گواہی دے رہا ہے کہ  
 جس پروردگار نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ انسان کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ لازماً ایک فیصلہ کا دن  
 اس نے مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ سب کو جمع کر کے فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی ربوبیت کا حق پہچانا  
 اور کس نے اس کی تائیدی کی۔ پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

یہاں یہ آیت اس طرح آئی ہے گویا یہ یوم الفصل اس کائنات کے نظام کے اندر سے خود اپنی  
 منادی کر رہا ہے۔ بدست ہیں وہ لوگ جو اس کو سن نہیں رہے ہیں۔ سعدیؒ نے کیا خوب بات کہی ہے: ع

ابرو باد و مر و خورشید و نلک در کارند تا تو ندانی بکف آرمی و بغفلت نہ خورم  
 'يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا' وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا وَ  
 سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِلطَّاغِينَ مَابًا  
 لِّبَشِيرٍ فِيهَا أَهْقَابًا لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا  
 جَزَاءً وِفَاقًا إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَابًا وَكُلُّ شَيْءٍ  
 أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا (۱۸-۳۰)

ادپر کی آیات میں یوم الفصل کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب ان آیات میں اس لمحہ کی  
 تصویر کھینچی گئی ہے جو اس دن اس پوری کائنات میں برپا ہوگی اور ساتھ ہی وہ انجام بھی سامنے  
 رکھ دیا گیا ہے جس سے سرکشوں اور نافرمانوں کو سابقہ پیش آئے گا۔

تیاست کی  
 بچوں کی تصویر

'يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا' فرمایا کہ اس یوم الفصل کے لیے اللہ تعالیٰ تمہیں  
 جمع کرنا چاہے گا تو اس کام میں اس کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بس ایک صور پھونکا جائے گا  
 اور تم فوج در فوج تہوں سے نکل کر اللہ کے داعی کی طرف چل کھڑے ہو گے۔ دوسرے مقام میں یہ  
 تصریح بھی ہے کہ لوگ تہوں سے اس طرح نکلیں گے جس طرح ٹڈیاں نکلتی ہیں اور داعی کی طرف  
 اس طرح بھاگیں گے کہ ذرا بھی راہ سے منحرف نہیں ہوں گے۔

'وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا' اور یہ آسمان جو آج نہایت محکم اور ایک گنبد بے در کی شکل  
 میں نظر آتا ہے اس دن اس طرح کھول دیا جائے گا کہ اس میں ہر طرف دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے۔  
 'وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا' اور یہ پہاڑ جو آج زمین میں گڑے ہوئے ہیں اس دن اکھاڑ  
 کر چلا دیے جائیں گے نیز آج وہ ٹھوس پتھر ہیں لیکن اس دن یہ ریت کے تودوں کی طرح پھس پھسے  
 ہو جائیں گے۔







‘فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا’۔ یہ مستقبل کے ماجرے کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے حاضر کے اسلوب میں بدل دیا ہے۔ فرمایا کہ تم تو اس انجام سے بے فکر رہے لیکن یہ لو، اپنا اعمال کا مزہ چکھو۔ ساتھ ہی مستقبل سے ان کو بالکل مایوس کر دینے کے لیے یہ آگاہی بھی سنادی کہ اب آگے تمہارے لیے عذاب ہی عذاب ہے۔ اس میں کسی کمی بیشی کی امید نہ رکھو اب جو تبدیلیاں بھی تمہارے مال میں ہوگی اس کی نوعیت عذاب میں اضافے ہی کی ہوگی۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۖ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ۖ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۖ وَكَاسًا شَدِيدًا طَاقًا ۖ  
لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذًّا ۚ بَابًا ۖ جَنَّاتُ عَدْنٍ مِّنْ رَّبِّكَ عَطَا أَعْجَبًا ۙ (۳۶-۳۱)

سُرکشوں اور باغیوں کے انجام کے بعد یہ متقیوں کا ملکہ بیان ہوا ہے تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے۔ فرمایا بے شک ان لوگوں کے لیے اس دن بڑی فیروز مندی و کامیابی ہے جنہوں نے روزِ جزا و سزا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری۔ یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ زندگی کو جادہ متقیتم پر استوار رکھنے والی چیز خوفِ آخرت ہی ہے۔ جس کے اندر یہ ہے وہ متقی ہے اور جس کا سینہ اس خوف سے خالی ہے اس کے اندر شیطان اپنا مسکن بنا لیتا ہے اور وہ خدا کی نافرمانی بالکل بے خوف ہو کر کرتا ہے۔

‘حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا’۔ یہ کامیابی کی تفصیل ہے کہ ان کے لیے باغ ہوں گے اور انکو رَحْدَائِقُ معروف تو کھجور کے باغوں کے لیے ہے لیکن کھجور کے باغوں کے لیے عمدہ طریقہ یہ تھا کہ کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو اور بیچ میں انگوروں اور دوسرے پھلوں اور سبزیوں کے قطعات۔ یہاں ‘حَدَائِقُ’ کے بعد ‘أَعْنَابٌ’ کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کے طور پر ہے اور اس سے اگر انگورستان مراد لیں تو یہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔

‘وَكوَاعِبَ أَتْرَابًا’۔ یہ حوروں کا ذکر ہے۔ ان کی تعریف میں فرمایا کہ یہ اٹھتی ہوئی جوانیوں والی اور باہم دگر بالکل ہم سن ہوں گی۔ ہم سنی آپس کی بے تکلفی، دل چسپی اور ہم طرحی و ہم مذاقی کے لیے فوری چیز۔

‘وَكَاْسًا شَدِيدًا طَاقًا ۖ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذًّا ۚ بَابًا ۖ’۔ یعنی ان کے لیے شراب خاص کے چھپکنے جہاں ہوں گے لیکن یہ شراب ان لغویات اور لاف زنیوں سے بالکل پاک ہوگی جو اس دنیا کی شراب کے لوازم میں سے ہیں۔ کیف و سرور میں وہ سب سے بڑھ کر ہوگی لیکن عقل و ہوش کو مائل نہیں کرے گی کہ ترنگ میں آکر آدمی یا وہ گوتی اور دروغ بانی پر اترا آئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شراب کی بدستی میں بسا اوقات شرابی ایسی بے ہودہ تمتمیں بکسا دیتے ہیں جو خاندانوں اور قبیلوں میں مستقل عناد کا سبب بن جاتی ہیں۔ جن سوسائٹیوں میں غیرت کا احساس مردہ ہو جاتا ہے ان کے اندر تو اس طرح کی باتیں لوگ پی جاتے ہیں لیکن اہل عرب نہایت حساس و غیور تھے۔ شراب کی بدستی میں بھی اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ نکال دے جس سے دوسرے کے ناموس پر حرف آتا ہو تو اس کے



نتائج اتنے دور رس ہوتے کہ ان کی تلافی ناممکن ہو جاتی۔ یہاں قرآن نے لفظ 'كَذَّابٌ' سے اسی طرح کی باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

جَزَاءُ مَن رَّبَّكَ عَطَاؤُهُ سَابَّاً۔ جس طرح اوپر کفار کے بارے میں فرمایا ہے: جَزَاءُ رَفَاتًا ان کو ان کے اعمال کے بالکل ہم وزن اور ٹھیک ٹھیک ان کے موافق سزا ملے گی اسی طرح یہ اہل جنت کے باب میں فرمایا کہ ان کو ان کی نیکیوں کا پورے حساب سے صلہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اور اہل ایمان کے لیے فضل کا جو وعدہ ہے وہ مزید برآں ہے۔

رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَنُ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَاباً (۳۷)

فرمایا کہ اہل ایمان کے لیے یہ صلہ (جو نذر ہوا) اسی خدا نے رحمان کی طرف سے ہو گا جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری ہی چیزوں کا خداوند ہے، کوئی دوسرا کسی چیز میں اس کا شریک ہسیم نہیں ہے کہ وہ کسی کو کچھ دے سکے۔

لَا يَسْتَكْبِرُونَ مِنْهُ خِطَاباً۔ یہ کفار اور ان کے مزعومہ معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کے معبودوں کو خدا کے ہاں بڑی رسائی ہوگی۔ یہ جو چاہیں گے خدا سے کہہ سکیں گے اور جو چاہیں گے منوا سکیں گے، یہ خیال بالکل باطل ہے۔ کوئی بھی مجاز نہ ہو گا کہ اس سے کوئی عرض معروض کر سکے، اس کے سامنے وہی زبان کھولیں گے جن کو اس کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور وہی بات منہ سے نکالیں گے جو بالکل حق ہوگی۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا أَلَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ دَقَّارَةً أَبَا (۳۸)

مشرکین کو سب سے زیادہ اعتماد فرشتوں کی سفارش پر تھا جن کو وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کی بیٹیاں فرض کر کے پوجتے تھے۔ فرمایا کہ اس دن ان کا حال یہ ہو گا کہ جبریلؑ اور دوسرے ملائکہ رب العزت کے سامنے اس طرح صف بستہ حاضر ہوں گے جس طرح قدام اپنے آقا کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی زبان کھولنے میں پہل نہیں کرے گا بلکہ وہی بات کرنے کی جرات کریں گے جن کو خدا نے رحمان کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور وہی بات کہیں گے جو بالکل ٹھیک ہوگی۔ یعنی اگر مشرکین اس خطبہ میں مبتلا ہیں کہ ان کے دیوی دیوتا خدا سے جو بات چاہیں گے ناز و تدلل سے منوا لیں گے اور ان کے حق میں جو سفارش چاہیں گے کر دیں گے تو محض ان کی طمع خام ہے۔

یہاں روح سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ ان کے لیے قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ ملائکہ کے کل سرسبد ہی میں اس وجہ سے ان کا ذکر سب سے پہلے ہوا تاکہ واضح ہو جائے کہ جب اس دن



جبریل کا یہ حال ہوگا تو نابہ دیگران چہ رسد! بعض لوگوں نے اس کو علم ادراج انسانی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس کا یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَسَنُشَآءُ نَحْنُ اِلٰی رَبِّهِ مَا يَآ (۳۹)

یہ برادیتِ ذمہ کا اعلان ہے کہ لوگوں کو اس دن کی آمد سے آگاہ کرنا ضروری تھا سو یہ کام کر دیا گیا۔ اب لوگوں کی ذمہ داری اپنی ہے۔ فرمایا کہ جس دن کی آمد سے یہ ڈرایا جا رہا ہے وہ ایک امر شنی ہے۔ وہ آکے رہے گا۔ نہ کوئی اس کو ٹال سکتا، نہ کوئی اس دن کسی کے کام آنے والا بنے گا تو جو اپنی خیر چاہے وہ اپنے رب کے پاس اپنا ٹھکانا بنائے۔

’فَسَنُشَآءُ نَحْنُ اِلٰی رَبِّهِ مَا يَآ‘ سے ایک بات تو یہ نکلی کہ اس معاملہ میں اللہ اور رسول کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اس دن سے آگاہ کر دیا جائے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف اتار بھی دیا جائے۔

دوسری بات یہ نکلی کہ اس دن پناہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بنے گا، کسی اور کی پناہ اس دن کسی کو حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

تیسری بات یہ نکلی کہ اللہ کو پناہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اس کی بتائی ہوئی راہ اختیار کی جائے جس نے یہاں اس کی راہ نہیں اختیار کی وہ آخرت میں اس کی پناہ نہیں حاصل کر سکے گا۔ اَنَا اُنْذَرْتُكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ اَيُّوْمٍ يَنْظُرُوْنَ اَبْرَءُ مَا قَدَّمْتُمْ يَدًا ۚ وَيَقُوْلُ لُكْفِرُوْا نَلِيْسَتِيْ كُنْتُ مُّرَآءَا (۴۰)

یہ آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ایک ایسے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے جو بالکل قریب آچکا ہے۔ یعنی رسول کی بعثت کے بعد اب قوم کا فیصلہ ہونا تو سنتِ الہی کے مطابق قطعی ہے اور یہ عذاب منکروں کے لیے عذابِ قیامت کا پیش خیمہ ہوگا۔ یوں بھی عذابِ قیامت کو دور خیال کرنا نادانی ہے۔ اس لیے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے اور جو مرا اس کی قیامت اس کے سامنے ہے۔ من مات فقد قامت قیامتہ۔ ’وَيَقُوْلُ لُكْفِرُوْا نَلِيْسَتِيْ كُنْتُ مُّرَآءَا‘ یعنی اس دن ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے آئیں گے اور جنہوں نے اس دن کے لیے کوئی تیاری نہ کی ہوگی وہ اپنی محرومی اور بدبختی پر اپنے سر پٹیں گے کہ کاش ہم مٹی ہی رہے ہوتے، ہمارا وجود ہی نہ ہوا ہوتا!!

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد لله اولاً و آخراً۔

رحمان آباد

۴۔ اپریل ۱۹۷۹ء

۶۔ جمادی الاول ۱۴۰۰ھ



تذکرہ قرآن

۷۹

الزُّرْعَةُ







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود

اس سورہ میں بھی قریش کے ان متمرّدین کو انداز ہے جو عذاب اور قیامت کو بالکل بعید از امکان محض ایک دھکی خیال کرتے تھے۔ ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات شہادت میں پیش کر کے ان کو آگاہ فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے محفوظ نہ سمجھو اور رسول کو جھٹلانے کی جسارت نہ کرو۔ تم اسی وقت تک محفوظ ہو جب تک خدا نے تم کو مہلت دے رکھی ہے۔ جو نہی یہ مہلت ختم ہوئی خدا کی پکڑ میں آ جاؤ۔ اے اور اس کے لیے خدا کو کوئی اتہام نہیں کرنا پڑے گا۔ یہی ہوائیں اور یہی بادل جو ہر جگہ موجود اور تمہاری زندگی کے لیے ناگزیر ہیں، قہر الہی کی شکل اختیار کر لیں گے اور تمہیں جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔

تمہید اور مطالب کے اعتبار سے یہ سورہ، سورہ ذاریات اور سورہ مرسلات سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ دنیا میں خدا کی پکڑ اور اس کی قدرت و ربوبیت کی جو شائیں بالکل نمایاں ہیں وہ اس امر کی نہایت واضح دلیل ہیں کہ ایک المیادن لازماً آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان سرکشوں کو سزا دے گا جنہوں نے اس کے حکم سے سرباہی کی اور ان لوگوں کو اپنی ابدی رحمت سے نوازے گا جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے اور اپنی خواہشوں کو لگام لگاتے رہے۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۵) ہواؤں اور بادلوں کی شہادت اس امر پر کہ اللہ کا رسول دنیا اور آخرت کے جس عذاب سے آگاہ کر رہا ہے اس کا واقع ہونا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے جس خدا کے ہاتھ میں ہواؤں اور بادلوں کی باگ ہے وہ ان کو جس کے لیے چاہے رحمت اور جس کے لیے چاہے عذاب بنا دے۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ دنیا میں رسولوں کے مکذّبین کی جو تاریخ موجود ہے وہ شہادت دیتی ہے کہ ایک دن سب کو اپنے رب کے آگے حساب و کتاب کے لیے پیش ہونا ہے۔



(۶-۱۴) قیامت کی پہلی اور اس دن اس کے جھٹلانے والوں پر جو گزرے گی اس کی تصویر۔  
 (۱۵-۲۶) قریش کے فراعنہ کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت  
 کہ نئے حصہ کی یاد دہانی جس کے لیے سورہ کا عمود مقفنی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت  
 ناصحانہ انداز میں فرعون کو راہ حق پر لانے کی کوشش کی لیکن اس نے اکر دکھاٹی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ  
 وہ خدا کی پکڑ میں آگیا۔ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ ہواؤں کے معمولی  
 تصرف ہی نے اس کا سارا بیڑا غرق کر دیا۔

(۲۷-۳۳) اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو از سر نو پیدا کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں  
 ہے۔ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے، رات اور دن نمودار کیے، لوگوں کی پرورش کے لیے طرح طرح  
 کے سامان مہیا کیے اس کے لیے لوگوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے؟ اس کی قدرت دلیل ہے  
 کہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت مقفنی ہے کہ وہ ایسا کرے۔

(۳۴-۴۱) باغیوں اور نافرمانوں کو اس دن جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کا بیان۔  
 ان کے بالمقابل اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو جو صلہ ملے گا اس کی بشارت۔

(۴۲-۴۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو لوگ تمہیں زچ کرنے کو قیامت کی تاریخ اور  
 اس کے دن کی بابت سوال کرتے اور اس کے لیے جلدی مچا رہے ہو تمہیں تم ان کی باتوں کا دھیان  
 نہ کرو۔ قیامت کے دن اور اس کی تاریخ کا معاملہ تم سے متعلق نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردہ۔  
 تم اس کے ظہور کا دن معین کرنے نہیں آئے ہو، بلکہ اس سے لوگوں کو آگاہ کرنے آئے ہو۔ آج جن کو  
 قیامت بہت بعید معلوم ہو رہی ہے جب وہ اس کو دیکھیں گے تو محسوس کریں گے کہ دنیا میں ایک سپر  
 یا ایک دپہر سے زیادہ نہیں رہے۔



# سُورَةُ النَّازِعَاتِ

مَكِّيَّةٌ ————— آيات: ٤٦

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آيات  
٢٦-١

وقف لازم

وقف لازم

وقف لازم

وقف لازم

٢٦-١

وَالنَّازِعَاتِ غُرُقًا ① وَالنَّشِيطَاتِ نَسْطًا ② وَالسَّابِقَاتِ سَبَاحًا ③ فَالسَّابِقَاتِ سَبَقًا ④ فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا ⑤ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ⑥ تَتْبِعُهَا الرَّادِفَةُ ⑦ قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ⑧ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ⑨ يَقُولُونَ عَرَانَا كَرُّدُون ⑩ فِي الْحَافِرَةِ ⑪ إِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ⑫ إِذَا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ⑬ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ⑭ فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ ⑮ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ⑯ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ⑰ إِذْ هَبَّ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى ⑱ فَقُلْ هَلْ لَكَ إِلَى أَنْ تَزَكَّى ⑲ وَأَهْدِيكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَخْشَى ⑳ فَارَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَى ㉑ فَكَذَّبَ وَعَصَى ㉒ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَى ㉓ فَحَشَرَ فَنَادَى ㉔ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ㉕ فَآخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَى ㉖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَخْشَى ㉗ عَرَانَا أَشَدُّ خَلْقًا مِّنَ السَّهَابِ يَنْهَأ ㉘ رَفَعَ ㉙



سَمَكُهَا فَسَوَّيْنَاهَا ۝ ۲۸ ۝ وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ صُحُفَهَا ۝ ۲۹ ۝  
وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ۝ ۳۰ ۝ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ۝ ۳۱ ۝  
وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا ۝ ۳۲ ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝ ۳۳ ۝ فَإِذَا جَاءَتِ  
الطَّامَّةُ الْكُبْرَى ۝ ۳۴ ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَى ۝ ۳۵ ۝ وَ  
بُرْزَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَرَى ۝ ۳۶ ۝ فَأَمَّا مَنْ طَغَى ۝ ۳۷ ۝ وَاتَّخَذَ الْجِبَاطَةَ  
الدُّنْيَا ۝ ۳۸ ۝ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى ۝ ۳۹ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَافَ  
مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى ۝ ۴۰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ  
الْمَأْوَى ۝ ۴۱ ۝ يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۝ ۴۲ ۝ فِيمَ  
أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا ۝ ۴۳ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَاهَا ۝ ۴۴ ۝ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرُ  
مَنْ يَخْشَاهَا ۝ ۴۵ ۝ كَانَهُمْ يَوْمَ يُدُونُهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً  
أَوْ صُحُفًا ۝ ۴۶ ۝

۲۴۰

ترجمہ  
۲۴۰-۱

شاہدیں جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے والی ہوائیں۔ اور شاہدیں آہستہ چلنے  
والی ہوائیں اور شاہدیں فضاؤں میں تیرنے والے بادل، پھر ایک دوسرے پر  
سبقت کرنے والے اور خدا کے حکم نازل کرنے والے (کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا  
جارہا ہے وہ شدنی ہے) ۱-۵

اس دن سے ڈرو جس دن کپکپی پڑے گی۔ اس کے پیچھے ایک دوسرا جھٹکا  
آئے گا۔ کتنے دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں پست ہوں گی۔ ۶-۹  
پوچھتے ہیں کیا ہم پھر پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے کیا جب کہ ہم کھنکھنا تی



ہڈیاں ہو چکیں گے! کہتے ہیں، یہ لوٹایا جاتا تو بڑے ہی خسارے کا ہو گا!! ۱۰-۱۲  
 وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہو گی کہ دفعۃً وہ میدان میں آ موجود ہوں گے۔ ۱۳-۱۴  
 کیا موسیٰ کی سرگزشت تمہیں پہنچی ہے؟ جب کہ اس کے رب نے وادی  
 مقدس — طوی — میں اس کو لپکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت  
 سراٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟  
 کیا میں تمہیں تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے والے بنو؟ پس اس  
 کو ایک بڑی نشانی دکھاٹی تو اس نے جھٹلایا اور بات نہ مانی۔ پھر پٹیا اپنی سرگرمیوں  
 کو تیز کرتے ہوئے۔ پس جمع کیا اور اعلان کیا کہ تمہارا رب اعلیٰ تو میں ہوں۔ پس  
 اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا۔ بے شک اس میں سبق ہے  
 ان لوگوں کے لیے جو ڈر رکھنے والے ہیں۔ ۱۵-۲۶

کیا تمہارا بنانا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اس کو اٹھایا، اس کے  
 گنبد کو بلند کیا، پس اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ اس کی رات ڈھانک دی اور  
 اس کے دن کو بے نقاب کیا اور زمین کو اس کے بعد ہموار کیا۔ نکالا اس سے  
 اس کا پانی اور چارہ اور پہاڑوں کو اس میں گاڑا۔ تمہاری اور تمہارے موشیوں  
 کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۷-۳۲

پس جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہو گا (تو یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا)،  
 اس دن انسان اپنے کیسے کو یا دکرے گا اور دوزخ ان لوگوں کے لیے بے نقاب  
 کر دی جائے گی جن کو اس سے دور چار ہونا ہے۔ تو جس نے سرکشی کی اور آخرت



کے بالمقابل دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا تو بس جہنم ہی بنے گی۔ اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا تو اس کا ٹھکانا لاریب جنت ہے۔ ۴۱-۴۲

وہ قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب کھڑی ہوگی؟ تم اس بحث میں کہاں پڑے ہو! یہ معاملہ تو تیرے رب کے حوالہ ہے۔ تم تو بس ان لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے والے ہو جو اس سے ڈریں۔ جس روز وہ اس کو دیکھیں گے تو گویا انھیں ایک شام یا اس کی صبح سے زیادہ وقفہ نہیں گزرا۔ ۴۲-۴۶

---



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالنَّزْعَاتُ غُرُقًا ۖ وَالشَّيْطَانُ نَسُطًا (۱-۲)

’نازعات‘ اور ’ناشطات‘ کی تادل میں یوں تو متعدد اقوال منقول ہیں لیکن غالب رائے یہ ہے ’نازعات‘ کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی جانیں سختی سے اور اہل ایمان کی جانیں نہایت نرمی سے لگاتے ہیں۔ سے مراد اگرچہ اس قول کو شہرت حاصل ہے لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں وہ بالکل تفسیری نوعیت کی ہیں۔ جن کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکے۔ قرآن میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے اس قول کے حق میں کوئی تائید نکلتی ہو۔ اہل کفر اور اہل ایمان کی جانوں کے نکالنے کا معاملہ تمام تر ایک روحانی و باطنی کیفیت سے تعلق رکھنے والا معاملہ ہے، وہ کوئی ایسی عام شاہدے میں آنے والی چیز نہیں ہے کہ اس کو کسی دعوے پر بطور حجت پیش کیا جاسکے درآنحالیکہ یہ قسمیں یہاں بطور شہادت کھائی گئی ہیں۔ مفسرین کے نزدیک چونکہ ضروری ہے کہ قسم کسی مبارک و مقدس چیز کی ہو اس وجہ سے انھیں ان الفاظ سے فرشتوں کو مراد لینے کا تکلف کرنا پڑا لیکن ہم برابر واضح کرتے آرہے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بالعموم کسی دعوے پر بطور شہادت آئی ہیں۔ ان کے اندر نمایاں پہلو دعوے پر دلیل کا ہوتا ہے۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ جس کی قسم کھائی گئی ہے وہ کوئی مقدس چیز ہے یا غیر مقدس۔

ہمارے نزدیک ’نازعات‘ سے مراد وہ تند ہوائیں ہیں جو درختوں، مکانوں اور گری ہوئی چیزوں کو اپنے زور سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس طرح کی ہواؤں کی صفت کے طور پر ’نازعات‘، ’مرسلات‘ اور ’عاصفات‘ وغیرہ الفاظ بھی قرآن میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ ’ذُرُفًا‘، ’عُذُفًا‘ اور ’عَصْفًا‘ کے الفاظ بطور تاکید آئے ہیں۔ اسی طرح یہاں لفظ ’نازعات‘ ان تند ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے جو درختوں اور مکانوں کو اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس کے ساتھ لفظ ’غُرُقًا‘، معنی کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید ہے۔

قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے بادِ تند کا جو عذاب مسلط فرمایا اس کی تصویر سورہ قمر میں یوں کھینچی گئی ہے:

وَاِنَّا ارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا  
فِي يَوْمٍ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنْفَخُ النَّاسُ كَآثِمًا  
اَعْمَارًا لِّخَلْ مُنْقَعِرَةٍ (القمر- ۵۴، ۵۵، ۵۶)

ہم نے ان پر ایک طویل نحوست کے زمانے میں  
بادِ صرصر مسلط کر دی جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی  
گویا وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہوں۔



یہاں فعل 'تَنْزِعُ' استعمال ہوا ہے اسی سے اس سورہ میں 'ناذعات' بطور صفت استعمال ہوا ہے۔  
 'ناشطات' کے مادہ سے ہے جس کے معنی کسی کام کو نرمی سے کرنے کے بھی آتے ہیں اور  
 کسی رسی کی گرہ یا کسی جانور کے بندھن کو چرنے پگنے کے لیے چھوڑ دینے کے معنی میں بھی۔ یہاں قرینہ تبارک  
 ہے کہ یہ نرم رد اور آہستہ خرام ہواؤں کے لیے آیا ہے جس طرح سورہ ذاریات میں 'فَالْبَحْرِ يَنْسُجُ' کے  
 الفاظ آئے ہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ تند اور نرم رد ہواؤں کے عمل کی ظاہری نوعیت اگرچہ الگ تھلک ہے لیکن  
 اللہ تعالیٰ کے عجائبات تصرف کی شانیں دونوں کے اندر نمایاں ہیں۔ سورہ ذاریات میں سیاق کلام اور ہے  
 اس وجہ سے ہوا کی نرم ردی کا ذکر بارش کے مقدر کے طور پر آیا ہے۔ یہاں اس کا ذکر مستقلاً ہوا ہے اس  
 وجہ سے یہ رحمت اور نعمت دونوں کو محتمل ہے۔ رحمت کے لیے اس کا محتمل ہونا تو بالکل واضح ہے کہ ہوا  
 کی مروجہ جنبانی ہی زندگی اور راحت و نشاط کا ذریعہ ہے لیکن اس کا رحمت یا نعمت بننا کیلئے اللہ تعالیٰ ہی  
 کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو بعض اوقات اس کی نرم ردی کو بھی عذاب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ آگے  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے تند پوربی ہوا کے تصرف سے نجات دی اور اسی  
 ہوا کے سکون کو فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔

وَالسَّيِّحَاتِ سَبْحًا ۚ فَالسَّيِّحَاتِ سَبْقًا ۚ فَالْمَدِ يَنْزِعُ امْرًا (۳-۵)

'سَبْحًا' سے ہے جس کے معنی تیرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرینہ اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں  
 یہ بادلوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ اول تو ہواؤں اور بادلوں کا تعلق ہے ہی کچھ لازم و ملزوم سی چیز  
 لیکن ایک واضح قرینہ یہاں یہ ہے کہ اس کے بعد اس کی دو صفتیں جو مذکور ہوئی ہیں وہ 'ف' کے ساتھ مذکور  
 جو عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ صفتیں 'سَبْحًا' ہی کی ہیں اور ان میں باہم دگر ترتیب  
 بھی ہے۔ اس قاعدے کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ 'فَالسَّيِّحَاتِ سَبْقًا ۚ فَالْمَدِ يَنْزِعُ امْرًا' کے الفاظ میں بادنی  
 تغیر الفاظ وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورہ ذاریات میں 'فَالْبَحْرِ يَنْسُجُ' کے الفاظ میں بادنی  
 کے الفاظ میں اور سورہ مزلت میں 'فَالْفِرْقَتِ فَوْقًا ۚ فَالْمَلُكِيَّتِ ذِكْرًا' کے لفظوں میں  
 فرمائی گئی ہے۔ مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ بادلوں سے لڑی ہوئی ان ہواؤں کی  
 صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس سرزمین کی طرف چلتی ہیں جس کے لیے حکم ہوتا ہے اور پھر وہ  
 وہ امر الہی کی تقسیم کرتی ہیں یعنی جن کے لیے حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتی ہیں۔ کسی علاقے پر وہ رحمت بن  
 کر برستی ہیں اور کسی کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ کسی جگہ جل تھلک کر دیتی ہیں اور کسی جگہ کو خشک یا تشہ چھوڑ



جاتی ہیں۔ گویا جو بات سورۃ ذاریات میں **فَالْمُتَّقِينَ أَزْوَاجٌ** کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں **فَالْمُتَّقِينَ أَزْوَاجٌ** کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

اس سے پہلے **فَالْمُتَّقِينَ أَزْوَاجٌ** کے الفاظ بادلوں کی اس بھاگ دوڑ کی تصویر پیش کر رہے ہیں جو فضا میں اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ان کے مختلف دستے ایک دوسرے پر سبقت کرتے دیکھے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ سب اپنے غیبی حاکم کے حکم کی تعمیل میں سرگرم لگا پڑے ہیں اور ہر ایک اس بات کا آرزو مند ہے کہ انتقال امر میں اول نمبر اسی کا رہے۔

ان قسموں کا مقسم علیہ یہاں لفظوں میں مذکور نہیں ہے بلکہ محذوف ہے۔ مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ سورۃ ص، سورۃ ق اور سورۃ تباہ سب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مقسم علیہ محذوف ہے۔ خدشہ کر دیا گیا ہے۔ جہاں ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو وہاں حذف ہی ادنیٰ ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ قیامت کی پہل کی بے خبری کا ذکر آگے تفصیل سے موجود ہے، جو مقسم علیہ کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے، اس وجہ سے اس کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس محذوف کو کھولنا چاہیں تو سورۃ مرسلات کی روشنی میں **إِنَّمَا تُنَادُوا وَنَادُوا فَرَجًا** کے الفاظ یہاں محذوف مان سکتے ہیں۔ گویا تنداد و نرم ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تصرفات کو شہادت میں پیش کیے قریش کے متمرّدین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تمہیں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اس کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ جب اس کو لانا چاہے گا تو اس کے لیے کوئی خاص انتہام اس کو نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کی ہواؤں اور اس کے بادلوں کے تصرفات کی جو تاریخ موجود ہے اور جو تمہیں سنائی بھی جا چکی ہے اگر اسی سے سبق حاصل کر دو تو وہی تمہارے لیے کافی ہے۔ تم سے کہیں زیادہ طاقتور تو ہیں اس زمین پر بسے ہیں جن کو خدا نے اپنی ہواؤں ہی کے ذریعہ سے خشک خاک کی طرح اڑا دیا۔

**يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاحِفَةُ ۖ لَاتَتَّبِعُهَا الرّٰدِفَةُ (۷۹-۸۰)**

یہ مقسم علیہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے، بلکہ اس دن کی یاد دہانی ہے جس دن اس عذاب سے سابقہ پیش آئے گا جس سے ان کو ڈرایا جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو وہ عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک اس عذاب سے جس سے قیامت کے دن دوپارہ ہونا پڑے گا۔ دوسرے اس عذاب سے جس سے اسی دنیا میں قوم کو سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر وہ اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے۔

پہلے آیات ۶-۱۴ میں عذاب قیامت کی تصویر ہے اس کے بعد آیات ۱۶-۱۷ میں اس قیامت کے عذاب کی تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے جو تکذیب رسول کے نتیجہ میں اس دنیا میں پیش آتا ہے۔ دن کی عذاب قیامت کا ذکر یہاں اس لیے مقدم کر دیا ہے کہ اصل عذاب وہی ہے جس سے ہر ایک کو ہوشیار یاد دہانی



رہنا چاہیے۔ وہ دائمی اور ابدی ہے۔ اس کے ہمتے دنیا کا عذاب نہ بھی ہو جب بھی کسی کے لیے کوئی اطمینان کا پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید اہتمام ہے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر اس دنیا میں بھی عذاب نازل کرتا ہے۔

یہاں 'یوم' سے پہلے فعل محذوف ہے۔ یعنی اس دن کو یاد رکھو یا اس کے ہم معنی کوئی فعل۔ 'لَا حِفْظَ' کے معنی کپکپی اور زلزلہ کے ہیں اور 'رَادِفَةُ' کے معنی پہلے جھٹکے کے بعد دوسرے جھٹکے کے۔ قیامت کی بلبل، جیسا کہ دوسرے مقامات میں وضاحت ہو چکی ہے۔ سور کی دو پھونکوں میں مکمل ہوگی۔ یہاں انہی دونوں پھونکوں کے اثرات کی طرف اشارہ ہے۔ مقصود اس سے مکذبین قیامت پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قیامت کے ظہور کو بہت متباعد اور ناممکن نہ سمجھو۔ پس دو جھٹکوں میں یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۖ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (۸-۹)

اس دن کا اثر لوگوں کے دلوں پر ہوں گے۔ ان آیات میں اس دن کی بلبل کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو اس کائنات میں نمودار ہوں گے۔ فرمایا کہ اس دن کتنے دل ہوں گے جو دھڑک رہے ہوں گے اور ان کی نگاہیں سرسبکی کے سبب سے جھکی ہوئی ہوں گی۔ یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جو اس دن سے نچنت رہے اور جب انھیں اس سے ڈرایا جاتا تو نہایت ڈھٹائی سے اس کا مذاق اڑاتے رہے وہ لوگ جو اس دنیا میں، اس عذاب کو دیکھے بغیر اس سے ڈرتے رہے وہ، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

'أَبْصَارُهَا' میں ضمیر کا مرجع 'قُلُوبٌ' ہے۔ آدمی کے اندر دل ہی وہ چیز ہے جس سے اس کی شخصیت عبارت ہے اور جس کی کیفیات کی ترجمانی اس کے بدن کا رداں رداں کرتا ہے۔ خاص طور پر اس کی آنکھ تو وہ چیز ہے جس کے آئینہ میں اس کے دل کی مخفی سے مخفی کیفیت بھی جھلکتی ہے۔ دل کے ساتھ آنکھوں کے اس تعلق کے سبب سے ان کی اصافت دل کی طرف کر دی ہے۔

يَقُولُونَ مَرَانَا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَاخِرَةِ ۖ إِذَا كُنَّا عِظَامًا تَخِرَّةً ۚ قَالُوا نَزَلْنَا إِذَا كُنَّا خَاسِرَةً (۱۰-۱۲)

کفار کے استہزاء کی تصویر یہ تصویر ہے ان کے اس مذاق کی جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر سن کر وہ نہایت بے باکی سے کرتے۔

'حَاخِرَةُ' کے اصل معنی نقش قدم کے ہیں لیکن محاورے میں اگر کہیں کہ فلاں رجیع علی حاکرۃ اوفی حاکرۃ تو اس کے معنی ہوں گے کہ فلاں شخص جس حال میں تھا اس سے نکل کر پھر اٹھے پاؤں



اسی میں واپس آ گیا۔

یعنی جب انھیں ڈرایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد حساب کتاب کے لیے زندہ کیے جاؤ گے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور ایک دوسرے سے بانڈاز استہزاء پوچھتے ہیں کہ کیوں جی! کیا رہ جانے اور بوسیدہ ہڈیاں ہو جانے کے بعد پھر ہم زندگی کی حالت میں لوٹائے جائیں گے!

”وَإِذَا كُنَّا عِظَامًا تَخِرَّطٌ“ میں استفہام کا اعادہ ان کی افزونی حیرت کو ظاہر کرتا ہے کہ اول تو مرنے کے بعد از سر نو زندہ کیے جانے کا تصور ہی عجیب ہے لیکن اس سے بھی عجیب تر ما جو ایسا ہے کہ جب ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر خاک میں مل جائیں گی تب لوگ زندہ کیے جائیں گے! — مطلب یہ ہے کہ بھلا ایسی بعید از عقل و قیاس بات کون مان سکتا ہے!

”قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ“ یعنی مذاق اڑانے کے بعد ذرا سنجیدہ موڈ بنا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ بات جو یہ ملاحظہ ہے سچی نکلی تب تو یہ بڑی ہی نامرادی اور بڑے ہی خسارے کا لوٹنا ہو گا! اگرچہ یہ بات سنجیدہ موڈ بنا کر کہتے وہ مذاق ہی کے طور پر لیکن یہ ان کے باطن کی غمازی بھی کرتی ہے کہ قیامت کی تکذیب پر ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس کے دلائل کے وزن کو محسوس کرتے اور اس کے انکار کے عواقب سے ڈرتے لیکن زندگی کی لذتوں کو طلاق دے کر ان کی طبیعت ادھر آنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اس خطرے کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ قیامت ہوئی تو ہے تو یہ بہت بڑا خطرہ لیکن جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا، ابھی سے اس کی فکر میں اپنے اوپر نیند حرام کیوں کی جائے! یہ امر یہاں واضح رہے کہ بے فکران کا اصلی فلسفہ یہی ہے جس پر وہ زندگی گزارتے ہیں حالانکہ آخرت کا گمان اگر کسی دوجے میں بھی ہے تو پھر دشمنی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی اس کو پیش نظر رکھ کر ہی زندگی گزارے۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۚ فَإِذَا هُمْ بِالنَّارِ هَوَّةٍ (۱۳-۱۴)

یعنی جو سنسن ساریاں یہ کرنی چاہتے ہیں کہ لیں اور جتنے محالات پیدا کر سکتے ہیں کر لیں لیکن یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جب ان کو اٹھانا چاہے گا تو نہ اس کو کوئی اہتمام کرنا پڑے گا، نہ اس میں ایک لمحہ کی تاخیر واقع ہوگی۔ صرف ایک ہی ڈانٹ میں یہ قبروں سے نکل کر میدان حشر میں موجود ہوں گے۔

”مَسَاحُفٌ“ ہموار زمین اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے میدان حشر مراد ہے۔ ایک ڈانٹ سے اشارہ یہاں صور کے دوسرے نفع کی طرف ہے۔ اس کی دفاحت سورہ زمر میں یوں فرمائی ہے: ”تَوَفِّعَ فِيهِ أَصْحَابُ الْأُحُدَىٰ فَإِذَا هُمْ صَيِّفًا مِّنْظُرُونَ“ (الزمر - ۳۹: ۴۸) پھر اس صور میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو وہ دفعۃً اٹھ کر تانے لگیں گے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ۖ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِاللَّوْحِ الْمُقَدَّسِ طُوى (۱۵-۱۶)



مکہ یسوع کے

نتیجہ میں جو غذا

آتا ہے اس کا شہاد

اور پر کے پیرے میں عذاب قیامت کی تصویر تھی۔ اب یہ اس عذاب کی تاریخی شہادت کا حوالہ ہے جس سے رسولوں کے جھٹلانے والوں کو اس دنیا میں سابقہ پیش آیا ہے۔ اس کے لیے حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کا انتخاب فرمایا ہے جو سب سے زیادہ مشہور و معروف شہادت ہے۔

’هَلْ أَتَاكَ‘ کا سوال محض سرگزشت کی عبرتوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے اور واحد کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو بلکہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ یہ خطاب عام بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سرگزشت کے آخر میں فرمایا بھی ہے کہ ’لَا تَذَكَّرُكَ لَعِبْرَةٌ لِّمَن يَخْشَىٰ (۲۶) (بے شک اس سرگزشت کے اندران لوگوں کے لیے بڑا درس عبرت ہے جو خدا کی گرفت سے ڈرنے والے ہیں)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت حیات کے اس ماجرے کی طرف اشارہ ہے جب وہ مدین سے واپس جوتے ہوئے طور کے دامن میں پہنچے ہیں اور آگ کی چمک دیکھ کر آگ لینے یا لاشہ معلوم کرنے کے لیے رات کے اندھیرے میں، وادی طوی کی طرف گئے ہیں اور وہاں ان کو ایک درخت سے آواز آئی ہے کہ اے موسیٰ، میں تمہارا رب ہوں۔ میں نے تمہیں ایک کارِ عظیم کے لیے منتخب کیا تو تم فرعون کے پاس میرے رسول کی حیثیت سے جاؤ اور اس کو میرا پیغام پہنچاؤ۔

یہ سرگزشت یہاں چھوٹی چھوٹی کل بارہ آیتوں میں بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے ایجازِ بیان کا اعجاز ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک کے سارے مراحل اس میں اس طرح بیان ہو گئے ہیں کہ کوئی ایسا پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے جو غماظوں کی سبق آموزی کے لیے ضروری ہو۔

’اِذْ هَبْنَا فِرْعَوْنَ رَأْسَهُ طَغَىٰ ۖ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَذَكَّرَ ۚ وَاِهْدِيكَ اِلٰى دَرَبِكَ فَتَخْشَىٰ (۱۷-۱۹)

یہ وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون کے پاس بھیجا۔ فرمایا کہ فرعون کے پاس جاؤ اس نے بہت سرائٹھا یا ہے۔ ’طَغَىٰ‘ سے مراد یہاں اس کے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کے ساتھ جبارانہ رویہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کسی کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب اعلیٰ ہے سب سے بڑی لغات ہے۔ اس لغات کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی خاص سند کے ساتھ اس کے پاس بھیجا کہ وہ پہلے اس کو زمی کے ساتھ راہِ راست اختیار کرنے کی دعوت دیں اگر سمجھ جائے تو فہم اور زاس کے انجام سے اس کو آگاہ کر دیں۔

’فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَذَكَّرَ‘ یعنی اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ رغبت پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہے کہ میں تمہیں اس کا طریقہ بتانے کی کوشش کروں؟ اس فقرے پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیک وقت انتہائی درجے کی نامحاذ شہادت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ عظمت و جلالت بھی جو اللہ تعالیٰ یا اس کے سفیر کے



کلام میں ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تمہاری جو روش رہی ہے وہ تو یہی باقی ہے کہ تم سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے لیکن اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اب بھی گنجائش ہے کہ اگر تم سلامت روی کی زندگی اختیار کرنے کی رغبت ظاہر کرو تو یہ رستہ تم کو دکھانے کی کوشش کی جائے۔

لفظ تَوْبَتُہُ یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی خود سری، انانیت اور ظلم اور جور سے فرعون کو حصول پاک زندگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بندے کی ہوتی ہے۔ تزکیہ کی دعوت

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی رہا ہے۔ یہ کلام انھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی آیات کے ذریعہ سے انجام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ارشاد ہے کہ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ (الحجۃ-۲۰، ۲۱) (وہی ہے جس نے بھیجا امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سنا ہے اس کی آیات اور ان کو پاکیزہ بناتا ہے) اپنے اسی مقصد کا اظہار حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے فرمایا کہ اگر تم خدائی کے پندار سے ذرا آگاہ ہو کر اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو تو میں تم کو اللہ کی کچھ باتیں سناؤں۔

وَإِهْدِيكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَحْتَشَىٰ یعنی اس وقت تو تمہارے اوپر اپنی خدائی کا بھرت سوار ہے اس وجہ سے بالکل گھٹ پل رہے ہو لیکن بات سننے اور سمجھنے کا کچھ شوق ہو تو میں بتاؤں کہ تمہارا اور تمام جہان کا رب کون ہے جس سے سب کو ڈرنا چاہیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ پاکیزہ زندگی خدا کی خشیت سے اور خدا کی خشیت اس کی صحیح معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دو فقروں میں فرعون کو اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْكَ الْكُتُبَ (۲۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ باتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرمائیں اور ساتھ ہی فرعون کو اس بات سے بھی آگاہ فرمایا کہ وہ اپنے پاس خدا کے رسول ہونے کی سند بھی رکھتے ہیں تو فرعون نے کہا کہ میں تو اپنے سوا کسی اور رب سے واقف نہیں، اگر تمہارے پاس خدا کے رسول ہونے کی کوئی سند ہے تو وہ دکھاؤ۔ اس کے اس مطالبے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بڑی نشانی دکھائی۔ بڑی نشانی سے اشارہ عصا کی نشانی کی طرف ہے۔ اس کو بڑی نشانی سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ یہ بیضاء کے سوا ان کے سارے معجزات و حقیقت اسی کے اندر مضمون تھے اور اسی کے ذریعہ سے ظاہر ہوئے۔

فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ (۲۱)

یعنی اس معجزہ کو دیکھنے کے بعد بھی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول تسلیم نہیں کیا۔ فرعون کی بلکہ ان کو ساحر اور مفتری ٹھہرایا اور ان کی تکذیب کر دی۔ وَعَصَىٰ یعنی اس دعوت کو جو آپ آیات ۱۸-۱۹ پر گزشتہ



میں مذکور ہوئی مانتے سے انکار کر دیا۔

ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْفِي (۲۲)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر ہٹا تو ان کو شکست دینے کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں ان سرگرمیوں کی تفصیل موجود ہے۔ اس نے چاہا کہ جادوگروں سے مقابلہ کرے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہما السلام کو شکست دی جائے لیکن درباریوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ یہ دونوں (موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) بڑے ماہر جادوگر ہیں، عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرنا شکست اور جگہ ہنسائی کا سبب ہو سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مملکت کے تمام اطراف کے ماہر جادوگروں کو دعوت دی جائے اور ایک کھلے میدان میں ان دونوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ اس مشورے پر عمل کیا گیا لیکن اس کا نتیجہ شدید ناکامی کی صورت میں نکلا۔

فَحَشَرَ فَنَادَى ۚ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (۲۳-۲۴)

یہ فرعون کی اس تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے سب سے آخر میں اختیار کی ہے۔ سورۃ زخرف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مصر پر کوئی آفت آتی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتا کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ بلا ٹل جائے، اگر ان کی دعا سے یہ بلا ٹل گئی تو وہ ان کا مطالبہ ضرور تسلیم کر لے گا لیکن جب وہ بلا ٹل جاتی تو وہ پھر اپنے وعدے سے مکر جاتا۔ اس کی بار بار کی اس روش کا اثر یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سچائی کا اثر خود قطبیوں میں بہت بڑھنے لگا۔ اس سے گھبرا کر فرعون نے قوم کے تمام بااثر افراد کو جمع کیا اور ان کے اندر اپنا اثر بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر اس نے جو تقریر کی اسی کی طرف یہاں اجمالی اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ زخرف میں ہے:

وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَقُومُوا لِي مَلِكٌ مِّمَّنْ هَٰؤُلَاءِ لَا يَخْفَىٰ عَلَيَّ مِنْهُ شَيْءٌ وَهِيَ الْآلَةُ الَّتِي يَنْتَصِفُونَ ۚ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ هُم مِّمَّنْ لَا يَلِكُادُ يُبَيِّنُ ۚ فَلَوْلَا الْفِي عَلَيْهِ اسْوَدَّةٌ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلِكَةُ مُقْتَرِبِينَ ۚ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَاطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا	اور فرعون نے اپنی قوم میں پکارا کہ کیا مصر کی بادشاہی اور یہ نہریں جو میرے نیچے جاری ہیں، میرے لیے نہیں ہیں؟ کیا تم لوگ دیکھ نہیں رہے ہو؟ تو یہ بہتر ہوا یا میں اس سے بہتر ہوں جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھل کر کہہ بھی نہیں سکتا؟ اگر یہ خدا کا رسول ہے تو ایسا کیوں نہ ہو کہ اس پر سونے کے گنگن اتارے جلتے یا اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھ کر آتے؟ ان باتوں سے
--	---



تَوَمَّا فُتِقَيْنِ ۚ فَلَمَّا أَسْفَوْنَا  
اُنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ  
اَجْمَعِينَ ۝  
(الزخوف - ۵۱۶ - ۵۵)

اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنالیا اور وہ  
تھے ہی نافرمان لوگ۔ توجیب انھوں نے ہم  
کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پس  
ان سب کو غرق کر دیا۔

فَاَخَذَ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَى (۲۵)

نکال کے معنی عبرت انگیز عذاب کے ہیں۔ یعنی جب اس نے سب کچھ دیکھا درس لینے کے بعد  
بھی اپنی سرکشی ہی پر اصرار کیا تو اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا دونوں کے عذاب میں پکڑا۔ دنیا میں وہ سمندر  
کی موجوں کے حوالہ ہوا اور آخرت میں جہنم کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔  
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰی (۲۶)

یہ وہ مقصد بیان ہوا ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے  
بڑا درس عبرت ہے جو خدا کی پکڑ سے ڈرنے والے ہوں۔ بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن  
اشارہ خاص طور پر قریش کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر کچھ خوف خدا ہے تو وہ اس سے سبق  
حاصل کریں اور دانش مند وہی ہے جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے نہ کہ خود اپنے اوپر سیلاب  
گزر جانے کا انتظار کرے۔

مَّا نُنشِئُ السَّمٰوٰتِ بَنٰیہَا (۲۷)

اب آگے کی سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی۔ آسمان و زمین  
ہے جو آسمان و زمین کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایسی  
عظیم قدرت والا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ جب وہ آسمان جیسی عظیم  
چیز کو پیدا کر سکتا ہے تو لوگوں کے مرکب جانے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے کیا دشوار  
ہے؛ اسی طرح آسمان سے لے کر زمین تک اپنی ربوبیت کا جو اہتمام اس نے پھیلا رکھا ہے وہ اس بات  
کا شاہد ہے کہ وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ ایک دن لازماً سب کو اکٹھا کرے گا اور یہ  
دیکھے گا کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہنچا اور کس نے ناشکری کی اور پھر ان کے اعمال کے مطابق ان  
کو جزایا سزا دے گا۔ گویا منکرین قیامت کے جس شبہ کا آیات ۱۰-۱۲ میں حوالہ دیا گیا ہے اس کا جواب  
بھی دے دیا گیا اور ساتھ ہی قیامت کی ضرورت اور حکمت بھی واضح فرمادی گئی ہے۔

مَّا نُنشِئُ السَّمٰوٰتِ بَنٰیہَا۔ فرمایا کہ اگر تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ مرنے اور  
بڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد تم دوبارہ کس طرح زندہ کیے جاسکتے ہو تو سوچو کہ یہ عظیم آسمان جو تمہارے  
سرور پر پھیلا ہوا ہے، اس کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا تمہارا پیدا کیا جانا؛ اگر اس کائنات کا خالق



اس آسمان کے بنانے پر قادر ہو سکتا ہے تو دوسرا کون سا کام ہے جو اس سے زیادہ مشکل ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا!

رَفَعَ سَمُوتَهَا فَسَوَّيْنَهَا ۖ وَاعْطَشَ لَيْلَهَا دَاخُجَ صُحُوتَهَا (۲۸-۲۹)

یہ آسمان کے اندر خدا کی عظیم قدرت و حکمت کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے تاکہ جو لوگ دوبارہ پیدا کیے جانے کو بے حیا و ایمان سمجھ رہے ہیں وہ غور کریں کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں وہ ہر وقت دیکھ رہے ہیں اس کے لیے کسی کام کے ناممکن ہونے کا کیا سوال؟

”سَمُوتُ“ کے معنی چھت کے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے آسمان کو بنایا، اس کی چھت کو بلند کیا اور پھر اس کو اس طرح ہموار کیا کہ کسی کے امکان میں نہیں کہ اس کے کسی کونے میں کسی فعل کی نشاندہی کر سکے۔

دَاخُجَ لَيْلَهَا دَاخُجَ صُحُوتَهَا یعنی پہلے اس کے اندر رات ہی رات تھی۔ وہ جیسا کہ سورہ صمد السجدۃ میں اشارہ ہے، دھڑکیں کی شکل میں تھا۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی رات ڈھانک دی۔ اس کے حصے کی روشنی نمودار کی، رات اور دن دونوں کو ایک نظام کا پابند بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا اس جہاں پر رات طاری کر دینے پر قادر ہے، کیا اس کے لیے دنیا کے مگرھپ جانے کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن ہو جائے گا؟ زیادہ مشکل پہلا کام ہے یا دوسرا؟

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ۖ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءً هَارًا وَمِنْهَا نَخْلًا وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا ۖ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنفُسِكُمْ (۳۰-۳۳)

آسمان کی نشانیوں کے بعد یہ زمین اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتی اور مقصود اس سے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کی قدرت اور اس کی پروردگاری کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جس خدا نے زمین کو ہمارے لیے بچھایا، اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا، اس کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کو گاڑا، کیا تم کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا؟ جب اس نے یہ سارے کام کیے اور اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو ایک اپنی ہی پیدا کی ہوئی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں دشوار ہو جائے گا!

”مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنفُسِكُمْ“ یہ اس ربوبیت کی طرف توجہ دلاتی ہے جو اس زمین کے چپے چپے پر نمایاں ہے۔ فرمایا کہ دیکھو تو معلوم ہو گا کہ تمہارے رب نے صرف تمہاری ہی ضرورت کا سامان نہیں کیا ہے بلکہ تمہاری خدمت کے لیے چوپائے پیدا کیے ہیں، ان کی مایحتاج کا بھی پورا انتظام فرمایا ہے۔ اب غور کرو کہ جس پروردگار نے تمہاری پرورش کے لیے آسمان سے لے کر زمین تک یہ اہتمام فرمایا ہے کیا اس نے تمہیں محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ کچھ عرصہ تک اس زمین میں کھاؤ پیو اور ایک دن ختم ہو جاؤ؟ اس سے اس کو کچھ بحث نہیں کرتے ہیں سے کس نے نیکی کی زندگی بسر کی اور کس نے بدی کی؟ کس نے اپنے رب کی نعمتوں کا







آسمان وزمین سب دہم برہم ہو جائیں گے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَى (۳۵)

یہ 'یَوْمَ' جواب شرط محذوف کا ظرف ہے جس طرح آیت ۶ میں 'یَوْمَ' مقسم علیہ محذوف کا ظرف ہے۔ یعنی اس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا۔ آج تو اس کو غفلت کی سرستی میں کچھ ہوش نہیں کہ وہ کیا بنا رہا ہے، جب اس کو اس دن سے ڈرایا جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتا ہے، لیکن اس دن اس کو ہوش آئے گا اور وہ دیکھے گا کہ وہ دنیا میں کیا کمائی کر کے آیا ہے۔

وَبُذِّتِ الْجَبِیْمُ لِمَنْ یُرَى (۱۶)

آج تو اسے آخرت اور جہنم بہت بعید از امکان نظر آتی ہے لیکن اس دن جہنم ان لوگوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی جن کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ بے نقاب کر دی جائے گی، یعنی وہ بالکل تیار ہے۔ بس پردہ اٹھنے کی دیر ہے۔ پردہ اٹھتے ہی وہ ان سب کے سامنے ہوگی جو اس کو آنکھوں دیکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

'لِمَنْ یُرَى' یعنی جن کے لیے، ان کے اعمال کی پاداش میں، اس کا دیکھنا مقتدر ہے وہ اس کو دیکھیں گے۔ رہے اللہ کے وہ بندے جو بن دیکھے ہی اس سے لرزاں و ترساں رہے ہیں۔ اللہ ان کو اس سے دور رکھے گا۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔

فَأَمَّا مَنْ خَلَّى ۖ وَاشْرَاَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِیَ الْمَاوٰی (۳۹-۳۷)

فرمایا کہ جس نے اس دنیا میں سرکشی کی ہوگی اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہوگی اس دن اس کا ٹھکانا بس جہنم ہی بنے گی جس سے اس کو کبھی نکلتا نصیب نہ ہوگا۔ پیچھے آیت ۱۷ میں فرعون کے طغیان کا ذکر گزر چکا ہے یہاں 'اَشْرَاَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا' سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس طغیان میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو آخرت کو نظر انداز کر کے اسی دنیا کے پجاری بن جاتے ہیں، اس سے الگ ہو کر وہ کسی چیز کو سوچتے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔

'فَأَمَّا الْجَحِيْمُ هِیَ الْمَاوٰی' میں حصر کا مضمون ہے یعنی پھر ان کے لیے جہنم ہی جہنم ہے، کوئی اور راہ ان کے لیے کھلنے والی نہیں ہے۔

دَامًا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ ۖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاوٰی (۴۱-۴۰)

البتہ وہ لوگ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے رہے اور دنیا کے پیچھے بھاگنے کے بجائے جہنم نے اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا تو ان کا ٹھکانہ بس جنت ہی ہوگی وہ اس سے کبھی محروم نہ ہوں گے۔



مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ سِوَا مَا رَدَّكَ حَقُّهُ بِشَيْءٍ سِوَا مَا هُوَ - سورۃ مطففین میں اس کی

وضاحت یوں آئی ہے :

الَّذِينَ يُؤْتُونَكَ مِنْ لَدُنْهُمْ يُسَبِّحُونَكَ  
لَيْلًا نَهَارًا ۚ يُكْسِرُونَ ۚ  
لَهُمْ فِيكَ رَازٍ أُنْزِلَ عَلَيْهِمْ لَمَنِ السُّرُورُ ۚ  
يُسَبِّحُونَكَ خَلْفَ ظُهُورِهِمْ  
وَخَلْفَ عَنَانٍ ۚ وَمِنْ لَدُنْهُمْ سُبْحَانَكَ  
مُطَفِّفِينَ - (۸۳ : ۹۰ - ۹۱)

کیا وہ یہ گمان نہیں رکھتے کہ وہ ایک بھاری  
دن کی حاضری کے لیے اٹھائے جانے والے  
ہیں؟ جس دن لوگ خداوندِ عالم کے حضور  
پیشی کے لیے اٹھیں گے !

اسی پیشی کا ڈر ہے جو انسان کو خواہشوں کی پیروی سے روکتا ہے۔ یہ ڈر نہ ہو تو نفس کو خواہشوں  
کے پیچھے بھاگنے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔  
لَيْسَ لَكَ مِنَ الْبَاعَةِ آيَاتٌ مُرْسِلَةٌ (۹۲)

یہ اور اس کے بعد خاتمہ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ قرآن نبی مسموع  
لوگوں کی پروا نہ کرو جو تمہیں زچہ کرنے کے لیے قیامت کے ظہور کا وقت پوچھتے ہیں۔ تمہارا کام اس سے  
لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے تاکہ جو مستحب ہونا چاہیں وہ متنبہ ہو جائیں۔ رہے وہ جو اس کو دیکھ کر ماننا چاہتے  
ہیں اور اس کے ظہور کا وقت معلوم کرتے کے درپے ہیں ان کو مطمئن کرنا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ  
انھوں نے محض اس کی تکذیب کے لیے ایک بہانہ بنایا ہے۔

’آيَاتٌ مُرْسِلَةٌ‘ یعنی یہ اس کے ظہور کے وقت سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ’آيَاتٌ‘ وقت مستقبل  
سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ میرے نزدیک ’کہاں‘ صحیح نہیں ہوگا بلکہ کب  
ہونا چاہیے۔

’مُرسِلٌ‘ کے معنی لنگر انداز ہونے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہاں ایک قسم کا طنز مضمر ہے۔ یعنی یہ منکرین  
پوچھتے ہیں کہ ہم کب سے یہ خبر سن رہے ہیں کہ بس قیامت آیا ہی چاہتی ہے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔  
آخر اس کا سفینہ ہمارے ساحل میں کب لنگر انداز ہوگا ! اس کے انتظار میں تو ہماری آنکھیں پتھر اگیں !  
فَتُيْمَأَنِّتُ مِنْ ذِكْرِهَا ۚ رَإِي ذِيكَ مُنْتَهَاهَا (۹۳ - ۹۴)

فرمایا کہ تمہیں اس بحث سے کیا تعلق؟ اس کا سرا تو صرف تمہارے رب کے پاس ہے۔ تم ان  
لوگوں کو یہ بتانے نہیں آئے ہو کہ قیامت کس دن آئے گی۔ اس کا علم تمہارے رب کے سوا اور کسی کے  
پاس نہیں ہے تو جو سوال سرے سے تم سے متعلق ہے ہی نہیں تمہیں اس سے کیا واسطہ اور تم اس کی  
کھوج کر بد میں کیوں پڑو ! اس کو اللہ کے حوالہ کرو جو اس کا حقیقی علم رکھنے والا ہے۔

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ مَنِ يَخْشَاهَا (۹۵)

جو لوگ قیامت کو دیکھ کر اس کو ماننا چاہتے ہیں ان کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے۔ ان کو



ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہارا انداز صرف انہی پر کارگر ہو گا جو دلائل کی روشنی میں اس کو بن دیکھے ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہوں۔

كَانَ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبِسُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَو ضُحَاهَا (۲۶)

یعنی آج اگر ان کو یہ دکھائی نہیں جاتی یا اس کی تاریخ نہیں مقرر کی جاتی تو اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ وہ اتنی دور ہے کہ اس کے لیے انہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس دن اس کو دیکھیں گے اس دن کا احساس یہ ہو گا کہ گویا دنیا میں وہ ایک دن کے پچھلے یا اس کے پہلے پہر سے زیادہ نہیں رہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاللّٰهُ الْكَاسِدُ  
اَوَّلًا وَاٰخِرًا۔

رحمان آباد

۲۷ اپریل ۱۹۷۹ء

۲۹ جمادی الاول ۱۴۰۰ھ



مدیر فرائد

۸۰

علیس







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— المذمت ————— کے جوڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اسلوب بیان اور مواد استدلال میں بھی دونوں کے اندر نہایت واضح یکسانی ہے۔ مطالب کی ترتیب میں البتہ تبدیلی ہوئی ہے جس سے ایک نیا حسن اس میں پیدا ہو گیا ہے اور دراصل یہی واحد چیز ہے جو اس سورہ کو سابق سورہ سے ممتاز کرنے والی ہے۔ آپ دونوں کو سامنے رکھ کر آسانی سے ان کے مابہ الاشتراک اور مابہ الاختلاف کو معین کر سکتے ہیں۔

سابق سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے یہ جو فرمایا ہے کہ اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ مَّنْ يَّحْشُرُهُمْ (۴۴) (تم تو بس انہی لوگوں کو قیامت سے ڈرا سکتے ہو جو اس سے ڈرنے والے ہوں) اسی مضمون سے اس سورہ کی تمہید استوار فرمائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو باندا ز عتاب قریش کے ان منکر دین کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا ہے جو ایمان نہ لانے کے روزِ روزِ نئے نئے بہانے تلاش کرتے اور نازک مہاجری میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ آپ سے مطالبہ کرتے تھے کہ جب تک آپ اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا نہیں دیں گے اس وقت تک وہ آپ کی مجلس میں بیٹھنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ اس پوری سورہ میں انہی منکر دین پر نہایت شدت سے عتاب ہے۔ اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن عتاب کا رخ تمام تر قریش کے فراعنہ ہی کی طرف ہے۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے :

(۱-۱۰) ایک واقعہ کے تعلق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کہ جو لوگ اپنے کبر و غرور کے سبب سے تمہاری تعظیم و تذکیر سے مستغنی اور اس بات کے متمنی ہیں کہ تم اپنے غریب ساتھیوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو تب وہ تمہاری مجلس میں بیٹھنے کے روادار ہوں گے، ان کی ناز برداری کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔



ان کے ایمان کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں اپنے جاں نثا ساتھیوں کی حق تلفی کرو۔ تمھارے اوپر اصل ذمہ داری انہی کی تربیت کی ہے جو تمھارے پاس ذوق و شوق سے آتے ہیں۔ جو نہیں آتے اور اپنی ناز برداری کے طالب ہیں ان کے بارے میں تم مسئول نہیں ہو کہ ان کو پانے کے لیے اپنیوں کو فضا تلخ کر دو۔

(۱۱-۱۶) قرآن کی عظمت کا بیان کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی یاد دہانی ہے تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ جو اس کی نافرمانی کریں گے وہ اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے۔ یہ اللہ رب العالمین کا فرمان واجب الاذعان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ اس کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرو جو اس کے شایان شان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کی امانت میں اس کو محفوظ کیا ہے سب عالی مقام اور بلند مرتبہ لوگ ہیں اور تم بھی انہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے ہو۔ سرکشوں اور مغروروں کی ناز برداری میں اتنا نہ جھکنا جو تمھارے منصب اور تمھارے اس پیغام کے وقار کے خلاف ہے۔

(۱۷-۲۳) ان سرکشوں کی حالت پر اظہارِ افسوس جو قیامت کے انکار پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کو خود ان کی خلقت اور زندگی کے مراحل کی یاد دہانی کہ جو انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے اور مختلف مراحل طے کرتا ہوا قبر تک پہنچتا ہے حیف ہے اگر وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو ناممکن سمجھے! جو اتنے واضح دلائل کے بعد بھی سمجھنے اور ماننے پر تیار نہیں ہوا وہ کسی دلیل سے بھی قائل نہیں ہو سکتا۔

(۲۴-۳۲) خلقت اور مراحلِ زندگی کی طرف توجہ دلانے کے بعد ربوبیت کے اس وسیع اہتمام کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور چوپایوں کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے اور جو اس امر کی نہایت واضح شہادت ہے کہ جس نے یہ سارا اہتمام کیا ہے وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ ایک دن وہ سب سے ان نعمتوں کا حساب لے گا۔ اس دن فائز المرام وہی ہوں گے جنہوں نے نعمتوں کا حق ادا کیا ہو گا جنہوں نے ان کا حق ادا نہیں کیا ہو گا وہ سب اس دن ذلیل و نامراد ہوں گے۔ (۳۳-۴۲) قیامت کے دن کی تصویر۔ اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کا نقشہ۔ جن لوگوں نے قیامت کی پیشی سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری ان کی شادمانی اور جو اس سے بے فکر ہے اور اسی حال میں مرے ان کی بدبختی و سیہ روئی کا بیان۔



# سورة عبس

مَكِّيَّةٌ ————— آيات: ٢٢

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ① أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ② وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ ③  
يَزْكِي ④ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى ⑤ أَمَّا مَنْ اسْتَغْنَى ⑥  
فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى ⑦ وَمَا عَلَيْكَ الْإِيزَى ⑧ وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ  
يَسْأَلُ ⑨ وَهُوَ يَخْشَى ⑩ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى ⑪ كَلَّا إِنَّهَا  
تَذِكْرَةٌ ⑫ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ⑬ فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ ⑭ وَقَفَّازٍ ⑮  
مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ ⑯ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ⑰ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ⑱  
قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ⑲ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ⑳ مِنْ  
نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ㉑ ثُمَّ اسْبِيْلَ ㉒ كَيْسَرَهُ ㉓ ثُمَّ  
أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ㉔ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ㉕ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ  
مَا أَمَرَهُ ㉖ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ㉗ أَنَا صَبَبْنَا  
الْمَاءَ صَبًّا ㉘ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ㉙ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا  
حَبًّا ㉚ وَعِنْبًا وَغُلًّا ㉛ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ㉜ وَحَدَائِقَ  
غُلْبًا ㉝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ㉞ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَعَامِلِكُمْ ㉟ فَإِذَا



جَاءَتِ الصَّاحَّةُ ۝ (۳۳) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ (۳۴) وَأُمِّهِ  
وَأَبِيهِ ۝ (۳۵) وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ (۳۶) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ  
يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝ (۳۷) وَجَوَافِدٌ يُوسِفُونَ ۝ (۳۸) مُسْفِرَةٌ  
ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ (۳۹) وَوُجُوهُ يُوسِفُونَ ۝ (۴۰) عَلَيْهَا غَبَرَةٌ  
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ (۴۱) أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ (۴۲)

ع  
۵

ترجمہ آیات

۴۲-۱

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس تابینا اور تمہیں کیا معلوم  
شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی! ۱-۴  
جو بے پروائی برتنا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری  
نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ  
خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتنے ہو۔ ۵-۱۰

ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاد دہانی ہے تو جو چاہے یاد دہانی حاصل کرے۔  
لائق تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز بادشاہوں کے ہاتھوں میں۔ ۱۱-۱۶  
یُرَا ہوا آدمی کا، یہ کتنا ناشکرا ہے! اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ پانی کی ایک  
بوند سے! اس کو بیدار کیا۔ پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔ پھر اس کے  
لیے راہ آسان کر دی۔ پھر اس کو موت دی۔ پھر اس کو دفن کرایا پھر جب چاہے گا  
اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۱۷-۲۲

ہرگز نہیں، اس نے اس حکم کی تعمیل اب تک نہ کی جو اس کے رب نے اسے  
دیا۔ پس انسان اپنی غذا پر دھیان کرے کہ ہم نے برسا یا پانی اچھی طرح، پھر پھاڑا



زمین کو اچھی طرح۔ پھر اُگائے اس میں غلے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور، گھنم  
 باغ، میوے اور سبزہ، تمھاری اور تمھارے مویشیوں کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۳-۳۲  
 پس جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز آئے گی! تب وہ شدنی ظاہر  
 ہوگی! اس دن آدمی اپنے بھائی، ماں باپ اور اپنی بیوی اور بیٹیوں سے بھاگے گا۔  
 اس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے،  
 ہشاش بشاش! اور کتنے چہروں پر اس دن خاک اڑتی اور سیاہی چھائی ہوگی۔ یہی  
 کافروں کا بکار ہوں گے! ۳۳-۴۲

---



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی (۱-۲)

عبد اللہ بن ام مکتومؓ کے دافعہ کی ذمیت کی طرف ہے۔ یہ ایک نادار اور نابینا صحابی تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے لیڈروں میں سے کسی سے یا ان کی کسی جماعت سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور وہ اپنے اعتراضات و شکوک پیش کر رہے ہوں گے کہ اسی اشارہ میں عبد اللہ بن ام مکتومؓ تشریف لائے اور موقع کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکنے کے باعث وہ بھی مجلس میں پہنچ گئے۔ ان کا یہ بے موقع آجانا حضورؐ کو ناگوار گزرا۔ اس ناگواری کی وجہ العیاذ باللہ یہ تو نہیں ہو سکتی کہ وہ نادار یا نابینا تھے، ناداروں اور نابیناؤں کی قدر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کر سکتا تھا، البتہ حضورؐ کو اندیشہ ہوا ہو گا کہ ان وحشیوں کو ذرا مانوس کرنے کا جو موقع میسر آیا ہے عبد اللہ بن ام مکتومؓ کے آجانے سے وہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ بدک جائیں گے اور کہیں گے کہ جب تم نے اس طرح کے مفلسوں اور قلاشوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کیا ہے تو تمہاری مجلس میں بیٹھ کر کون اپنی عزت گنوائے گا۔

قریش کے لیڈروں کی نازک مزاجی یہ امر واضح رہے کہ قریش کے فراعنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات تھے ان میں ایک بڑا اہم اعتراض یہی تھا کہ آپ کے ساتھی قلاش اور مفلس لوگ ہیں۔ اس چیز کو وہ آپ کی نبوت کے خلاف ایک دلیل بنائے بیٹھے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے لیے یہ خیال بھی باعث تردد ہوا ہو گا کہ ممکن ہے یہ اپنی بڑائی کے نشہ میں آپ کے ایک محبوب صحابی کی کوئی توہین یا دل آزاری کر بیٹھیں جس سے مزید بد مزگی پیدا ہو۔

اسی واقعہ کو، جو بالکل اتفاق سے پیش آگیا، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینے کا ذریعہ بنالیا کہ آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز اپنے ان صحابہ کو بنائیں جو اپنی اصلاح و تربیت کے طالب اور شوق و ذوق سے آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں، ان لوگوں کے درپے زیادہ نہ ہوں جو بے نیاز ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ان کی ناز برداری کریں۔

مذہب کو نظر انداز کرنے کی ہدایت یہ کچھل سورتوں میں یہ بات جگہ جگہ واضح ہو چکی ہے کہ ابتدا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں کو دعوت دینے کا خاص اہتمام تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ آپ کو اول اول، جیسا کہ آیت



وَأَسْأَلُكُمْ عَنِ النَّبِيِّ الْأَقْرَبِ إِلَيْكُمْ (الشعراء ۲۴: ۲۱۴) سے واضح ہے، انہی کو خطاب کرنے کا حکم ہوا تھا۔ دوسری یہ کہ ان لوگوں کو پورے عرب کی سیادت و قیادت حاصل تھی۔ ترقی تھی کہ اگر یہ دعوت قبول کر لیں گے تو پورے عرب میں دعوت کی کامیابی کی راہ کھل جائے گی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک حضورؐ نے اپنا سارا زور انہیں پر صرف فرمایا اور ان کی طرف سے انتہائی رعوت اور توہین و دل آزاری کے اظہار کے باوجود آپ ان کو دعوت دینے میں لگے رہے لیکن جب ان کی رعوت بہت بڑھ گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ یہ ہٹ دھرم نہ صرف یہ کہ کوئی اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے جو وقت ضائع ہو رہا ہے اس سے ان غریب مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے جو ایمان لائے ہیں اور جو اپنی تعلیم و تربیت کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کے ان ناقدروں سے زیادہ مستحق ہیں تو آپ کو ان کے زیادہ درپے ہونے سے روک دیا گیا اور اس کے لیے عبداللہ بن ابی مکتومؓ کے واقعہ نے ایک نہایت مناسب موقع تقریب پیدا کر دیا۔

وَمَا يَذْكُرُ لَكُمْ يَذْكُرْ أَدَبًا كَذَبْتُمْ لَهُ الْبُذْرُ (۳-۴)

اور یہ آیات سے عرن ایک واقعہ کی خبر سامنے آئی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کس کا ہے اور نہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے ذکر سے مقصود کیا ہے لیکن یہاں 'يَذْكُرُ لَكُمْ' کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ واقعہ کا تعلق حضورؐ سے ہے اور آپ کو اس بات پر متنبہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کھوئی ہوئی بھٹیروں کی تلاش میں بعض اوقات اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ گھلے کی بھٹیروں کی دیکھ بھال میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔

پہلے کٹے میں خطاب کے نہ ہونے سے قاری کے ذہن میں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے کہ معلوم کرے کہ کس کا واقعہ بیان ہو رہا ہے لیکن چونکہ مخاطب واضح نہیں ہے اس وجہ سے اس کو اپنی ذات سے متعلق کوئی پریشانی پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ حضورؐ کے اندر بھی واقعہ سے متعلق سوال تو فوراً پیدا ہوا ہو گا لیکن خطاب چونکہ براہ راست نہیں تھا اس وجہ سے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی ہوگی برعکس اس کے اگر خطاب معین ہوتا تو یہ عتاب بہت سخت ہو جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں یہ بات متعین ہو جاتی کہ آپ پر عتاب ہوا اور وجہ عتاب یہ ہے کہ آپ نے ایک نابینا کے آنے پر ترش رویہ اختیار فرمایا اور اس کا ایک واقعہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا اور آگے آ رہا ہے یہ نہیں ہے۔

آیات زیر بحث میں خطاب اس لیے واضح فرما دیا ہے کہ یہاں وہ بات بھی بیان فرمادی گئی ہے جس پر عتاب ہوا ہے۔ یہ بات کسی فرض میں کوتاہی کی نوعیت کی نہیں بلکہ ادائے فرض میں حد مطلوب سے تجاوز کی نوعیت کی ہے۔ ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ نفس کی خواہشوں کی پاسداری کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی



وہ اپنے رب کی رضا طلبی کے جوش میں اس حد سے آگے نکل جایا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شریعت دینے کے لیے طُور پر بلایا تو اس کے لیے ایک خاص تاریخ بھی مقرر فرمادی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام فرطِ شوق میں مقررہ تاریخ کا انتظار نہ کر کے بلکہ اس سے پہلے ہی طُور پر پہنچ گئے۔ ان کی اس عجلت پر گرفت ہوئی تو انھوں نے یہ معذرت پیش کی کہ اے رب، میں تیری رضا طلبی کے شوق میں جلدی چلا آیا ہوں۔ اس طرح کی لغزش ظاہر ہے کہ نہایت اعلیٰ جذبہ سے ہوتی ہے۔ لیکن حضراتِ انبیاء علیہم السلام حق و عدل کی کامل میزان ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی لغزشوں پر بھی گرفت فرماتا ہے تاکہ میزان ہر پہلو سے درست رہے۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جس لغزش پر گرفت فرمائی گئی ہے وہ بھی اسی نوعیت کی ہے۔ ساداتِ قریش کے ایمان لانے سے چونکہ آپ پرے عرب کے لیے دعوت کی راہ کھلنے کی توقع رکھتے تھے اس وجہ سے اس کام میں آپ کا انہماک اس قدر بڑھ گیا کہ نہ آپ کو اپنے ذاتی آرام کی کوئی فکر رہی، نہ اس ادراک کوئی خیال رہا کہ یہ لوگ آپ کی ذات اور آپ کی دعوت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس انہماک سے یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا کہ جو غریب مسلمان ایمان لائے ہیں ان کی تربیت کی جو ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے اس کو ادا کرنے کے لیے بھی آپ شکل ہی سے کچھ وقت نکال سکیں گے۔ اس صورتِ حال پر قرآن نے جبکہ جبکہ آپ کو نہایت محبت آمیز انداز میں ٹوکا اور آگاہ فرمایا ہے کہ آپ نے قریش کے معاملے میں اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھالی ہے جتنی اللہ نے آپ پر ڈالی ہے۔ آپ ان کے پیچھے اتنے ہلکا نہ ہوں۔ آپ پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی وہ آپ نے پہنچا دی، اب مزید ان کی ناز برداری کی ضرورت نہیں ہے۔ انہی حالات کے اندر عبداللہ بن ام مکتومؓ کا یہ واقعہ پیش آیا جس نے گویا اس بات میں ایک بالکل فیصلہ کن سورہ نازل کر دی۔ اس تمہید کی روشنی میں آیاتِ زیر بحث اور آگے کی آیات پر غور کیجیے۔

’دَمَا يَذُرِيكَ لَعَلَّهٗ يَذُرْكِي‘ یعنی تم پر اس نابینا کا آنا اس اندیشہ سے گراں گزرا کہ شاید اس کے آجانے سے ان سادات کے پندار کو چوٹ لگے اور وہ بدک جائیں حالانکہ ہو سکتا ہے کہ تم ان کی ناز برداری میں ایک سچے طالب کو نظر انداز کر دو لیکن یہ پھر بھی نہ سنیں تو ایسے ناقدروں کے پیچھے اپنے ایک سزاوار تربیت یافتہ کی حق تلفی کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔

رسول کے توجہ سے معلوم ہوا کہ رسول کا اصل مقصد لوگوں کا تزکیہ ہے۔ جو لوگ اس کے پاس تزکیہ کے لیے آتے ہیں اس کی توجہ و دلدادگی کے اصل حق دار وہی ہیں۔ دوسرے لوگ، خواہ بظاہر کتنی ہی اہمیت رکھنے والے ہوں، ان میں اگر اصلاح و تربیت کی طلب نہیں ہے تو رسول کے مقصد کے اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔



یہاں ایک سچے طالب کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طالب تزکیہ ہوتا ہے۔ سچے طالب  
دوسری یہ کہ وہ یاد دہانی سے فائدہ اٹھانے والا ہوتا ہے۔

کے دو صفتیں

یہ درحقیقت تربیت گاہِ نبوی کے سچے شرکاء کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ان میں بالعموم  
دو طرح کے لوگ ہوتے۔ ایک وہ جن کے سامنے اپنی اصلاح و تربیت سے متعلق کوئی سوال ہوتا اور  
وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آتے، دوسرے وہ جن  
کے سامنے اگرچہ کوئی خاص سوال تو نہ ہوتا لیکن وہ مجلس میں حاضر ہوتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بطور خود  
یا کسی سائل کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمائیں اس سے بہرہ مند ہوں۔ یہاں 'لَعَلَّكَ يَنْزِكُ' سے پہلی قسم  
کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے اور 'يَذْكُرُ فَتَنْفَعُكَ الْيَذْكُرُ' کے الفاظ سے دوسری قسم کے لوگوں  
کی طرف۔ یہ دونوں ہی راہیں طلب علم کی ہیں اور مقصود ان دونوں کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ  
جس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنا ہو وہ انہی میں سے کسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر آئے  
اور وہی پیغمبر کے التفات کے حق دار ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنی ناز برداری کے خواہاں ہیں ان کے  
لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور اپنے انجام کا انتظار کریں۔

أَمَّا مَنْ اسْتَفْنَىٰ ۖ فَجَاءَكَ يَسْعَىٰ ۖ وَهُوَ يَخْشَىٰ ۖ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ (۵-۱۰)

تنبیہ

یہ وہ اصل تنبیہ ہے جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی گئی کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ جو اپنی  
اصلاح کے طالب بن کر آئیں اور ان کے اندر خدا کے حضور پیشی کا خوف ہو وہ آپ کی توجہ کے  
اصل مستحق قرار پائیں لیکن جو یہ رہا ہے کہ جو بے پروا دے نیاز ہیں آپ ان کو دعوتِ دین کے لیے تو  
اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اگر اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو اس کی ذمہ داری آپ  
پر نہیں ہے۔ آپ پر اصل ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو ذوق و شوق سے آپ کے پاس آتے  
ہیں لیکن آپ ان سے غفلت برتتے ہیں۔

'نَقْذِي' دراصل 'تَقْذِي' ہے جو 'صَدَد' کے مادہ سے ہے جس کے معنی متوازی  
اور مقابل کے ہیں۔ اس میں جو تغیر ہوا ہے وہ عربیت کے قاعدے کے مطابق ہوا ہے جس کی مثالیں  
پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بے نیازی برتتے ہیں ان سے تو آپ متعرض ہوتے اور ان کو  
پر جانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ بوجھ اللہ تعالیٰ نے آپ پر نہیں ڈالا ہے۔

'وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَنْزِكُ' یعنی آپ پر اصل ذمہ داری انذار و بلاغ کی تھی، وہ کر چکنے کے  
بعد آپ ان سے بری الذمہ ہوئے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ آپ انہیں لازماً مومن و مسلم  
بھی بنادیں۔ یہ مضمون پیچھے کی سورتوں میں مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور ہر جگہ اس کا مقصود



پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری سے زیادہ بوجھ اپنے اوپر نہ اٹھائیں اور اپنے کو غیر ضروری مشقت میں نہ ڈالیں۔ اگر یہ محروم قسمت لوگ اپنی اصلاح نہیں چاہتے تو ان کو ان کی تقدیر کے حوالہ کریں۔

”بَآءُكَ يَسْتَعِي، يَسْتَعِي“ کا اصل مفہوم کسی کام کو ذوق و شوق اور سرگرمی و مستعدی سے کرنا ہے۔ دوڑنا اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ ”فَاسْعُوا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ“ کے معنی ہوں گے پس اللہ کے ذکر کی طرف سرگرمی اور مستعدی سے لپکو۔ آیت میں یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے یعنی جو لوگ آپ کے پاس نہایت ذوق و شوق سے اس طرح آتے ہیں جس طرح تشنہ چشمہ کی طرف بڑھتا ہے۔

”وَهُوَ يَحْشَىٰ“ یہ مقابل میں ہے ”أَمَّا مَنِ اسْتَعْنَىٰ“ کے۔ یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی مطلوبات و مرغوبات میں اس طرح کھوئے ہوئے ہیں کہ انھیں کبھی یہ فکر ستاتی ہی نہیں کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے اور اس کے لیے بھی کوئی تیاری ضروری ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنے اندر آخرت کی پیشی کا خوف رکھتے ہیں۔ اسی گروہ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی باتیں سننے اور ان کو حرزِ جاں بنائے نہ کہ پہلے گروہ سے، لیکن آپ کا حال یہ ہے کہ آپ پتھروں میں جونک لگانے کے لیے تو رات دن سرگرم ہیں لیکن جن کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت ہے ان کی طرف پوری توجہ کرنے کی فرصت آپ کو نہیں ملتی۔

ان آیات سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہونیں:

ایک یہ کہ ان میں بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو عتاب ہے اس کا اصل رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ توبہ کے ان نااہل لیڈروں کی طرف ہے جن سے کسی خیر کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ آپ ان سے صرف نظر کر کے اپنی ساری توجہ کامرکز ان غریبوں کو بنائیں جو اسلام لا چکے تھے اور آپ کی تعلیم و تربیت کے اصل حقدار تھے۔

ان آیات  
کی تعلیم

دوسری یہ کہ حضور کو کسی فرض کی ادائیگی میں کسی کوتاہی پر نہیں ٹوکا گیا ہے بلکہ اس بات پر ٹوکا گیا ہے کہ آپ نے اس سے زیادہ ذمہ داری اپنے اوپر اٹھالی ہے جتنی اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے۔ گویا یہ اسی طرح کا پر محبت و جاں نواز عتاب ہے جو لَعْنَاكَ بَاخِعُ نَفْسِكَ إِلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (الشعراء: ۲۶-۳۰) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں گزر چکا ہے۔

تیسری یہ کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ اسلام کی اصل دولت وہ غریب ہیں جن کے اندر خدا کی خشیت ہے نہ کہ وہ امیر جن کے سینے خدا کی خشیت سے خالی ہیں۔ اس وجہ

سے معلوم ہوتا ہے تم اپنے آپ کو ان کے پیچھے ہلاک کر کے رہو گے کہ وہ رہن نہیں بن رہے ہیں۔



سے آپ اپنی توجہ کا اصل مرکز انہی کو بنائیں جو اہل ہیں۔ ان کے پیچھے اپنا وقت نہ ضائع کریں جن کے اندر خیر کی کوئی رمت باقی نہیں رہی ہے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورہ عیس میں اس عتاب کے رُخ کو ایک تشیل سے سمجھایا ہے جو نہایت حقیقت افروز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ایک حقیقت افروز  
تشیل

”اس کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت مستعد اور فرض شناس چرواہا ہے۔ اس کے گلے کی کوئی خربہ بھڑگلے سے الگ ہو کر کھڑ جاتی ہے۔ چرواہا اس کی تلاش میں نکلتا ہے ہر قدم پر اس کی گھر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں۔ جنگل کے کسی گوشے سے اس کی آواز بھی آرہی ہے۔ اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دوزخ تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصل گلے سے کچھ دیر کے لیے غافل ہو جاتا ہے۔ جب وہ واپس لوٹتا ہے تو آتا اس کو ملامت کرتا ہے کہ تم لوہے کے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھڑگلے پیچھے بدکان ہوئے۔ اس کو چھوڑ دیتے، بھڑگلا کھٹا جاتا، وہ اسی کے لائق تھی۔ بتاؤ۔ اس میں عتاب کس پر ہوا؟ چرواہا پر یا کھوٹی ہوئی بھڑگلے پر۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا رخ بظاہر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضرور ہے لیکن غصہ کا سارا زور منکرین و منافقین پر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس عتاب کے اندر نہایت دل نوازشیں مقیم ہیں۔“

كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ (۱۱-۱۲)

”کَلَّا“ یعنی اس طرح کے ناقدروں سے اس طرح چٹنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ یہ قرآن بس ایک پیغمبر کی یاد دہانی ہے۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کا جی نہ چاہے وہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر پر ذمہ داری لوگوں تک اس یاد دہانی کو پہنچا دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اس کو اتار دے۔ اس پر ذمہ داری انذار کی ہے نہ کہ ایک ایک کی نازیبرداری کی!

زَانَتْہَا میں ضمیر کا مرجع ذکر کی ہے جو آیت ۱۱ میں ہے۔ اور ”ذَكَّرْهُ“ میں بھی مرجع وہی ہے لیکن یہاں لحاظ معنی کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی۔ چونکہ ”ذَكَّرْهُ“ اور ”تَذْكِرَةٌ“ دونوں سے مراد قرآن ہی ہے اس وجہ سے یہاں ضمیر مذکر لاکران کے اصل مفہوم پر روشنی ڈالی دی۔ اس کی شاہیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس سے وہ حقیقت واضح ہو گئی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہاں اگر حضور پر کوئی عتاب ہے بھی تو اس کی نوعیت عتاب محبت کی ہے کہ آپ نے اپنے اوپر وہ بوجھ کیوں اٹھا لیا ہے جو آپ کے رب نے آپ پر نہیں ڈالا۔

”فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ“ کے بعد کلام کا ایک حصہ حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی



کہ جس کا جی چاہے اس باددہانی سے فائدہ اٹھائے، جس کا جی چاہے وہ بہرہ بنالہ ہے۔ دوسرے مقام پر یہی بات یوں فرمائی ہے اَفَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ اَلَا هُمْ (۱۸:۱۹) (پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے)۔

فِي صُحُفٍ مُّسْكَّرَةٍ ۚ مَّرْقُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۚ بِأَيْدِي سَفِيَةٍ ۚ كَوَامٍ  
بَدْرَةٍ (۱۳-۱۴)

اد پر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متکبرین سے اعراض اور بے پروائی برتنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے۔ یہ اسی کی مزید وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارے نمایان شان بات یہ نہیں ہے کہ ان مغروروں کے آگے تم اپنے آپ کو زیادہ جھکاؤ اسی طرح یہ کلام بھی، جو تم ان کو سنار ہے ہو، ایسی چیز نہیں ہے جو منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ یہ نہایت ہی اشرف، نہایت ہی بلند اور نہایت ہی پاکیزہ و برتر چیز ہے۔ یہ کوئی ناقص جنس نہیں ہے کہ تمہیں یہ فکر کرنی پڑے کہ کسی نہ کسی طرح یہ یک ہی جاثے اگر چہ اس کی خاطر تمہیں خریداروں کی خوشامد ہی کرنی پڑے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ محفوظ کے لعل و گہر ہیں جو تم مفت لٹا رہے ہو۔ اگر یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنے ہی کو ابدی خسارے میں مبتلا کر رہے ہیں۔

فِي صُحُفٍ مُّسْكَّرَةٍ ۚ یہ اس کلام کی عالی نسی اور عالی مقامی کی تعریف ہے۔ 'فِي صُحُفٍ' دراصل 'هُوَ فِي صُحُفٍ' ہے۔ یہاں مبتداء کو حذف کر دیا ہے۔ صفات مابعد کے بیان میں مبتداء کا حذف عربیت میں معروف ہے۔

'صَحِيفَةٌ' لکھے ہوئے ورق کو کہتے ہیں۔ جمع کی صورت میں یہ بعض اوقات کتاب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اس سے اشارہ لوح محفوظ کی طرف ہے۔ 'مُكْرَمَةٌ' یعنی وہ ایک عزیز، گراں مایہ اور قیمتی خزانہ ہے جس کی حفاظت اللہ کے فرشتے نہایت اہتمام سے کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس تک ہر ایک کی رسائی ہے اور نہ ہر ایک اس کا اہل ہے کہ اس میں سے کچھ لے یا پاسکے بلکہ یہ اللہ ہی ہے کہ اس میں سے جس کو چاہتا ہے کچھ بخشتا ہے اور اسی نے تمہیں اس خزانے سے بخشا ہے تو اس نعمت سے انہی کو بہرہ مند کرو جو اس کے اہل ہیں۔ نا اہلوں کے آگے ان موتیوں کو نہ ڈالو۔ یہ بات انجیل میں بھی نہایت مؤثر تمثیل کی صورت میں آئی ہے اور ہم کسی موزوں مقام میں اس کو نقل کر آئے ہیں۔

'مَرْقُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ' یہ دونوں صفتیں بھی اس کے مکرم ہونے کے پہلو ہی کی وضاحت کے لیے آئی ہیں۔ صفت 'مَرْقُوعَةٍ' معنی اور رجمہ دونوں قسم کی بندیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے: دُرَاهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلَّكُمْ (الزخرف: ۴۳)۔



(اور یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے، نہایت بلند اور پر حکمت)۔

’مُطَهَّرَةٌ‘ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ قرآن مجید شایعین اور ارجح خیبتہ کی دست رس سے بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً فرمایا ہے: ’فِي كِتَابٍ مُّكْتُوٰتٍ ۭ لَا تَمَسُّهُ اِلَّا الْمَطَهَّرُوْنَ‘ (الواقعة- ۵۶: ۷۸-۷۹) وہ ایک محفوظ کتاب میں ہے جس تک صرف پاکیزہ ہاتھوں ہی کی رسائی ہے۔

’بِاَيِّدِي سَفَرَةٍ ۭ كِرَامٍ بَرَرَةٍ‘۔ یہ ان ملائکہ کی صفت بیان ہو رہی ہے جن کی امانت میں اللہ تعالیٰ نے اس کتابِ عزیز کو محفوظ فرمایا ہے۔ اور ’لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمَطَهَّرُوْنَ‘ مالین کی والی آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے۔ اس میں جو بات منفی پہلو سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں مثبت پہلو سے فرمائی گئی ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ اس کتابِ عزیز تک ارجح خیبتہ کی رسائی نہیں ہے بلکہ یہ ان پاک فرشتوں کی تحویل میں ہے جو نہایت با عزت اور نہایت با وفا ہیں۔

’سَفَرَةٌ‘ جمع ہے ’سَافِرٌ‘ کی جس کے معنی قاری و کاتب کے ہیں۔ ’سَفَرٌ‘ پڑھنے اور لکھنے دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ اس کے اشتقاق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں تو لکھنے کے لیکن پڑھنے اور بیان کرنے کے مفہوم میں یہ وسیع ہو گیا ہے۔

لفظ ’کِرَامٍ‘ میں ان کی عالی مقامی اور بلند کرداری کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایسے بلند مرتبہ اور معزز ہیں کہ ان سے کسی خیانت کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ نہ وہ اس میں خود کمی بیشی کر سکتے، نہ یہ امکان ہے کہ جنات و شیطین کو اس تک رسائی کا کوئی موقع دیں۔

’بَرَرَةٍ‘ جمع ہے ’بَارٌّ‘ کی۔ ’بَارٌّ‘ کہتے ہیں فرماں بردار، با وفا اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والے کو۔ یہ صفت ان کی امانت داری کے وصف کو مزید نمایاں کرنے کے لیے آئی ہے مثلاً فرمایا ہے: ’نَزَلَ بِهٖ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ‘ (الشعراء- ۲۰: ۱۹۳) (یہ کلام جبریل امین کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے)۔ دوسرے مقام میں اس کی مزید وضاحت ہے: ’اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كُوْبِرَ ذِيْ قُوَّةٍ يُنۡصِتُۭ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٌ ۭ مَّتَّاعٍ مُّتَمَكِّيْنٌ‘ (التکوید- ۸۱: ۱۹-۲۱) (یہ کلام ایک با عزت رسول کے واسطے سے القاء ہوا ہے۔ وہ بڑی قوت والا اور عرشِ واسے کے حضور میں نہایت مقرب ہے۔ اس کی بات مانی جاتی ہے۔ مزید بآں وہ نہایت معتد ہے)۔

قرآن اور اس کے محافظین کی ان صفات کے ذکر سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے بلکہ جس عظمت و شان کا وہ کلام ہے اسی قدر و خود داری کے ساتھ اس کی دعوت دی جائے اور جس طرح کے با و تار ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اور اس کو نازل کرنے پر مامور فرمایا ہے چاہے کہ اللہ کا رسول اور اس کے ساتھی بھی اس کی دعوت و تبلیغ میں اسی



کردار کا مظاہرہ کریں۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ وحی الہی کے اخذ و تلقین کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس ذات کا انتخاب فرمایا اور پھر جن لوگوں پر اس کی حفاظت، وصیانت اور تحریروں کی ذمہ داری ڈالی وہ کس کردار اور کن صفات کے لوگ تھے اور انھوں نے کس دیانت و امانت کے ساتھ اپنے اس فرض کو انجام دیا۔ گویا جن صفات کے ملائکہ کو اس خدمت پر آسمانوں میں مامور فرمایا گیا انہی صفات کے انسانوں کو اس زمین پر اس کے حمل و نقل کے لیے منتخب فرمایا گیا۔

قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ (۱۷)

انسان کی بددماغی پر اظہارِ اندوس اگرچہ لفظ الْإِنْسَانُ عام ہے لیکن کلام کا رخ انہی متکبرین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ہم سمجھے مناسب مواقع پر زبان کے اس اسلوب کی طرف توجہ دلا چکے ہیں کہ بعض مرتبہ کلام کا رخ ہوتا تو کسی خاص شخص یا کسی مخصوص گروہ ہی کی طرف ہے لیکن بات ان سے منہ پھیر کر عام صیغے سے کہہ دی جاتی ہے جس سے مشکل کی بے زاری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ فرمایا کہ یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے! غارت ہوا کتنے ناشکرا بن کے رہ گیا ہے! اس کی بددماغی کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کو اللہ کا کلام اور پیغام بھی سنایا جائے تو اس کے آگے جھک کر اور نیاز و بند بن کر سنایا جائے!

دراز دستی ایس کو تہ آستیناں بین!

”مَا أَكْفَرَهُ“ کا اسلوب اظہارِ تعجب اور اظہارِ نفرت دونوں کا حامل ہے۔

مِنْ أَمْرِ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ ۖ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۖ  
ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۖ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ (۱۸-۲۲)

یہ ان مغروروں کے کہہ و غرور پر ضرب لگاتی ہے لیکن مطالب کی ترتیب اس طرح ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں انسان کی خلقت، مادہ خلقت، مراحل خلقت، وسائلِ معیشت، غرض زندگی، موت، قبر سے لے کر حشر و نشر تک ساری باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ ان پر اپنے غرور کی بجائے بھی واضح ہو جائے اور وہ خود اپنی زندگی کے آئینہ میں اس جزاءِ سزا کو بھی دیکھ لیں جس کی خبر قرآن ان کو دے رہا ہے۔

”مِنْ أَمْرِ شَيْءٍ خَلَقَهُ“ یہ سوالِ تحقیر کے لیے بھی ہے اور زندگی بعد الموت کی طرف

توجہ دلانے کے لیے بھی۔ ان متمردین کو زعمِ ہمت کہ جس طرح اس دنیا میں وہ باعزت اور صاحبِ سیادت و قیادت ہیں اسی طرح آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے نمایاں شان و مراتب ہوں گے۔ اس زعم کے سبب سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز ان کے دلوں پر بڑا شاق گزرتا تھا کہ



یہ ہم کو تو جہنم میں جھونکے جانے کے ڈر اورے سنا رہے ہیں اور ان فقروں کو جنت اور ابدی بادشاہی کی بشارت دے رہے ہیں جو ہمیشہ سے ہماری جوتیاں سیدھی کرتے آئے ہیں اور جن کو اپنے پہلو میں بٹھانا بھی ہم نے گوارا نہ کیا۔ ان کے اس زعم پر قرآن نے ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے :

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ  
مُطْعِينَ ۚ عَنِ السَّيِّئِ دَعْنِ  
الشَّكَاكِ عَزِيزٍ ۚ أَلَيْسَ كُلُّ امْرِئٍ  
مِّنْهُمْ أَن يَدَّ حَلَّ جَنَّةٍ نَّعِيمٍ ۚ  
كَلَّا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُونَ ۚ  
(المعارج - ۷۰ : ۳۶ - ۳۹)

پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ تمہارے  
ادھر پہلے پڑ رہے ہیں، دابنے بائیں سے  
ٹولیاں بنا بنا کر! کیا ان میں سے ہر شخص یہ توقع  
یہے مٹھتا ہے کہ وہ نعمت کے باغ میں داخل  
کر دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں، ہم نے ان کو پیدا کیا  
ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں!

ان آیات کا سیاق و سباق اور اس کی تفسیر تذکرہ قرآن کی روشنی میں سمجھ لیجیے۔ یعنی نجس پانی کی ایک  
بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی برتری اور پاک دامنی کا یہ غرہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو  
پیدائشی حق و رب جنت سمجھ بیٹھے۔

اسی طرح قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت اور اس کے مادہ خلقت سے قیامت پر اس پہلو سے  
استدلال کیا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک حقیر بوند کو انسان بنا سکتا ہے اس کے لیے اس کو مرنے کے بعد  
دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے! یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے بار بار بیان ہوا ہے، ہم صرف  
چند جامع آیات یہاں نقل کرتے ہیں :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ  
مِّنْ طِينٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً  
فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۚ ثُمَّ خَلَقْنَا  
النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ  
مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا  
فَنَكْسَرُوهُنَّ أَعْظَمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ  
خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ  
الْمُخْلِقِينَ ۚ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ  
ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ۚ ثُمَّ إِنَّكُمْ لَكُمْ يَوْمَ  
الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۚ

اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔  
پھر ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند کی شکل میں ایک  
غفوط ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے بوند کو  
ایک جنین کی شکل دی پھر اس جنین کو گوشت  
کا ایک لوتھڑا بنایا اور اس لوتھڑے کے اندر  
ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ  
پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری شکل  
دے دی۔ پس بڑا ہی بانیض و بابرکت ہے  
اللہ، بہترین خالق! پھر اس کے بعد لازماً  
تم مرنے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے  
یعنی جاؤ گے۔



مَنْ تَطْفِئُهُ خُلُقَهُ فَقَدْ رَكَ - سوال کا جواب چونکہ بالکل واضح تھا جس سے کسی کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں تھی اس وجہ سے جواب خود ہی دے دیا کہ پانی کی ایک بوند سے انسان کو پیدا کیا۔ اس پانی کی صفت قرآن کے دوسرے مقام میں 'مہین آئی ہے جس کے معنی حقیر و ذلیل کے ہیں۔ یعنی نہ اپنی کیت کے اعتبار سے کوئی بڑی چیز نہ قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی گہر گراں مایہ! تو ایسے شخص قطرے سے وجود میں آنے والے انسان کو زیادہ اترا ناس طرح زیب دیتا ہے!

خُلُقَهُ فَقَدْ رَكَ - تحقیق کے مضمون کے بعد کلام کا رخ اس تقدیر، تدبیر اور تیسیر کے بیان کی طرف مڑ گیا ہے جو انسان کی خلقت اور اس کی زندگی کے احوال و مراحل میں نمایاں ہے اور جو اس بات کی ناقابل انکار شہادت ہے کہ قدرت جس قطرے کو گہر بنانے پر اپنے عجائب تصرف کی اتنی شانیں دکھائی ہے وہ کوئی عبث اور بے مقصد چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازم ہے کہ ایک الیادن آئے جس میں وہ اس کی قدر و قیمت کو پرکھے، اس کے خیر و شر کو تو لے اور پھر جس کو اپنی میزان میں با وزن پائے اس کو چھانٹ لے اور جس کو ناکارہ اور بے قیمت پائے اس کو خس و خاشاک کی طرح تنور میں جھونک دے۔

'فَقَدْ رَكَ' میں اشارہ ان منازل و مراحل کی طرف ہے جو انسان کی تدریجی تشکیل میں نمایاں ہیں۔ جس طرح چاند کے عروج و محاق کی منازل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لفظ آیا ہے، مثلاً وَالْقَسْرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ زَيْنٍ - (۳۶ : ۳۷) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں) اسی طرح انسان کے تدریجی نشو و نما اور اس کے بچپن، جوانی اور پھر زوال و فنا کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ اور سورہ مومن کی آیات کا حوالہ گزرا ہے اس میں بھی یہ مضمون ہے اور یہاں آگے کی آیات میں بھی اس کے بعض پہلو واضح فرماے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تدریج و تقدیر خدا کی قدرت و حکمت اور اس اہتمام پر دلیل ہے جو انسان کی تخلیق میں نمایاں ہے اور یہ قدرت اور یہ اہتمام اس امر کی دلیل ہے کہ انسان کوئی عبث چیز نہیں ہے بلکہ اس کی خلقت ایک عظیم غایت کے لیے ہے جس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے، اس کا حساب ہو، اس کو جزایا سزا ملے۔ ساتھ ہی انسان کی تخلیق میں خدا کی جو قدرت نمایاں ہے وہ اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ذرا بھی متنبہ نہیں ہے۔

ثُمَّ الْبَيْدَ يَسْأَلُ مَفْتَرِينَ - عام طور پر اس تیسیر سے وہ تدبیر مراد لی ہے جو قدرت نے بچے کے بطنِ مادر سے برآمد ہونے کے لیے خود عورت اور بچے کے نظامِ جسم میں ودیعت فرمادی ہے اور جو درو کی مدد کے لیے عین وقت پر نمودار ہوتی ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ قدرتی انتظام نہ ہو تو کوئی دوسری تدبیر اس کا بدل نہیں ہے بلکہ زچہ و بچہ دونوں کے گھٹ کو مر جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک تیسیر کے مفہوم کو اس قدر محدود کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بچہ جس طرح بطنِ مادر



کے اندر قدرت ہی کی تدبیر و تیسیر سے نشوونما پاتا ہے اسی طرح مہد سے لحد تک قدرت ہی کی تیسیر اور رہنمائی سے وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز طے کرتا ہے۔ یہ خدا ہی کی تیسیر ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے کے بعد اس کی ماں کی چھاتیوں میں اس کے تغذیہ کے لیے دودھ اترتا ہے اور اس کو قدرت کی طرف سے جتنی طور پر یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ماں کی چھاتیوں کو چوسے۔ اسی طرح جوانی کے دور میں، وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں جو سرگرمیاں دکھاتا اور جو فتوحات حاصل کرتا ہے ان میں بھی وہ خدا ہی کے بخشے ہوئے اعضاء و اسلحہ، خدا ہی کی عطا کردہ عقل اور خدا ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سورہ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی شان یہ بتائی ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسُوْیَۃً وَّ اَلَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (الاعلیٰ - ۸۷ : ۲ - ۳) (جس نے خاک بنایا اور اس کے نوک چک سنوارے اور جس نے صلاحیتیں و ولایت کیں اور پھر ان کے استعمال کی راہ دکھائی)۔

یہی حال انفسی اور اخلاقی عالم میں بھی ہے۔ سورہ شمس میں فرمایا ہے : وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا ۖ فَالْتَمَسَهَا فُجُوْرَهَا وَنَقَّاهَا ۚ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۚ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (الشمس - ۹۱ : ۷ - ۱۰) شاید ہے نفس اور اس کی ترکیب، پس اس کو الہام کی اس کی بدی اور نیکی تو جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے گندا کیا وہ نامراد ہوا۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ روحانی ہو یا مادی اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کی راہ ہموار کی۔ اگر وہ اس راہ پر چلے تو وہ کبھی ٹھوکر نہ کھائے لیکن اپنے اختیار کے سوء استعمال سے وہ سیدھی راہ کے بجائے ٹیڑھی راہ اختیار کر لیتا ہے جو اس کو کسی ہلاکت کے کھڈ میں لے جا پھینکتی ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهُ فَاَنْبَوْهُ ۚ یہ زندگی کے آخری مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو موت دیتا اور دفن کھاتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والے کے لیے پیدا ہونے کے بعد سب سے زیادہ یقینی چیز موت ہی ہے۔ قدرت نے اس کو ایسے ضابطوں کے اندر جکڑ رکھا ہے کہ موت سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہے۔ اس کی کمند بالکل بے خطا ہے۔

اَنْبَوْهُ کے معنی کسی کو قبر میں رکھنا یا دفن کرنا ہے۔ اس لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس آخری مرحلہ بات کی طرف بھی ہے کہ جو مرنے والے کو دفن نہیں ہو جاتا بلکہ قدرت اس کو زمین کی تخیل میں دے دیتی ہے۔ جو شے تخیل میں دی جاتی ہے وہ لازماً ایک دن واپس لی جاتی ہے چنانچہ جب وقت آئے گا اللہ تعالیٰ اس امانت کو زمین سے واپس لے گا۔

ثُمَّ اِذَا سَاءَ اَنْشَرُهُ ۚ اِنْشَارُ کے معنی کھولنے، پھیلانے، چھینٹنے اور از سر نو اٹھا کھڑا کرنے کے ہیں۔ یعنی جب وہ پا ہے گا اس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کام میں اس کو ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جب پانی کی ایک بوند کو رحم مادر کے اندر اس نے ایک انسان کی شکل دے دی اور



اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو اسی انسان کو زمین میں دفن کرانے کے بعد اس سے  
اڑھرا کر لے کر لینا کیوں محال ہو جائے گا!  
لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَ (۲۲)

یہ آیت اوپر والی آیت قُبِلَ الْإِنْسَانُ مَّا أَكْذَبَ کے بالکل متوازی آیت ہے جس طرح اس میں  
بہشت دھرموں کی بہت دھرمی پر اظہارِ تعجب اور پھر ان کے اپنے وجود سے اس قیامت پر دلیل ہے  
جس کو وہ نالکھن سمجھ رہے تھے اسی طرح اس آیت میں ان کی کج فہمی پر باندازِ جبرِ ملامت اور اس کے  
بعد قیامت اور جزا و سزا پر اس اہتمامِ ربوبیت سے دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے گرد و پیش  
میں پھیلا رکھا ہے اور جو زبانِ حال سے یہ شہادت دے رہا ہے کہ جس انسان کے لیے رتبہِ کریم نے یہ  
خوانِ نعمت بچھایا ہے وہ غیر مشغول نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ اس کے لیے لازماً ایک روز حساب آنے والا ہے۔  
لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَ کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک سمجھانے اور دلائل پیش  
کرنے کا تعلق ہے اس میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے لیکن ان ضدیوں کی ضد اور مکابریت کا وہی حال ہے  
جو پہلے تھا جس دن کے لیے تیاری کی ان کو ہدایت کی جا رہی ہے اب بھی وہ اس سے بے پروا ہیں۔

’مَا أَمَرَ‘ میں وہ تمام احکام و اوامر بھی داخل ہیں جو فطرت کی بدیہیات میں سے ہیں اور وہ احکام  
بھی جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے۔ بدیہیات  
فطرت کے امر الہی ہونے کی وضاحت ہم آیت فَاذْكُوهُنَّ مِّنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ الرَّابِعَةُ ۲: ۲۲۲ کے تحت کر چکے ہیں۔  
فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ (۲۳)

غور کرنے والے  
کے لیے درمئی کی  
کہ نہیں ہے۔  
مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس پر غور کرے گا تو ضد کی بات اور ہے لیکن اس کی عقل میں فتور نہیں ہے تو وہ نہایت  
آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو مرنے کے بعد زندہ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جو بارش  
اس کی غذا کا ذریعہ ہے وہی برابر اس کا مشاہدہ کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ  
ربوبیت کا یہ وسیع انتظام منکزم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہو۔ ایک بنِ لازم اس سے پرستش  
ہونی ہے کہ اس نے ان نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم ایک امرِ فطری ہے۔

أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۲۵-۲۶)

غور کرنے کا  
باقیہ  
صرف غور کرنے کی دعوت ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ غور کی لائن بھی معین کر دی کہ یوں غور کرے  
فرمایا کہ یہ ہماری ہی قدرت و عنایت کا کرشمہ ہے کہ ہم اچھی طرح مینہ برساتے اور پھر زمین کے مسامات کو اس



میدن سے میرا بھونے کے لیے اچھی طرح کھول دیتے ہیں۔ نہ آسمان سے پانی برسا کسی کے بس میں ہے اور زمین کے سمات کو کھولنا کسی کے امکان میں در آنحالیکہ انہی دونوں چیزوں پر زمین کی تمام فیض بخشی کا انحصار ہے یہی مضمون سورہ انبیاء میں یوں بیان ہوا ہے: **إِنَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا دُثْفًا فَفَتَقْنَاهُمَا** (الانبیاء-۲۱: ۳۰) (آسمان اور زمین دونوں بندھوتے ہیں پس ہم ان کو کھول دیتے ہیں)۔

اوپر کے پیرے میں انسان کی خلقت کی جو نوعیت بیان ہوئی پہلے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے تو دونوں دلیلوں کی مشابہت واضح ہوگی۔ وہاں بیان ریل کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ بات اثبات امکان قیامت سے چلی پھر روبرویت، مسئولیت اور جزاء و سزا تک پہنچتی ہے۔ یہاں بھی آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ استدلال کی ترتیب وہی ہے۔ پہلے ایک جامع بات نے امکان معاد کی تہیہ و استوار کر دی۔ اس کے بعد روبرویت کے آثار کی طرف توجہ دلائی گئی اور پھر مسئولیت اور جزاء و سزا کو ایک بدیہی نتیجہ کے طور پر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔

**فَاَنْتَبِهْ فِيهَا حَيَاةٌ وَعَذَابٌ وَقُضْبًا ۚ وَذُرِّيُّونَا دَنَخُلًا ۚ وَحَدَائِقُ غُلْبًا ۚ وَفَاكِهَةٌ وَّارْبًا ۚ (۲۴-۲۱)**

آسمان و زمین یا بالفاظ دیگر بارش اور زمین کے باہمی تفاعل سے اللہ تعالیٰ کی پروردگاری کی جو برکتیں زمین کی بل زمین کے لیے ظہور میں آتی ہیں یہ ان میں بعض ایسی نمایاں چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن سے قرآن بعض برکتیں کے دل مخاطب، واقف بھی تھے اور جو انسان کی غذائی ضروریات میں بنیادی اہمیت رکھنے والی بھی ہیں۔

سب سے پہلے بعض ان چیزوں کی طرف توجہ دلائی جو زمین سے لگی ہوئی یا اس پر کھپی ہوئی پیدا ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، مثلاً غلہ، انگور اور ترکاریاں۔ غلہ غذائی چیزوں میں بنیادی اہمیت رکھنے والا ہے۔ دوسری ساری چیزیں اس کے تحت ہیں۔ اس وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے کیا، غلہ کے بعد غذائی چیزوں میں دوسری اہمیت رکھنے والی چیز پھل ہے اور پھلوں میں راس الثمار کی حیثیت انگور کو حاصل ہے اس پھل سے بطور نمونہ اس کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ترکاریوں کا ذکر فرمایا جو زمین پر پھیل ہوئی پیدا ہوتی اور غلہ کے ساتھ سالن کے طور پر کام آتی ہیں، بعض کچی حالت میں اور بعض پکا کر لفظ 'قضب' کا غالب استعمال اگرچہ سبزیوں اور ترکاریوں کے لیے ہے جو کچی کھائی جاتی اور تیار سالن کے حکم میں داخل ہیں لیکن عام سبزیوں اور ترکاریوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد بعض ان نعمتوں کا ذکر ہے جو فضا میں ابھرے ہوئے درختوں سے حاصل ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کے لیے نگاہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بطور مثال ان میں سے زیتون اور کھجور کا ذکر فرمایا۔ زیتون کو روغن پیدا کرنے والی چیزوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ قرآن میں اس کے روغن کی غذائی اہمیت کا بھی ذکر ہے اور سورہ نور میں اس سے جنے والے روشن چراغوں کی تمثیل بھی بیان ہوئی ہے۔







کہ ان چیزوں کا تمھاری نفع رسانی کے لیے ہونا تو بالکل واضح ہے اور اس امر میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ سب نعمتیں تمھارے پروردگار کے فضل سے حاصل ہوتی ہیں تو اب تم سوچو کہ ان انعامات کے بعد تمھارے اوپر خدا کی طرف سے کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ آخری بات اگرچہ نکتوں میں مذکور نہیں ہے لیکن سیاق کلام سے یہ خود واضح ہے، اس لیے کہ اوپر سے اصل بحث ہی یہی چلی آ رہی ہے کہ یہ ضدی اور مغرور لوگ اپنے رب کی ناشکری اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ ان پر خدا کے حقوق واضح نہیں ہیں یا یہ اپنی ذمہ داریوں کے شعور سے نابلدہ ہیں بلکہ یہ جان بوجھ کر محض اکڑ اور ضد کے سبب سے پیغمبر کی کوئی بات اپنی خواہشوں کے خلاف سننے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

فَإِذَا جَاءَتْ الْعَاقِبَةُ (۳۳)

’عَاقِبَةُ‘ کے معنی پہری کر دینے والی کڑک یا چنچ کے ہیں۔ جس طرح سورہ نازعت میں لفظ قیامت کی ’طَامَّةٌ‘ آیا ہے اسی طرح اس سورہ میں لفظ ’عَاقِبَةُ‘ آیا ہے۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر یاد دہانی رہی ہے کہ صور قیامت کی پہلی کڑک ہی ایسی ہوناک ہوگی کہ کانوں کو ہرا کر دے گی۔

’اِذَا‘ کا جواب، جیسا کہ سورہ نازعت کی آیات ۳۰-۳۵ کے تحت بیان ہو چکا ہے برہائے وضاحت قرینہ مخدوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ پیغمبر کے انذار سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں لیکن اس دن کیا کریں گے جس دن خدا کا نادی اتنے قریب سے ان کو لپکے گا کہ اس کا آواز سب کے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی!

يَوْمَ يَفِرُّ الْمُرْءِيُّ مِنْ أَخِيهِ ۖ وَأُمُّهُ وَأَبِيهِ ۖ وَصَاحِبَتُهُ وَبَنِيهِ ۖ وَإِذَا الْكَافِرُ كَانَ فِي رُكْنٍ مُمْتَدٍّ ۖ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا نَسِيهِ (۳۴-۳۵)

یہ تفصیل ہے اس دن کی ہوناک کی۔

’يَوْمَ يَفِرُّ الْمُرْءِيُّ مِنْ أَخِيهِ ۖ وَأُمُّهُ وَأَبِيهِ ۖ وَصَاحِبَتُهُ وَبَنِيهِ‘، ’اِذَا‘ کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو عربیت کے قاعدے سے اسلوب بیان اور ہوتا جواب تو، جیسا کہ سورہ نازعات کی آیت ’يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَى‘ (النزعت ۷۹-۸۵) کے تحت گزر چکا ہے، مخدوف ہے البتہ اس سے مخدوف جواب پر روشنی ضرور پڑتی ہے مطلب یہ ہے کہ آج پیغمبر کے انذار سے انھوں نے اپنے کان جو بند کر رکھے ہیں تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کو اپنی خاندانی اور قبائلی قوت و مصیبت پر بڑا ناز ہے۔ اس زعم نے ان کو اندھا کر رکھا ہے کہ بھلا ان کو ان کے مقام سے کون ہلا سکا ہے یا ہلا سکے گا لیکن اس پہری کر دینے وال چنچ کے بعد جو دن آئے گا وہ ایسا ہوناک ہوگا کہ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ نہ بھائی اپنے بھائی کی فریاد سنے گا، نہ بیٹا اپنے ماں باپ کی دہائی پر کان دھرے گا اور نہ کوئی اپنی بیوی اور بیٹیوں کی مصیبت میں ان کا شریک بننے کا حوصلہ کرے گا۔ اس دن ہر ایک کو اپنی ہی ایسی پڑی ہوگی کہ کسی دوسرے کی فہم کرنے کا وہ کوئی تصور ہی نہ کر سکے گا اگرچہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز ہو۔

یہی مضمون سورہ مارج میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے،



وَلَا يَسْتَدْرِكُ حَبِيمًا ۖ يَنْصُرُونَهُمْ  
يَوْمَ الْمَجْزُمِ لَوْ يَقْدِرُ مِنْ عَذَابٍ  
يَوْمَئِذٍ بَيْنِيهِ ۖ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۖ  
فَصِيلَتْهُ الَّتِي تُؤْتِيهِ ۖ وَمَنْ فِي  
الْأَرْضِ بَعْمِيًّا ۖ ثُمَّ يُنَجِّيهِ ۖ

اور اس دن کوئی سرگرم سے سرگرم دوست بھی اپنے  
دوست کا پرسان حال نہ ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو  
دکھائے جائیں گے لیکن مجرم یا ہے گا کہ کاش وہ اپنے  
بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی، اپنے خاندان کو  
جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے اور تمام اہل زمین کو نذیر  
میں سے اس دن کے عذاب سے اپنے کو بچالے۔

(المعارج - ۱۰۰: ۱۴)

ان دونوں آیتوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں رشتہ داروں کی ترتیب البعد سے  
اُزب کی طرف سے اور اس آیت میں اقرب سے البعد کی طرف اور یہ دونوں اسلوب بلاغت کلام کے  
تقاضی سے اختیار کیے گئے ہیں اور یہ بلاغت بالکل واضح ہے۔

وَجُودٌ يُؤْمِدُ مُسْفِرَةٌ ۖ ضَاحِكَةٌ مُتَبَشِّرَةٌ ۖ وَجُودٌ يُؤْمِدُ عَلَيْهَا غَبْرَةٌ ۖ  
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ (۲۸-۴۲)

اس دن اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان جو فرق ان کے چہروں سے نمایاں ہوگا، یہ آخر میں  
بالجمال اس کی طرف اشارہ کر دیتا کہ ان کے اس ظاہر سے ان کے باطن کا کچھ اندازہ ہو سکے کہ اہل ایمان کے  
دل اس دن کن امیدوں اور حوصلوں سے معمور ہوں گے اور اہل کفر کے دلوں پر اس دن کیا گزر رہی ہوگی۔

’مُسْفِرَةٌ‘ کے معنی روشن اور تابناک کے ہیں۔ یہ اسفرا صبح کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ مسرت  
کی پہلی چمک جو اہل جنت کے چہروں پر ظاہر ہوگی یہ لفظ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

’ضَاحِكَةٌ‘ بھی مسرت اور خوشی کی تعبیر ہے یعنی ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے۔

’مُتَبَشِّرَةٌ‘ یعنی ہشاش بشاش ہوں گے۔

اہل کفر کے چہروں کا جو حال ہوگا اس کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ وَجُودٌ يُؤْمِدُ عَلَيْهَا غَبْرَةٌ ۖ تَرْهَقُهَا  
قَتَرَةٌ کہ ان پر خاک اڑ رہی اور سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ ان پر امید کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔

’أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ‘: یہ آخر میں ان کی فرد قرار دینے کی طرف اجمال اشارہ ہے کہ ان کا  
یہ حشر اس وجہ سے ہوگا کہ یہ خدا کے ناشکرے اور اس کے باغی و نافرمان رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ وہو الموفق للصواب۔

رحمان آباد

۲۱ - مئی ۱۹۷۹ء

۲۲ - جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ



مدیر قرآن

۸۱

التکویر







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلق

پچھلے دونوں توام سورتوں ————— السُّورَةُ اَوَّلُ صَاحَّة ————— میں جس ہول قیامت سے طامۃ اَوَّلُ صَاحَّة کے ناموں سے ڈرایا گیا ہے اس سورہ میں اسی ہول کی پوری تصویر ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں پھر انسان کے قریب و بعید اور اس کے ظاہر و باطن کے ہر گوشہ میں اس ہول کے جو اثرات مترتب ہوں گے وہ اس طرح نگاہوں کے سامنے کر دیے گئے ہیں کہ انسان اگر سوچنے سمجھنے والا ہو تو ان آیات کے آئینے میں وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ابھی پس پردہ ہے لیکن ایک دن وہ سب اس کے سامنے آنے والا ہے۔

اس کے بعد قریش کے مکذبین کو مخاطب کر کے آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن اس دن سے جو تمہیں ڈر رہا ہے تو اس کو ایک حقیقت سمجھو اور اس کے لیے تیاری کرو۔ یہ خدا کا نازل کردہ کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے مقرب و معتمد فرشتے کے ذریعہ سے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ اگر تم نے اس کو کانٹوں کی کہانت اور شاعروں کی شاعری سمجھ کر رد کر دیا تو یاد رکھو کہ نہ خدا کا کچھ لگاؤ ہو گے نہ رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کر دو گے۔ رسول کا کام لوگوں تک اس یاد دہانی کو پہنچا دینا ہے۔ اس کے بعد ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس پر ایمان لانے کی توفیق انہی کو حاصل ہوگی جو حق کے تدریان اور اس کے طالب ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے :  
پہلے چھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو مردوں کو زندہ کیے جانے سے پہلے پیش آئیں گے۔

(۱-۲) اس کائنات کی بلند و بالا اور عظیم و پر شوکت چیزوں مثلاً سورج، چاند اور پہاڑوں کا اس دن جو حال ہوگا اس کی تصویر۔



(۴-۶) زمین کی ہر چیز پر اس دمن نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کا اجمالی بیان۔ محبوب ترین چیزیں چھوٹی پھریں گی لیکن ان کا کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ جنگلوں اور غاروں کے وحوش دیہات مندروں کی طیفانی سے فرار کے لیے اکٹھے ہو جائیں گے، شیر اور ہرن دونوں پاس پاس ہوں گے لیکن مشترک مصیبت کے سوا ان کو اور کسی چیز کا بھی کچھ ہوش نہ ہوگا۔

اس کے بعد آٹھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو اٹھائے جانے کے بعد شاہدہ میں آئیں گے۔ (۷-۱۴) انسانوں کی ان کے عقائد و اعمال کے اعتبار سے درجہ بندی اور معصوم مظلوموں کی داد رسی ہوگی۔ لوگوں کے اعمال نامے کھلیں گے۔ آسمان سرخ ہو جائے گا، جہنم دھکائی جائے گی جنت اپنے حق داروں کے قریب لائی جائے گی اور ہر ایک اس دن دیکھوے گا کہ وہ اپنے رب کے حضور کیا نذرانے کر آیا ہے۔

(۱۵-۲۱) ستاروں کے ٹوٹنے اور شب کی تاریکی کے بعد صبح کے نمودار ہونے سے اس بات پر شہادت کہ یہ قرآن کا ہنوں کی خرافات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے ایک جلیل القدر فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے جو عرشِ فائے کے نزدیک بڑا ہی باعزت و با اقتدار ہے۔ تمام ملائکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ نہایت معتد اور امانت دار ہے۔

(۲۲-۲۶) قرآن کے مکذبین کو تنبیہ کہ جو رسول تم کو یہ کلام سنا رہا ہے وہ کوئی خبیثی و دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا رسول اور نہایت فرزانہ ہے۔ وہ جس فرشتہ سے اپنی ملاقات کا دعویٰ کر رہا ہے یہ کوئی دھم نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ اس نے اس فرشتہ کو بالکل کھلے انتق میں دیکھا ہے۔ وہ غیب دانی کا حریص نہیں ہے بلکہ اس پر جو وحی آتی ہے وہ بالکل غیر ارادی طور پر مبداء فیض سے نازل ہوتی ہے۔ نادان ہیں جو اس کے کلام کو کسی شیطانِ رجیم کا افتاء سمجھتے ہیں اور اس کے انذار کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۲۷-۲۹) مکذبین کو مزید تنبیہ کہ اگر اسی طرح اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ نہ اللہ کا کچھ لگاؤ ہوگا نہ اس کے رسول کا بلکہ اپنی ہی تباہی کا سامان کر دے گا۔ جو کلام تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمہارے لیے یاد دہانی ہے، اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمہارا اپنا کام ہے۔ نہ رسول کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو تمہارے دلوں میں زبردستی اتار دے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس کو قبول کرنے پر مجبور کر دے۔ اس کے لیے انہی کے سینے کھلیں گے جو سیدھی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ رکھنے والے ہوں گے اور یہ حوصلہ انہی کے اندر پیدا ہوگا جو سنتِ الہی کے مطابق اس کے منرا دار ہوں گے۔







# رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ آیات

۲۹-۱

جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور تارے بے نور ہو جائیں گے۔  
پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور دس ماہرہ گا بھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور  
اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر ابل پڑیں گے۔ ۱-۲۹

جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا  
جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی! جب کہ اعمال نامے کھولے جائیں گے اور آسمان کی  
کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی،  
تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے! ۴-۱۲

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں سچے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے  
ستاروں کی اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے کہ  
یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ وہ بڑی ہی قوت والا اور عرش والے کے  
نزدیک بڑا ہی بار سوخ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ ۱۵-۲۱  
اور مھارایہ ساکتی کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا  
ہے اور یہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے اور یہ کسی شیطانِ رحیم کا اتقاء نہیں  
ہے۔ ۲۲-۲۵

تو تم کہاں کھوٹے جاتے ہو! یہ تو بس علم والوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ اس  
کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ اختیار کرنی چاہے اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ عالم  
کا خداوند چاہے۔ ۲۶-۲۹



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذَا الشَّمْسُ بَرَّتْ (۱)

’تکویر‘ کے معنی کسی شے کو لپیٹ دینے یا ایک گٹھر کی صورت میں باندھ لینے کے ہیں۔ کَوْنَالْعِمَامَةِ  
عَلَى رَأْسِهِ کے معنی ہیں اس نے عمامہ اپنے سر پر لپیٹ لیا۔

قیامت کے ظہور کے وقت آسمانوں بلکہ اس پوری کائنات کی سب سے زیادہ نمایاں اور شاندار چیز۔ قیامت کے  
سورج نہ کا جو حال ہو گا یہ اس کی تصویر ہے کہ اس کی بساط بالکل لپیٹ دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب ظہور کے وقت  
سورج کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی تو وہ سارا عالم تیرہ دن ہوتا رہے گا جو اس کی تابانی سے روشن سورج کا حال  
ہے۔ اگرچہ سورج کے چھپنے کا مشاہدہ ہمیں آج بھی ہر روز ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف  
ہے۔ یہ صورت صرف اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم اسی سے اوٹ میں ہو جاتے ہیں البتہ جب قیامت  
کی پہلی برپا ہوگی تو سورج کا سارا نظام ہی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس  
تاریکی کا جب کہ سرے سے سورج ہی تاریک ہو جائے۔

وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ (۲)

’انکدأ‘ کے معنی دھندلے ہو جانے اور مات پر جانے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ستاروں کا بے نور  
ہو جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سورج ہی کی بساط لپیٹ دی جائے گی تو اس کے نظام سے البتہ جتنے  
بھی جلیب اور قمقمے ہیں وہ سب آپ سے آپ بے نور ہو جائیں گے۔

وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّدَتْ (۳)

آسمان کے بعد زمین کی سب سے شاندار اور عظیم چیز۔ پہاڑوں کی طرف اشارہ فرمایا کہ  
یہ پہاڑ جو زمینوں میں گڑے ہوئے ہیں، جن کو سمجھتے ہو کہ یہ بالکل غیر فانی اور اٹل ہیں، ان کی جگہ سے ان  
کو ہلایا نہیں جاسکتا، یہ اس دن چلا دیے جائیں گے۔ یہاں صرف چلا دیے جانے کا ذکر ہے لیکن دوسرے  
مقامات میں اس کی تفصیل بھی ہے کہ وہ اس طرح اڑتے پھریں گے جس طرح بادل اڑتے پھرتے ہیں۔

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (۴)

یہ امر ملحوظ رہے کہ شارحین قیامت کو جب قیامت کی پہلی سہ ڈرایا جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ  
سارا کرتے کہ قیامت آئے گی تو کیا وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی،



محبوب چیزوں کی کس پر سی 'عِشَاءُ' جمع ہے 'عُشَاءُ' کی۔ یہ لفظ اس اذٹنی کے لیے آتا ہے جو دس ماہ کی گاہن

یعنی بچہ جننے کے قریب ہو۔  
عظیم چیزوں کی بے ثباتی کے بعد یہ محبوب چیزوں کی بے وقعتی واضح فرمائی ہے کہ اس دن کی بچل  
لوگوں پر ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری کر دے گی کہ کسی کی نظروں میں اس کے محبوب سے محبوب مال  
کی بھی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔

یہ بات قرآن کے اولین مخاطب، اہل عرب کے خاص مذاق طبعیت کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی  
ہے۔ ان کے مال میں سب سے زیادہ قدر کی جگہ ان کے اذٹنیوں کو حاصل تھی۔ خاص طور پر وہ اذٹنیاں  
ان کو نہایت عزیز و محبوب تھیں جن کے حمل پر دس ماہ گزر چکے ہوں اور بچہ جننے کا وقت اب قریب  
آگیا ہو۔ اس طرح کی اذٹنیوں کے مالک ان کی نگہداشت کا قدرتی طور پر خاص اہتمام کرتے۔ ان کی مستقبل  
کی بہت سی آرزوؤں کا ان پر انحصار ہوتا۔ انہی محبوب اذٹنیوں کو بطور مثال ذکر کر کے دنیا کی محبت میں  
پھنسے ہوئے غافلوں کو ہولِ آخرت کی یاد دہانی فرمائی ہے کہ اس کا پہلا ہی مرحلہ اتنا شدید ہوگا  
کہ اس وقت کسی کو اپنی محبوب سے محبوب چیزوں کا بھی کچھ ہوش نہیں رہے گا۔ گاہن اذٹنیاں  
آوارہ پھریں گی لیکن ان کے مالکوں کو خود اپنی اس طرح پڑی ہوگی کہ وہ کسی اور چیز کی طرف، خواہ  
وہ کتنی ہی محبوب و مطلوب کیوں نہ ہو، توجہ نہیں کر سکیں گے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام 'تَذْهَدُ  
'کُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ' (الحج - ۲۲: ۲۰) (جس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے  
کو بھول جائے گی) کے الفاظ سے سمجھائی گئی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ یہاں اس دن کے ہول کی حقیقت  
محبوب مال کی ناقدری سے سمجھائی گئی ہے اور وہاں شفقتِ مادری کے مردہ ہو جانے سے درانحالیکہ  
یہ جذبہ اتنا قوی ہے کہ اس دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو مغلوب نہیں کر سکتی۔

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (۵)

یعنی انسان تو انسان اس دن کے ہول سے وحشی جانوروں پر بھی ایسی نفسی نفسی کی حالت  
طاری ہوگی کہ ان کو جس بگاڑ پناہ ملنے کی توقع ہوگی، آپس کی فطری دشمنیاں بھول کر سب اکٹھے ہو جائیں گے  
جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب کا پانی پھیل جائے تو جنگلی جانور سراسیمگی کی حالت میں جس ٹیلے  
اور ٹیکرے پر ان کو پناہ ملنے کی توقع ہو وہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مشترک مصیبت کا ہول ان پر ایسا طاری  
ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو ہوش نہیں۔ ہتھاکہ اس کا  
حرکت یا ٹسکا اس کی بھل میں ہے۔ یہی صورت حال خونناک ترین شکل میں ظہورِ قیامت کے وقت  
پیش آئے گی۔ آگے والی آیت: 'وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ' (۶) (اور جب کہ سمندر ابل پڑیں گے) سے  
معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سمندر اپنی حدود سے آزاد ہو کر زمین پر پھیل جائیں گے۔ یہ ہمہ گیر



مصیبت جنگل جانوروں پر بھی نفسی نفسی کی حالت طاری کر دے گی۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۴)

لفظ 'تُسَجِّرُ' اصلاً تنور کو ایندھن سے بھر کر بھڑکا دینے کے لیے آتا ہے پھر اسی مفہوم سے سمندروں وسعت پا کر یہ دریاؤں اور سمندروں کی طغیانی کے لیے بھی آنے لگا۔ دریا جب بے قابو ہو کر اپنے حدود سے باہر نکل پڑیں اور زمین پر پھیل جائیں تو اس حالت کی تعبیر کے لیے یہ معروف لفظ ہے۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لیے لفظ 'تُسَجِّرُ' بھی آیا ہے، چنانچہ بعد والی سورہ میں جو اس کی توام سورہ ہے، یہی بات 'وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ' (الانفطار - ۸۲: ۳) کے الفاظ سے تعبیر فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ سمندر اپنے اپنے حدود کے اندر بند ہیں لیکن جب قیامت کی پھل برپا ہوگی تو یہ اہل کرنام سطح پر چھا جائیں گے۔

وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (۵)

اوپر کی آیات میں وہ احوال بیان ہوئے جو ظہور قیامت کے وقت پیش آئیں گے۔ اب اس آیت اور بعد کی آیات میں وہ باتیں بیان ہو رہی ہیں جن کا تعلق ظہور قیامت کے بعد کے احوال سے ہے۔

فرمایا کہ جب کہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی، جوڑیں ملانے سے مقصود لوگوں کی ان کے اعمال عقائد کے اعتبار سے الگ الگ کردہ بندی ہے۔ یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے جس کی تفصیل سورہ واقعہ کی آیت، 'وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً' سے لے کر آیت ۴۴ تک بیان ہوئی ہے۔ وہاں واضح فرمایا ہے کہ اس دنیا میں تو نیک و بد دونوں ایک ہی ساتھ زندگی گزارتے ہیں لیکن یہی حالت ہمیشہ نہیں رہے گی بلکہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب لوگوں کی درجہ بندی ان کے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہوگی۔ اس دن وہ لوگ فائز المرام اور ابدی بادشاہی کے حق دار ٹھہریں گے جو ان روزِ عدل کی میزان میں پورے اتریں گے اور وہ ایک ابدی خیران لذت سے دوچار ہوں گے جو اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزاریں گے۔ اس کے بعد لوگوں کو تین بڑے گروہوں ——— اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور سابقون و مقلوبون ——— میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر گروہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہوگا اس کی تفصیل ہے۔ اسی چیز کی طرف دو لفظوں میں یہاں اشارہ فرمادیا ہے اور مقصود لوگوں کو متنبہ فرمانا ہے کہ یہ دنیا آزمائش و امتحان کے لیے ہے۔ اس میں خیر و شر اور حق و باطل دونوں کو بہت ملی ہوئی ہے لیکن قیامت کے بعد جو جہان پیدا ہوگا اس میں باطل



کے پرستار جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اور ان لوگوں کو ابدی سرفرازی حاصل ہوگی جو امتحان میں پورے اتریں گے۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۸-۹)

یہ اس روزِ عدل کے عدل کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بیان کے لیے بطور مثال زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کی دادرسی کا حوالہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دن سب سے پہلے وہ معصوم اپنی مظلومت کی داد پائیں گے جو بالکل بے گناہ ان لوگوں کے ہاتھوں ظلم کے شکار ہوئے جن کو خدا نے ان کا محافظ بنا یا۔ مَوءُودُ ذُنُّو زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو کہتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے بعض اجڈ قبائل میں سنگدل باپ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بیشتر تو اس سنگ دلی کا سبب نفرت کا اندیشہ ہوتا لیکن بعض حالات میں غیرت کی بے اعتدالی بھی اس کا باعث بن جاتی۔ ان مظلوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے والے چونکہ ان کے باپ ہی ہوتے، جن کو ان کے ادپرکلی اختیار حاصل ہوتا، اس وجہ سے ان کی داد فریاد کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

معصوم مظلوموں کی دادرسی

قرآن نے یہاں ان بے زبان مظلوموں کی دادرسی کا ذکر کر کے آخری عدالت کا مزاج واضح فرمایا ہے کہ اس میں سب سے پہلے ان کی دادرسی ہوگی جو اس دنیا میں سب سے زیادہ بے بس اور کمزور تھے اور جو اپنے ادپر گزرے ہوئے ظلم کی کسی کے آگے فریاد بھی نہ کر سکے۔ ان کو سب سے پہلے پکارا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ انھیں کس گناہ پر مارا گیا؟ ان سنگدل باپوں کو یہ نہایت ہی سخت قسم کی تنبیہ ہے کہ اگر ان کی سنگ دلی کے خلاف یہ بے زبان و بے گناہ بچیاں فریاد نہ کر سکیں تو اس سے وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ خدا کے ہاں بھی ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ اس دن اللہ تعالیٰ خود ان کے خون کا مدعی بنے گا۔ وہ ان مظلوموں سے پوچھے گا کہ تمہیں کس جرم میں مارا گیا؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ ان کے تئیں ناحق کا مقدمہ جو دنیا کی کسی عدالت میں نہ جاسکا اس کو رب العزت خود اپنی عدالت میں لائے اور اس کا فیصلہ فرمائے۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۱)

صُحُف سے مراد لوگوں کے اعمال نامے ہیں اور ان کے کھیلے جانے سے مقصود یہ ہے کہ ہر ایک کچا چٹھا اس کا سارا کچا چٹھا اس کے سامنے آجائے گا۔ آگے فرمایا ہے: 'عَمِلَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ' (یعنی ہر کے سامنے یہ جانے لگی کہ آج کے دن کے لیے اس نے کیا کیا۔)

ہر ایک کا کچا چٹھا اس کے سامنے آجائے گا

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (۱۱)

كُشِط کے اصل معنی کسی چیز کے ادپر سے اس چیز کے اتار لینے کے ہیں جو اس کو ڈھانکے ہوئے ہو۔ یہیں سے یہ ترجمہ کی کھال اتار لینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اونٹ کی کھال کھینچ لینے کے

آسمان سرخ ہو جائے گا



لیے یہ عربی میں معروف لفظ ہے اور یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے بعد اس کا گوشہ  
سرخ سرخ نظر آنے لگتا ہے۔ گویا یہ آسمان کے سرخ ہو جانے کی تعبیر ہے۔ سورہ رحمن میں تَنكَأَتْ  
وَرْدَةً كَالسِّدِّهَاتِ (۳۷) کے الفاظ آٹھ میں اور یہاں آگے کی آیت میں جہنم کے بھڑکاتے جانے کا ذکر  
ہے جو نہایت واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ آسمان کی یہ سرخی جہنم کے بھڑکاتے جانے کے سبب  
سے ہوگی۔

وَإِذَا أَذْجَبْتُمْ سَعَرَتُمْ (۱۲)

’سَعَرْتُمْ‘ کے معنی بھڑکانے اور دھکانے کے ہیں۔ جہنم تیار تو پہلے سے ہوگی لیکن جب مجرموں  
کو اس میں ڈالنے کا وقت آئے گا تو وہ ان کو جلانے کے لیے خاص طور پر بھڑکا دی جائے گی پھر جب  
مجرم اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنا مطلوب انہی صحن پاکر مزید قوت سے بھڑکے گی۔  
وَإِذَا الْجَبَّةُ أُرْفِغَتْ (۱۳)

’اُرْفِغَتْ‘ کے معنی قریب لانے کے ہیں۔ یعنی وہ ان متقیوں کے قریب لائی جائے گی جو اس کے مستحق قرار  
پائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ’جنت‘ بھی پہلے سے تیار ہوگی، البتہ اس کی نقاب کشائی اس وقت  
ہوگی جب لوگوں کی درجہ بندی ہو جائے گی۔ سورہ ہق میں یہ وضاحت بھی فرمادی گئی ہے کہ اس قریب  
لانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کہیں دور سے قریب لائی جائے گی، وہ دور نہیں ہوگی بلکہ پاس ہی ہوگی  
لیکن وہ قریب ہونے کے باوصف اور قریب لائی جائے گی تاکہ اہل جنت کی تشریف و تکریم کے لیے ایک  
پیش کش کے طور پر ان کے سامنے پیش کی جائے۔ فرمایا ہے: وَإِذَا رُفِغَتِ الْجَبَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ  
(نق۔ ۵۰۔ ۳۱) اور جنت خدا تر سوں کے لیے قریب لائی جائے گی دراصل لیکہ وہ کچھ دور بھی نہ ہوگی۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (۱۴)

ادھر جتنے اُڈا کر رہے ہیں یہ ان رب کا اکٹھے جواب ہے۔ یعنی جب یہ یہ احوال پیش آئیں گے  
تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ اپنے رب کے آگے پیش کرنے کے لیے کیا لے کر آئی ہے۔ اس جانے  
سے مقصود ظاہر ہے کہ اس کے انجام کو جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آج کے حالات میں  
اس کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ مذاق اڑائیں لیکن یاد رکھیں کہ یہ دن آنے والا ہے اور ایک عظیم بلجلی  
کے ساتھ آنے والا ہے اور اس دن ہر ایک دیکھ لے گا کہ اس کے لیے اس نے کیا تیاری کی اور  
کیا چیز نظر انداز کی دراصل لیکہ وہ کرنے کی تھی۔ آگے والی سورہ میں، جو اس کی توام سورہ ہے، یہی  
مضمون زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ فرمایا ہے: عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ  
آخِرَتْ (الانفطار۔ ۸۲: ۵) (تب ہر ایک جانے گا اس نے کیا کیا اور کیا چھوڑا)۔

فَلَا تَسْمُ بِالْخُنْصِ ۖ الْجَوَارِ الْكُنْصِ ۖ إِذَا عَسَيْتُمْ ۖ وَالصُّبْحِ



اِذَا تَنَفَّسَ ۖ اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۱۵-۱۹)

قرآن کی کتاب سے متعلق اسیجا دیکھا اور جس کو دلیل بنا کر انھوں نے اپنے عوام کو درغلانے کی کوشش کی کہ وہ قرآن کو کوئی خدائی وحی سمجھ کر اس سے مرعوب یا متاثر نہ ہوں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے متاثر ہو رہے ہیں اور عذاب و قیامت کا ڈر ادا ایک حقیقت مناجا رہا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکل سکتا ہے کہ وہ اس دعوت کے حامی بن جائیں تو انھوں نے ان کو اس سے بدگمان کرنے کے لیے یہ اُشغله ایجاد کیا کہ یہ قرآن خدائی وحی ہے اور نہ اس کے پیش کرنے والے اللہ کے رسول ہیں بلکہ یہ ہمارے کاہنوں کی طرح کے ایک کاہن ہیں جس طرح کاہنوں کا تعلق بجات سے ہوتا ہے جو ان پر غیب کی باتیں اتقاء کرتے ہیں اسی طرح ان کا رابطہ بھی (العیاذ باللہ) کسی شیطان سے ہے جو ان پر اپنی باتیں اتقاء کرتا ہے اور وہ اس کو خدائی وحی کے نام سے پیش کرتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں جن کو اس نے ہمارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ ہم ان کی اطاعت کریں اور اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو اس دنیا میں بھی ہم پر عذاب آ جائے گا اور اس کے بعد آخرت میں بھی ہمارے لیے جہنم تیار ہے۔

قرآن نے ان کے اس پراپیگنڈے کی جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورہ شعراء اور سورہ نجم میں اس کی تردید پوری وضاحت سے ہوئی ہے اور ہم نے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ یہاں بھی ان کے اسی پراپیگنڈے کی تردید ایک نئے پہلو سے ہے جس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے عربوں میں مروج کہانت کی اصل و بنیاد کو جان لینا ضروری ہے۔

اس کہانت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی:

ایک تو ان کے مزعمہ علم نجوم پر۔ وہ ستاروں کے مصروف بالذات ہونے کے معتقد اور ان میں سے بعض کے سعد اور بعض کے نحس ہونے کے مدعی تھے۔ اسی طرح ان کے طلوع و غروب، ان کے گرنے اور چڑھنے اور ان کے چلنے اور چھپنے کے متعلق مختلف قسم کے ادہام انھوں نے ایجاد کر رکھے تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے مختلف قسم کی مبارک یا منکوس پیشین گوئیاں کرتے اور اپنی غیب دانی کی دھونس جھاتے۔ مثلاً بسا اوقات یہ افواہ پھیلا دیتے کہ فلاں ستارے کی الٹی گردش سے ایک بڑا خطرہ ظہور میں آنے والا ہے اس سے بچنے کی تدابیر معلوم کرنے کے لیے لوگ ان سے رجوع کریں۔ پھر جو بد قسمت ان کے دام میں آ جاتے ان کو وہ اچھی طرح بے وقوف بناتے۔ دوسری یہ کہ وہ بجات سے رابطہ رکھنے اور ان کے ذریعہ سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کے مدعی تھے۔ سورہ شعراء کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے کہ جب کوئی شخص ان سے کسی معاملے میں غیبی رہنمائی کا



طالب ہوتا تو وہ اس مقصد کے لیے مراقبہ کی نمائش کرتے اور پھر ایک متفقہ اور صحیح کلام کی صورت میں جو اکثر بے معنی یا ذومعانی ہوتا، اپنی فرعونہ وحی پیش کر کے اس کے کچھ اٹھ سیدھے معنی بیان کرتے اور دعویٰ کرتے کہ یہ وحی ان پر عالم غیب کے اصرار سے واقف ایک جن نے کی ہے۔

قرآن نے جگہ جگہ کہانت کے ان دونوں ہی ستونوں پر ضرب لگائی ہے۔ شمس و قمر اور تاروں کے طلوع و غروب کو اس نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی ستون پر معترف بالذات ہے اور نہ کوئی سعد یا نحس بلکہ ان کا طلوع و غروب خالق کائنات کے اختیار میں ہے۔ وہی قرآن کہ ضرب جب چاہتا ہے ان کو مطلع پر نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے ان کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ خود اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کے رب کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اسی کے حکم سے آنے اور اسی کے حکم سے جلتے ہیں۔ ع

لائی حیات آئے قضاے چلی چلے

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

سورہ انعام آیات ۵، ۸۴ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا جو تدریجی ارتقاء نمایاں فرمایا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہ اس باب میں قرآن کے طریق استدلال اور اس کے منطقی نتیجہ کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح کہانت کے دوسرے ستون پر ضرب لگانے کے لیے قرآن نے شہاب ثاقب کا حوالہ دیا اور واضح فرمایا ہے کہ کسی جن کے لیے ملاو علیٰ تمک رسائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر غیب کی خبر معلوم کرنے کے لیے وہ ٹوہ لگاتے ہیں تو ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے اندر یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ان کی برجوں سے ان کے اوپر شہاب ثاقب کے راکٹ پھینکے جاتے ہیں۔ یہ مضمون یوں تو جگہ جگہ بیان ہوا ہے لیکن زیر بحث قسموں کو سمجھنے کے لیے سورہ نجم اور سورہ جن کی متعلق آیات پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔

اس تمہید کی روشنی میں اب آیات کے الفاظ اور ان کے معانی پر غور کیجیے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخَنَسِ ۚ الْخَنَسُ الْيَمِينُ ۖ يَمِينُ ۖ يَمِينُ ۖ اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہے کہ قرآن مجید میں اس آیت قسم طرح کی قسمیں جو آئی ہیں وہ کسی دعوے پر شہادت کے مقصد سے آئی ہیں اور بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ الفاظ کی قسم سے پہلے اگر اس طرح لایا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے تحقیق اس زعم کی نفی کے لیے آیا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہے۔

”خَنَسٌ“ جمع ہے ”خَانِثٌ“ کی۔ اس کے معنی آگے بڑھ کر پیچھے پلٹ جانے والے، ظاہر ہر کہ غائب ہو جانے والے اور نمایاں ہو کر روپوش ہو جانے والے کے ہیں۔ یہ لفظ ستاروں کی صفت کے طور



پر آتا ہے اور ان کے لیے اس قدر معروف ہے کہ بسا اوقات موصوف کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مجرد صفت ہی موصوف کو ظاہر کر دینے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ بعض اہل لغت نے اس کو بعض خاص ستاروں کے ساتھ مخصوص کیا ہے لیکن یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ یہاں ستاروں کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں وہ تمام ستاروں پر یکساں منطبق ہوتی ہیں خواہ وہ ثوابت ہوں یا سیارے، زحل ہو یا عطارد اور ان کے قبیل کے دوسرے ستارے۔

”الْجَوَادِ الْكُنُسِ“ یہاں ستاروں کی مزید صفات کا بیان ہے اور ان کا لغیر حروف عطف کے آنا عربیت کے اس معروف قاعدے سے، جس کی وضاحت اس کے محل میں گزر چکی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے موصوف الگ الگ نہیں ہیں۔

”بَجَادِئِی“ کے معنی چلنے والے کے ہیں اور ”كُنُسُ“ جمع ہے گائیس کی۔ کُنُسُ انطبی کے معنی ہوں گے ہرن اپنے مامن میں چھپ گیا۔ کُنُسُ النجوم کے معنی ہوں گے کہ ستارے اپنے مدار میں چلے اور چل کر اپنے ٹھکانوں میں روپوش ہو گئے۔ صاحب اقرب الموارد نے وضاحت کی ہے کہ یہ صفت تمام ستاروں کی مشترک صفت ہے۔

ستاروں کی یہ قسم یہاں کہانت کے ابطال کے لیے کھاٹی گئی ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کہنوں کے مروجہ علم غیب کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ ایک ان ستاروں کے مؤثر بالذات ہونے کے تصور پر، دوسرے کے ابعاد اس وہم باطل پر کہ آسمانوں کے اندر ایسے ٹھکانے (مقاعد للسمع) ہیں جن میں بیٹھ کر جنات غیب کی باتیں سنتے اور پھر ان کو پہنچاتے ہیں۔ ستاروں کی مذکورہ صفات کا حوالہ دے کر قرآن نے ان کے ان دونوں باطل تصورات کی نفی کر دی۔ طلوع کے بعد ان کے غروب اور آنے کے بعد ان کے جانے اور اس طلوع و غروب اور ایاب و ذہاب میں ادوات کی ایسی پابندی کہ منٹ اور سیکنڈ کا بھی فرق نہ پیدا ہونے پائے اس امر کی نہایت واضح شہادت ہے کہ وہ اس کائنات کے نظام میں مؤثر بالذات عناصر کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک بالاتر حکیم و قدیر کے ماتحتوں میں مسخر ہیں۔ اس وجہ سے اصل مولیٰ و مرجع اور نافع و ضار وہ ہے نہ کہ یہ محکوم و مقہور کو اکب و نجوم۔

دوسرے وہم کے ابطال کے لیے قرآن نے اس کائنات کے ایک راز کو آشکارا فرمایا ہے کہ ان ستاروں کے اندر شیطاٹین کے استراق سمع اور تجسس غیب کے لیے ٹھکانے نہیں بنے ہوئے ہیں، جیسا کہ نادانوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر ایسی برجیاں اور دیدبان بنے ہوئے ہیں جہاں سے ان شیطاٹین پر مار پڑتی ہے جو ملاء اعلیٰ کی باتوں کی ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ستاروں کی یہ صفیں یہاں قسم کے اسلوب میں بیان ہوئی ہیں اس وجہ سے بتقاضاے بلاغت ان میں غایت درجہ ایجاز ہے۔ تاہم الفاظ کے اندر ایسے اشارے یہاں بھی موجود ہیں جو غور کرنے والوں



کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، مثلاً اُنْخَسَ کی صفت واضح طور پر ان کے انول و غروب کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس صفت کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ نادانوں نے صرف ان کے طلوع کو اہمیت دی اور ان کو معبود بنا بیٹھے حالانکہ ان کی پسپائی اور ان کے ڈوبنے کو بھی دیکھنا تھا جو ان کے محکوم و مستحر ہونے کی نہایت واضح دلیل ہے۔

اسی طرح اَلْجَوَارِ الْاُنْخَسَ کے اندر ایک ہلکا سا اشارہ اس نقل و حرکت کی طرف بھی ہے جو یہ تارے شیاطین کے تعاقب میں کرتے ہیں جب وہ استراقِ سمع کی کوشش کرتے نکلتے ہیں تو اس وقت تاروں کا منظر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ایک برقی خاطف تیر کی طرح نکلی اور اپنے ہدف پر پہنچ کر دفعۃً پھر اپنے ترکش میں چھپ گئی۔

وَاللَّيْلِ إِذَا عَسَسَ ۖ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (۱۷-۱۸)

یہ دوسری قسم ہے جو اسی دعوے پر ایک دوسرے پہلو سے شہادت ہے۔

عَسَسَ کے معنی اہل لغت نے تاریک ہو جانے کے بھی لکھے ہیں اور پیچھے ہٹ جانے اور گزر جانے کے بھی۔ اگرچہ آیت کی تاویل دونوں معنوں کی روشنی میں ہو سکتی ہے لیکن میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعینہ یہی قسم، بالکل اسی سیاق و سباق اور معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ سورہ مدثر کی آیات ۳۳-۳۴ میں بھی آئی ہے۔ وہاں عَسَسَ کی جگہ لفظ اُدْبَرَ آیا ہے۔ فرمایا ہے: وَاللَّيْلِ إِذَا اُدْبَرَ ۖ وَالصُّبْحِ إِذَا اسْفَرَدَ ۚ شاید ہے رات جب کہ وہ پیچھے ہٹ جاتی ہے اور شاید ہے صبح جب کہ وہ بے نقاب ہو جاتی ہے (وہاں بھی اس قسم کے بعد قرآن مجید کے اندازِ قیامت کی خفائیت ثابت کی گئی ہے اور یہاں بھی، جیسا کہ آگے وضاحت آرہی ہے اسی دعوے کی تصدیق فرمائی گئی ہے۔

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ میں لفظ تَنَفَّسَ سے مقصود تو صبح کا نمودار ہونا ہی ہے لیکن اس طریقہ تعبیر میں ایک خاص بلاغت ہے جو اصحابِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ لفظ گویا یہ تاثر دیتا ہے کہ صبح رات کے بوجھ کے نیچے اس طرح دبی ہوتی ہے کہ اس کا دم گھٹ رہا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سے اس پر جھل محاف کو سرکاتا ہے اور اس کو سانس لینے اور سر اٹھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۱۹)

یہ مذکورہ بالا دونوں قسموں کا مقسم علیہ یا بالفاظِ دیگر وہ اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے اصل دعویٰ یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ فرمایا کہ بے شک یہ قرآن ایک معزز و مکرم فرستادہ الہی کا لایا ہوا کلام ہے۔ رسول سے یہاں مراد حضرت جبریل ہیں۔ آگے جو صفات بیان ہوئی ہیں اور جن کی وضاحت آرہی ہے ان سے معین ہو جائے گا کہ ان صفات کے موصوف حضرت جبریل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔



یہی بات آگے آیت ۲۵ میں منفی پہلو سے بھی فرمادی گئی ہے جس سے لفظ کسریٰ کا اصل موقع و محل واضح ہوتا ہے۔ فرمایا ہے: وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ تَرْتَجِسُهُ (اور یہ کسی رائدہ درگا شیطان کی القاء کی ہوئی بات نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ محروم القسمت ہیں وہ لوگ جو اس قرآن کو کاہنوں کی بکواس کی قسم کی کوئی چیز قرار دیتے اور اللہ کے رسول کو کاہن کہتے ہیں۔ کاہن جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ شیطانی القاء ہوتا ہے جس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ غیب دانی کے مدعی ہوتے ہیں لیکن ان کے شیاطین کی رسائی ملاو علی تک ہونا تو دلورکنر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے مردود و مغضوب ہیں کہ وہ آسمانوں میں گھات لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر شہابوں کے ذریعہ سے سنگ ماری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ کلام جو ان کو سنایا جا رہا ہے یہ اللہ کے ایک ایسے فرستادہ کا لایا ہوا کلام ہے جو خدا کی بارگاہ میں عزت پائے ہوئے اور نہایت مقرب و مکرم ہے۔

ذُنَىٰ قُتُوْبٍ عِشْدَ ذِي الْحَرِثِ مَكِيْنٌ ۝ مُطَاعٌ ثُمَّ اَمِيْنٌ ۝

(۲۰-۲۱)

یہ حضرت جبریل امینؑ کی مزید صفات بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کس محفوظ و مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے اور کاہن جس ذریعہ سے اپنا مزعور علم حاصل کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ باعزت رسول نہایت زور و قوت والا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی اعلیٰ اور محکم صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ دوسری شیطانی طاقتیں اس کو مرعوب یا مغلوب یا متاثر نہیں کر سکتیں کہ اس کے فرائض مفوضہ میں وہ مزاحم ہو سکیں یا اس سے کوئی چیز اچک سکیں یا اس کو دھوکہ دے سکیں۔ وہ صاحب عرش کے احکام پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ نافذ کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس کی بارگاہ میں نہایت تقرب اور رسوخ رکھنے والا ہے۔ اس کو صاحب عرش تک براہ راست رسائی حاصل ہے کوئی دوسرا اس کے اور صاحب عرش کے درمیان حائل نہیں ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی یہی صفت سورہ نجم کی آیات ۵-۶ میں شَدِيْدُ الْقُوٰی اور ذُو مِرَّةٍ کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

’مُطَاع‘ یعنی جو ارواح و ملائک اس کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چون و چرا اس کی اطاعت کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ سرِ مولا اس کے احکام سے انحراف کر سکیں یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں یا اس کے دیے ہوئے احکام میں کوئی تحریف یا ترمیم یا شیطان کے ساتھ کوئی ساز باز کر سکیں۔ ’ثُمَّ اَمِيْنٌ‘ کلام عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ’ثُمَّ‘ اور ’ثُمَّ‘ کے مواقع استعمال میں بڑا فرق ہے۔ ’ثُمَّ‘ کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کے لیے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر خاص انتہام سے زور دینے کے لیے بھی، مثلاً سورہ شعراء میں فرمایا ہے: وَادْفَنْنَاهُمُ الْاَخْيَرِيْنَ ۝

ثُمَّ اَمِيْنٌ

تحتیں



اس کا ترجمہ اگر شے کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہیں تو یہ ہو گا کہ وہیں ہم لائے دوسروں کو بھی۔  
یعنی جس راہ سے ہم نے نبی اسرائیل کو نجات دی وہیں ہم فرعونوں کو بھی لائے تاکہ ان کو غرق کر دیں۔  
اسی طرح سورہ دھر کی آیت **وَإِذَا دَأْبُتْ ثُمَّ تَابَتْ تُعِمْ** (۲۰) میں بھی  
یہ لفظ آیا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ ہمارے نزدیک یہ ہو گا کہ جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت الٰہی  
عظیم بادشاہی دیکھو گے۔

ز سرق تا بقدم ہر کجاکہ می نگیم  
کر شمه دامن دل می کشد کہ جا این جا است

اسی طرح صفت سے پہلے جب یہ آتا ہے تو اس کی عظمت و اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ صفت 'امین' سے پہلے آیا ہے تو اس سے مقصود حضرت جبریل علیہ السلام کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی یا خاص طور پر ذکر کے لائق صفت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت امانت دار ہیں۔

اس صفت کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں نہ کسی ملاوٹ کا کوئی شائبہ ہو تا نہ کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ۔ اس کے برعکس کاہنوں کے علم کا حال یہ ہے کہ وہ جن شیاطین سے علم حاصل کرتے ہیں وہ اچکے اور چور ہوتے ہیں۔ اول تو ملاء اعلیٰ تک وہ پہنچ نہیں پاتے اور اگر کوئی بات اچکنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ٹکیہ جھوٹ ہوتی ہے جس میں مزید جھوٹ ملا کر وہ اپنے کاہنوں پر القاء کرنے ہیں اور یہ کاہن ان سے بھی بڑھ کر جھوٹے ہوتے ہیں جو اپنی مکان داری کو فروغ دینے کی خاطر رائی کو پر بت بناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس ناپاک جوہر کو اس چشمہ صافی سے کیا نسبت جس سے اللہ کا رسول فیض یاب ہوتا ہے!

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِبَغِيٍّ (۲۲)

رسول کے ذریعہ علم کی عظمت و طہارت واضح کرنے کے بعد یہ قریش کے بیٹروں کو مخاطب کر کے قریش کو تنبیہ فرمائی کہ تمہارے یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمہیں انذار کرنے پر مامور فرمایا ہے اور جو کچھ وہ تمہیں سنا رہے ہیں وہ اس کا کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعہ سے ان پر نازل فرمایا ہے تو ان کی ان باتوں کو غلط و جنون پر محمول نہ کرو بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔

یہاں لفظ صَاحِبُکُمْ کے استعمال میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں۔ تمہارے ہی اندر یہ پیدا ہوئے۔ تمہارے ہی ساتھ یہ رہے اور تمہارے ہی



اندر ان کی اب تک کی زندگی کا ہر دور گزرا اور تم میں سے ہر شخص ان کی شرافت، رزانت، منانت، عفت، صداقت اور امانت کا گواہ رہا ہے۔ اب اگر ان کی موعظت تمہیں گراں گزر رہی ہے تو ان کے اب تک کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو نہ کہ ان کو خطبی، دیوانہ، مجنون اور کانہن و منجم بنا ڈالو۔

وَلَقَدْ رَاكُمْ بِآلِثْقَىٰ اَلْاَسْبَابِ (۲۳)

یعنی اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس فرشتہ کو دیکھا ہے جو ان پر وحی لے کر آتا ہے تو یہ بھی کوئی جھوٹ یا فریب نفس نہیں ہے بلکہ بیان حقیقت ہے۔ انھوں نے فی الواقع اس فرشتے کو بالکل کھلے ہوئے اور صاف افق میں دیکھا ہے۔ 'افق مبین' سے مراد فضا کے آسمانی کا وہ حصہ ہے جو نظر کے سامنے ہے جس کا مشاہدہ بغیر کسی شائبہ اشتباہ کے ہوتا ہے۔ سورہ نجم میں اسی کو 'افق اعلیٰ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝  
ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ  
بِالْاُفْقِ الْاَعْلَىٰ ۝ ثُمَّ دَنَا  
فَتَدَلَّىٰ ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ  
اَوْ اَدْنَىٰ ۝ فَاَوْجَحِيْ اِلَىٰ عِبْدِهٖ مَآ  
اَوْجَحِيْ ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰ ۝  
اَفَتَسْمُرُوْنَهُ عَلٰی مَا يَـُٔوْى ۝  
(النجم - ۵۳ : ۵۰ - ۱۲)

اس کو ایک بڑی مضبوط قوتوں والے طاقتور نے تسلیم دی ہے۔ وہ سیدھا ہوا دراز نما بیکہ وہ افق اعلیٰ میں تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور جھک پڑا۔ پس دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی یہ مشاہدہ جو اس نے کیا وہ کوئی فریب نفس نہیں ہے۔ تو کیا تم لوگ اس سے اس چیز پر جھگڑاتے ہو جس کا اس کو مشاہدہ ہوتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر تذکرہ قرآن میں پڑھی ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مشاہدات کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو آغازِ وحی میں ہوئے۔ جب آپ نے ان کا ذکر اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا تو وہ آپ کے سر ہو گئے اور اس کی تردید میں طرح طرح کی باتیں انھوں نے بنائیں۔ کسی نے اس کو شیطانی القا قرار دیا اور کسی نے محض واہمہ کی خلاقیت۔ انہی جھٹلانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ نہ یہ کوئی فریب نفس ہے اور نہ قریب نظر بلکہ یہ کھلے ہوئے افق کا ایک ایسا مشاہدہ ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيٍّ (۲۴)

یعنی ہمارا رسول تمہارے کا ہنوں کی طرح غیب کا حریف نہیں ہے کہ جو داہمہ دل میں گزر جائے غیب کا حریف اس کو حقیقت سمجھ کر غیب دانی کا مدعی بن بیٹھے اور اپنی دکان سجالے بلکہ اس کو جو مشاہدہ ہوتا ہے یا نہیں ہے جو وحی اس پر آتی ہے وہ منظراری طور پر آتی ہے جس کو وہ تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تمہارے



کاہن غیب جاننے کے لیے نہ جانے کیا کیا پاڑ بلیتے ہیں اور اسی پران کی دکان داری کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی سچی چیز ہاتھ نہیں آتی تو جھوٹ ہی سے اپنی دکان چمکاتے ہیں لیکن اپنے اس سادھن کے متعلق تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ وہ ان چیزوں کے پیچھے کبھی نہیں پڑے۔ یہ جو کچھ تمہارے آگے پیش کر رہے ہیں یہ غیب دانی کی نمائش یا جلب زر کا کوئی بہانہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار ہے جس کے اظہار پر وہ مضطرب ہیں۔

صُنِیْتُ کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'بخیل' کیا ہے لیکن میں نے حوص کیا ہے۔ بخل و حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں اس وجہ سے ان میں فرق محض ظاہری ہے لیکن میں نے حرص کے معنی کو اس وجہ سے ترجیح دی ہے کہ لفظ 'صُنِیْتُ' بخل کے معنی میں جب آتا ہے تو اس کا صلب آتا ہے اور یہاں 'علیٰ' آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ حرص کے معنی پر متضمن ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِیْمٍ (۲۵)

اوپر جو بات اُسے بقولِ دَسْوِیٰ کریم کے انفاط میں فرمائی ہے وہی بات یہ منفی پہلو سے روک کر دی ہے کہ یہ کسی شیطانِ رجیم کا اتفاق نہیں ہے جو تمہارے کاہنوں پر ہوتا ہے۔

'دَجِیْم' مقابل ہے 'کَبِیْر' کے۔ مطلب یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو فرشتہ وحی کے کرتا ہے وہ تو اللہ کا ایک عالِ مقام فرشتہ ہے اور تمہارے کاہنوں پر جو شیاطین اترتے ہیں وہ کھد پڑے اور راندے ہوتے ہیں۔ 'دَجِیْم' کے معنی سنگسار کیے ہوئے کے ہیں۔ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جو شیاطین آسمانوں میں غیب کی خبریں مسیم کرنے کے لیے چھپنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر شاہدوں کے ذریعہ سے سنگساری ہوتی ہے اس وجہ سے 'دَجِیْم' ان کی مستقل صفت ہے۔

فَاِنَّ شَنْدُ هَبُوْنَ (۲۶)

یہ ان ہٹ دھرموں کی کورڈ وائی اور ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب ہے کہ کہاں یہ قرآن اور کہاں تمہارے کاہنوں اور شیاطین کی خرافات۔ دونوں میں کیا نسبت! آخر تم ضد کے جنوں میں کہاں سے کہاں نکل جاتے ہو گکہ اور پشیز میں فرق نہیں کرتے۔

اِنَّ هُوَ لَا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّتَقِیْمَ (۲۷-۲۸)

یہ آخر میں نہایت مؤثر تنبیہ و موعظت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا والوں کے لیے اس وقت کے ظہور سے پہلے یاد دہانی ہے جو بہر حال آنے والا ہے اور جس سے کسی کے لیے مفر نہیں ہے اگر تم اس کو قبول کرو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کس دوسرے پر احسان نہیں کرو گے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا تمہاری اپنی ہی ذمہ داری ہے خدا یا اس کے رسول کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کو تمہارے دلوں میں اتار دیں تو جس کو اپنی راہ سیدھی کرنی ہو وہ سیدھی کر لے ورنہ



اپنی کج روی کے اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔

وَمَا تَسْأَلُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۲۹)

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا حوالہ دیا ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے باب میں ٹھہرا رکھی ہے کہ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اس کے طالب بنتے اور اس کے لیے اپنی صحتیں بروٹے کا رلاتے ہیں۔ جو اندھے بہرے ہو کر زندگی گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسند کردہ ضلالت ہی میں بٹکنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ اس سنت الہی کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۃ مدثر کی آخری آیات کے تحت بھی اس کی وضاحت ہوئی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

توفیق ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَلَلهُ الْحَمْدُ عَلَىٰ أَحْسَانِهِ۔

رحمان آباد

۱۷۔ جولائی ۱۹۷۹ء

۲۱۔ شعبان ۱۳۹۹ھ



تذکرہ

۸۲

الانقطاع







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— التکویر ————— کی توام ہے۔ دونوں کے ظاہر و باطن اور اسلوب و معنی میں نہایت واضح مشابہت ہے۔ جس طرح سابق میں پہلے اس پیل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو ظہور قیامت کے وقت آسمانوں اور زمین میں برپا ہوگی اسی طرح اس کا آغاز بھی اسی ہول کے ذکر سے ہوا ہے۔ دونوں میں اصل مدعا بھی تقریباً ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ پہلی سورہ میں ہول قیامت کی تصویر کے بعد فرمایا ہے: **عَلِمْتُ نَفْسٍ مَّا أَحْضَرْتُ لَهَا** (اس دن ہر جان اس چیز کو دیکھ لے گی جو اس نے پیش کی) اسی طرح اس سورہ میں، ٹھیک اسی محل میں، فرمایا کہ **عَلِمْتُ نَفْسٍ مَّا قَدَّمَتْ وَآخَرَتْ** (۵) (اس دن ہر جان دیکھ لے گی جو اس نے آگے بڑھایا اور جو پیچھے چھوڑا) سلف سے بھی یہ بات منقول ہوئی ہے کہ جس کو ہول قیامت کی تصویر دیکھنی ہو وہ ان سورتوں میں دیکھے۔ دونوں میں اصل مخاطب وہ انبیاء و مسکبین ہیں جو قرآن کے انداز کو اس وجہ سے خاطر میں نہیں لارہے تھے کہ ان کو اپنے قلعوں اور حصاروں میں در اڑ پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ البتہ بنائے استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ پہلی سورہ میں استدلال کی بنیاد قرآن کی صداقت و حقانیت پر رکھی گئی ہے۔ یعنی یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اس کا منبع، اس کے نزول کا واسطہ اور اس کا حامل سب ظاہر و مطہر اور نور علی نور ہیں۔ جو لوگ اس کا جوڑ کا بہنوں اور منجھوں کی اٹکل پچھ باتوں سے غلنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ شب و دیور اور صبح صادق کے درمیان امتیاز سے قاصر ہیں۔

اس سورہ میں استدلال خالق کائنات کی صفات خلق، قدرت، حکمت، عدل اور رحمت سے ہے۔ یعنی انسان کی خلقت کے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت کی جو نشانیاں ظاہر ہیں ان کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک بزرگوار و منرا بھی لائے جس میں اپنے نیکو کار و وفادار بندوں کو انعام اور نافرمانوں اور سرکشوں کو سزا دے۔ ایک ایسے دن کا آنا لازمی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کام ذرا بھی دشوار نہیں۔ جب اس نے پہلی بار پیدا کیا اور اس میں اس کو کوئی شکل نہیں پیش آئی تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا؟ اگر اس دنیا میں وہ بھرموں کے جرائم سے چشم پوشی کر رہا ہے تو اس



کے معنی یہ نہیں ہیں کہ معنی کی اور بدی کے معاملے میں گمے جس ہے۔ بلکہ یہ محض اس کی گریہ ہے کہ وہ بندوں کو مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنے روپے کی اصلاح کر لیں اگر چاہیں اور اصلاح نہ کریں تو ان پر اس کی حجت پوری ہو جائے اور قیامت کے دن وہ کوئی غدر نہ کر سکیں۔ اس تاخیر سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے کسی کا کوئی قول و عمل مخفی ہے۔ اس نے ہر شخص پر اپنے معزز فرشتے مامور کر رکھے ہیں جو اس کی ہر بات نوٹ کر رہے ہیں۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۵) ظہور قیامت کے وقت آسمان اور اس کے ستاروں، زمین اور اس کی قبروں پر جو گزے گی۔ اس کی اجمالی تصویر اور لوگوں کو یہ تنبیہ کہ اس دن سب کا کچا چٹھا اس کے سامنے آ جائے گا۔  
(۶-۸) انسان کی خلقت کے اندر خدا کی قدرت، حکمت، رحمت اور عدل کی جو شانیں ظاہر ہیں ان کی روشنی میں یہ یاد دہانی کہ نہ قیامت کے وقوع کو بعید از اسکان سمجھو نہ اس مغالطہ میں رہو کہ تم بچوں ہی شتر بے مہار بنا کر چھوڑے رکھے جاؤ گے۔ تمہاری صنعت گری میں اس نے جو اہتمام فرمایا ہے وہ دلیل ہے کہ تمہارا وجود بے مقصد اور بے غایت نہیں ہے۔

(۹-۱۲) اس مغالطہ میں نہ رہو کہ خدا کو تمہارے تمام اقوال و اعمال کا علم کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ تمہارا حساب کرنے بیٹھے۔ اس نے تمہارے ہر قول و فعل کو لکھنے کے لیے تمہارے اوپر اپنے معزز فرشتے مامور کر رکھے ہیں جو ہر چیز نہایت احتیاط اور دیانت داری سے نوٹ کر رہے ہیں۔  
(۱۳-۱۶) جزاء و سزا کے دن نیکو کار اور فاجر بندے نعمت کے باغوں میں داخل ہوں گے اور نابکار و نافرمان دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے۔ دوزخ میں پڑنے کے بعد پھر ان کو اس سے کبھی باہر نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

(۱۷-۱۹) جزا کے بالکل بے لاگ ہونے کا بیان کہ اس دن سارا زور و اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ کوئی دوسرا کسی کے معاملہ میں دخل یا اثر انداز نہ ہو سکے گا۔



# سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ

مَكِّيَّةٌ ۱۹ آیات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ① وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ② وَإِذَا الْأَبْهَارُ فَجُرَتْ ③ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ④ عَلِمْتَ نَفْسٌ ۱۹-۱  
 مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ⑤ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ⑥ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ⑦ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ⑧ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالذِّينِ ⑨ وَلَاتَ عَلَيْكُمْ لَحِيفَتَيْنِ ⑩ كَرَامًا كَاتِبَيْنِ ⑪ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ⑫ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ⑬ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ⑭ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الذِّينِ ⑮ وَمَاهُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ⑯ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الذِّينِ ⑰ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الذِّينِ ⑱ يَوْمَ لَا تُنَلِّكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ⑲

جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور جب کہ ستارے بکھر جائیں گے اور جب کہ

ترجمہ آیات ۱۹-۱

سمندر پھٹ پڑیں گے اور جب کہ قبریں اگلوائی جائیں گی تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ

اس کے کیا اگے بھیجا اور کیا سمجھے چھوڑا۔ ۱-۵



اے انسان! تجھے تیرے ربِّ کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے! جس تے تیرا خاکہ بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے اور تجھے بالکل موزوں کیا! جس شکل پر چاہا تجھے مشکل کر دیا! ۸-۶

ہرگز نہیں، بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ تم پر نگران مامور ہیں، دبیران گرامی۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ ۱۲-۹

بے شک نیکو کار عیش میں ہوں گے اور نابکار دوزخ میں۔ وہ جزا کے دن اس میں داخل ہوں گے اور پھر اس سے وہ اوجھل ہونے والے نہیں۔ ۱۴-۱۳

اور تم کیا سمجھے جزا کے دن کو! بولو، کیا سمجھے جزا کے دن کو! اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی۔ معاملہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا!! ۱۹-۱۴



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (۱)

’انْفَطَرَتْ‘ کے معنی پھٹ جانے اور شق ہو جانے کے ہیں ظہورِ قیامت کے وقت آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورہ الشقاق کی پہلی ہی آیت میں یہی مضمون ’إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ‘ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سورہ رحمن کی آیت ۳ میں بھی لفظ ’انْشَقَّتْ‘ استعمال ہوا ہے اور ’انْفَطَارُ دُ’ انْشَقَّتْ‘ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

قیامت کے بعد ایک بالکل نیا عالم، نئے نئے قوانین کے تحت ظہور میں آئے گا اس وجہ ایک نیا عالم سے اس عالم کہن کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی شکل کیا ہوگی؟ اس کا صحیح تصور نئے قوانین آج نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کی یاد دہانی اس لیے فرمائی گئی ہے کہ جو انبیاء و مشکبرین اپنے قلعوں کے ساتھ اور گروہوں کے اعتماد پر بالکل نچنت ہیں، سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ بنا رکھا ہے وہ ان کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے، ان کو جھنجھوڑا جائے کہ قیامت کی ہلچل ایسی ہوگی کہ تمھارے بنائے ہوئے گھروں کا تو کیا ذکر اس پورے عالم کی یہ محکم چھپت جس میں تم ڈھونڈھے سے بھی کوئی رخنہ نہیں پاسکتے، بالکل رخنہ ہی رخنہ اور شکاف ہی شکاف بن کر رہ جائے گی۔

یہاں اس الجھن میں اپنے دماغ کو نہ ڈالیں کہ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے یہ محض ایک غلا، یا کوئی ٹھوس چیز ہے بلکہ اس امر پر یقین رکھیے کہ جس طرح آج اس کا مشاہدہ آپ ایک محکم چھپت کی شکل میں کر رہے ہیں جس میں کسی رخنہ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی اسی طرح قیامت کی ہلچل کے وقت اس میں شکاف ہی شکاف نظر آئیں گے۔

وَإِذَا الْكُكُوبُ انْثَرَتْ (۲)

’انْثَرَتْ‘ کے معنی بکھر جانے اور منتشر و پراگندہ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی آج تو تارے ایک غیر مرئی ستاروں کا نظم و نصاب میں پروئے ہوئے آسمان کی چھپت میں مقیموں کی طرح ٹنکے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس دن یہ شیرازہ بکھر جائے گا اور وہ ٹوٹ ٹوٹ کر ادھر ادھر پراگندہ ہو جائیں گے۔ سابق سورہ میں ان کے بے نور ہو جانے کا ذکر ہوا ہے اس لیے کہ سورج کی بساط لپیٹ دیے جانے کے باعث نظامِ سی سے ان کا تعلق ختم ہو جائے گا اس سورہ میں ان کے انتشار کا ذکر ہوا اس لیے کہ وہ شامیانہ باقی نہیں رہے گا جس کی آرائش



کے لیے ان کو آویزاں کیا گیا تھا۔

وَإِذَا الْبُحَارُ تُجَدَّتْ ۖ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ (۳-۴)

زمین کے سمندروں اور اس کے ستاروں کا حال بیان کرنے کے بعد یہ زمین کی بھی دو چیزوں — سمندروں اور قبروں کی — کا حال بطور مثال بیان فرمادیا کہ اس دن سمندر اپنی حدود کو توڑ کر نہ نکلیں گے اور قبروں میں جو دفن ہیں وہ بھی ان سے اگلا لیے جائیں گے۔

سابقہ سورہ میں 'وَإِذَا الْبُحَارُ تُجَدَّتْ' کے الفاظ آئے ہیں، یہاں وہی بات 'فُجِّرَتْ' کے لفظ سے بیان ہوئی ہے۔ دونوں میں بس یہ فرق ہے کہ پہلے لفظ سے سمندروں کا جوش و هیجان نمایاں ہو رہا ہے اور دوسرے سے ان کی آزادی و بے قیدی۔ یعنی وہ موجودہ حد بندیلوں سے بے قید ہو کر ہر طرف پھوٹ پھیں اور ہر نشیب و فراز پر چھا جائیں گے۔ سورہ دھر کی آیت 'لُفَجِّرُوهَا تَفْجِيرًا' (۱۳) کے تحت اس لفظ کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ' کے معنی ہوں گے، کسی شے کو پراگندہ و منتشر کر دیا۔ اس کو ادھیڑ ڈالا، اس کو کھول کر جو کچھ اس میں تھا برآمد کر لیا۔ اگرچہ یہاں خاص طور پر قبروں ہی کا ذکر ہے اس لیے کہ مقصد انذار کے پہلو سے زیادہ اہمیت انہی کے کھولے اور ان کے اندر سے لوگوں کے نکالے جانے کی تھی۔ لیکن قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس دن زمین اپنا سارا بار بوجھ نکال پھینکے گی۔ سورہ زلزال میں ہے: 'دَاخَرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا' (۲) (اور زمین اپنے بار بوجھ نکال پھینکے گی) اسی طرح سورہ الشقاق میں ہے: 'وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۖ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ' (۳-۴) (اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ اس کو نکال پھینکے گی اور خالی ہو جائے گی)۔

عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا قَدَّمْتُ وَآخَرْتُ (۵)

یہ وہ اصل بات بیان ہوئی ہے جو اس دن سب کے سامنے آئے گی۔ یعنی جب اس کائنات میں یہ عظیم بلچل برپا ہوگی جس کے بعض آثار مذکور ہوئے تب ہر شخص کو پتہ چلے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ اس گھنٹہ میں نہ رہیں کہ یہی دن ہمیشہ رہیں گے بلکہ اس دن کی عظیم بلچل کو سامنے رکھ کر اپنے انجام پر غور کریں جس سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور جس سے کسی کو بھی پناہ نہیں ملنی ہے، نہ کسی چھوٹے کو نہ کسی بڑے کو۔

'مَّا قَدَّمْتُ وَآخَرْتُ' کی تاویل اگر ان مستکبرین کو سامنے رکھ کر کی جائے جو سورہ کے اول مخاطب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو ناکردنی کام اللہ و رسول کے خلاف انہوں نے کیے ان کا انجام بھی وہ دیکھیں گے اور جو کرنے کے کام انہوں نے نظر انداز کیے ان کی حسرت بھی چکھیں گے۔ سورہ جمعہ میں یہود کے



متعلق فرمایا ہے کہ "وَلَا يَتَمَتَّوْنَہٗ اَبَدًا اَبَاقًا قَدَّ مَتَّ اَیُّہُمْ" (۷) (اور وہ ہرگز موت کی تمنا کرنے والے نہیں ہیں جو اپنی کرتوتوں کے جوہ کر گزر رہے ہیں)۔ یعنی جو راہِ آخرت کے لیے انھوں نے بھیجا ہے وہ اس سے اچھی طرح واقف ہیں اس وجہ سے یہ خدا کو منہ دکھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ کفار قیامت کے دن نہایت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کاش، آخرت کی زندگی کے لیے انھوں نے کچھ کر لیا ہوتا۔ سورہ فجر میں ان کا قول نقل ہوا ہے: "قُلْ نَکِیَّتِیْ قَدَّ مَتَّ لِحَیَاتِیْ" (۲۴) (وہ کہے گا، اے کاش! میں نے اپنی آخری زندگی کے لیے دنیا کی زندگی میں کچھ کر لیا ہوتا) اسی طرح سورہ مومن میں ہے: "حَتّٰی اِذَا جَاؤْا اَحَدَہُمْ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِیْ" (۱۰۰-۹۹) (یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آدھلے گی وہ کہے گا اے رب! مجھے پھر واپس بھیج کہ جو مال و متاع میں دنیا میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کی کٹائی کر لوں)۔

اگرچہ ان حوالوں کی روشنی میں "قَدَّ مَتَّ" اور "اَحَدَہُمْ" دونوں کا صحیح محل متین ہو جاتا ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم بھی لیا ہے کہ "ما قدم من الخیر والمشر وما لم یقدمہ" (یعنی جو نیکی اور بدی اس نے کی اور جو چھوڑی) اسی طرح بعض دوسروں نے یہ مطلب لیا ہے کہ "ما قدم من مالها وما اخلو للوادثین" (جو اس نے اپنے مال میں سے اپنی آخری زندگی کے لیے بھیجا اور جو وارثوں کے لیے چھوڑا) اگرچہ آیت کے عموم میں یہ باتیں بھی داخل ہیں لیکن اس کے موقع و محل کے پہلو سے اس تاویل کو ہمارے نزدیک ترجیح حاصل ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَوْنِیْمِ (۶)

’انسان‘ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں روئے سخن انہی کمزبین قیامت کی طرف ہے جن کو اس سورہ میں خدا کی انذار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا ہے "کَلَّا بَلْ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ" (۱) (ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلا رہے ہو)۔ خاص مخاطب کو عام لفظ سے خطاب کرنے میں جو بلاغت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔

"مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَوْنِیْمِ" میں استفہامیہ اسلوب اظہار تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے رب کی اس کریمی نے تم کو جزا و سزا سے نچنت کیا کہ وہ تمہاری سرکشیوں پر فوراً گرفت نہیں کرتا اور برابر ڈھیل پڑھیل دیے جا رہا ہے تو تم نے اس کریمی سے بہت سخت دھوکا کھایا۔ ہونا تو یہ تھا کہ تم اس کے لطف و کرم کی قدر کرتے، اس کے شکر گزار بندے بنتے اور اپنے آپ کو اس کی مزید عنایات کا حق دار بناتے لیکن ہوا یہ کہ تم اس کے آگے بالکل ڈھیٹ بن گئے۔ اس کے انذار کا مذاق اڑانے لگے، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ جو رنابیت تمہیں حاصل ہے یہ تمہارا پیدائشی حق ہے اور رسول جس قیامت سے آگاہ کر رہا ہے یہ محض ایک ہوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔



الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۖ فِي آيٍ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ (۸-۷)

اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا حوالہ دیا ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر ظاہر ہیں اور جو دلیل ہیں کہ جس رب نے انسان کے پیدا کرنے میں اپنی کارگیری، حکمت، قدرت اور اہتمام خاص کی شانیں دکھائی ہیں اس نے اس کو عبث نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ شتر بے ہمار کی طرح چھوٹا پھرے۔ بلکہ ایک دن وہ لازماً اس کو اپنے حضور میں بلائے گا، اس کا محاسبہ فرمائے گا، پھر جن کو وہ اپنا فرما نہ دے گا ان کو ابدی رحمتوں سے نوازے گا اور جو اس کے باغی ہوں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ سارا اہتمام بالکل بے معنی و بے مقصد ہو جاتا ہے جو انسان کے پیدا کرنے پر اس نے کیا اور اس کی اس قدرت و حکمت کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو اس کے ہر فعل میں نمایاں ہے۔

”الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ ۖ“ خلق کے معنی ہیں کسی چیز کا خاکہ بنانا اور اس کو پیدا کرنا اور تسمیۃ کے معنی اس کی نوک پلک سنوارنے کے ہیں۔ گویا یہاں انسان کی پیدائش کے ابتدائی اور انتہائی دونوں مرحلوں کی طرف اشارہ فرمادیا کہ اسی رب کریم نے تمہارا خاکہ بنایا اور اسی نے تمہارے نوک پلک سنوارے۔ ”فَعَدَلَكَ“ اور اس طرح اس نے تمہیں ایک متوازن مخلوق بنایا۔

انسان کی خلقت میں حکمت کا پایا جو انسان کی تخلیق میں نمایاں ہے۔ یہ اہتمام و عنایت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کوئی کھلونا نہیں ہے جس کو قدرت نے اپنا جی بہلانے کے لیے وقتی طور پر بنالیا ہو اور پھر جب چاہے اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ جس چیز پر جتنا ہی اہتمام صرف ہوتا ہے اس کے اندر اتنی ہی مقصدیت ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے اس کو قدرت کے نظام میں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان برسات میں پیدا ہونے والے پتنگوں کی مانند نہیں ہے کہ پیدا ہوا اور فنا ہو جائے بلکہ وہ قدرت کی بہترین متاعی کا مظہر ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ امتحانوں سے گزرتا ہو اس مقام تک پہنچے جو اس کے لیے مقدر ہے اور اگر وہ اس کا حوصلہ نہ کرے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی پست حوصلگی کی سزا بھگتے۔

”فَعَدَلَكَ“ میں اس اعتدال و توازن کی طرف اشارہ ہے جو ”يَقْدُ خَلَقًا اِلٰهًا“ (۴:۹۵) والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ انسان اپنی ظاہری شکل و صورت اور اپنی روحانی و معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے عالم کی تمام مخلوقات میں بالکل نقطہ وسط پر ہے اس وجہ سے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے، اس کو امت وسط کے منصب پر سرفراز فرمائے اور اگر وہ زمین میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرے تو آسمان کی ابدی بادشاہی کا بھی حق دار ٹھہرائے۔

”فِي آيٍ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ“ یعنی ایک طرف تو اپنے رب کے اس اہتمام اور اس کی



اس عنایت پر نظر کرو کہ اس نے ہر آدمی کے لیے الگ الگ شکل و صورت تجویز کی اور اپنے کمال قدرت کے جس کے لیے جو صورت پسند فرمائی اسی پر اس کو پیدا کر دیا۔ اس میں ذرا بھی اس کو مشکل پیش نہیں آئی۔ مجال نہیں کہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر سے بھی کوئی دو آدمی ایسے نکالے جاسکیں جو بالکل ایک ہی شکل و صورت کے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی قدرت و عنایت کا یہ حال ہے اس کے لیے فردی ہے کہ ایک دن وہ تمہارے نیکیوں اور بدوں میں امتیاز کرے اور اس کام کے لیے تمہیں وہ مرنے کے بعد اٹھائے اور یہ کام اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

كَلَّا بَلْ تُكْذِبُوْنَ بِالْحَقِّ (۹)

کَلَّا یہاں مکذبین کے ان شبہات و اعتراضات کی نفی کے لیے ہے جو وہ قیامت کے خلاف پیش کرتے تھے اور جن کی تردید اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے فرمائی گئی ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر موجود ہیں۔ ان کو پیش کرنے کے بعد ان دلیل بازوں کو زجر فرمایا ہے کہ کَلَّا یعنی تمہارے ان تمام شبہات و اعتراضات کی ہرگز کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ ساری باتیں بناوٹی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ تم جزاء و سزا کو ماننا نہیں چاہتے اس وجہ سے لا یعنی شبہات پیش کر رہے ہو کہ بھلا مر کھپ جانے کے بعد وہ لوگ دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے؟ حالانکہ اگر جزاء و سزا عقل، عدل، فطرت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و حکمت کی رو سے واجب ہے تو اس کے لیے انسانوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا کیا مشکل ہے!

یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ بعض اوقات انسان جھٹلانا تو کسی چیز کو چاہتا ہے لیکن اس کے خلاف کچھ کہنے کی گنجائش نہیں پاتا اس وجہ سے بعض غیر متعلق سوالات چھیڑتا ہے تاکہ اس کے باب میں کچھ شبہات پیدا کرنے کی راہ کھلے۔ قریش کے منکرین اسی طرح کی الجھن میں گرفتار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جزاء و سزا کو جھٹلانا ایک امر بدیہی کو جھٹلانا ہے لیکن اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے بعض بناوٹی شبہات کی آڑ لے کر یہ نمائش کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ گویا ان کے پاس کچھ دلائل ہیں جن کی بنا پر وہ قرآن کے انذار کو نہیں مان رہے ہیں۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۖ كَوَّامًا كَاتِبِينَ ۖ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ (۱۰-۱۲)

اوپر والی آیت میں جو جھڑکی ہے اس سے بھی اس کا تعلق ہے اور مکذبین قیامت کے اس شبہ پر، جو وہ آخرت کے حساب کتاب سے متعلق محض مصنوعی طور پر اٹھاتے تھے اس میں تلبیہ بھی ہے۔

فرمایا کہ اس مغالطے میں نہ رہو کہ تمہاری جلوت و خلوت کی ساری باتوں سے کون باخبر ہو سکتا ہے کہ ایک دن ان کا محاسب کرنے بیٹھے اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے نگران بٹھار کھے ہیں

اعمال کا ریکارڈ رکھنے والوں کی ذمہ داری



جو تمہارے ہر قول و فعل کو نوٹ کر رہے ہیں۔ جو کچھ بھی تم کہتے ہو یا کرتے ہو اس کو سنتے اور جانتے ہیں۔  
ساتھ ہی وہ نہایت معزز ہیں۔

ان فرشتوں کی صفت کرام سے مقصود اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ یہ جس ڈیوٹی پر مامور ہیں اس کو نہایت فرض شناسی، پورے احساس ذمہ داری اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ نہ کام چوروں کی طرح یا اپنے فرض میں کوئی غفلت برتتے، نہ احساس ذمہ داری سے محروم لوگوں کی طرح کبھی دفع الوقتی اور دماہنت سے کام لیتے اور نہ کسی کے دباؤ یا اس کی خوشامد میں آنے والے ہیں کہ کسی کے ساتھ جانبداری برتیں۔

لَيَكُونَنَّ مَا تَفْعَلُونَ یعنی جو کچھ تم کرتے ہو اور جہاں کہیں بھی کرتے ہو وہ سب ان پر واضح ہوتا ہے۔ یہاں صرف افعال کے جاننے کا ذکر ہے لیکن سورہ ق میں فرمایا ہے کہ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق۔ ۵-۱۸) (نہیں بولتا ہے وہ کوئی بات مگر ایک مستعد نگران اس کے پاس موجود ہوتا ہے)۔ سورہ ق میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دوسرے ہیں اور ان میں بائیں دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ احادیث سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ان میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ ایک نیکیاں لکھنے پر مامور ہوتا ہے دوسرا بدیاں۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۚ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (۱۳-۱۴)

یہ نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے اس انتہام و انتظام کا جو اوپر مذکور ہوا کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں اور بدکاروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا بلکہ وہ نیکوں کو جنت میں داخل کرے گا اور بدوں کو دوزخ میں۔ جو نادان یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ زندگی پس اسی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد نہ موت ہے نہ زندگی یا یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد زندگی ہوئی تو وہاں بھی وہ اپنے شرکاء کی سفارش سے اس سے اچھی زندگی حاصل کر لیں گے جو یہاں حاصل ہے، تو وہ اپنے دماغ کا علاج کرائیں۔ اس کائنات کا خالق نیکی و بدی کے معاملے میں جس اور غیر جانبدار نہیں ہے کہ سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، بلکہ وہ لازماً دونوں میں فرق کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ نیک اور بد دونوں اس کی نگاہ میں یکساں ہیں اور اس کی دنیا ایک اندھیرا ہے جس میں حق و عدل کا کوئی تصور نہیں ہے۔

يُصَلُّونَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۚ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (۱۵-۱۶)

یعنی اس طرح کے لذت خواہوں میں زندگی گزارنے کے بجائے بہتر ہے کہ لوگ اس حقیقت کا مواجہہ کریں۔ جزا کے دن تمام نابکار جہنم میں داخل ہوں گے اور پھر ان کو وہاں سے ایک پل کے لیے اصل حقیقت کا مواجہہ



بھی اوجھل ہونا نصیب نہ ہوگا۔ ”وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ“ کا اصل مدعا وہی ہے جو دوسرے مقامات میں ”خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا“ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ جگہ پسند نہ آئی تو وہاں سے فرار کی کوئی راہ ڈھونڈ لیں گے وہ یہ خیال دل سے نکال دیں۔ اس میں داخل ہونے کے بعد اس سے نکلنے کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔

وَمَا آذُرُكَ مَا يَوْمَ الْقِيَامِ ۚ ثُمَّ مَا آذُرُكَ مَا يَوْمَ الْقِيَامِ (۱۷-۱۸)

یہ سوال اس جزا کے دن کی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے لیے ہے اور اس کی تکرار نے اس کو مزید چربول بنا دیا ہے۔ ”آذُرُكَ“ میں واحد کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ انہی لوگوں سے ہے جن سے ”مَا غَزَاكَ بِرَبِّكَ“ اور اس کے بعد کی دوسری آیات میں ہے۔ جمع کو واحد کے سینہ سے خطاب میں جو بلاغت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۚ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ (۱۹)

سوال چونکہ جواب کے لیے نہیں بلکہ صرف اس دن کے ہول کا تصور پیدا کرنے کے لیے تھا اس وجہ سے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی جواب دے دیا کہ اس دن کوئی جان کسی دوسرے کے کام آنے والی نہیں بنے گی۔ سارا اختیار و اقتدار اس دن صرف اللہ وحدہ لا شریک ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس دن کوئی کسی کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا۔ جن کو خدا کا شریک و شفیع سمجھا گیا اور اس امید پر ان کی عبادت کی گئی کہ وہ اپنے پوجنے والوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے وہ سب اس دن ہوا ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَلَلهِ الْحَمْدُ عَلَىٰ أَحْسَنِهِ۔

رحمان آباد

۲۹۔ جولائی ۱۹۷۹ء

۴۔ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ







تذکرہ قرآن

۸۳

المطففين







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ \_\_\_\_\_ الانقطاع \_\_\_\_\_ کا تکرار و تکرار ہے۔ دونوں کا عمود بنیاد کی طور پر ایک ہی ہے۔ سورہ انفطار کے آخر میں ابرار اور فجار کی جو تقسیم ہے اس سورہ میں اسی کی تفصیل ہے۔ مگر استدلال کی بنیاد دونوں میں الگ الگ ہے۔ سابق سورہ میں استدلال اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر نمایاں ہیں۔ اس سورہ میں استدلال اس فطرت سے ہے جو فاطر نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔

اس استدلال کی تقریر بالاجمال یوں ہے کہ انسان بالبطع عدل اور خیر کو پسند کرنے والا اور ظلم و شر سے نفرت کرنے والا ہے۔ اس کی یہ پسند اور نا پسند اس بات کی شہادت ہے کہ فاطر فطرت عدل اور ظلم یا بالفاظ دیگر عادل اور ظالم میں فرق و امتیاز کرنے والا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نیک اور بد دونوں اس کے نزدیک یکساں ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ انسان کی فطرت میں نیک اور بد میں یہ امتیاز کیوں رکھتا؟ رہا یہ سوال کہ انسان جب طبعاً نیکی پسند ہے تو وہ بد کی کیوں کر گزرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بدی اس وجہ سے نہیں کرتا کہ یہی اس کو طبعاً مرغوب ہے۔ طبعاً تو اس کو مرغوب نیکی ہی ہے لیکن بسا اوقات نفس کے دوسرے داعیات سے وہ مغلوب ہو کر، اپنی فطرت کے خلاف بدی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اگر بدی اور نا انصافی اس کو طبعاً مرغوب ہوتی تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی اس کے ساتھ نا انصافی کرتا تو وہ اس پر بھی راضی رہتا لیکن ہر شخص دیکھتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہی شخص جو دوسروں کے لیے ناپ اور تول میں بے ایمانی کرتا ہے جب دوسرے اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں تو وہ چیختا اور فریاد کرتا ہے۔

قرآن نے اس سورہ میں انسان کی اسی فطرت کو شہادت میں پیش کر کے یہ تذکرہ فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود عادل ہے اور اس نے اپنے بندوں کے اندر بھی عدل اور خیر کی محبت ودیعت فرمائی ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو بھرپور انعام دے جو اپنی فطرت کے اس نور کی تذر کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو اس کی بے حرمتی کریں۔



قیامت کے حق میں یہ طریق استدلال قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم برابر اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ خاص طور پر سورہ قیامہ میں 'نَفْسٍ لَّوَامَةٍ' کی قسم اور 'بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ' (تِلْكَ الْأَنفُسُ مَعَادِزٌ ذُرِّيَّةُ النَّفْسِ الْفَاسِقَةِ - ۵، ۴، ۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرا تراشے) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۶) ان لوگوں کے حال پر افسوس جو اپنے لیے تو چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی نا انصافی نہ ہونے پائے لیکن جب وہ دوسروں سے معاملہ کرتے ہیں تو ان کے ساتھ نا انصافی کرتے ہیں۔ حالانکہ عدل پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کریں۔ ان کا یہ رویہ شاید ہے کہ وہ اس عظیم دن کی توقع نہیں رکھتے جس دن لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

(۷-۱۷) ان فجار کے انجام کی تفصیل جنہوں نے جزاء و سزا کے دن کو جھٹلایا اور زندگی خدا کی نافرمانی میں گزاری۔

(۱۸-۲۸) ابرار کے انجام کا بیان جو روز جزا پر ایمان لائے اور جنہوں نے زندگی اس سے ڈرتے ہوئے گزاری۔

(۲۹-۳۶) اس انقلاب حال کی تصویر جو ایک دن سب کے سامنے آنے والا ہے۔ آج کفار اپنے حال میں مگن ہیں اور اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں، اس دن اہل ایمان اپنی فیروز مندا پر شادمان ہوں گے اور کفار کا مذاق اڑائیں گے۔



# سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ

مَكِّيَّةٌ ————— آيات: ٣٦

آيات

٣٦-١

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ ① الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ  
يَسْتَوْفُونَ ② وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ③  
أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ④ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ⑤  
يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ⑥ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ  
الْفُجَارِ لَفِي سِجِّينٍ ⑦ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ ⑧ كِتَابٌ  
مَرْقُومٌ ⑨ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ⑩ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ  
بِيَوْمِ الدِّينِ ⑪ وَمَا يُكْذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ⑫ إِذَا  
نُتِلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ⑬ كَلَّا بَلْ  
رَأَىٰ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ⑭ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ  
يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ⑮ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ⑯ ثُمَّ  
يُقَالُ لَهُمُ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ⑰ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ  
الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيَّينَ ⑱ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ ⑲ كِتَابٌ  
مَرْقُومٌ ⑳ يُشْهَدُ الْمَقْرَبُونَ ㉑ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ㉒



عَلَىٰ أَرَأَيْكَ يَنْظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ  
النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقُونَ مِنْ رَّحِيقٍ مَّخْمُومٍ ﴿٢٥﴾ خِشْيَهُ مِسْكَ  
وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِرَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾  
عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا  
مِنَ الَّذِينَ أَتَيْنَا يَصْحَكُونَ ﴿٢٩﴾ وَإِذَا أُمِرُوا بِهِمْ تَتَغَامِرُونَ ﴿٣٠﴾  
وَإِذَا نُفِخَ فِي الْأُنْفُسِ الْفُكْهَيْنِ ﴿٣١﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا  
إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿٣٢﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ﴿٣٣﴾  
فَالْيَوْمَ الَّذِينَ أَتَيْنَا مِنْ الْكُفَّارِ يَصْحَكُونَ ﴿٣٤﴾ عَلَىٰ أَرَأَيْكَ  
يَنْظُرُونَ ﴿٣٥﴾ هَلْ تُؤْتِي الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

۱  
ع ۳۶

ترجمہ آیات

۲۶-۱

براہو، ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا! جو دوسروں سے پوائیں تو پورا پوائیں  
اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں۔ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے  
کہ ایک دن وہ اٹھائے جانے والے ہیں۔ ایک عظیم دن کی حاضری کے لیے۔ جس دن  
لوگ اٹھیں گے خداوندِ عالم کے حضور پیشی کے لیے۔ ۱-۶

ہرگز نہیں، ناجروں کے اعمال نامے سچین میں ہوں گے۔ اور تم کیا جانو کہ سچین کیا  
ہے! لکھا ہوا دفتر! اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کی! جو روزِ جزا کو جھٹلا  
رہے ہیں۔ اس کو تو وہی جھٹلاتے ہیں جو تعدی اور حق تلفی کرنے والے ہوتے ہیں۔  
جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہرگز  
نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس دن



وہ اپنے رب سے ادٹ میں رکھے جائیں گے۔ پھر وہ جہنم میں پڑنے والے بنیں گے تب کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۱۷-۱۸

ہرگز نہیں، بے شک اچھوں کے اعمالنا عِلّٰتین میں ہوں گے۔ اور تم کیا سمجھے کہ عِلّٰتین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر۔ مقرّبوں کی نگرانی میں۔ بے شک نیک بندے عیش میں ہوں گے۔ نعموں پر بیٹھے سیر دیکھتے۔ ان کے چہروں پر آسائش کی بشارت جھلک رہی ہوگی۔ سر بہ مہر شرابِ خالص ان کو پینے کو ملے گی۔ جس پر مشاک کی مہر ہوگی۔ یہ چیز ہے جس کی طلب میں طالبوں کو سرگرم ہونا چاہیے! اور اس میں تسنیم کی مدوئی ہوگی۔ ایک خاص چشمہ جس پر مقرّبین بیٹھ کر پئیں گے۔ ۱۸-۲۸

جو مجرم رہے ہیں وہ ان لوگوں کے حال پر ہنستے رہے ہیں جو ایمان والے تھے۔ اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو گن انکھیوں سے اشارے کرتے اور اپنے لوگوں میں لوٹتے تو گن ہو کر لوٹتے۔ اور جب ان کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بالکل گمراہ ہیں، یہ ان پر کوئی نگران بنا کر تو نہیں بھیجے گئے ہیں! پس آج ایمان والے کفار کے حال پر ہنسیں گے، تختوں پر بیٹھے، سیر دیکھتے۔ کیوں پایا ناکفار نے اپنے کپے کا



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

دَلِيلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ (۱)

یہ جملہ صرف خبر یہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر لعنت اور پھینکا رکھا مضمون بھی مضموم ہے! 'تطفیف' کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں یعنی جو لوگ ناپ اور تول میں کمی کرنے والے ہیں ان کے لیے تیاہی اور ان پر خدا کی مارا در پھینکا رہے۔

ان لوگوں پر لعنت

جن کے لینے کے

باٹ اور درجنے

کے باٹ اور ہیں

الَّذِينَ إِذَا كُنُوا عَلَى النَّاسِ لَيَسْتَوْفُونَ ۚ وَكَأَنَّهُمْ يُؤَدُّونَ غَوْلَهُمْ

يُخْسِدُونَ (۲-۳)

یہ ان کمی کرنے والوں کی صفت بیان ہوئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مجرد ناپنے اور تولنے میں کمی کرنا زیر بحث نہیں ہے بلکہ ایک خاص کردار زیر بحث ہے۔ وہ یہ کہ آدمی دوسروں سے اپنے لیے نیوانے اور تولوانے میں تو بڑا چوکس اور حساس ہو، ہرگز نہ چاہے کہ جو چیز اس کے لیے ناپی یا تولی جائے اس میں رقی برابر بھی کمی ہو لیکن وہی شخص جب دوسروں کے لیے ناپے اور تولے تو اس میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کرے۔ یہ کردار اس امر پر شاہد ہے کہ انسان عدل کے تصور اور اس کے وہب ہونے کے شعور سے عاری نہیں ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لینے کے باٹ اور دینے کے باٹ الگ الگ نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان کا ایک ہونا ضروری ہے۔ نیز وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ جو چیز اسے اپنے لیے پسند نہیں ہے وہ اسے دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف محض اپنی خود غرضی سے مغلوب ہو کر کرتا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی نا انصافی بھی ہے اور ایک سخت قسم کی ذمادت بھی۔

عدل سے محبت

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر فاطر فطرت نے عدل اور ظلم کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بھی رکھی ہے اور عدل کے ساتھ محبت اور ظلم سے نفرت بھی ودیعت فرمائی ہے۔ اس کے باوجود وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عدل اور ظلم میں امتیاز سے وہ قاصر ہے یا ظلم کا ظلم ہونا اس پر واضح نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محض یہ ہے کہ وہ اپنی کسی خواہش یا کسی جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنے نفس کے توازن کو قائم نہیں رکھ پاتا۔

کے باوجود ارتکاب

ظلم کی وجہ

ایک چور دوسروں کے گھروں میں نقب لگاتا ہے وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے گھر میں نقب لگائے، ایک قاتل جو دوسروں کو قتل کرتا ہے یہ نہیں پسند کرتا کہ کوئی اس کی یا اس کے کسی



عزیز و قریب کی جان کے درپے ہو، کوئی زانی جو دوسروں کے عزت و ناموس پر حملہ کرتا ہے اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے عزت و ناموس پر حملہ آور ہو۔ بلکہ انہی چوروں، انہی قاتلوں اور انہی زانیوں سے اگر ان کی غیر جانبدارانہ رائے معلوم کرنے کی کوئی شکل ہو تو وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کریں گے کہ چوروں، قاتلوں، زانیوں اور اس قبیل کے دوسرے مجرموں کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ معاشرے میں جگہ انہی کے لیے ہونی چاہیے جو جان و مال اور ان کے عزت و ناموس کے اسی طرح حفاظت کرنے والے ہوں جس طرح وہ اپنی جان اور اپنی عزت کی حفاظت چاہتے ہیں۔

انسان کا یہ طرز عمل اور اس کی فطرت کا یہ پہلو اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ نہ وہ نیک اور انسان کی فطرت سے ایک روز جزا پرست لان بد کو یکساں سمجھتا اور نہ اس بات پر راضی ہے کہ دونوں قسم کے لوگوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ کیا جائے بلکہ اس کا غیر جانبدارانہ فیصلہ یہی ہے کہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہونا چاہیے۔ یہ چیز اس بات کو بھی متلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے جس میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کرے۔ اگر ایک ایسا دن نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیک اور بد دونوں یکساں ہیں دراصل لیکہ یہ چیز اس فطرت کے منافی ہے جو فطرت انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔ یہاں انسان کی اسی فطرت سے ایک روز جزا و سزا کے لازمی ہونے پر دلیل اور ان منکرین قیامت پر حجت قائم فرمائی ہے جو اپنی فطرت کی اس شہادت سے توازن کار نہیں کر سکتے تھے لیکن قرآن کے انداز قیامت کی تکذیب پر تلے ہوئے تھے۔

اس آیت کے تحت مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ انصار میں ناپ تول میں کمی کی خرابی موجود تھی اس وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن اول تو یہ سورہ مکی ہے، مدنی نہیں ہے۔ پھر انصار میں یہ خرابی رہی بھی ہوگی تو اتنی ہی رہی ہوگی جتنی اہل مکہ میں رہی ہوگی بلکہ اہل مکہ کے اندر اس کے پائے جانے کے زیادہ امکان تھے اس لیے کہ وہ بالعموم تجارت پیشہ تھے جبکہ انصار کا اصل پیشہ زراعت تھا۔ پھر سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ آیت ناپ تول میں کمی کرنے کی مذمت کے سیاق میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ انسان عدل و ظلم میں امتیاز سے قاصر نہیں ہے۔ وہ برائی کرتا ہے تو اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف محض اپنے نفس کی کسی خواہش کی پاسداری میں کرتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت لازم کرتی ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان کامل امتیاز ہو۔ اگر وہ ایک ایسے دن کے آنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ جزا و سزا کے مواجہہ سے گریز کرنا چاہتا ہے حالانکہ یہ چیز اس کی اپنی فطرت کا مطالبہ ہے۔

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۖ لِيُذِمَّ كَبِيرُهُمْ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَلِيِّ ۚ



ان لوگوں کو ملے یہ اس طرح کے لوگوں کے حال پر اظہارِ تعجب بھی ہے اور ان کو سرزنش بھی کہ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک ایسا عظیم دن آنے والا ہے جس میں لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے؟ یعنی ایک ایسے دن کے ظہور کا اندیشہ ہر شخص کے دل کے اندر ہونا چاہیے اس لیے کہ اس کی شہادت ہر شخص کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ اگر کسی کا دل اس اندیشہ سے خالی ہے تو وہ خود اپنی فطرت کی آواز سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہے حالانکہ وہ دن کوئی معمولی دن نہیں ہوگا بلکہ ایک نہایت ہی عظیم دن ہوگا۔ اس دن لوگ اس لیے اٹھیں گے کہ خداوند کائنات کے سامنے پیش ہوں اور ان سے پرسش ہو کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا، پھر اپنے اعمال کے مطابق وہ جزا یا سزا پائیں۔

دَبَّ الْعَلَمِينَ کے اندر اس دن کی عظمت، ضرورت اور اس کے فیصلوں کے ناظر ہونے کی جو دلیلیں مضمون میں ان کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔ ان کو ذہن میں تازہ کر لیجیے تب اس کا اصلی زور سمجھ میں آئے گا۔

كَلَّا اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَقِيْ سَجِيْنٍ (۱)

مناجروں کے 'کَلَّا' مخاطبوں کے اس زعمِ باطل کی تردید کے لیے بطور جزا آیا ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت میں موجود ہے۔ یعنی وہ اس فکر سے بالکل نچپٹ ہیں کہ ان کے سامنے حساب کتاب اور جزا و معزا کا کوئی مرحلہ آنے والا ہے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان اللہ تعالیٰ فرق کرے گا بلکہ وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اول تو کوئی دن آنا نہیں ہے اور آیا بھی تو وہ اپنی خاندانی وجاہت اور اپنے دیوتاؤں کی بدولت وہاں بھی اس سے زیادہ عیش و ٹھٹھیں گے جو عیش یہاں ٹوٹ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہرگز نہیں، اس قسم کے طفلانہ خیالات میں اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اس دن ابرار اور فجار میں مشرق و مغرب کی دوری ہوگی۔ فُجَّار کے اعمال نامے 'سَجِین' میں ہوں گے اور ابرار کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ ان کے اعمال نامے 'عِلِّیْن' میں ہوں گے۔

وَمَا اَدْرَاكَ مَا سَجِیْنٌ ۚ كِتَابٌ مُّذْمُوْمٌ (۸-۹)

مُحِیْن' لفظ 'سَجِیْن' اوپر والی آیت میں لغوی مفہوم میں نہیں بلکہ بطور ایک نام کے آیا ہے اس وجہ سے قرآن نے خود ہی اس کی وضاحت بھی فرمادی ہے۔ اس طرح کے نام قرآن میں متعدد آئے ہیں اور ہر جگہ ان کی وضاحت بھی فرمادی گئی ہے۔ سورہ دہر میں ان کی بعض مثالیں گزری ہیں لیکن اس سورہ میں بھی 'عِلِّیْن' اور 'تَسْنِیْن' کے الفاظ اسی نوعیت سے آئے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ میں اصل اہمیت ان کے لغوی مفہوم کی نہیں بلکہ ان کے اصطلاحی مفہوم یا ان کے تسمیہ کی ہوتی ہے۔

وَمَا اَدْرَاكَ مَا سَجِیْنٌ یہ اسلوب بیان 'سَجِیْن' کے ہول کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا گیا۔



ہے کہ تم کیا سمجھے کہ 'سَجِّین' کیا ہے! اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو! وہ تباہ ہوا جس کا نام یا جس کے اعمال اس میں درج ہوئے!

رِکْتَبُ مَقْدُومٌ وہ لکھا ہوا دفتر ہے۔ یعنی اس میں تمام مجرمین کا سارا ریکارڈ بشکل تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ 'بشکل تحریر' کی قید سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان ہے اور نہ اس کے تحت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش۔

معلوم ہوا کہ 'سَجِّین' اس دفتر کا نام ہے جس میں مجرموں کے اعمال کا سارا ریکارڈ تحریری صورت میں محفوظ کیا جا رہا ہے اور جس کی بنیاد پر قیامت کے دن فیصلہ ہوگا کہ کون دوزخ کے کس درجے میں داخل کیے جانے کا سزا دار ہے۔ 'سَجِّین' کا مادہ 'سَجَن' ہے جس کے معنی قید یا قید خانہ کے ہیں۔ اس مناسبت سے مستحقین سزا کے ریکارڈ آفس کا نام 'سَجِّین' رکھا گیا ہے۔

دَلِيلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ الَّذِيْنَ كُذِّبُوْنَ يَوْمَ الْمَدْيُنِ (۱۰-۱۱)

یعنی اس گمان میں نہ رہو کہ جس طرح آج چھوٹے پھر رہے ہو اسی طرح برابر چھوٹے ہی پھر دو گے، بلکہ جب وہ جزاء و سزا کا دن ظہور میں آئے گا تو ان لوگوں کی شامت آ جائے گی جو اس کو جھٹلاتے رہے ہیں۔ اس دن وہ دیکھ لیں گے کہ ان کا کوئی قول و عمل نہ ریکارڈ ہونے سے رہ گیا ہے اور نہ اب اس کے وبال سے بچنے بچانے کی کوئی صورت ہی باقی رہی۔ مجرم اس کو دیکھ کر لپکا راٹھیں گے۔

مَا لِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْطٰ بِهَا ۚ (الکہف - ۱۸: ۴۹)

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اٰثِمٍ (۱۲)

اب یہ ان لوگوں کا سراغ دے دیا جو جزاء و سزا کے دن کو جھٹلانے میں پیش پیش ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی اس کی تکذیب وہی لوگ کر رہے ہیں جو حدود سے تجاوز کرنے اور حق تلفی کرنے والے ہیں مطلب نشاندہی جو یہ ہے کہ اس کی تکذیب کرنے کی جرأت کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کے اندر عدل اور رحم کی ادنیٰ امتیاز تکذیب جزاء بھی ہو۔ اس کی شہادت ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے اس وجہ سے کسی خارجی دلیل کی اس کے لیے کوئی حاجت نہیں۔ ہر شخص اس کو اپنے دل کے آئینہ میں دیکھ سکتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کو یہ چیز نظر نہیں آتی جن کے دلوں پر تعدی اور حق تلفی کا رنگ چڑھ چکا ہو۔

'عدوان' اور 'اِثْم' کی حقیقت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'عدوان' اور 'اعتداء' یہ ہے کہ کوئی دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرے اور 'اِثْم' یہ ہے کہ دوسروں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھے۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنے یا دبا بیٹھنے کی جن کو پاٹ

لہ عجیب ہے یہ کتاب کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی بات لکھنے سے چھوڑی ہے نہ کوئی بڑی بات!



لگ جاتی ہے وہ جزا و سزا سے فرار کیسے کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی فردر کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کا ضمیر ان کی تعدیوں اور حق تلفیوں سے کوئی خلش نہ محسوس کرے۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت سے فرار انسان محض اس وجہ سے نہیں اختیار کرتا کہ اس کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے اس کی خواہشوں اور عاداتوں پر زبرد پڑتی ہے۔ جب ایک بات وہ ماننا نہیں چاہتا تو اپنے لیے کچھ عذرات تراشنے کی کوشش کرتا ہے اگرچہ وہ کہتے ہی لنگ ہوں۔ سرہ قیام میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے وَبَدِ الْأِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيوَةٌ لَا يَؤْتِيهَا مَعَاذَ يَوْمِهِ (القيامة: ۴۵-۱۲-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کہتے ہی عذرات تراشے)۔

إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۱۳)

یہ اس طرح کے کذبین کے طریقہ تکذیب کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ لوگ ایک واضح حقیقت کی تکذیب اپنے ضمیر کے بالکل خلاف کرتے ہیں ان کے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی بجائے محض اپنی ہٹ دھرمی اور مکاہرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں: چلو ہٹو، سن لیا، اس میں ہے کیا، یہ تو محض اگلوں کے فسانے ہیں!

’آیت‘ سے مراد وہ دلیلیں اور حجتیں ہیں جو قیامت اور جزا و سزا کے حق میں ان کو قرآن کے ذریعہ سے سنائی گئیں۔ ان دلیلوں کا بیان پچھلی سورتوں میں بھی ہوا ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی آ رہا ہے۔ ساتھ ہی ان میں ان قوموں کی تاریخ کا بھی حوالہ ہے جو انذار قیامت کی تکذیب کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں۔ ان چیزوں کو سن کر وہ بس ایک ہی فقرے میں ان کی تکذیب کر دیتے کہ یہ سب اگلوں کے فسانے اور پھلوں کے قصے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو حقائق اعتقاد ہو۔

كَلَّا بَلْ سَكَتَ آتٍ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۱۴)

یہ قرآن نے اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان بد دماغوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں۔ یہ ہیں تو حقائق جن کے حق میں آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ناقابل انکار دلائل موجود ہیں لیکن ان کے اعمال کا رنگ اس طرح ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے کہ اب حق کی کوئی گون ان کے اندر نفوذ ہی نہیں کرتی۔

تکذیب کی  
اصل علت

’مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ‘ اسے ان کے اسی طرح کے اعمال کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر عددان اور ائم کے تحت ہم کر چکے ہیں اور جن کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے کہ جو ان کے ترکب ہوتے ہیں وہ جزا و سزا کی تکذیب کا کوئی بہانہ ضرور ڈھونڈتے ہیں۔



”بَلْ سَوَّلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ“ میں اس سنت الہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو دلائل و دلیلت فرمائے ہیں اور عقل و دل کے اندر جو چنے سمجھنے کی جو صلاحیت بخشی ہے یہ چیزیں کلام اسی صورت میں آتی ہیں جب انسان ان کی قدر کرے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اگر ان سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ ان کے مقابل میں نفس کی خواہشوں ہی کو اپنا رہنما بنا لے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو ٹھکرا دے تو آہستہ آہستہ آدمی کی بد عملیوں کا رنگ ان پر چڑھنا شروع ہوتا ہے اور بالآخر یہی اس طرح ان کا احاطہ کر لیتا ہے کہ ان کے اندر کسی صحیح چیز کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتی۔

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَجُولُونَ (۱۵)

یعنی یہ لوگ اپنے دلوں میں یہ ارمان لیے جو بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو جس طرح دنیا میں ان کو عزت و شرف حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی ان کو اعلیٰ مدارج حاصل ہوں گے، ان کے یہ ارمان پورے ہونے والے نہیں ہیں بلکہ اپنے عقل و دل کے دیدے انھوں نے جو پھوڑ لیے ہیں اس کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ وہ اپنے رب سے اس دن اوٹ میں ہوں گے۔ اوٹ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ یا اس کے قرب، اس کی نظر عنایت، اس کے انصاف و عنایات اور اس کے انوار و تجلیات کے مشاہدے سے بالکل محروم رہیں گے۔ ان کو اتنا موقع بھی نہیں ملے گا کہ اپنے رب سے کچھ عرض معروض ہی کر لیں۔

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ (۱۶-۱۷)

پھر وہ جہنم میں پڑیں گے۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے، گو کی تکرار سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ بات ان سے خاص اہتمام کے ساتھ کہی جائے گی اور مقصود اس سے ان کی تفسیح ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کی پورے شد و مد سے مخالفت کی اب اس کو دیکھ لو اور اس کا مزہ چکھو!

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ (۱۸)

”كَلَّا“ یہاں بھی اسی طرح مکذبین قیامت کے زعم باطل کی تردید کے لیے ہے جس طرح آیت، میں ہے: ”عِلِّيُّونَ“ یعنی نیک و بد ہرگز یکساں نہیں ہوں گے بلکہ بدکاروں کے لیے جس طرح الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہوگا اسی کی تحقیق طرح نیکوکاروں اور ناداروں کے لیے الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہوگا۔ ان کے اعمال نامے ”علیتین“ میں ہوں گے۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ (۱۹)

جس طرح اوپر اسی اسلوب بیان میں ”سَجِّينَ“ کا ذکر اس کے ہول کے اظہار کے لیے ہوا ہے اسی طرح یہاں اسی اسلوب میں ”عِلِّيُّونَ“ کا ذکر اس کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہوا ہے۔ یعنی



اس کی عظمت و شان کا بھلا اس دنیا میں کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے! وہ عالی مقاموں کا دفتر ہے جس میں ان کے کارنامے درج ہوں گے۔

كِتَابٌ مُّزَوَّرٌ لَا يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ (۲۰-۲۱)

لفظ 'عَلِيُّوْنَ' چونکہ اپنے خاص لغوی مفہوم سے الگ ایک خاص اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے اس کی وضاحت فرمادی گئی ہے کہ یہ ایک دفتر ہے جس کی ہر چیز ضبط و تحریر میں آئی ہوئی ہے اور جس کی نگرانی بھی اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب فرشتے کرتے ہیں۔

'يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ' کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دفتر چونکہ مقربین کے ریکارڈ کے لیے خاص ہوگا اس وجہ سے اس میں انہی کی آمد و شد ہوگی، دوسروں کی یہاں رسائی نہ ہوگی۔ آگے آیت ۲۸ میں مقربین کا ذکر ہے۔

إِنَّ الْإِبْرَارَ لَنَعْلَمُهُ عَلَىٰ الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ (۲۲-۲۳)

یہ ان نعمتوں کا ذکر آ رہا ہے جو ابرار کو حاصل ہوں گی۔ 'نَعْلَمُهُ' کے اسلوب بیان کی وضاحت اس کے محل میں ہم پرچکے ہیں کہ اس انداز میں جب بات کہی جاتی ہے تو مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ ہر جانب سے نعمتوں میں گھرے ہوں گے، ان کی نگاہیں بدھراٹھیں گی نعمت ہی نعمت ان کو نظر آئے گی۔

'عَلَىٰ الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ' اور پر فحار سے متعلق تو فرمایا ہے: 'كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ' (۱۵) اس کے بالکل برعکس ابرار کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے تختوں پر بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے افصال و عنایات اور اس کی شانیں اور جلوے دیکھ رہے ہوں گے۔ آگے یہ وضاحت بھی ہوئی ہے کہ تختوں پر بیٹھے بیٹھے ہی ان کو دشمنوں کا انجام بھی دکھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ کیوں کافروں کو ان کے کیے کا بدلہ مل گیا تا! 'عَلَىٰ الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ' ۛ هَلْ تُؤْتِي الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۳۵-۳۶)

تَعْرِفُ فِي وُجُوهِِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ (۲۴)

'نَضْرَةُ' اس تازگی و شاشت کو کہتے ہیں جو نعمتوں میں گھرے ہوئے لوگوں کے چہروں پر چمکتی ہے۔ فرمایا کہ جو بھی دیکھے گا ان کے چہروں پر نعمت کی تازگی اور شاشت پائے گا۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَّخْمُومٍ لَا خِشْمَ لَهُ مِنْكَ ۖ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ (۲۵-۲۶)

ان نعمتوں میں سے یہ ایک نعمت کا بطور مثال ذکر فرمایا کہ ان کو شرابِ خالص کے جام پلائے جائیں گے۔ یہ شراب سرمہر ہوگی جو اول اول انہی کے لیے کھولی جائے گی اور یہ ہر شک کی ہوگی۔



ظاہر ہے کہ یہ چند صفات محض اس کا ایک اجمالی تصور دینے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ رہیں اس کی اصل صفات و کیفیات تو ان کا اندازہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ البتہ یہ فرما دیا کہ چاہئے کی چیز ہے تو یہ ہے جس کے لیے حوصلہ کرنے والوں کو حوصلہ کرنا چاہیے! یہ اہل ایمان کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے اور اس میں ان سگان دنیا پر طرز بھی ہے جو حیات چند روزہ کی حقیر و فانی لذتوں کے حصول کی جدوجہد میں اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں اور چاہئے کی جو چیزیں ہیں ان کا چاہئے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

وَمَذَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ۖ عَيْنًا يُشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ (۲۷-۲۸)

’مَذَاجُ‘ سے مراد وہ ملوثی ہے جو پینے والے پیتے وقت شراب میں اس کے کیف میں اضافہ یا اس کے راعتدال پیدا کرنے کے لیے ملا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ اس شراب میں ملوثی تسنیم کی ہوگی۔ پھر تسنیم کی وضاحت فرمادی کہ یہ ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر مقربین اس شراب سے لطف اندوز ہوں گے۔

’عَيْنًا‘ کا نصب علی سبیل الاختصاص ہے اور ’بِهَا‘ میں ’ب‘ میرے نزدیک ظرفیہ ہے۔ اس کی وضاحت ’عَيْنًا يُشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا‘ (الدھر- ۶: ۶۰) کے تحت کر چکا ہوں۔ مے نوشی کے لازم میں سے ایک چیز اس کا لب جو ہونا بھی ہے۔ اس دنیا میں اس خانہ خراب کے رسیبا تو جہاں پائیں اور جس طرح بھی پائیں پی لیتے ہیں، یہاں تک کہ برباد نہیں ملتا تو چلو ہی سے پی لیتے ہیں! لیکن یہ مقربین کی بزم مے نوشی ہے اس وجہ سے اس کے آداب اور ہیں۔

ہمارے مفسرین اور مترجمین پر اس ’ب‘ کی نوعیت واضح نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے وہ یا تو اس سے کتر اگئے ہیں یا اس کی غلط توجیہ پر راضی ہو گئے ہیں۔ مترجمین نے عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اس سے پیتے ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ بالکل بے معنی ہے۔ اس کا مطلب اگر یہ سمجھا جائے کہ اس چشمہ میں سے پیتے ہیں تو یہ بات ’مَذَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ‘ سے پوری ہو گئی اور نہایت واضح طور پر پوری ہو گئی پھر اس بات کو ایک بالکل مبہم انداز سے دہرانے کا فائدہ! یہ بات واضح رہے کہ ظرفیت کے لیے ’ب‘ کا استعمال اعلیٰ عربی میں معروف ہے، بالخصوص اس طرح کے مواقع میں تو ظرفیت کے سوا اور کوئی معنی لینے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ (۲۹)

یہ اس انقلاب حال کی تصویر ہے جو نیکوں اور بدوں کے درمیان اس وقت نمایاں ہوگا جب نیکو اعمال کے دونوں کے نتائج اعمال سامنے آجائیں گے۔ پہلے اس صورت حال کی تصویر کھینچی ہے جس سے اہل ایمان بطور کے بعد بالخصوص غریب مسلمان مغرور و دولت مندوں کے ہاتھوں اس دنیا کی زندگی میں دوچار رہے۔ فرمایا کہ یہ مجرمین انقلاب



جہاں ان کو پاتے اپنی نقرہ بازیوں اور پھبتیوں کا ہدف بنا لیتے۔

وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ (۳۰)

اور جب کبھی پاس سے گزرتے تو کُن انکھیں سے اشارہ کرتے۔

مَرُّوا بِهِمْ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ جب کبھی مسلمان ان کے پاس سے گزرتے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب کبھی ان فرامنہ کا گزر مسلمانوں کی طرف ہوتا تو کُن انکھیں کے اشاروں سے ان کے دلوں پر چوکے لگاتے۔ یہ امر واضح رہے کہ آنکھ کے اشاروں کے گھاؤ تیراؤ تلوار کے گھاؤ سے بھی گہرے ہوتے ہیں اور تذلیل و تحقیر کا تو یہ خاص ہتھکڑیا رہے۔ ان شاء اللہ سورہ ہمزہ کی تفسیر میں اس بحث بعض خاص پہلو زیر بحث آئیں گے۔

وَإِذَا الْفُلُوعَا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَاكْبِهِينَ (۳۱)

یعنی اہل ایمان کے ساتھ یہ بدتمیزیوں کے جب اپنے گھروالوں میں لوٹتے تو بہت لگن لوٹنے گو یا کوئی بڑا میدان جیت کر لوٹے ہیں۔ یہ اشارہ ان کے سفہ پن کی طرف ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کو اپنی ان حرکتوں پر کچھ ندامت ہو وہ ان کا ذکر بڑے فخر سے اپنے گھروالوں میں کرتے کہ انھوں نے فلاں کے اس طرح لٹے لیے اور فلاں کر بولے تیار۔ سورہ قیامہ میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے ذُو لَکِنِّ کَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۖ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ (القیمة - ۴۵: ۳۲-۳۳)

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں اہل ایمان کے کردار سے متعلق مذکور ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اہل اور متعلقین کے اندر ایک محتاط آدمی کی طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے کسی رویہ سے ان کو کوئی غلط سبق نہ ملے جو قیامت کے دن اُن کے لیے تباہی اور ان کے لیے رسوائی کا باعث ہو۔ اس کے برعکس ان اثرات کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ یہ باہر اہل ایمان کے ساتھ جو گنڈہ گردی کر کے لوٹتے ہیں اس کی داستان فخر کے ساتھ گھروالوں کو بھی سناتے ہیں تاکہ ان کی پوری نسل گنڈوں کی نسل بن جائے۔

وَإِذَا نَادَوْهُمُ قَالُوا إِنَّا هُمُ الْوَلَاةُ لَصَالُونَ (۳۲)

اور ان کی یہ کوشش بھی ہوتی کہ ان اہل ایمان سے متعلق کسی کے اندر کسی نوعیت کا کوئی حسرت نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ جب بھی وہ ان کو دیکھتے ان کے بارے میں لوگوں کو یہ یاد کرانے کی کوشش کرتے کہ یہ بچے گمراہ ہیں اس لیے کہ یہ دین آباتی کے دشمن ہیں اور اپنے سوا سب کو جہنم کا ایندھن سمجھتے ہیں۔ یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کے ذکر و فکر آخرت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کے ذہن متاثر ہو گئے تو قریش کے لیڈروں نے ان کا یہ توڑنکا لاکہ ان کو گمراہ اور بے دین ثابت کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے جو دلیلیں انھوں نے ایجاد کیں ان کی تفصیلات اپنے محل میں گزر چکی ہیں۔

وَمَا أَدُسَاؤُهُمْ خَفِيفِينَ (۳۳)



عام طور پر تو لوگوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ یہ کفار ان مسلمانوں پر کوئی نگران اور اتالیق تو نہیں مقرر کیے گئے تھے کہ ان کو منافی و مضل ٹھہرائیں اور ان کے اعمال و عقائد پر نیکر کریں لیکن میرے نزدیک یہ کفار ہی کے قول کا ایک حصہ نقل ہوا ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ بکے گمراہ ہیں، یہ ہمارے اعمال و عقائد کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ہمارے اوپر وار و فہ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے ہیں کہ ہماری ہر چیز پر اعتراض اٹھائیں اور ہماری اصلاح کے مدعی بن کر کھڑے ہوں۔

فَالْيَوْمَ اتَّذِينَ اٰمَنُوْا مِنْ الْكُفَّارِ يَصْحَكُوْنَ (۳۴)

کفار کے رویہ کی تفصیل کے بعد اب یہ اس انقلابِ حال کا ذکر ہے جو قیامت کے دن واقع ہوگا۔ فرمایا کہ اب تک تو کفار مسلمانوں کے حال پر ہنستے رہے لیکن اب اہل ایمان کفار کے حال پر ہنسیں گے۔ اہل ایمان کا یہ ہنسنا بالکل جائز ہوگا۔ جب انھوں نے کفار پر محبت تمام کر دی اور انھوں نے کوئی اصلاح قبول کرنے کے بجائے اسلئے انہی کو مجرم ٹھہرایا تو وہ اسی کے سزاوار ہوں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو کوئی ہمدردی نہ ہو۔

عَلَى الْاَرَآءِ يَنْظُرُوْنَ (۳۵)

یعنی وہ جس طرح اپنے تختوں پر بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جلوے دیکھتے ہوں گے اس طرح اپنے تختوں پر بیٹھے ہی بیٹھے جب پاہیں گے جہانک کے دوزخ میں کفار کا حال بھی دیکھیں گے بلکہ ان سے سوال و جواب بھی کر لیں گے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے۔

هَلْ تُوْتَبُ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۶)

یہ سب کچھ دیکھ دیکھا لینے کے بعد اہل ایمان سے بطور طلب تصدیق یہ سوال ہوگا کہ کیوں کفار کو اپنے کیے کا پورا پورا بدلہ مل گیا نا!

”مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ“ میں کفار کی وہ بدتمیزیاں بھی شامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی فضله

واحسانہ۔

رحمان آباد

۱۴۔ اگست ۱۹۶۹ء

۲۰۔ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ







مدیر فرزان

۸۴

الانشقاق







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ اور سابق سورہ ————— المطففین ————— میں نہایت واضح معنوی مشابہت موجود ہے۔ جزاء و سزا کے منکروں کو جس طرح اس میں متنبہ کیا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی اسی گردہ کو جھنجھوڑا گیا ہے۔ اس میں بیان فرمایا ہے کہ ایک ایسا دن لازماً آنا ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے ایمان اور عمل کی بنیاد پر الگ الگ گروہوں میں تقسیم کرے گا، جو خدا کے فرمانبردار و نیکو کار ہوں گے وہ ابدی بادشاہی میں داخل ہوں گے اور جو نافرمان و ناکار ہوں گے وہ ابدی ذلت سے دوچار ہوں گے۔ اس سورہ میں بھی لوگوں کا دو گروہوں میں تقسیم ہونا بیان ہوا ہے۔ ایک وہ جن کو ان کے اعمال نامے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور وہ ابدی کامیابی حاصل کریں گے دوسرے وہ جن کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے ان کے ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے اور وہ ابدی ذلت سے دوچار ہوں گے۔

دونوں میں اصل مخاطب وہ مترفین و ارباب تنعم ہیں جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اول تو جزاء و سزا کا کوئی دن آنے والا ہے نہیں اور ہے بھی تو ان کو جو عزت و سرفرازی یہاں حاصل ہے وہ وہاں بھی حاصل رہے گی۔ ان کو بتایا گیا ہے کہ انسان کی فطرت عدل کے شعور سے عاری نہیں ہے اور خالق نے یہ دنیا اندھیر نگری نہیں بنائی ہے، اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان امتیاز ہو۔ اس دن وہ لوگ ہلاک ہوں گے جو اس بدیہی حقیقت کو پس پشت ڈال کر زندگی گزاریں گے۔

استدلال کی بنیاد سابق سورہ میں، جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، انسانی فطرت پر ہے اور اس سورہ میں، جیسا کہ آگے وضاحت ہوگی، انفاق کے بعض شواہد پر۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:



(۵-۱) ظہرِ قیامت کے وقت آسمان وزمین میں جو پھیل برپا ہوگی اس کا اجمالی تذکرہ اور اس امر کی وضاحت کہ اس دن نہ آسمان کی بحال ہوگی کہ وہ اپنے رب کے حکم سے سرتابی کر سکے اور نہ زمین کی۔ دونوں اپنے رب کی بے چون و چرا اطاعت کریں گے اور یہی ان کے لیے زیبا ہے۔ جب خدا نے ان کو پیدا کیا ہے تو ان پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔

(۱۵-۶) انسان کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ تجھے بھی کشتی کشاں کشاں اپنے رب سے ملنا اور اپنے انجام سے دوچار ہونا ہے۔ اس دن جن کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے وہ تو نہایت ستے چھوٹیں گے اور خوش خوش اپنے لوگوں سے ملیں گے۔ البتہ ان کی شامت ہے جہنم نے اسی دنیا کو منزلِ مقصود بنا لیا اور اصل منزل سے غفلت سے زندگی گزاری۔ ان کو ان کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے پکڑا دیے جائیں گے۔ ان کے لیے ہر قدم پر ہلاکی ہی ہلاکی ہوگی۔

(۲۱-۱۶) اس کائنات کے بعض آثار کی شہادت اس بات پر کہ اس کی ہر چیز کے اندر ایک تدریج پائی جاتی ہے اور ہر چیز ہر لمحہ خدا کے قانون کی گرفت میں ہے۔ انسان بھی درجہ بدرجہ اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک دن اس کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ اگر وہ قرآن کی اس بات کو نہیں مان رہا ہے تو یہ اس کی خرد بابتگلی ہے۔

(۲۵-۲۲) ان لوگوں کو وعید جو قرآن کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو بشارت جو اس کے انذار کی تصدیق کر کے ایمان و عملِ صالح کی راہ پر چل پڑے ہیں۔



## سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ

مَكِّيَّةٌ \_\_\_\_\_ آيات: ٢٥

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ① وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ② وَإِذَا  
 الْأَرْضُ مُدَّتْ ③ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ④ وَأَذِنَتْ  
 لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ⑤ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ  
 كَدُ حَافِلٍ قِيَّهِ ⑥ فَمَا مَنِ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ⑦ فَسَوْفَ  
 يُعَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ⑧ وَيُنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ⑨  
 وَأَمَّا مَنِ أُوْتِيَ كِتَابَهُ وِرَاءَ ظَهْرِهِ ⑩ فَسَوْفَ يَدْعُوا  
 ثُبُورًا ⑪ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ⑫ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ⑬  
 إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّنْ يَحُورَ ⑭ بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ⑮  
 فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ⑯ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ⑰ وَالْقَمَرِ إِذَا  
 اتَّسَقَ ⑱ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ⑲ فَمَا لَهُمْ لَا  
 يُؤْمِنُونَ ⑳ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ㉑  
 بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكْذِبُونَ ㉒ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ㉓  
 فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ㉔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

آيات  
٢٥-١

مناقبه

الجنة  
الجنة



۱  
ع ۲۵  
۹  
لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۚ ۲۵

ترجمہ آیات  
۲۵-۱

جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے یہی زیبا ہے۔ اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر ڈال کر فارغ ہو جائے گی اور وہ اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کو یہی چاہیے۔ ۱-۵  
اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے خداوند ہی کی طرف جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ تو جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب تو نہایت ہلکا ہے۔ اور وہ اپنے لوگوں کے پاس نہایت شاد مند لوٹے گا۔ رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے پیچھے سے پکڑا دیا جائے گا تو وہ موت کی دہائی دے گا اور دوزخ میں پڑے گا۔ وہ اپنے لوگوں کو کہے گا: ۱-۲۱۔ نہ گمان رکھا کہ اس کو کبھی لوٹنا نہیں ہوگا۔ ہاں، کیوں نہیں! اس کا رب تو اس کو اپنی طرح دیکھ رہا تھا۔ ۶-۱۵  
پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے کہ تم کو لازماً چڑھنا ہے درجہ بدرجہ۔ ۱۶-۱۹

تو انھیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لائے ہیں اور جب انھیں قرآن سنایا جاتا ہے تو سجدے میں نہیں گر پڑتے! بلکہ جنھوں نے کفر کیا وہ جھٹلا رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ ہاں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے دائمی النعم ہے۔ ۲۰-۲۵



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۖ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (۲-۱)

قیامت کے بعد جو جہانِ نو وجود میں آئے گا وہ نئے نوا بیس و قوانین کے تحت وجود میں آئے گا اس وجہ سے اس میں یہ آسمان و زمین جو آج موجود ہیں، ختم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، دوسرے آسمان و زمین نمودار ہو جائیں گے۔

’إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ‘ کے الفاظ سے یہاں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو سورۃ انفطار میں ’إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ‘ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ کائنات کے اس سب سے بڑے حادثہ کا آج کوئی اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ قرآن نے اس پہلی کائنات کا ذکر ان نادانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کیا ہے جو اپنے قلعوں اور محلوں پر بہت نازاں تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بھلا ان میں کوئی دروازہ کہاں سے پڑ جاتے گی؟ ان کو آگاہ فرمایا کہ تلے اور ٹرہیاں، ایوان اور محل تو درگنا دوسرے سے یہ آسمان و زمین ہی پاش پاش ہو جائیں گے جن کے اندر یہ گھر و ندے تم نے بنائے ہیں۔ ’وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ‘۔ ’أَذِنَتْ لَہُ‘ کے معنی ہیں ’استمع لہ‘ اس نے اس کی بات مان لی، اس کے حکم کی تعمیل کی، اس کے آگے سر جھکا دیا۔

’وَحُقَّتْ لَہُ‘ کے معنی ہیں کہ اس کے لیے واجب ہے کہ وہ ایسا کرے، اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔

مطلب یہ ہے کہ اس جہالت میں نہ پھنسے رہو کہ بھلا آسمان و زمین جیسی چیزوں پر کس کا زور چل سکتا ہے کہ وہ ان کو پاش پاش کر کے رکھ دے۔ اس دن اپنے رب کے حکم سے یہ بھی پاش پاش ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے گا اور بے چون و چرا وہ اس کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ ’وَحُقَّتْ‘ یعنی اس کے لیے یہی کرنا واجب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے تو اس کے لیے یہ کس طرح زیبا ہے کہ وہ اپنے خالق کی نافرمانی کرے!

یہ فقرہ یہاں ان مغروروں کی تنبیہ و تعلیم کے لیے آیا ہے جو بات بات پر اللہ اور رسول اکبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف محاذ قائم کرنے پر تے ہوئے تھے۔ برہم و متوہن ان کو توجہ دلا دی گئی کہ آسمان تو اپنے رب عزوجل کے حکم کی تعمیل میں پاش پاش ہو جائے گا اور یہی اس کے لیے زیبا ہے۔ اب وہ نادان جن کی حیثیت اس آسمان کے نیچے بالکل ایک ذرہ بے مقدار کی ہے سوچ لیں کہ ان کا یہ رویہ کس طرح جائز



ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے رب سے لڑنے اٹھیں اور اس زعم میں مبتلا ہوں کہ کوئی ان کو ان کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا!

وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۖ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۖ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا  
وَحَقَّتْ (۳-۵)

قیامت کے دن زمین کے بعد یہ زمین پر جو کچھ گزرے گی اس کا حال بیان ہو رہا ہے کہ زمین تان دی جائے گی۔  
زمین کا حال یعنی آج تو زمین میں بہت سی شکلیں اور سلوٹیں ہیں، نشیب و فراز ہیں، وادیاں اور کہسار ہیں، دریا اور پہاڑ ہیں۔ اس کی اونچ نیچ اور اس کی تہوں میں بے شمار چیزیں چھپی ہوئی ہیں جو نظر نہیں آ رہی ہیں لیکن اس دن یہ ایک چادر کی طرح تان دی جائے گی اور جو کچھ اس کی سلوٹوں میں ہے وہ اس کو باہر نکال کر فارغ ہو جائے گی۔ یہ اشارہ اگرچہ خاص طور پر مردوں کے اٹھائے جانے کی طرف ہے لیکن اسلوب بیان عام ہے۔ وہ ساری چیزیں اس میں داخل ہیں جو زمین میں دفن ہیں۔ یعنی ان سر پایہ داروں کے خزانے بھی جو اس سورہ میں خاص طور پر مخاطب ہیں۔

وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ، اسلوب بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ زمین ان چیزوں کے بوجھ سے اسی طرح بوجھل ہے جس طرح ایک حاملہ اپنے حمل سے بوجھل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس بوجھ سے فارغ ہونے میں وہی راحت و فراغت محسوس کرے گی جو ایک حاملہ وضع حمل کے بعد محسوس کرتی ہے۔

وَإِذْنَتْ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ، اس آیت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آسمان اور زمین دونوں اس دن اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے اور یہ اطاعت ہی ان کے لیے زیبا ہے اور یہ بالکل رضا مندانہ ہوگی۔ قرآن میں دوسری جگہ آسمان و زمین کی اس رضا مندانہ اطاعت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا وَقَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (حم السجدة ۱۰: ۱۱) پس اس نے آسمان اور زمین دونوں کو حکم دیا کہ حاضر ہو، رضا مندانہ خواہ مجبورانہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم حاضر ہیں رضا مندانہ۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا حَافِلٌ لِّقِيهِ (۶)

یہاں کے خطاب باعتبار الفاظ اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خالص طور پر انہی مغروروں کی طرف ہے جو اپنے عیش دنیا میں مگن اور آخرت سے بالکل نچپت تھے۔ فرمایا کہ اے انسان تو بھی کشاکش کر رہا ہے اپنے رب کی طرف! ہاں اور بالآخر اسی کے حضور تیری پیشی ہوتی ہے! تجھے اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

دنیا کے پستار اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں اپنی اصل منزل ہمیشہ بھولے رہتے ہیں۔ انھیں



کامیابیوں کے بعد کامیابیاں اور فتوحات کے بعد جو فتوحات حاصل ہوتی ہیں ان میں وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان سے باہر ہو کر وہ کسی چیز پر غور ہی نہیں کر سکتے۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری کامیابی کے حصول کی بھاگ دوڑ میں انھیں کبھی اس سوال پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ان کی اصلی منزل ہے کیا؟ وہ اسی دنیا کی کسی کامیابی کو اپنی آخری منزل سمجھتے ہیں حالانکہ آخری منزل آخرت ہے جس کی طرف سب، خدا کے قانون کی زنجیر میں بندھے، نہایت بے بسی کے ساتھ کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔ اگر ان کی نظر زندگی کے اس پہلو پر بھی ہوتی تو وہ جادہ مستقیم سے منحرف نہ ہوتے بلکہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے کہ جتنی تیزی کی زندگی کے ساتھ وہ اپنی مرغوبات دنیا کی راہ میں بڑھ رہے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ ان کی زندگی محاسبہ اعمال کے لیے خدا کی طرف بڑھ رہی ہے۔

رَأَيْتَكَ كَادِحًا إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا ۖ كَدْحُكَ كَدْحُ شَيْءٍ مِّنْ شَيْءٍ  
 کے ہیں۔ یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے اس حقیقت کی کہ انسان جس دن سے وجود میں آتا ہے اسی دن سے کشاں کشاں اس کا سفر خدا کی ٹھہرائی ہوئی منزل یعنی موت کی راہ میں شروع ہو جاتا ہے اور یہ سفر بلا کسی توقف کے خدا کی طرف جاری رہتا ہے۔ موسم سخت ہو یا نرم، آدمی مریض ہو یا صحت مند، حالات مساعد ہوں یا نامساعد، کسی جا رہا ہے حال میں بھی یہ منقطع نہیں ہوتا۔ ولادت سے لے کر موت تک بچپن، مراہقہ، جوانی، ادھیڑ پن، پیری اور ناتوانی کے مختلف مراحل آتے ہیں لیکن اس میں ایک منٹ بلکہ سکنڈ کے لیے بھی وقفہ نہیں ہوتا۔ انسان قانونِ قدرت کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ وہ اس راہ میں نہ بھی چلتا چاہے جب بھی اس کو چلنا پڑے گا اور اس بے بسی میں شاہ اور گدا، شریف اور ضعیف، امیر اور مامور، نیک اور بد سب یکساں ہیں۔

فَمَلِيْئِيْهِ ۖ يٰۤاِسْرَافَ ۚ  
 یہ اس سفر کی غایت بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ انسان اس دنیا میں شتر بے ہمار نہیں ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ سب کشاں کشاں اپنے خالق کے حضور میں پہنچیں اور اس کے آگے پیش ہوں۔ اس پیشی کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد سے ان کو دنیا میں پیدا کیا اس سے متعلق ان سے سوال ہو کہ وہ انھوں نے پورا کیا یا نہیں، چنانچہ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔

فَاَمَّا مَنۡ اُوْتِيَ كِتٰبًا بِمِیْنٰہٖ ۙ فَسَوَفۡ یُّجٰۤا سَبۡحًا یَّاسِیًّا (۷-۸)

یہ ادب کے اجمال کی تفصیل ہے۔ فرمایا کہ اس دن جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے وہ تو سستے چھوٹے گے بطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال ناموں کا ان کے دہنے ہاتھ میں دیا جانا ہی اس بات کا ضامن ہو گا کہ وہ نجات کے حق دار ہیں، ان کی نیکیاں ان کی بدیوں پر غالب اور وہ عفو و صفحہ



کے حق دار ہیں۔ معلوم ہوا کہ جہاں تک حساب کا تعلق ہے وہ تو ان کا بھی ہوگا لیکن ان کے نیک اعمال کا وزن زیادہ ہوگا۔ اس وجہ سے ان کی معمولی غلطیوں سے درگزر کی جائے گی برعکس اس کے جن کے برے اعمال کا وزن زیادہ ہوگا ان کی ایک ایک غلطی پر گرفت ہوگی اور وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔  
وَيُنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُودًا (۹)

ایک جامع اسلوب اور اس کے  
یہ ایک جامع اسلوب میں ان کا صلہ بیان ہوا ہے کہ اس دن وہ اپنے اہل و عیال میں خوش خوش لوٹیں گے۔ اس اسلوب بیان میں کسی باتیں سمٹ آئی ہیں جو خود بخود نظر آ رہی ہیں، مثلاً

مغمرات  
— یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے باایمان اہل و عیال کو ان کے ساتھ جنت میں جمع کر دے گا اگرچہ اہل و عیال اس درجہ بلند کے مستحق نہ ہوں جس کے وہ مستحق نہ ہوتے تاکہ جنت کی کامیابی سے یک جا مسرور و شاد مند ہوں۔ سورہ طور آیت ۲۱ میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ اس یک جائی کے لیے اللہ تعالیٰ ان کے دوسرے کو نیچا نہیں کرے گا بلکہ ان کے اہل و عیال کے درجے بلند کر دے گا۔

— یہ کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کے اندر ان کی عاقبت سے بے فکرہ کر زندگی نہیں گزار سی بلکہ دنیا سے زیادہ ان کی اخروی کامیابیوں کی فکر رکھی۔ فکر آخرت سے غافلوں کا رویہ تو سابق سورہ میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں ہوتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے کہ بھلا اس ہرے بھرے باغ پر خزاں کدھر سے آسکتی ہے! وَإِذَا الْغُلُوبُ إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَمِنْهُمْ شُكَّيْنٌ (المطففين: ۸۳-۸۴) اس کے برعکس آخرت پر ایمان رکھنے والوں سے متعلق سورہ طور آیات ۲۶-۲۷ میں یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن جب وہ اپنے اہل و عیال کی یکجائی سے مسرور ہوں گے تو کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوا کہ ہم ان کی اخروی فلاح سے غافل نہیں بلکہ اس کے لیے برابر فکر مند رہے جس کا صلہ ہمیں یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ہمارے ساتھ جمع کر دیا۔ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۚ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَدْنَا عَذَابَ السُّورِ — یہ کہ جو شخص اپنے اہل و عیال سے محبت رکھتا ہے اس کی اس محبت کا اصلی تقاضا

یہ ہے کہ وہ ان کی عاقبت سنوارنے کے لیے خود بھی فکر مند رہے اور ان کو بھی فکر مند رکھنے کی کوشش کرے۔ اسی فکر مندی سے آخرت میں یکجائی اور محبت کا اصلی سرور حاصل ہوگا۔ اگر آخرت کو نظر انداز کر کے اسی دنیا کے لیے محبت کی گئی تو وہ محبت بالآخر دونوں فریق کے لیے موجب وبال و خسران ہوگی اور قیامت میں دونوں باہم دگر مسرور ہونے کے بجائے ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔

وَأَمَّا مَنْ أَدْبَىٰ كِتَابَهُ دَرَاءَ ظَهْرِهِ (۱۰)

آخرت سے غافل  
یہ دوسرے گروہ یعنی ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جنھوں نے آخرت سے بالکل بے پروا رہ کر زندگی گزار دی۔ فرمایا کہ ان کے اعمال نامے ان کے پیچھے ہی سے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے



جائیں گے۔ اگرچہ الفاظ میں بائیں ہاتھ کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرینہ اس پر دلیل ہے۔ جب پہلے گروہ سے مشتق یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اس کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے تاکہ ان کی اور ان کے اعمال نامے کی نامبارکی اس بڑاؤ ہی سے واضح ہو جائے۔ علاوہ ازیں سورہ حاقہ آیت ۲۵ میں واضح نفلوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اس گروہ کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا ہے: **وَأَمَّا مَنْ أَدْبَرَ كَتِفَهُ بَشْمَالِهِ لَا يَقُولُ يَكْتُمُنِي لَمْ أَدْتُ كِتَابِي** (رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا، اے کاش مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا)۔

زیر بحث آیت سورہ حاقہ کی مذکورہ آیت کی روشنی میں دیکھیے تو اس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اس گروہ کو بیک وقت دو فیصلحتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ ایک یہ کہ اس کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ دوسری یہ کہ یہ کام بھی اس طرح ہو گا کہ سامنے سے دیے جانے کے بجائے پیچھے ہی سے ان کو پکڑا دیے جائیں گے۔ مزید غور کیجیے تو یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ مجرموں کی طرح پیچھے کی طرف بندھے ہوں گے۔

**فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۚ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۚ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا (۱۱-۱۳)**

اد پر اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کی طرف خوش خوش ٹوٹیں گے، اس کے ٹھیک مقابل میں ایک دوسرے گروہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ موت اور ہلاکت کی دہائی دیں گے۔ یعنی جس دوزخ میں وہ داخل ہوں گے اس سے نجات کی واحد شکل ان کو صرف یہ نظر آئے گی کہ موت آکر ان کا فائدہ کرے لیکن وہ بھی ان کی پرسانِ حال نہ بنے گی۔

اگرچہ **يَدْعُوا ثُبُورًا** کو بڑا ہر فیصلیٰ سعیر کے بعد آنا چاہیے لیکن بتقاضائے بلاغت مسبب کو سبب پر مقدم کر دیا ہے تاکہ سابق گروہ کی شادمانی اور اس دوسرے گروہ کی بدبختی و حرمان نصیبی دونوں کا ذکر ایک دوسرے کے بالمقابل ہو۔

**إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا** یعنی یہ اہل و عیال کے ساتھ یکجا ٹی کے سرور سے اس وجہ سے محروم رہیں گے کہ ان کو جتنا اس سے حظ اٹھانا تھا دنیا میں اٹھا چکے۔ جب دنیا میں نہ اپنی عاقبت کے لیے وہ فکر مند ہوئے نہ ان کی عاقبت کے لیے تو آخرت میں وہ کس طرح حق دار ہوں گے کہ جنت میں ان کی یکجا ٹی کے سرور سے محظوظ ہوں۔ آخرت میں ہر نعمت سے بہرہ مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں اس کی خاطر قربانی دی گئی ہو۔

**إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَجُوزَ (۱۴)**



یعنی وہ اس گمان میں رہے کہ مرنے کے بعد نہ انھیں جینا ہے نہ کسی کی طرف لوٹنا ہے تو آخر وہ اپنا یا اپنے متعلقین کا عیش کیوں مکدر کرتے؟ انھوں نے زندگی اور اس کے وسائل سے جو خطا اٹھانا تھا اٹھا لیا۔ نہ آخرت کے لیے انھوں نے کوئی فکر ہی کی اور نہ اس میں ان کا کوئی حصہ ہی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا رَبِّهٖ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا (۱۵)

ایک بربروتغ  
استدراک  
یہ ان کے اس ظن پر جس کا اوپر حوالہ ہے، بربر موقع استدراک ہے کہ انھوں نے یہ گمان جو کیا تو بالکل غلط کیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کا رب ان کو دیکھ رہا تھا، تو جب دیکھ رہا تھا تو آخر یہ کس طرح روا تھا کہ وہ ان کو اپنے حضور میں پیشی کے لیے نہ بلاتا؟ یہ بات تو اس کی قدرت، حکمت، عدل اور رحمت سب کے منافی ہوتی! قیامت اور جزا و سزا کے حق میں یہ دلیل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔

فَلَا تُسْمِعُ بِالشَّفَقِ ۚ وَالْيُسُورِ ۚ وَمَا دَسِقَ ۚ وَالْقَسْرِ ۚ اِذَا الشَّقِیُّ دَكَّرَ کَبِیْرًا  
طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۶-۱۹)

ادپر کے دعوے  
بدیہی قسم  
شہادت  
اب آخر میں تین چیزوں کو بصورت قسم شہادت میں پیش کر کے اسی دعوے کو ثابت کیا ہے جو اوپر آیت ۶ میں گزر چکا ہے کہ اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے رب ہی کی طرف جا رہا ہے اور تجھے اس کے آگے پیش ہونا ہے۔ ان قسموں کا مقسم علیہ کثرت کتب طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ہے جس سے یہ بات نکلی کہ تیرا خدا کے آگے پیش ہونا ہے تو ایک امر شدنی لیکن یہ کام ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ ہو گا اس لیے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت جاری ہے کہ ہر چیز اپنی غایت نہایت کو ایک تدریج کے ساتھ پہنچتی ہے۔

اس خلاصہ بحث کو سامنے رکھ کر اب اجزائے کلام پر غور کیجیے۔

فَلَا تُسْمِعُ بِالشَّفَقِ ۚ وَالْيُسُورِ ۚ وَمَا دَسِقَ ۚ وَالْقَسْرِ ۚ اِذَا الشَّقِیُّ دَكَّرَ کَبِیْرًا  
جس طرح لَا تُسْمِعُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ اور متعدد دوسری قسموں سے پہلے یہاں لَا، اسی طرح آیا ہے بار بار کہ چکے ہیں کہ نہ یہ زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس زعم باطل کی پیشگی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید قسم سے مقصود ہوتی ہے۔ اس اسلوب میں یہ بلاغت ہے کہ متکلم مخاطب کے زعم باطل کی تردید میں اتنا توقف بھی گوارا کرنے پر تیار نہیں ہے کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ کلام کا آغاز ہی اس کی تردید سے کرتا ہے۔ یہ اسلوب ایک فطری اسلوب ہے اور ہر قابل ذکر زبان میں موجود ہے۔

رات اور اس کے  
تغنیات کی قسم  
یہاں پہلے شَفَق کی قسم کھائی ہے، پھر رات اور اس کے تغنیات کی۔ شَفَق اس سرخی کو کہتے ہیں







’اِذَا اَنْتَقَى‘ کے معنی ہیں جب کہ وہ پورا ہو جاتا ہے یہاں اشارہ اس کے پورے ہونے کی طرف فرمایا ہے کہ دیکھو کس طرح درجہ بدرجہ اس کو چڑھاٹی چڑھنی پڑتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ اس سے ہر مٹوا سحراف کر سکے اور اس نقطہ کمال پر پہنچ کر اس کے اختیار میں یہ نہیں رہے کہ وہیں ٹمک جائے بلکہ اسی طرح منزل کے بعد منزل طے کرتے ہوئے اسے اتنا بھی چڑھنا ہے اور اس سے بھی اس کو مفر نہیں ہے۔

’لَتَوَكَّبْنَ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ‘ یہ ان قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ فرمایا کہ جس طرح یہ چیزیں خدا کے قانون میں بندھی ہوئی سب اسی کی طرف رواں دواں ہیں اسی طرح انسان بھی ایک مرحلہ کے بعد دوسرے مرحلہ طے کرتا ہوا کشاں کشاں جاتا خدا ہی کی طرف ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ اپنی جگہ ہی پر ٹکرا رہ جائے اور نہ اس کا امکان ہے کہ کسی اور سمت میں نکل جائے، البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مطابق، جو اس پوری کائنات میں جاری ہے، درجہ بدرجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ ہوگا اس وجہ سے نہ اس کو غلبت کرنی چاہیے اور نہ کسی حقیقت کی اس بنا پر تکذیب کرنی چاہیے کہ وہ اس کی طلب پر اس کو دکھائی نہیں گئی۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۰)

یہ ان لوگوں کی حالت پر اظہارِ تعجب ہے کہ اتنے واضح شواہد کے بعد بھی آخر ان کی کیا منت ماری ہوئی ہے کہ یہ آخرت اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں لارہے ہیں!

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ (۲۱)

یعنی حق تو یہ تھا کہ جب قرآن ان کو ایسی عظیم حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے تو جب وہ ان کو سنایا جاتا تو وہ اس کی عظمت کے اعتراف اور اس کی بیان کردہ حقیقت کی تصدیق کے لیے بطور شکر اپنے رب کے آگے سجدہ میں گر پڑتے، لیکن ان کا رویہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اگر تے اور اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

انسان کی ناپاکی  
پر اظہارِ تعجب

یہاں عرب اور اہل مصر کی یہ روایت پیش نظر رہے کہ جب وہ کسی کی بات کی عظمت اور صداقت کا سچے جوش و جذبہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہتے تو اس کو دیکھتے یا سنتے ہی بے تحاشا سجدے میں گر پڑتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے فرعون نے جن ساحر وں کو اکٹھا کیا تھا انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور ان کے معجزات کی عظمت کا اعتراف اسی طرح کیا۔ مشہور شاعر بلید کے قصیدے کے ایک شعر پر بھی وقت کے مشہور شعراء نے عرب نے سجدہ کیا جس کی بنا پر ان کا قصیدہ خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا اور وہ وقت کے ملک الشعراء قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اپنی بلاغت و صداقت میں ان چیزوں سے بدرجہا بلند ہے لیکن جو لوگ اس کی قدر و قیمت سے نا آشنا تھے وہ



سجدہ کرنے کے بجائے اکڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُكْذَبُونَ (۲۲)

یہ اس صورتِ حال کا بیان ہے جو عملاً کھتی۔ یعنی سجدہ کرنا تو درکنار جو قیامت کے منکر ہیں وہ قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں کہ یہ محض پیش کرنے والے کا اپنا گھڑا ہوا کلام ہے جو قیامت کے ڈراوے سنا کر ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ (۲۳)

یعنی اس گہر کو پھینک کر جو پیشیز اور خزف ریزے یہ لوگ جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کے نقدِ عاجل نے ان کو قرآن کی تکذیب پر آمادہ کیا لیکن یہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں اس کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ اس کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے۔ جس دن ان کا اندوختہ اپنی اصل صورت میں ان کے سامنے آئے گا تب انھیں پتہ چلے گا کہ انھوں نے کس چیز کو پھینکا اور کس چیز کے انبار جمع کیے! بَلِ يُكْذَبُونَ کے اجمال میں ان کی دولت بھی داخل ہے، ان کے اعمال بھی شامل ہیں اور ان کے دوستاںچ اعمال بھی جو ازل زمانہ ظہور میں آنے والے ہیں لیکن ان کا حقیقی علم اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ہوگا۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۚ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (۲۵-۲۴)

یعنی اگر یہ محبتِ دنیا میں پھنس کر قرآن کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو ان کو اس دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو جس کے تمام اسباب انھوں نے فراہم کر لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ نجات کی خوش خبری سننے پر آمادہ نہیں ہیں تو عذاب کی خوش خبری تو انھیں سنا ہی دو۔ اس عذاب سے صرف وہی محفوظ رہیں گے جو ایمان اور عملِ صالح کی وہ راہ اختیار کر لیں گے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے بے شک ایک دائمی اجر ہوگا!

ان سطور پر توفیقِ ایزدی اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ السعی متی والانتہام من اللہ و بیدالفضل کلہ وهو علی کل شیء قدير۔

رحمان آباد

۱۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

۱۷۔ شوال ۱۳۹۹ھ







تذکرہ قرآن

۸۵

البروج







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا زمانہ نزول اور مضمون

یہ سورہ دعوت کے اس دور میں نازل ہوئی جب کفار قریش اول اول اسلام لانے والوں کو اس غصہ میں بہرسم کے مظالم کا تختہ مشق بنائے ہوئے تھے کہ انھوں نے آباؤی دین چھوڑ کر یہ نیا دین کیوں اختیار کر لیا؟ ان کو اس میں آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس ظلم و ستم سے باز نہ آئے تو بہت جلد خدا کی ایسی سخت پکڑ میں آجائیں گے جس سے کبھی نہ چھوٹ سکیں گے۔ ساتھ ہی مظلوم مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ ان مظالم سے وہ ہراساں نہ ہوں بلکہ دین حق پر جے رہیں۔ حالات بظاہر کتنے ہی نامساعد ہوں لیکن جس رب پر وہ ایمان لائے ہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے ارادوں میں کوئی بھی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ آخر میں کفار کو یہ تنبیہ بھی فرمادی گئی ہے کہ اس قرآن کو، جو ان کو اس خطرے سے آگاہ کر رہا ہے، سحر و نجوم اور کہانت و شاعری کے قسم کی کوئی چیز نہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے اور اس کا منبع لوح محفوظ ہے۔ اس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) برجوں والے آسمان اور روزِ قیامت کی قسم اس بات پر کہ قیامت شدنی ہے اور ان لوگوں کے لیے ابدی تباہی ہے جو جہنم کے گڑھوں میں پھینکے جائیں گے۔

(۵-۱۱) بڑا ہل ایمان اس بنا پر تائید گئے کہ آسمان و زمین کے رب پر ایمان لائے ان کی دادی کا وعدہ اور جنت کی بشارت بشرطیکہ ان مظالم کے باوجود وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ ساتھ ہی ان ظالموں کو عذاب کی وعید جھٹوں نے مسلمانوں کو تائید اور اس جرم سے توبہ کی توفیق انھیں حاصل نہیں ہوئی۔

(۱۲-۱۶) ظالموں کے لیے خدا کی پکڑ کی بے پناہی اور اس جرم سے توبہ کرنے والوں کے لیے اس کی رحمت و مغفرت کی وسعت کا بیان، صفاتِ جلال و جمال کی روشنی میں۔



(۱۷-۱۸) ماضی کی بعض جبار قوموں کی طرف اشارہ جو اہل ایمان پر اسی طرح کے مظالم کی ترکیب ہوئیں جس کے ترکیب قریش ہو رہے تھے اور جس کی پاداش میں وہ خدا کی پکڑ میں آگئیں۔

(۱۹-۲۲) قریش کی بدبختی پر افسوس کہ وہ قرآن کے انذار کی تکذیب پر اڑے ہوئے اور نشہ اقتدار میں مست ہیں۔ حالانکہ یہ انذار ایک حقیقت ہے جس سے مفر نہیں۔ وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ اس نے ہر طرف سے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔ قرآن کوئی ساعری اور کہانت کے قسم کی چیز نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ یہ نہایت ہی اشرف و اعلیٰ کلام ہے جو خدا نے اتارا ہے اور اس کا سرچشمہ لوح محفوظ ہے۔

---



# سُورَةُ الْبُرُوجِ

مَكِّيَّةٌ \_\_\_\_\_ آيات ٢٢:

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ① وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ② وَشَاهِدِ ③ آياتِ  
 وَمَشْهُودِ ④ قَتَلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ⑤ النَّارِ ذَاتِ  
 الْوَقُودِ ⑥ أَذْهَبَتْ عَلَيْهِمُ أَعْيُنُهُمْ ⑦ وَهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ  
 بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ⑧ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا  
 بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ⑨ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ  
 الْأَرْضِ ⑩ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ⑪ إِنَّ الَّذِينَ قَتَلُوا  
 الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ كَفَرُوا فَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ  
 وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ⑫ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
 لَهُمْ جَنَّاتُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ⑬ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ⑭ آية حميدة  
 إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ⑮ إِنَّهُ هُوَ يَدِي وَيُعِيدُ ⑯ وَهُوَ  
 الْغَفُورُ الْودُودُ ⑰ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ⑱ فَقَالَ لِمَا  
 يُرِيدُ ⑲ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ⑳ فِرْعَوْنُ وَ  
 ثَمُودُ ㉑ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ㉒ وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ



۲۰ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰ ۱۰۱ ۱۰۲ ۱۰۳ ۱۰۴ ۱۰۵ ۱۰۶ ۱۰۷ ۱۰۸ ۱۰۹ ۱۱۰ ۱۱۱ ۱۱۲ ۱۱۳ ۱۱۴ ۱۱۵ ۱۱۶ ۱۱۷ ۱۱۸ ۱۱۹ ۱۲۰ ۱۲۱ ۱۲۲ ۱۲۳ ۱۲۴ ۱۲۵ ۱۲۶ ۱۲۷ ۱۲۸ ۱۲۹ ۱۳۰ ۱۳۱ ۱۳۲ ۱۳۳ ۱۳۴ ۱۳۵ ۱۳۶ ۱۳۷ ۱۳۸ ۱۳۹ ۱۴۰ ۱۴۱ ۱۴۲ ۱۴۳ ۱۴۴ ۱۴۵ ۱۴۶ ۱۴۷ ۱۴۸ ۱۴۹ ۱۵۰ ۱۵۱ ۱۵۲ ۱۵۳ ۱۵۴ ۱۵۵ ۱۵۶ ۱۵۷ ۱۵۸ ۱۵۹ ۱۶۰ ۱۶۱ ۱۶۲ ۱۶۳ ۱۶۴ ۱۶۵ ۱۶۶ ۱۶۷ ۱۶۸ ۱۶۹ ۱۷۰ ۱۷۱ ۱۷۲ ۱۷۳ ۱۷۴ ۱۷۵ ۱۷۶ ۱۷۷ ۱۷۸ ۱۷۹ ۱۸۰ ۱۸۱ ۱۸۲ ۱۸۳ ۱۸۴ ۱۸۵ ۱۸۶ ۱۸۷ ۱۸۸ ۱۸۹ ۱۹۰ ۱۹۱ ۱۹۲ ۱۹۳ ۱۹۴ ۱۹۵ ۱۹۶ ۱۹۷ ۱۹۸ ۱۹۹ ۲۰۰ ۲۰۱ ۲۰۲ ۲۰۳ ۲۰۴ ۲۰۵ ۲۰۶ ۲۰۷ ۲۰۸ ۲۰۹ ۲۱۰ ۲۱۱ ۲۱۲ ۲۱۳ ۲۱۴ ۲۱۵ ۲۱۶ ۲۱۷ ۲۱۸ ۲۱۹ ۲۲۰ ۲۲۱ ۲۲۲ ۲۲۳ ۲۲۴ ۲۲۵ ۲۲۶ ۲۲۷ ۲۲۸ ۲۲۹ ۲۳۰ ۲۳۱ ۲۳۲ ۲۳۳ ۲۳۴ ۲۳۵ ۲۳۶ ۲۳۷ ۲۳۸ ۲۳۹ ۲۴۰ ۲۴۱ ۲۴۲ ۲۴۳ ۲۴۴ ۲۴۵ ۲۴۶ ۲۴۷ ۲۴۸ ۲۴۹ ۲۵۰ ۲۵۱ ۲۵۲ ۲۵۳ ۲۵۴ ۲۵۵ ۲۵۶ ۲۵۷ ۲۵۸ ۲۵۹ ۲۶۰ ۲۶۱ ۲۶۲ ۲۶۳ ۲۶۴ ۲۶۵ ۲۶۶ ۲۶۷ ۲۶۸ ۲۶۹ ۲۷۰ ۲۷۱ ۲۷۲ ۲۷۳ ۲۷۴ ۲۷۵ ۲۷۶ ۲۷۷ ۲۷۸ ۲۷۹ ۲۸۰ ۲۸۱ ۲۸۲ ۲۸۳ ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۶ ۲۸۷ ۲۸۸ ۲۸۹ ۲۹۰ ۲۹۱ ۲۹۲ ۲۹۳ ۲۹۴ ۲۹۵ ۲۹۶ ۲۹۷ ۲۹۸ ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۷ ۳۰۸ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۶ ۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۵ ۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۴ ۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۳ ۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۲ ۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۷۰ ۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۹ ۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱ ۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰ ۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹ ۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸ ۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷ ۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶ ۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵ ۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰

ترجمہ آیات  
۲۲-۱

قسم ہے برجوں والے آسمان اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور دیکھنے والے اور  
دیکھی ہوئی کی۔ ہلاک ہوئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے جب کہ وہ اس پر بیٹھے  
ہوں گے اور جو کچھ وہ اہل ایمان سے کرتے رہے اس کو دیکھیں گے۔ ۱-۱۰،

اور انھوں نے ان پر محض اس وجہ سے غصہ نکالا کہ وہ ایمان لائے اس خدائے  
عزیز و حمید پر جس کی ہی بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین میں اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔  
جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، ان کے لیے  
لازمًا جہنم کی سزا اور جلنے کا عذاب ہے۔ البتہ جو بچتہ ایمان لائے اور انھوں نے نیک  
عمل کیے ان کے لیے باغ ہوں گے جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ بڑی کامیابی  
دراصل یہ ہے! ۱۰-۱۱

بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ وہی آغاز کرتا ہے اور وہی  
لوٹائے گا۔ اور وہ بخشنے والا پیار کرنے والا ہے۔ عرش بریں کا مالک۔ جو چاہے کر  
ڈالنے والا۔ ۱۲-۱۶

تجھے شکروں کی خبر پہنچی ہے؛ فرعون اور ثمود کے شکروں کی؛ لیکن یہ کفار  
جھٹلانے ہی میں لگے رہیں گے۔ اور خدا ان کو ان کے آگے سمجھے سے گھیرے ہوئے  
ہے۔ (یہ جھٹلانے کی چیز نہیں) بلکہ یہ بڑے مرتبہ کا کلام ہے۔ یہ لوح محفوظ کے اندر



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ (۱)

لفظ 'برج' قلعوں اور گڑھیوں کے لیے آتا ہے۔ عربی زبان اور قرآن دونوں میں یہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آسمان کی صفت کے طور پر یہ جہاں آیا ہے اس سے مراد آسمان کے وہ قلعے اور دیدبان ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے برابر مامور رہتے ہیں کہ وہ خدا کی ملکوت میں شیاطین کو ایک خاص حد سے آگے یعنی ملاء اعلیٰ کے حدود میں داخل نہ ہونے دیں۔ اگر اس حد سے وہ آگے بڑھنے کی جرات کرتے ہیں تو جیسا کہ اس مختلف سورتوں میں پڑھ چکے ہیں، ان پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی جن یا انسان ملاء اعلیٰ کے حدود میں داخل یا غیب کے اسرار کی کچھ سن سگئے۔

قسم یہاں، جیسا کہ جگہ جگہ وضاحت ہو چکی ہے، بطور شہادت یا اس دعوے پر بطور دلیل کھائی گئی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس سورہ میں مخاطب، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، مکہ اور طائف کے وہ فراعنہ ہیں جو نشہ اقتدار میں کمزور مسلمانوں کو مظالم کا ہدف بنائے ہوئے تھے اور اپنے قلعوں اور ایوانوں پر ان کو اتنا ناز تھا کہ ان کو کبھی خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ جس خدا کے علم و تدبیر پر ایمان لانے کے انتقام میں وہ اس کے کمزور بندوں پر ستم ڈھا رہے ہیں وہ کوئی کمزور مہنتی نہیں ہے بلکہ وہی برجوں والے آسمان کا خالق و مالک ہے۔ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا سے غافل نہیں ہے بلکہ آسمانی قلعوں اور دیدبانوں سے اس کے کردہ ہر گوشہ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہ جب چاہے آسمانی برجوں سے اپنی افواج قاہرہ بھیج کر یازمین ہی سے کوئی آفت ارضی ابھار کر سارے قلعوں، گڑھیوں، ایوانوں کو مسمار اور ان پر ناز کرنے والوں کے غرور کو پامال کر کے دکھ دے۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ (۲)

یہ اس روز قیامت کی قسم ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ جس طرح سورہ قیامہ میں اس کی قسم کھائی ہے اسی طرح یہاں بھی قسم کھائی ہے۔ قیامت کی قسم خود قیامت ہی سے ڈرانے کے لیے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس سے کسی دی ہوش کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ قیامہ میں فرمایا ہے کہ اس کی شہادت خود انسان کے نفس ہی کے اندر موجود ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔



بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَلَوْ أَنَّهُ مَعَاذَ بِرِّكَ ۚ (القيمة - ۷۵ : ۱۴ - ۵۵) (بلکہ انسان خود اپنے اور پر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

وَشَٰهِدٌ ۭ وَشَٰهَدٌ (۳)

قیامت کے ان نکرہ یہاں تعمیم کے لیے ہے جس سے قیامت اور جزاء و سزا کے ان تمام دلائل و شواہد کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جو آفاق کے ہر گوشے میں موجود ہیں بشرطیکہ انسان آنکھیں اور عبرت پذیر دل رکھتا ہو۔ مثلاً

یہ موجود نہیں

— اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز خالق کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت اور دوسری اعلیٰ صفات کی گواہی دیتی ہے۔ ان صفات کا یہی تقاضا، جیسا کہ قرآن نے وضاحت فرمائی ہے، یہ ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے اور نہ یوں ہی ایک حادثہ کے طور پر تمام ہو جائے بلکہ واجب ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ اس کے نیکیوں اور بدوں میں امتیاز کرے۔ جنہوں نے اس کے منشاء کے مطابق زندگی گزاری ہو وہ انعام پائیں اور جنہوں نے شتر بے مہار کی زندگی گزاری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس کائنات کے خالق کے نزدیک خیر اور شر، نیک اور بد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

— قرآن نے جابجا رسولوں اور ان کی قوموں کی کشمکش اور اس کشمکش کے نتیجہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ اس نے کس طرح ان لوگوں کو پامال کیا جنہوں نے اس کے رسولوں کی تکذیب کی اگرچہ وہ بڑی قوت و شوکت رکھنے والی قومیں تھیں۔ پھر ان کے آثار سے لوگوں کو سبق حاصل کرنے کی دعوت دی اور فرمایا ہے کہ ہم نے یہ آثار زمین میں محفوظ کیے ہی اس لیے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں اور ان سے عبرت پکڑیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا ہے وہی ان کے ساتھ بھی کرے گا اگر انہوں نے بھی انہی کی روش اختیار کی اور انہی کی طرح اکر دکھائی۔

اس استدلالی پہلو کے ساتھ ساتھ شاہد اور مشہود کے الفاظ کے اندر ایک تنخویف کا پہلو بھی ہے جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے آئے گا۔ وہ یہ کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو کچھ وہ دنیا میں کر رہا ہے ان میں سے کوئی چیز خدا سے مخفی ہے بلکہ وہ جو کچھ کرے گا ایک ایک ایک کر کے وہ اس کے سامنے آئے گا اور ہر چیز وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اس کے اعضاء و جوارح خود اس کے ہر قول و فعل کی گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے نکوما کا تبین اس کے جملہ نیک و بد اعمال و اقوال کی رپورٹ پیش کریں گے، حضرات انبیاء علیہم السلام اور صالحین و مصلحین بھی گواہی دیں گے کہ انہوں نے کیا بتایا اور سکھایا اور لوگوں نے ان کے اور ان کی تعلیمات کے ساتھ کیا سلوک کیا۔



تُتِلَ امَّاخُودٌ الْاُخْدُوْدُ لَا النَّارِ ذَاتِ الْوُجُوْدِ (۵-۴)

یہ مذکورہ قسموں کا جواب نہیں ہے بلکہ سورہ ق اور بعض دوسری سورتوں میں جس طرح جواب منکرین قیامت  
قسم حذف ہو گیا ہے اسی طرح یہاں بھی جواب قسم حذف کر کے اس کی جگہ منکرین قیامت کے لیے کتبہ  
تذکرہ تنبیہ کی آیتیں رکھ دی گئی ہیں۔ یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں جواب قسم اس  
قدر واضح ہو کہ ذکر کے بغیر بھی ذہن اس کی طرف بے تکلف منتقل ہو سکے۔ اس سے کلام میں ایجاز  
بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ساری بات جواب قسم کی حیثیت سے محذوف بھی مانی جاسکتی ہے۔  
جس کے لیے کلام کا سیاق و سباق متفق ہی ہو۔ یہاں مذکورہ قسموں کی روشنی میں مقسم علیہ کو کھولے تو یہ  
ہوگا کہ قیامت شدنی ہے، اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، اس دن ہر  
شخص اپنے کیے کا انجام دیکھے گا۔

’اُخْدُوْدُ‘ کے معنی کھڈ، کھائی اور گڑھے کے ہیں۔ اس کی وضاحت ’النَّارِ ذَاتِ الْوُجُوْدِ‘  
سے فرما دی گئی ہے۔ یعنی یہ گڑھے ایندھن والی آگ سے بھرے ہوں گے۔ ایندھن والی آگ کی صفت  
سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس آگ کے برابر بھڑکتے رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے  
وافر ایندھن فراہم کر رکھا ہے، کوئی یہ تو قن نہ رکھے کہ ایندھن کی کمی کے سبب سے کبھی یہ دھیمی پڑ جائے گی۔  
اس ایندھن کی نوعیت سورہ بقرہ آیت ۲۴ میں یوں واضح فرمائی گئی ہے: ’فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي دُودُهَا  
النَّاسُ وَالْجِبَارُ‘ (پس اس آگ سے بچو جس کے ایندھن لوگ بنیں گے اور پتھر)۔

’اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ‘ کے تحت مفسرین نے ایک بادشاہ کا قصہ نقل کیا ہے لیکن اس کا کوئی نام یا  
زمانہ نہیں بتایا ہے۔ بس اتنا ہی بتاتے ہیں کہ اس نے اپنے دور کے بہت سے باایمان نصاریٰ کو محض  
اس جرم میں آگ کے گڑھوں میں پھینکوا دیا کہ انھوں نے اس کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اہل کتاب  
کی عقائد کی حقیقت کے دور میں ایک دوسرے کو جلدانے کے بعض واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں لیکن خاص  
اس واقعہ سے متعلق مفسرین نے جو عجیب و غریب باتیں نقل کی ہیں وہ کسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں ہیں،  
اس وجہ سے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ یہاں مخاطب، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، قریش کے فراتہ  
ہیں جو کمزور مسلمانوں کو ظلم و ستم کا ہنر بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے مجہول بادشاہ کے انجام سے  
کیا سبق حاصل کرتے جس کا نام تک نہ ان کو معلوم تھا نہ مفسرین کے علم میں ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی قابل  
توجہ ہے کہ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ کے لیے یہاں جو زجر اور وعید ہے وہ آخرت سے متعلق ہے نہ کہ اس  
دنیا سے متعلق۔ اگر اس کو اس دنیا سے متعلق مانیے تو اس سے ان کے ظلم کی ایک ہلکی سی تصویر تو ضرور  
سامنے آتی ہے لیکن ان کا کوئی ایسا عبرت انگیز انجام قرآن نے نہیں بتایا ہے جو قریش کے لیے سبق آموز  
ہو سکتا۔ یہ بات کہ ان کی بھڑکائی ہوئی آگ نے خود ان کو اور ان کی بستیوں کو جلا کر رکھ دیا صرف مفسرین



نے بیان کی ہے۔ قرآن نے کوئی اشارہ اس کی طرف نہیں کیا حالانکہ پیش نظر مقصد کے لیے اصل ظاہر کرنے کی بات یہی تھی۔

ہمارے نزدیک یہ قریش کے ان فراعنہ کو، جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے طرح طرح کی اذیتوں کا تختہ مشق بنائے ہوئے تھے، جہنم کی دیکھ رہے تھے۔ ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس شقاوت سے باز نہ آئے تو وہ جہنم کی اس خندق میں پھینکے جائیں گے جو کبھی نہ بچنے والی آگ سے بھری ہوگی۔  
اَذْهَبْهُمْ عَلَيْهِمْ نُحُودٌ ۚ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ (۷۶)

یہ تصویر ہے ان اشیاء کے انجام کی۔ فرمایا کہ یہ اس وقت کو یاد رکھیں جب وہ اس خندق کے کنارے بیٹھیں گے اور جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے ان کو اس آگ بھری خندق کے کنارے پر بٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنا ٹھکانا دیکھ لیں اور پھر وہ اپنی ایک ایک ظالمانہ حرکت کا مزہ چکھیں گے۔ گریا لفظ شہود یہاں نتیجہ فعل کے مفہوم میں ہے جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مجرم کو اس کا اصل ٹھکانا اگر پہلے سے دکھا دیا جائے اور پھر اس کو اس کا مزہ چکھایا جائے تو اس کا عذاب دونا ہو جاتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ مجرموں کو پہلے جہنم کے کناروں پر بٹھایا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ ان کو کہاں جانا ہے اور پھر ان کو اس میں پھینک دینے کا حکم دیا جائے گا۔ فرعون اور آل فرعون کے متعلق بھی قرآن میں یہ ذکر ہے کہ عالم برزخ سے ان کو صبح و شام دوزخ کی سیر کرائی جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حرف 'اذا' گزرے ہوئے زمانہ کے کسی واقعہ کی یاد دہانی کے لیے آتا ہے اور ہم نے مستقبل میں پیش آنے والی صورت حال کے بیان کے مفہوم میں لیا ہے، لیکن اس شبہ کا ازالہ یوں ہو جاتا ہے کہ قرآن میں احوالِ قیامت کی تفصیل جا بجا ماضی کے صیغوں سے کی گئی ہے جس کی توجیہ علماء نے یہ کی ہے کہ مستقبل کی تعبیر ماضی کے اسلوب میں اس کی قطعیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

وَمَا لَكُمْ مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (۸)

ایمان والوں کی سب سے بڑی نیکی ان اشیاء کے نزدیک ان کا سب سے بڑا جرم ہے جس کے سبب سے نیکی کا وہیں کے دو سر اور تعذیب قرار پائے ہیں۔ ان کو سزا اس گناہ کی دی جا رہی ہے کہ یہ خدائے عزیر و حمید پر نزدیک نہیں ایمان لائے۔ حالانکہ خدا نے عزیر و حمید پر ایمان لا کر اللہ کے ان بندوں نے وہ سب سے بڑا حق فراغت ہے ادا کیا ہے جو ان کے خالق و مالک کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے۔ ان کا یہ اقدام لائقِ اعتراف



اکرام اور قابلِ تقلید تھا نہ کہ سزاوارِ عناد و انتقام لیکن جن کی ست ماری جاتی ہے وہ اپنے خیر خواہوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے دو صفتوں ————— عزیز اور جمید ————— کا حوالہ ہے۔ صفت 'عزیز' اس کی عزت، قدرت، شان اور عظمت و جلال کو ظاہر کرتی ہے اور 'جمید' سے اس کی رحمت، ربوبیت اور سزاوارِ حمد و شکر ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو ذات ان صفات سے متصف ہے وہی حق دار ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ جو اس پر ایمان لائے انھوں نے اس کا سہارا لیا ہے جس کا سہارا ہی اصل سہارا ہے اور وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اس میں ضمناً مظلوم مسلمانوں کے لیے جو بشارت اور ان کے درپے آزار کفار کے لیے جو وعید مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ذَا لَٰكُمُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۹)

یہ مذکورہ بالا بشارت اور وعید دونوں پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جس کی بادشاہی ہے وہی حق دار ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور جو اس پر ایمان لائے ان کے لیے اسی کی پناہ کافی ہے۔

ذَا لَکُمْ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ یعنی جو مسلمان اعدائے ایمان کے ہاتھوں دکھ اٹھا رہے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ان کے مصائب سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تو جب وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو اپنی بادشاہی میں اپنے باایمان بندوں پر اعداء کے ظلم و ستم کو کب تک گوارا کرے گا! ساتھ کفار کے لیے اس میں وعید ہے کہ خدا کی ڈھیل سے مغرور نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ستم رانیوں سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ سارا تماشا دیکھ رہا ہے۔ وہ وقت و در نہیں ہے جب وہ اپنے مظلوم بندوں کا انتقام لے گا اور بھرپور انتقام لے گا۔

لَا تَزِدُ الَّذِينَ ظَلَمُوا إِلَّا سَبْعًا ۚ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثَمَرٌ ۚ لَّيْسَ لَهُنَّ فِي جَهَنَّمَ وَلَا لَهُنَّ فِي جَهَنَّمَ عَذَابٌ مُّحْدِقٌ (۱۰)

وہ جو ظالموں کی سزاوارِ عذاب ہے اس آیت میں وہ بالکل بے نقاب کر دی گئی۔ مسلمانوں کو سزا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانے والے مردوں اور ایمان لانے والی عورتوں کو دین سے پھیرنے کے لیے نشانہ ستم بنائیں گے اور پھر توبہ نہیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے جہنم کا عذاب خاص کر آگ کا عذاب ہے۔

لفظ نقتلہ یہاں خاص کر اس ظلم و ستم کے لیے آیا ہے جو کسی پر اس کے دین سے اس کو پھیرنے کے لیے کیا جائے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں بار بار آیا ہے جس کی وضاحت ہو چکی ہے۔



”مُؤْمِنِينَ“ کے پہلو پر پہلو ”مُؤْمِنَاتٍ“ کا ذکر یہاں خاص اہتمام سے اس لیے ہوا ہے کہ جس دور ابتلا سے یہ آیات متعلق ہیں اس میں سب سے زیادہ ظلم کمزور غصہ ہونے کے سبب سے عورتوں بالخصوص لونڈیوں پر ڈھائے گئے۔ ان ظلم ڈھلنے والوں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ سلامتی مطلوب ہے تو جلد سے جلد توبہ اور اصلاح کر لیں ورنہ یاد رکھیں کہ اسی حال میں اگر ان کا خاتمہ ہوا تو سیدھے جہنم میں اتریں گے۔

”عَذَابُ جَهَنَّمَ“ کے ذکر کے بعد بظاہر عَذَابُ الْجَنَّةِ کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ ”جہنم“ عذاب کی جملہ اقسام و انواع کا مرکز ہے جس میں سب سے بڑا عذاب جلنے کا عذاب ہے۔ گویا ان لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ جہنم کے دوسرے عذابوں کے ساتھ ساتھ ان کو جلنے کے عذاب کا بھی مزہ چکھنا پڑے گا۔ اس انجام کو اچھی طرح سوچ رکھیں۔

رَأَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ (۱۱)

یہ ان اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو ان پر محسن حالات کے باوجود اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ ”فعل“ ”آمَنُوا“ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظالموں کے ان مظالم کے علی الرغم جو اہل ایمان اپنے ایمان پر جمے اور عمل صالح کی روش پر قائم و دائم رہیں گے ان کے لیے بے شک ایسے باغ ہوں گے جن میں نہریں بہ رہی ہوں گی۔

”ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ“ یعنی کوئی اس کامیابی کو معمولی کامیابی نہ سمجھے۔ یہ دائمی اورابدی کامیابی ہے جس کو حاصل ہوگی وہی جلنے کا کہ اس نے چند دنوں کی آزمائشوں کے صلے میں کیسی عظیم بادشاہی حاصل کی۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۚ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِيهِ وَيُعِيدُهُ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الْودودُ ۚ  
ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۚ فَعَالٍ لِّمَا يُرِيدُ (۱۲-۱۳)

ادپر کی آیات میں اہل ایمان کے ننانے والے کفار کو جو دھکیاں اور مظلوم مسلمانوں کو جو بشارتیں دی گئی ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مزید صفات کی یاد دہانی سے ان کو مزید متوجہ و مدلل کر دیا ہے۔

”إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ“ فرمایا کہ تیرے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ کوئی اس مناعہ میں نہ رہے کہ وہ اپنی جماعت و جمعیت یا اپنے شرکا و دشمنوں کے بل پر اس سے اپنے کو بچالے گا۔ اللہ کی پکڑ سے نہ کوئی بچ سکتا نہ اس کو کوئی بچانے والا بن سکتا۔

”رَبِّكَ“ کا خطاب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مانا جائے تو یہ خطاب آپ سے ان مظلوموں کے وکیل کی حیثیت سے ہوگا۔

ثابت قدم  
رہنے والوں  
کو بشارت

مذکورہ باتوں کی  
تائید میں صفات  
اہل کا حوالہ



إِنَّهُ هُوَ يَبْدِئُ وَيُعِيدُ۔ ظالموں کو اوپر جس عذاب جہنم کی دھکی دی گئی ہے یہ اس کی دلیل بیان کر دی گئی ہے کہ کوئی اس معاملہ میں بھی نہ رہے کہ آخرت اور جنات و سزا کا ڈرا و محض ڈرا دیا ہے، مرنے کے بعد نہ کوئی زندگیاں ہے نہ کوئی موت۔ فرمایا کہ خدا ہی ہے جو لوگوں کو اس دنیا میں پیدا کرتا ہے اور جب وہ پیدا کرتا ہے تو وہ از سر نو ان کا اعادہ بھی کر سکتا ہے۔ جب پہلی بار اس کو پیدا کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی تو دوبارہ یہ کام اس کے لیے کیوں مشکل ہو جائے گا؟

وَهُوَ الْغَفُورُ الْودُودُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۖ فَعَالٌ تَبَارِكُ يَعْنِي بَخْشَ وَالْا  
اور محبت کرنے والا تنہا وہی ہے جس کو کو لگائی ہو تنہا اسی سے لگائے۔ کوئی اور نہیں ہے جو کسی کے کچھ کام آئے۔ عرش کا مالک اور عظمت والا وہی ہے۔ کوئی اس کے اقتدار اور اس کی عظمت میں شریک نہیں ہے۔ وہ جو چاہے کر ڈالنے والا ہے۔ نہ وہ کسی کا محتاج ہے نہ کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکتا۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۖ فِرْعَوْنٌ وَثَمُودَ (۱۷-۱۸)

انہی حقائق کو ثابت کرنے کے لیے جو اوپر مذکور ہوئے یہ تاریخ کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ فرما دیا۔ خدا کی پکڑ میں آنے والی جن قوموں کی سرگزشت قرآن نے سنائی ہے ان میں قوم ثمود اور فرعون کے جبر و ظلم اور طغیان و فساد کا ذکر خاص اہتمام سے فرمایا ہے۔ قریش کے لیڈروں پر ان دونوں قوموں کی عظمت و شوکت کی بڑی دھاک تھی۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھ لو، جب خدا نے ان کو پکڑا تو چشم زدن میں وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بن سکا!

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ (۱۹)

اس 'بَل' سے پہلے کلام کا کچھ حصہ بر بنائے قرینہ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری انکار کا اصل بات یوں ہوگی کہ جو کچھ ان کو سنا یا جارہا ہے، ہے تو یہ حرف حرف حق۔ کسی کے لیے بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ قیامت کے منکرین جان بوجھ کر جھٹلانے کے درپے ہیں اور اب ایسی ہرج آپڑی ہے کہ کسی طرح اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ (۲۰)

لفظ ورائے آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جھٹلانے ہی پر بعد ہیں تو اپنی ضد پراٹھ لے رہے ہیں لیکن یاد رکھیں کہ ان کی تکذیب سے حقیقت جھوٹ نہیں ہو جائے گی۔ اللہ ان کے آگے سچے ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔

بَلِ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۖ فِي سُورٍ مُّحْفُوظٍ (۲۱-۲۲)



اس 'بَلْ' سے پہلے بھی بر بنائے وضاحت قرینہ کچھ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ یہ قرآن جس انجام سے تمہیں ڈرا رہا ہے یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ ایک بزرگ و بزر کلام ہے۔ یہ شاعروں اور کاہنوں کے کلام کی طرح کی کوئی ہوائی چیز نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی نازل کردہ وحی ہے اور اس کا منبع لوح محفوظ ہے جس تک کسی جن دانس کی رسائی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

لاہور

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء

۱۸۔ ذوالقعدہ ۱۴۰۰ھ



تذکرہ

۸۶

الطریق







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ کی توام ہے۔ دونوں کا عمود بالکل ایک ہے۔ صرف اسلوب بیان اور پہنچ استدلال الگ الگ ہیں۔ تمہید اور خاتمہ کے پہلو سے بھی دیکھیے تو دونوں میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ آفاق و انفس کے شواہد اور خالق کائنات کی صفات کی روشنی میں یہ حقیقت ان میں مہر بن فرمائی گئی ہے کہ قرآن جس روز جزاء و سزا سے ڈرا رہا ہے اس کو ہنسی مسخری نہ سمجھو۔ یہ ایک اعلیٰ حقیقت ہے۔ اس کے ظہور میں جو دیر ہو رہی ہے تو اس کو تکذیب کا بہانہ نہ بناؤ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے ڈھیل ہے کہ اس کی حجت تمام ہو جائے اور تم اپنا پیما نہ اچھی طرح بھرو۔ خدا کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے اس وجہ سے وہ سرکشوں کو پکڑنے میں عجلت نہیں کرتا۔ لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس کے پنجہ غدا ب سے چھوٹ نہیں سکتا۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے :

(۴-۱) آسمان اور اس کے ستاروں کی شہادت اس بات پر کہ خدا کی نگاہوں سے کوئی چیز بھی اور جہل نہیں۔ اس نے ہر جان پر پیرے بٹھا رکھے ہیں۔ جن ہوں یا انسان سب کی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ جس کو جب چاہے پکڑ سکتا اور سزا دے سکتا ہے کوئی اس کے قابو سے باہر نہیں ہے۔

(۵-۸) منکرین قیامت کو اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت کہ انسان کی خلقت کسی ایسے نایاب جوہر سے نہیں ہوئی ہے جو خدا کی دسترس سے باہر ہو بلکہ وہ پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو اسی کے اندر سے نکلتی ہے۔ جب اسی کے اندر سے ٹپکی ہوئی ایک بوند کو اللہ تعالیٰ اپنی صنعت گری سے انسان بنا دینے پر قادر ہے تو اس کو دوبارہ پیدا کرنے اور اٹھا کھڑے کرنے سے کیوں عاجز رہ جائے گا!

(۹-۱۰) اس حقیقت کا اظہار کہ خدا ہر ایک کے ہر قول و فعل بلکہ دلوں کے بھیدوں اور پس پردہ



رازدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ ایک دن سارے راز پرکھے اور جانچے جائیں گے۔ اس دن کسی کے پاس نہ اس کی اپنی کوئی قوت و جمعیت ہوگی جو اس کے کام آ سکے اور نہ کسی کی سعی و سفارش اس کو کچھ نفع پہنچانے والی بنے گی۔

(۱۱-۱۲) ایک عام آفاقی شہادت کا حوالہ اس امر کے حق میں کہ قرآن جس قیامت سے ڈرا رہا ہے وہ کوئی ہنسی منخری کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جو پیش آگے رہے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس کے لیے تیاری کریں نہ کہ اس کا مذاق اڑائیں۔

(۱۵-۱۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ مخاطبین تمھاری تکذیب کے لیے جو جو چاہیں چل رہے ہیں اس سے مایوس نہ ہو بلکہ ان کو ابھی کچھ دن مہلت دو۔ تمھارے رب نے ان کے لیے استدراج کا جو دام بچھایا ہے یہ اس میں پھنس چکے ہیں۔ ان کا انجام اب ان کے سامنے آیا ہی چاہتا ہے۔



# سُورَةُ الطَّارِقِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۱۷

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ① وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ② النُّجُومُ  
 الشَّاقِبُ ③ إِنَّ كُلَّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ④ فَلْيَنْظُرِ  
 الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ⑤ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ⑥ يَخْرُجُ مِنْ  
 بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ⑦ إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ⑧ يَوْمَ  
 تُبْلَى السَّرَائِرُ ⑨ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ⑩ وَالسَّمَاءِ  
 ذَاتِ الرَّجْعِ ⑪ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ⑫ إِنَّهُ لَقَوْلُ  
 فَصْلٍ ⑬ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ⑭ إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ⑮ وَ  
 أَكِيدُ كَيْدًا ⑯ فَهَلِ الْكَافِرِينَ أَهْلُهُمْ رُويَدًا ⑰

شاید ہیں آسمان اور رات میں نمودار ہونے والے اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہیں  
 رات میں نمودار ہونے والے! دکتے تارے! کہ کوئی جان نہیں کہ اس پر نگہبان

نہیں - ۱ - ۲

انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے! وہ پیدا کیا گیا ہے  
 ذرا سے اچھلتے پانی سے جو نکلتا ہے ریڑھ اور پسلیوں کے بیچ سے۔ بے شک



وہ اس کے لوٹنا سکے پر پوری طرح قادر ہے - ۵-۸

اس دن ساری چھپی باتیں پرکھی جائیں گی تو اس وقت اس کے پاس کچھ زب

نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار - ۹-۱۰

شاہد ہے آسمان، پُر از باران اور زمین، پر شگافت کہ یہ دو ٹوک بات

ہے اور یہ کوئی ہنسی مستحرمی نہیں - ۱۱-۱۲

وہ چل رہے ہیں ایک چال اور میں بھی کر رہا ہوں ایک داؤ۔ تو ان کافروں

کو مہلت دے، ان کو چھوڑ ذرا دیر کو - ۱۵-۱۶



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۚ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۱-۳)

جس طرح سابق سورہ میں برہوں والے آسمان کی قسم کھائی ہے اسی طرح اس سورہ میں آسمان اور اس کے دکتے ستاروں کی قسم کھائی ہے اور یہ قسم، جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، بطور شہادت ستاروں کی قسم اس دعوے پر دلیل پیش کرنے کے لیے کھائی ہے جو آگے آ رہا ہے۔

طَارِقُ کے لغوی معنی تو شب میں آنے والے کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد شب میں نمودار ہونے والے ستارے ہیں۔ اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے 'النَّجْمُ الثَّاقِبُ' کے الفاظ سے کر دی ہے۔

'وَمَا أَدْرَاكَ' کا سوال اس شہادت کی عظمت و اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس شہادت کو معمولی شہادت نہ گمان کرے۔ یہ بہت بڑی شہادت ہے بشرطیکہ غور کرنے والے اس پر غور کریں اور سمجھیں، اس کو مذاق بنانے کی کوشش نہ کریں۔

'النَّجْمُ الثَّاقِبُ' سے کوئی خاص ستارہ مراد نہیں ہے بلکہ جس طرح 'وَالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ' (النحل-۱۶: ۱۶) اور بعض دوسری آیات میں یہ لفظ جنس کے مفہوم میں آیا ہے اسی طرح یہاں بھی یہ جنس ہی کے مفہوم میں ہے۔ البتہ 'ثَاقِبُ' کی صفت سے یہ اشارہ فرما دیا ہے کہ اس سے مراد وہی ستارے ہیں جن کی روشنی از خود ہم تک پہنچتی ہے اور جن کی جستجو کے لیے ہمیں ترقی یافتہ دوربینوں کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ہر دیکھنے والا ان کو دیکھ اور ان سے وہ سبق حاصل کر سکتا ہے جو قرآن یہاں دینا چاہتا ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ ستارے صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنے ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ تو مشنہ نمونہ از خردارے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے کہ کتنے جہان اور کتنے ستارے ہیں!

إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۴)

یہ مقسم علیہ یا اصل دعویٰ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا قسم کھائی گئی ہے۔ لَمَّا کا استعمال یہاں ذرا نادار ہے اس وجہ سے اس کی توجہ میں اہل نحو نے اختلاف کیا ہے ہم اس کی تحقیق سورہ ہود آیت ۱۱۱ اور سورہ زخرف آیت ۳۵ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

ستاروں کی شہادت اس دعوے پر ایک تواس پہلو سے ہے کہ انسان سوچے کہ جس خدا کی مقرر کی ہوئی اتنی ان گنت آنکھیں رات بھر جاگتی اور

ستاروں کی شہادت اس دعوے پر کہ ہر جان پر نگراں مقرر کر رکھے ہیں ایک



ٹکائی لگائے زمین والوں کو گھورتی رہتی ہیں کس کی مجال ہے کہ اس کے دام سے بچ کے نکل سکے یا انس کی ایجاد کردہ بڑی سے بڑی دور بینوں کے اندر بھی وہ طاقت نہیں ہے جو آسمان کے معمولی سے معمولی تاروں کے اندر ہے جن کی روشنی تہ بہ تہ فضاؤں کو چیرتی ہوئی زمین تک پہنچ جاتی ہے۔ جو خدا اپنی قدرت کی یہ شان ہر شب میں ہمیں دکھا رہا ہے اس کے متعلق یہ تصور کہ اس کی نگاہوں سے کوئی چیز بھی اوجھل رہ سکتی ہے صرف اس شخص کے اندر پیدا ہو سکتا ہے جو عقل سے بالکل عاری ہو۔ دوسرا پہلو اس کا وہی ہے جس کی طرف ہم سابق سورہ میں بھی اشارہ کر چکے ہیں اور جو قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے کہ انہی تاروں کے اندر خدا نے لیے برج بنائے ہیں جہاں سے ان شیطن پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے جو خدا کے ممنوعہ حدود میں دراندازی کی جسارت کرتے ہیں۔ تیسرا یہ انتظام اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دنیا بے راہی کا گناہ نہیں ہے بلکہ اس کے چپے چپے پر خدا نے اپنے پرہ دار بٹھا رکھے ہیں جو شب و روز ہر چیز کی نگرانی کر رہے ہیں اس وجہ سے لازماً اس کے بعد ایک یوم الحساب آئے گا جس کے احتساب سے کوئی بھی اپنے کو بچا نہ سکے گا۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۖ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ رَافِقٍ ۖ ثُمَّ يَجْرُجُ مِنَ بَيْنِ اصْصَبِ وَ التَّوَابِ ۚ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ (۵-۸)

یہ اس احساسِ ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہر اس انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے انسان کا وجود خود شاہد ہے کہ جو اس حقیقت کو پا گیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیری نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق ایک چیز پرہ نگاہ رکھے ہوئے ہے اور جب وہ نگاہ رکھے ہوئے ہے تو لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے اٹھا سکتا ہے جس میں نیکوں کے سامنے ان کی نیکی اور بدوں کے سامنے ان کی بدی اپنے حقیقی نتائج کی صورت میں بے نقاب ہو۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۚ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۚ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ رَافِقٍ ۚ ثُمَّ يَجْرُجُ مِنَ بَيْنِ اصْصَبِ وَ التَّوَابِ ۚ

خلقت پر غور کرے تو خدا کی قدرت، حکمت اور اس کی صنعت گری کی ایسی شانیں ظاہر ہوں گی کہ وہ پکاراٹھے گا کہ جو خدا پانی کی ایک حقیر بوند سے اس کو ان اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کر سکتا ہے وہ مرنے کے بعد اس کو دوبارہ اٹھا سکنے پر بھی قادر ہے۔

جزاردن کے منکرین کا سب سے بڑا شبہ یہی تھا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے کو بیدار مکان تصور کرتے تھے۔ ان کے اس شبہ کو دور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ ان کو خود ان کی خلقت پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ سورہ عس میں اسی طرح کے لوگوں کو ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۚ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ رَافِقٍ ۚ ثُمَّ يَجْرُجُ مِنَ بَيْنِ اصْصَبِ وَ التَّوَابِ ۚ



شَيْءٌ خَلَقَهُ مِنْ نُّطْقَةٍ  
خَافَهُ فَقَدَرَهُ لَا تَعْلَمُ السَّيْلَ  
بَيْتَهُ لَا تَعْلَمُ أَمَاتَهُ فَأَخْبَرَهُ لَا  
تَعْلَمُ إِذَا شَاءَ النَّشْرَهُ ۝

نئے کس چیز سے پیدا کیا، پانی کی ایک بوند سے  
اس کو پیدا کیا، پھر اس کے لیے ایک  
اندازہ ٹھہرایا، پھر اس کے لیے راہ آسان کی  
پھر اس کو موت دی اور اس کو قبر میں رکھوایا۔

(عبس - ۱۷۸ - ۲۲)

لَخَلْقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ لَا تَخْرِجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ: یہ اس پانی کی نوعیت  
اس کے خروج کی صورت اور اس کی جگہ کے حد درجہ کی وضاحت فرمادی تاکہ انسان پر یہ حقیقت واضح  
ہو جائے کہ یہ پانی نہ کوئی جوہر نہایا ہے اور نہ یہ کسی ایسی ولایت سے آتا ہے جو خدا کی خدائی  
کے حدود سے باہر ہو بلکہ انسان ہی کی ریڑھ اور اس کی چھاتیوں کے بیچ سے اچھلتا ہے اور قدرت  
اسی کو اپنے سانچے میں جس شکل و صورت پر چاہتی ہے ڈھالتی ہے اور پھر اس کو لطف مادر سے  
باہر لاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی اس عظیم قدرت و حکمت کا مشاہدہ ہر شخص خود اپنے وجود  
کے اندر کر رہا ہے کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ زندہ کرنا ناممکن ہو جائے گا! اسی حقیقت کی طرف  
سورۃ انفطار میں یوں توجہ دلائی ہے:

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا  
غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ  
الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ  
فَعَدَلَكَ لَا فِي أَعْيُنِ  
صُورَةٍ مَّا شَاءَ وَكَبَدَهُ  
كَلًّا بَلْ تُكْذِبُونَ  
بِالْبَيِّنِ ۝

اے انسان، تجھے تیرے اس رب کریم کے باب  
میں کس چیز نے غلطی میں ڈال رکھا ہے؟ جس  
نے تیرا خاک بنایا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے  
اور تجھے بالکل ٹھیک ٹھاک کیا، اور جس شکل  
پر چاہا تجھے مشکل کر دیا! (اس خدا کی قدرت  
کے باب میں کسی شک کی گنجائش ہرگز نہیں  
ہے لیکن تم جزام و سزا کو جھٹلانا چاہتے ہو)

(الانفطار - ۸۲: ۶-۹)

إِنَّهُ عَلَىٰ دَجْبِهِ لَفَاعِدٌ: یعنی جس خدا نے انسان کو پیدا کرنے میں اپنی قدرت و حکمت کی  
یہ شانیں دکھائی ہیں وہ اس کے مہیپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی ضرور قادر ہے۔  
دَجْبِهِ: میں ضمیر کا مرجع انسان ہے جس کو آیت فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ (ہم خلیق (ہم) میں غور کرنے کی دعوت  
دی گئی ہے۔ یہ امر یہاں واضح ہے کہ اگرچہ لفظ عام استعمال ہو رہا ہے لیکن اصل روئے سخن قریش ہی  
کی طرف ہے جو اس قسم کے لاطاعی شبہات پیدا کر کے قرآن کے انداز کو غیر موثر بنا دیتا چاہتے تھے۔

يَوْمَ تُسْأَلُ السُّورَةُ (۹)



آخوت کے اس دن جس طرح کے احتساب سے لوگوں کو سابقہ پیش آئے گا یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا  
 امتساب کہ اس دن مخفی باتیں بھی جانچی اور پرکھی جائیں گی۔ یعنی صرف ظاہری اقوال و اعمال ہی زیر بحث نہیں  
 نوعیت آئیں گے بلکہ مخفی اعمال، دلوں کے کھوٹ اور نیتوں کے فساد بھی پرکھے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے  
 پاس ایسے آلات ہیں جو مخفی سے مخفی گوشوں میں کیے ہوئے اعمال و اقوال کا بھی کھوج لگالیں گے  
 اور ہر عمل کو پرکھ کر بتا دیں گے کہ کس کے اندر کتنا کھوٹ ہے اور کتنا اخلاص ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے  
 کہ اس دن آدمی کے اعضاء و جوارح بھی ان تمام اعمال کی گواہی دیں گے جو انسان نے کیے ہوں گے  
 توجب اعضاء و جوارح بھی گواہ بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے تو کسی راز کے راز رہنے کا کیا امکان  
 باقی رہا۔

فَمَالَهُ مِنْ قُوَّةٍ دَلَا نَاصِرٍ (۱۰)

اس دن آدمی کے پاس نہ اس کی اپنی ذاتی قوت ہوگی جس سے وہ مدافعت کر سکے اور نہ اس  
 کے اعوان و انصار اور شُرکاء و شفعاء میں سے کوئی اس کی حمایت کے لیے اٹھے گا۔ ہر ایک کا ظاہر و  
 باطن کھلی کتاب کی طرح سامنے ہوگا اور صرف خدا نے علیم و خبیر ہی کا فیصلہ ہے چون و چرا ناذ ہوگا۔  
 وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۚ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدُوعِ (۱۱-۱۲)

حیات بعد الموت

ادھر حیات بعد الموت اور روز جزا پر انسان کی خلقت سے شہادت پیش کی ہے۔ اب

پر ماقی شہاد

اسی دعوے پر ایک آفاقی دلیل کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

رَجْعٌ کی تشریح اہل لغت نے 'المطر بعد المطر' سے کی ہے۔ یعنی وہ بارش جو یکے بعد  
 دیگرے ہوتی اور زمین کو زندگی و شادابی بخشتی ہے۔

'صَدُوعٌ' کے معنی پھٹنے کے ہیں۔ یعنی جب بارش ہوتی ہے تو زمین کے مسامات کھل جاتے  
 ہیں اور وہ پانی جذب کر کے پھول جاتی اور دیکھتے دیکھتے لہلہا اٹھتی ہے۔ اگرچہ یہاں لہلہا اٹھنے کا  
 ذکر نفلوں میں نہیں ہے لیکن قریبہ اس پر دلیل ہے۔ اسلوب تمبیہ ہے اس وجہ سے بات اشاروں  
 میں کہہ دی گئی ہے۔

قرآن کے دوسرے مقامات میں مختلف اسلوبوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ مرنے کے  
 بعد لوگوں کو از سر نو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جو لوگ اس بات میں شک  
 کر رہے تھے اُن کو ملامت کی گئی ہے کہ تم ایک ایسی بات میں شک کر رہے ہو جس کا مشاہدہ آنے والے  
 تمہیں ہوتا رہتا ہے۔ سورۃ انبیاء میں اسی طرح کے شک کیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ السَّحَابَ أَتًا ۖ

کیا جنہوں نے قیامت کا انکار کیا انہوں نے

نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند



وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۝

ہوتے ہیں پس ہم ان کو کھول دیتے ہیں اور

ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔

(الانبیاء: ۲۱-۲۰)

اس آیت کی تفسیر اس کے محل میں دیکھ لیجیے۔ آسمان وزمین کے بند ہونے سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ نہ آسمان سے پانی برستا نہ زمین سبزہ اگاتی لیکن جب اللہ تعالیٰ آسمان کے دریچے کھول کر پانی برسا دیتا ہے تو زمین بھی اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا زمین سے ان سارے لوگوں کو زندہ اٹھا کرے گا جو اس میں دفن ہیں۔

إِنَّهُ نَقُولُ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ إِلَّا هَزْلٌ (۱۳-۱۲)

جس طرح سابق سورہ کے آخر میں کذب میں قیامت کو متنبہ فرمایا ہے کہ قرآن کے اس انذار کا مذاق کذب میں قیامت نہ اڑاؤ، یہ لوح محفوظ سے اترا ہوا نہایت برتر کلام ہے، اسی طرح اس سورہ کے آخر میں بھی ایک تنبیہ نئے اسلوب سے آگاہ فرمایا کہ یہ قرآن جس روز حساب سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے وہ ایک امر قطعی اور اٹل ہے جس سے تمہیں لازماً سابقہ پیش آنا ہے تو اس کو مذاق کا موضوع نہ بناؤ بلکہ دانشمندی اور عاقبت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو توجہ سے سنو، سمجھو اور آنے والے دن کی تیاری کرو۔

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ وَأَكِيدُ كَيْدًا (۱۵-۱۶)

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلل دی گئی ہے کہ تمہارے انذار کا مذاق اڑانے کے لیے بگ جو پیغمبر صلعم سخن سازیاں کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں فی الواقع کچھ شبہات ہیں جو کسی جواب کو تسلل یا کوئی معجزہ دکھا دینے سے دور ہو جائیں گے۔ یہ شبہات محض حقیقت سے فرار کے لیے گھڑے جا رہے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ نہ یہ خود تمہاری بات بانیں نہ اپنے عوام کو ماننے میں تاکہ ان کی سیادت قائم رہے اور اپنی جن خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں بدستور ان کی پیروی کرتے رہیں۔

وَإَكِيدُ كَيْدًا ۝ فرمایا کہ ان کی اس چال کے توڑ کے لیے میں بھی ایک چال چل رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ان کو پکڑنے میں جلدی کرنے کے بجائے ان کو ڈھیل دے رہا ہوں تاکہ یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور جب پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ نادان اس ڈھیل کو اپنی کامیابی گمان کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ خدا کے استدراج کے پھندے میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ جتنی ہی ان کی رسی دماز ہو رہی ہے اتنی ہی اس کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ یہ گویا اسی بات کی دوسرے الفاظ میں وضاحت ہے جو سابق سورہ میں وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مَحِيطٌ (البروج: ۴۵) کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔

فَمَهْلِكُ الْكَافِرِينَ أَمْهَلُهُمْ زَوِيدًا (۱۷)

یعنی جب یہ ہر طرف سے اللہ تعالیٰ کے گھیرے میں ہیں تو خواہ ان کو کتنی ہی ڈھیل ملے اس بات



کاکڑی اندیشہ نہیں ہے کہ یہ خدا کی گرفت سے باہر نکل جائیں گے تو تم بھی ان کو ڈھیل ہی دو یعنی ان کے طعنوں اور مطالبات سے ہٹ کر یہ متنا نہ کرو کہ اب ان کو کوئی نشانہ عذاب دکھا ہی دی جائے یا سہ سے ان کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔

’اُمِّ الْوَدَّیْدُ‘: یہ اور کے ٹکڑے ہی کی وضاحت ہے کہ اس ڈھیل سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی غیر محدود مدت کے لیے ان کو ڈھیل دی جائے بلکہ بس ذرا سی ان کی رسی درا کر دی جائے تاکہ جو کلیں یہ کرنی چاہتے ہیں کر لیں بالآخر تو ان کو اپنے انجام سے دوچار ہونا ہی ہے۔

یہاں کلام کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ڈھیل دینے کی ہر ایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی جا رہی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اب ان کی قسمت کی باگ و راصل پیغمبر ہی کے ہاتھ میں خدا نے دے دی ہے۔ البتہ وہ پسند یہ فرماتا ہے کہ پیغمبر ان کو فوراً سی ڈھیل مزید دے دیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ **فَاتَّخَذَ اللَّهُ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ**۔

לקי

۲۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء

یکم ذی الحجه ۱۳۹۱



تذکرہ قرآن

۸۶

الاعلیٰ







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ————— الطارق ————— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین صبر و انتظار پر ختم ہوئی ہے۔ آپ کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو رگ تمہاری تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے استدراج کے پھندے میں پھنس چکے ہیں، اب ان کے دن گنتی کے ہیں جو وہ پورے کر رہے ہیں۔ ان کو تھوڑی سی مہلت اور دور ان کے طغیان کا انجام ان کے سامنے آیا ہی چاہتا ہے۔ اطمینان رکھو کہ یہ خدا کے قابو سے باہر نہیں جاسکتے۔ وہ ہر طرف سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اب اس سورہ میں قریش کے ہٹ دھرموں سے صرف نظر کر کے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا ہے اور آپ کو یہ بشارت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہے اور یہ ترتیب و تدریج تمام تر اس کی حکمت پر مبنی ہے تو اپنے رب پر بھروسہ رکھو۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہاری سعی بامراد اور اللہ کی نعمت تم پر تمام ہوگی اور راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ خطاب کی یہ تبدیلی آگے کی سورتوں میں (کم از کم دس سورتوں تک) نمایاں ہے۔ ان میں مخالفین سے کوئی بات کہی گئی ہے تو ضمناً۔ اصل خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے اور مختلف اسلوبوں سے آپ کی وہ تمام الجھنیں دور فرمائی گئی ہیں جو دعوت کے اس مرحلے میں پیش آئیں یا جن کے پیش آنے کا امکان تھا۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے :

(۱-۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی براہر تسبیح کرتے رہنے کی ہدایت اور اس کی ان

صفات کی یاد دہانی جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اس کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدریج ہوتی ہے۔

جس طرح زمین کی نباتات آہستہ آہستہ ہی گنجان دسر بن رہتی ہیں اسی طرح انسان کی جسمانی و عقلی

صلاحیتیں بھی تدریج کے ساتھ ہی کمال کو پہنچتی ہیں۔



(۸-۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کہ قدرت کے اسی قانون کے مطابق آپ کے ساتھ بھی معاملہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی جولعت، وحی کی صورت میں نازل ہو رہی ہے وہ درجہ بدرجہ نازل ہوگی اور اس اہتمام کے ساتھ آپ کو تعلیم دی جائے گی کہ اس چیز کے سوا جس کو اللہ ہی نظر انداز کرتا ہے آپ ایک حرف بھی نہ بھولیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر مہر و ملائکہ سے باخبر ہے۔ آپ کو جن حالات سے سابقہ ہے یا پیش آئے گا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف ہے مشکلات کے اندر سے آپ کے لیے آسان راہ وہ نکالے گا۔

(۹-۱۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ فدیوں اور ہٹ دھرموں کے زیادہ دوسرے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو سنا نہیں چاہتے ان کو سنانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ صرف وہ نہیں گے جو اللہ اور آخرت سے ڈرنے والے ہیں۔ جو مہر و قسمت ہیں وہ اس سے گریز ہی کریں گے اور اپنا انجام دیکھیں گے۔

(۱۴-۱۵) ان خوش بختوں کو بدی نائنہ المرامی کی بشارت جنہوں نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے رب کو یاد کیا اور اس کی نماز پڑھی۔

(۱۶-۱۹) کفار کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ تمہاری اصل بیماری یہ ہے کہ تم دنیا کی زندگی اور اس کی لذات کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو اس وجہ سے تمہارے دلوں میں پیغمبر کی باتیں نہیں اترتی ہیں۔ حالانکہ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔ تمام اگلے بیوں اور صحیفوں کی تعلیم یہی ہے۔



سُورَةُ الْأَعْلَى

مَكِّيَّةٌ ————— آیات ۱۹۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

[illegible]

اپنے خداوند برتر کے نام کی تسبیح کر جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پہنک سناوے۔  
جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی اور جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو گھنٹی

سر سبز و شاداب بنایا - ۱ - ۵



ہم تمہیں پڑھائیں گے تو تم نہیں بھولو گے مگر وہی جو خدا چاہے گا۔ وہ جانتا ہے علانیہ کو بھی اور اس کو بھی جو چھپا ہوتا ہے۔ اور ہم تمہیں لے چلیں گے آسان

راہ - ۵ - ۶ - ۸

پس تم یاد دہانی کرو اگر یاد دہانی کچھ نفع پہنچائے۔ فائدہ اٹھالے گا وہ جس کو ڈر ہوگا اور گریز کرے گا وہ جو بد بخت ہوگا۔ وہ پڑے گا بڑی آگ میں۔ پھر نہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا۔ ۹ - ۱۳

کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے خداوند کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔ ۱۴ - ۱۵

پر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور پائدار ہے۔ یہی تعلیم اگلے صحیفوں میں بھی ہے۔ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں - ۱۶ - ۱۹



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ (۱)

ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ لفظ تَسْبِيحُ میں تزیین کا پہلو غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ہی تمام علم و معرفت اور تمام قوت و اعتماد کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو انسان صحیح معرفت کی راہ سے ہٹ جاتا اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ اس کا دل بے پروا ہو کر نیکوئی کی نعمت، طمانیت و شرح صدر کے نور اور عزیمت و استقامت کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی یاد دہی ہے جو دل کو پا برجا اور مستقیم و مطمئن رکھتی ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد-۱۳: ۲۸)۔

تَسْبِيح کی سب سے اعلیٰ اور معیاری شکل تو جیسا کہ ہم جگہ جگہ بیان کر چکے ہیں، نماز، بالخصوص شب کی نماز ہے لیکن جس طرح سانس انسان کی مادی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یاد اس کی روحانی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے۔ اس وجہ سے صرف نمازوں کے اوقات ہی نہیں بلکہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنا چاہیے تاکہ شیطان کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہ ملے۔ سورہ مزمل کی آیت اِنَّ لَدَفِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا کے تحت اس حقیقت کی ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت صبر و استقامت کے حصول کے لیے فرمائی گئی ہے اس وجہ سے یہ اپنے جامع مفہوم ہی میں ہے۔

الَّذِي خَلَقَ فَسُوَّىٰ (۲)

اب اس آیت اور آگے کی چند آیات میں خدائے بزرگ کی چند صفات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں ایک ترتیب و تدبیر ہوتی ہے جو یکسر اس کام میں ایک تدبیر کی حکمت پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں صبر و استقامت کے ساتھ لگا رہے اور یہ امید رکھے کہ جس راہ پر چلنے کا اس نے حکم دیا ہے اس کی آخری منزل کی حکمت پر مبنی اپنی تمام برکتوں کے ساتھ، بالآخر آگے رہے گی۔ اس میں جو دیر ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہوگی ہوتی ہے اور جو مشکلیں پیش آئیں گی ان کے اندر بھی دنیا اور آخرت دونوں کی مصلحتیں مضمر ہوں گی۔

خَلَقَ کے معنی تو پیدا کرنے کے ہیں لیکن کسی چیز کا خاکہ یا پتلا بنانے کے معنی میں بھی یہ آیا خلق



ہے، مثلاً اِنِّیْ اَخْلَقْتُ نَسَمًا مِّنْ اَطْنَبِیْنِ کَهَيْتُهُ الْعَطِیْرَ فَاَنْفَعُ فِیْہِ فِیْکُوْنُ طَیْبًا یَّادُوْنِ اللّٰہِ (ال عمران - ۴۹۱۳) (میں نے اس کے لیے پندے کی شکل پر ایک پتلا مٹی سے بناؤں گا پھر اس میں پھونک دوں گا تو اللہ کے حکم سے وہ سچ پچ پرندہ بن جائے گا) یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔

تَسْوِیْۃ کے معنی ہیں کسی شے کو ٹھیک ٹھاک کرنا، اس کو ہموار کرنا، اس کے لوک پاک ستوارنا۔ یہاں تربیت دینا ہے کہ یہ اس آخری مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اپنی جبلت ہی پر غور کرے تو اس کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یک یک نہیں بنا کر رکھا ہے بلکہ اس نطفے کو گہر بنانے تک بہت سے مرحلوں سے گزارنا پڑا ہے۔ ایک دودھ ہوتا ہے جب اس کا ابتدائی خاکہ بنتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ دور آتا ہے جب قدرت اس خاکے میں رنگ بھرتی اور اس کا موقلم اس کے لوک پاک ستوارتا ہے۔

وَالَّذِیْ قَدْ رَفَعَدٰی (۳)

یہی حال اس کی لوتوں اور صلاحیتوں کے نشوونما اور اس کے مادی و عقلی عروج کمال کا بھی ہے۔ قدرت نے اس کی زندگی کو جن چیزوں کا محتاج بنایا ہے ان کے تقاضے بھی اس کے اندر رکھے ہیں اس کے اسباب بھی فراہم کیے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کا اس کو سلیقہ بھی الہام فرمایا ہے مثلاً بچے کو دودھ کا محتاج بنا دیا ہے تو اس کی ماں کی چھاتی میں دودھ بھی پیدا کیا ہے اور پھر بچے کو یہ رہنمائی دی ہے کہ وہ ماں کی چھاتی کو چومے اور اس سے اپنی غذا حاصل کرے۔

بعد کے دور میں جب اس کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے تو ہر ضرورت کے لیے زمین میں ذخیرے محفوظ ہیں اور خالق نے انسان کو عقل دی ہے کہ وہ ان ذخائر کا سراغ لگائے ان کے حاصل کرنے کی راہیں کھولے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے ایجاد کرے۔

اسی طرح اس کی روحانی و اخلاقی ترقی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ذخیرہ و لہر کا شعور و ولایت فرمایا ہے اور پھر اس کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا کہ وہ بتائیں دیکھائیں کہ زندگی کا کون سا طریقہ اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اور اس کے اختیار کرنے میں اس کی فلاح ہے اور کون سا طریقہ اس کی فطرت سے بے جوڑ اور اس پر چلنے میں اس کی تباہی ہے۔

ولادت سے لے کر موت تک زندگی کے سارے مراحل و مقامات، تمام اطوار و ادوار اور حمد امتیازات و عقبات بھی اللہ تعالیٰ نے مقدر فرما دیے ہیں جولاڑا پیش آکے رہتے ہیں۔ پھر ان سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ بھی اس نے بتا دیا ہے۔ اگر انسان وہ طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کا سفید خیانت پر منجھ ہار سے سلا متی کے ساتھ گزرتا ہے اور اگر وہ اس سے ہٹ کر اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ جاتا ہے تو یہ چیز اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ وَالَّذِیْ قَدْ رَفَعَدٰی کے دو



لفظوں کے اندر یہ تمام معانی مضمون اور ان کی تفصیل بہت طویل ہے جس کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔  
سورہ طہ کی آیت ۵۰: قَالُوا رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ فَتَنْهَدِیْ كُنُوزَہُمْ اَسْمًا  
مضمون کی وضاحت کر چکے ہیں۔

قَالُوا رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ فَتَنْهَدِیْ كُنُوزَہُمْ اَسْمًا (۵۰-۵۱)

اس ٹکڑے میں ایک ادبی اشکال ہے اس کو پہلے سمجھ لیجیے تب اس کا صحیح موقع و محل واضح ہوگا۔  
اشکال کا محل

عُشَّاءُ اَحْوٰی کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے کالا کوڑا یا سیاہ غص و خاشاک کہا ہے لیکن عربی میں لفظ  
'عُشَّاءُ' تو بے شک جھاگ اور غص و خاشاک کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن 'اَحْوٰی' ہرگز اس سیاہی کے  
لیے نہیں آتا جو کسی شے میں اس کی کھنگی، بوسیدگی اور پامالی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ  
اس سیاہی مائل سرخی یا سبزی کے لیے آتا ہے جو کسی شے پر اس کی تازگی، شادابی، زرخیزی اور  
جوش و خروش کے سبب سے نمایاں ہوتی ہے۔ یہ نباتات اور جانوروں کی صفت کے طور پر کثرت استعمال ہوا  
ہے اور بلا استثنا ہر جگہ ان کی سرسبزی کی شدت اور گھنے پن کو ظاہر کرنے ہی کے لیے استعمال ہوا  
ہے۔ پھر ہمیں سے بطور استعارہ یہ سڑیل، صحت مند گل، ترکی صورت کھلے ہوئے جوان کے لیے بھی استعمال  
ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن کی صحت بہت اچھی اور ان کے بدن میں خون وافر ہو ان کے ہونٹوں پر  
سیاہی مائل سرخی نمایاں ہو جاتی ہے چنانچہ مشہور جاہل شاعر تابلہ شرا اپنے ممدوح کی تعریف میں  
کہتا ہے: اع

مَسْبِلٌ فِي الْحَيِّ اجْوٰی رَفْلٍ وَاِذَا اِنْخَضَ وَافِلِيْثٌ اَبْلٍ

ایوں تبید کے اندر تو وہ ایک خوش پوش، سرخ و سپید بالکا چھبیدا بنا رہتا ہے لیکن جب

میدان جنگ میں اترتا ہے تو تھیں نیتاں بن جاتا ہے

لفظ 'عُشَّاءُ' اگرچہ مکھن کے جھاگ اور سیلاب کے غص و خاشاک کے لیے بھی آتا ہے لیکن اس سبب  
کے لیے بھی اس کا استعمال معروف ہے جو زمین کی زرخیزی کے سبب سے اچھی طرح گھنا اور سیاہی مائل  
ہو گیا ہو۔ اسنادا نام فراہم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس کی تائید میں شعر لکھے  
جاہلیت کے متعدد شعراء لکھے ہیں۔ ہم بقید اختصار صرف قطامی کا ایک شعر جو اس نے ایک اودی  
کی تعریف میں کہا ہے، پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: اع

حَلَوًا بِاَخْضَرٍ قَدْ مَالَتْ سِرَاتُہُ مِنْ ذٰی عُشَّاءٍ عَلٰی الْاَعْرَاضِ الضَّادِ

(وہ ایک سرسبز و شاداب وادی میں اترے جس کے نیچے گھنے اور شاداب ہنرے اس کے

کناروں پر باہم دگر گھم گھماتا اور ایک درمے پر نہ بے گھرے ہوئے تھے)



آیت زیر بحث میں چونکہ 'مُتَشَاكِلٌ' کی صفت 'اَحْوٰی' آتی ہے اس وجہ سے لازماً یہ اس دوسرے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے ورنہ صفت اور موصوف میں نہایت بھونڈی قسم کی بے ربطی پیدا ہو جاتے گی اس لیے کہ 'اَحْوٰی' جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس سیاہی کے لیے ہرگز نہیں آتا جو کسی چیز میں اس کی کہنگی، فرسودگی اور پامالی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ کلام عرب میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں موقع کلام بھی، جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے، اس مفہوم سے آباد کر رہا ہے۔

پس 'الَّذِي اَخْرَجَ الْمَرْعٰى فَجَعَلَهُ نَجًا وَّ اَحْوٰی' کا صحیح مطلب یہ ہو گا کہ اس خداوند کی تسبیح کر دو جن باتوں کو زمین سے نازک سوئیوں کی شکل میں نکالتا ہے پھر ان کو گھٹی اور سیاہی مائل سرسبز و شاداب بناتا ہے۔

سَقُوْنُكَ فَلَا تَنْسٰی ؕ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ط اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْغُوْیَّ وَمَا يَخْفٰی (۶-۷)

یہ وہ اصل مدعا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھانے کے لیے اوپر کی تمہید بیان ہوئی ہے۔ یعنی قدرت کا جو قانون تدبیر و ترتیب انسان کے خلق اور اس کی تکمیل میں، قوتوں اور صلاحیتوں کو مقدر کرنے اور ان کو بروئے کار لانے میں، سبزے کو اگانے اور اس کو پردان چڑھانے میں کار فرما ہے اسی قانون کے تحت اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ بھی معاملہ کرے گا۔ اس نے تمھیں جس منصب پر مرفراز فرمایا ہے اور جس وحی آسمانی سے نوازا ہے اس کے موطن بالترتیب طے ہوں گے اور بلودہ وقت آئے گا کہ تم دیکھو گے کہ جس راہ پر تمھیں چلنے کا حکم دیا گیا اس کے تمام عقبات طے ہو گئے اور آخری منزل آگئی۔

سَقُوْنُكَ فَلَا تَنْسٰی ؕ یہ آیت بالکل اسی محل میں آئی ہے جس میں سورہ طہ کی آیت ۱۱۱،

لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّقُوْلَ اِلَیْكَ وَحِیْہٖ ؕ یا سورہ قیامہ کی آیت ۱۶ اَلَا نَحْمَدُکَ بِمَا نَسَآئُکَ

لِتُعْجَلَ بِہٖ آئی ہیں۔ ہم ان آیات کے تحت نہایت تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ دعوت کے اس دور

میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن مخالفتوں اور مزاحمتوں سے سابقہ تھا ان میں آپ کے لیے واحد سہارا

وہ آسمانی کمک ہی تھی جو وحی الہی کی صورت میں آپ پر نازل ہوئی۔ اسی سے آپ کو قوت و عزیمت

کا زادِ راہ ملتا، اسی سے آگے کے لیے رہنمائی حاصل ہوتی، اسی میں مخالفین کے اعتراضات و

مطالبات کے جواب ہوتے۔ ان گناہوں و جوبہ سے آپ کو ہر وقت وحی کا انتظار رہتا اور جب وہ

ملہ تم قرآن کے لیے اپنی طرف اس کی وحی پوری کیے جانے سے پہلے جلدی نہ کرو۔

ملہ تم جلدی کے خیال سے قرآن کے پڑھنے پر اپنی زبان نہ چلاؤ۔



نازل ہوتی تو اس کے اخذ کرنے میں آپ تدبیراً اس بے قراری اور اضطراب و عجلت کا اظہار کرتے ہو ایک بھوکا بچہ اس وقت کرتا ہے جب ماں اس کو چھاتی سے لگاتی ہے۔ فرط شوق میں آپ چاہتے کہ پوری دھجی ایک ہی سانس میں آپ کے سینہ میں اتر جائے اور چونکہ یہ غایت کائنات کی ایک عظیم امانت بھی تھی جو آپ کی تحویل میں دی جا رہی تھی اس وجہ سے آپ اس کا حرف حرف اپنی زبان مبارک سے دہراتے بھی کہ مبادا کوئی لفظ حافظہ کی گرفت سے باہر رہ جائے۔

آپ کے اس اضطراب و شوق اور اس عجلت و بے قراری پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اس دھجی کے لیے تم جلد بازی نہ کرو۔ اس کے اترنے کے لیے جو ہر دگرگام ہم نے مقرر کیا ہے اسی کے مطابق یہ اترے گی اور اسی میں مکت و سلامت ہے۔

ساتھ ہی یہ تسلی بھی دے دی کہ اس کی حفاظت کے لیے بھی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کا ایسا سامان کرے گا کہ تم اس میں سے ایک حرف بھی نہیں بھولو گے۔ سورہ قیامہ میں یہی بات یوں فرمائی ہے :

لَا تُحَدِّثْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ  
بِهِ ثَرَاتٌ عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَذُرَاتُهُ  
يَا ذَا قُرْآنَهُ ذَاتِجِ قُرْآنَهُ  
فُحْرَانٌ عَلَيْنَا بَيَانُهُ  
القیسۃ - ۱۷ : ۱۶ - ۱۵

تم عجلت کے خیال سے اس پر زبان نہ چلاؤ۔  
ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھ  
کر سنانا تو جب ہم اس کو پڑھ کے سنا دیں  
تو اس سنائے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی  
ذمہ ہے اس کی وضاحت۔

اَلَا مَا بَشَاءُ اللّٰهُ یعنی اس کلیہ سے مستثنیٰ صرف وہ چیزیں ہیں جو وقتی اور منہگامی نوعیت کی ہیں۔ ان کی مدت پوری ہو جانے کے بعد خود اللہ تعالیٰ ہی تبادے گا کہ ان کی مدت پوری ہو گئی۔ یہ اشارہ ان احکام کی طرف ہے جو وقتی اور عارضی تھے اور جو بعد میں منسوخ ہو گئے۔

اِنَّهُ يَعْلَمُ الْغُيُوبَ مَا يَخْفٰی یعنی یہ گمان نہ کرو کہ تم جن حالات و مسائل سے دوچار ہو تمہارا  
رب ان سے بے خبر ہے۔ وہ بے خبر نہیں ہے بلکہ ان باتوں کو بھی وہ جانتا ہے جو ظاہر ہیں اور  
ان باتوں سے بھی آگاہ ہے جو پوشیدہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری پریشانیاں اور دعائیں سبھی اس  
کے علم میں ہیں اور دشمنوں کی کھلی ہوئی شرارتیں اور ان کی مخفی سازشیں بھی اس کے علم میں ہیں تو جب  
سب کچھ اس کے علم میں ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت اور اختیار رکھتا ہے تو اطمینان رکھو  
کہ تمہیں جس قسم کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہوگی اس سے محروم نہیں رہو گے۔ یہی مضمون سورہ طہ میں  
اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ فرمایا ہے :

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اس کے اختیار میں ہے جو آسمانوں اور زمین میں



وَمَا بَيِّنُهُمَا وَمَا تَحْتِ الْمَثَرِيَّةِ  
وَأَنْ تَبْعَهُمْ بِأَتَقُولُ فَإِنَّهُ  
يُخْلِكُ الْمَيِّتَ وَيَا خَلْقُ  
(طہ - ۲۰ : ۶ - ۷)

اور ان کے درمیان اور جو کچھ زیر زمین ہے وہ  
میں چاہے تم بند آواز سے بات کہو یا پرشیدہ  
طور پر وہی ہر پرشیدہ اور پرشیدہ تر باتوں  
کو بھی جانتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح توکل و اعتماد اس کے محیط کل علم اور اس کی ہمہ گیر قدرت  
کے استحضار ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

وَلْيَسِّرْ لَكَ الْيُسْرَى (۸)

یہ نہایت واضح لفظوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت ہے کہ یہی دن سہیلہ نہیں رہیں گے بلکہ  
ہم اسی مشکلات سے نکال کر جلد تمہیں آسان راہ پر لے چکیں گے۔ 'یُسْرَى' صفت ہے جس کا مروت  
'طَرِيقَةُ' یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ مذکور ہے۔ لفظ 'تیسیر' کی وضاحت اس کے فعل میں ہو  
چکا ہے کہ یہ کسی چیز کو کسی برتر مقصد کے لیے تیار کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس سے یہاں یہ اشارہ  
نکلتا ہے کہ اس وقت تم جن مشکلات میں ہو یہ تمہاری تربیت کے لیے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے  
ان افضال و عنایات کا اہل اور حق وار بنائے جن سے تمہیں مستقبل میں وہ بہرہ مند فرمائے والا ہے۔  
اور 'قَدْ فَهِدَى' اور 'أَخْرَجَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهَا فَبَعَلَهُ مُنْكَأً وَخَوَسَى' میں اپنی جس سنت کی طرف  
اشارہ فرمایا ہے یہ اسی کا اقتضا و بیان ہوا ہے کہ اس وقت راہ میں جو عقبات مائل ہیں وہ  
سنت الہی کے تحت بغرض امتحان و تربیت ہیں۔ آگے راہ صاف ہے۔ اپنے رب کی رہنمائی  
پر بھروسہ رکھو۔ یسر کی منزل عسر کے بعد ہی آتی ہے۔

فَكَذَّبُوا بِتِلْكَ الْكَذِبِ (۹)

یعنی لوگوں کی مخالفتوں اور ناقدریوں سے بد دل اور مایوس نہ ہو۔ لوگوں کے دلوں میں بات  
اتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے کہ ان کے پیچھے پڑو۔ تمہارا فرض صرف تذکیر ہے جب دیکھو  
کہ سننے کی طرف مائل ہیں تو سناؤ ورنہ ان کو ان کی تقدیر کے حوالہ کرو۔

سَيَكُونُ مِنْكُمْ نَفْسٌ ۖ وَيَتَجَلَّبُهَا الْأَشْشَى ۚ الَّذِي يَبْلُغُ النَّارَ أَكْبَرُ ۚ  
فَلَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۚ (۱۰-۱۳)

یہ بتایا ہے کہ کون آپ کی بات پر کان دھریں گے اور کس مزارع کے لوگ اس سے گریز کریں گے۔  
فرمایا کہ جن کے دلوں میں خدا اور آخرت کا کچھ خوف ہوگا وہ آپ کی بات سنیں گے اور جن کے دل اس  
خوف سے خالی ہیں ان پر آپ کا انداز یہ اثر نہیں رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آپ کی دعوت سے بدک  
رہے ہیں ان کے بدکنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس دعوت میں یا اس کے داعی میں کوئی خرابی ہے بلکہ ان



بدکنے والوں کے دلوں میں ہی خوابا ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں۔  
 اطوت کا کوئی اندیشہ ان کے اندر سرے سے ہے ہی نہیں۔ ایسے مہر دم القسمت لوگوں کو ان کے  
 حال پر چھوڑ دو۔ یہ اس بڑی آگ میں پڑیں گے جو ان کے لیے تیار ہے۔ پھر اس میں نہ یہ مریں گے  
 نہ جلیں گے بلکہ اس کے ابدی عذاب میں گرفتار رہیں گے۔ اس میں وہ موت کی تمنا کریں گے  
 لیکن وہ بھی ان کی پرسان حال نہیں ہوگی۔

یہاں اس سنت الہی کہ ذہن میں تازہ کر لیجئے جس کی وضاحت اس کتاب میں بار بار ہو چکی  
 ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو لور و دلیت فرمایا ہے جو لوگ اس کو باقی رکھتے ہیں ان کو پیغمبر  
 کی دعوت اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ لور کچھ ضعیف بھی ہو چکا ہوتا ہے جب بھی دیر  
 سویر پیغمبر کے مہم جوئے سے وہ جاگ پٹتے ہیں لیکن جن کے اندر یہ لور بالکل بجھ چکا ہوتا ہے وہ مردوں  
 کے حکم میں ہیں ان کو صوری اسرافیل کے سوا اور کوئی چیز بھی نہیں جگا سکتی۔

مذکورہ آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ بعد والی سورہ ————— الفاشیہ ————— میں  
 جو اس کی مثل ہے، زیادہ وضاحت سے آیا ہے۔ فرمایا ہے :

مَذْكُرْتُمْ أَنَّكُمْ تُمِيتُونَ	تو یاد دہانی کرو اتم تو بس ایک یاد دہانی
كُنْتُمْ عَلَيْهِمْ بِمُطَيْبِ	کر دینے والے ہو۔ تم ان پر کوئی دار و نہ تو
إِلَّا مَنْ تَدَّى وَكَفَرًا	نہیں ہو (جو بیان لئے گارہ نلاج پائے گا)
فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ	رہے جو بیٹھے پھریں گے اور کفر کریں گے تو
الْأَكْبَرُ إِنَّ الْكِبْرِيَا بَهُوَ	اللہ ان کو عذاب دے گا بڑا عذاب و ہر
لُعْنَتٌ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِينَ	ہی طرف ان کا لٹنا ہے۔ پھر ہمارے ہی

(الفاشیہ - ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴)

یہ بات یاد رکھیے کہ یہاں اَلْعَذَابُ الْاَكْبَرُ آیا ہے اور آیت زیر بحث میں اَلنَّارُ الْكُبْرٰی ہے  
 یہ ایک ہی بات دونوں ترام سوزنوں میں ذرا مختلف الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ اس کی وضاحت  
 ان شاء اللہ اگلی سورہ میں آئے گی۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۚ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى (۱۴-۱۵)

ادھر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے گریزا اختیار کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا۔ ان لوگوں کا  
 اب یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جن کا ذکر ادر پُر سید نکو مَنْ تَزَكَّى کے الفاظ سے انجام ہوا ہے۔  
 فرمایا کہ بے شک ان لوگوں نے فلاح پائی جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تذکیر سے فائدہ  
 اٹھایا اور اپنے آپ کو کفر و شرک کی آلودگی سے پاک کر لیا۔ ان کے لیے دنیا میں بھی فلاح کے دروازے



کھلیں گے اور آخرت میں بھی یہ اپنے رب کی رحمت درخشان سے نوازے جائیں گے۔

وَذَكِّرْهُمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝۱۷۰

دین میں نماز ہم اور پرستارہ کرچکے ہیں کہ تمام علم کا سرچشمہ درحقیقت اسمائے الہی ہیں۔ انہی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے رب کی صفات کیا ہیں اور پھر انہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صفات کی روشنی میں ہمارے عقائد کیا ہونے چاہئیں اور وہ عقائد ہمارے اور ہمارے رب اور اس کے بندوں سے متعلق کیا حقوق و فرائض عائد کرتے ہیں جو یا نماز کا ذکر یہاں ایمان باللہ کے اولین مظہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس نکتہ کی وضاحت کرچکے ہیں کہ ایمان کا اولین مظہر نماز ہے اور پھر یہی چیز تمام شریعت کی اساس بھی ہے اور اس کی محافظ بھی۔ اس نکتہ کی مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورہ مومنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر تذکرہ قرآن میں پڑھ لیجیے۔

بَلَىٰ تُوشِدُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ وَالْآٰخِرَةُ خَيْرٌ مَّا يُلْقٰی (۱۷-۱۸)

یہ آخر میں مخالفین یعنی قریش کے لیڈروں کو خطاب کر کے ان کے اصل سبب مخالفت سے پردہ اٹھا دیا کہ تمہاری ساری مخالفت کی علت محض تمہاری دنیا پرستی ہے۔ تم آخرت کو ماننے اور اس کی خاطر اپنے ناجائز دنیوی مفادات قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہو اس وجہ سے بے بنیاد شبہات ایجاد کرتے اور ان کو پھیلاتے ہو تاکہ اپنے عوام کو یہ فریب دے سکو کہ تمہارے گریز کے لیے فی الواقع کچھ وجوہ ہیں لیکن نادار، یاد رکھو کہ تم اس دنیا کی چند روزہ زندگی کی محبت میں پھنس کر ابدی بادشاہی کھورہے ہو! بہتر اور پائیدار چیز آخرت ہے۔ اگر تمہارے اندر سمجھ ہے تو اس کے طالب بنو!

اِنَّ هٰذَا لَفِي الضُّحٰی ۚ اِلٰی صٰحِفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوسٰی (۱۸-۱۹)

قرآن کی تعلیم یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہیں بتا رہے ہیں یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔ تمام اگلے نبیوں اور رسولوں نے بھی یہی تعلیم دی ہے کہ اصل زندگی آخرت ہی کی زندگی رہے اور وہاں آدمی کا اپنا ہی عمل کام آئے گا اگر کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ سورہ نجم میں یہی حقیقت یوں بیان ہوئی ہے:

اَمْ نَكْنِزُ الْبَیِّنٰتِ فِیْ صُحُفٍ مُّوسٰی ۚ وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِیْ وَفٰی ۚ اَلَّا تَشِیْذُوْا زَیْنَةَ قُدْرٍ اُخْذٰی ۝

کیا اس کو اس تعلیم کی خبر نہیں ملی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم کے جس نے ہر بات پروری کر دکھائی کہ کوئی جان بھی کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔



حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے دوسرے متعدد ذنبیوں کے صحیفے اسفارِ تورات کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں اگرچہ بہت سی تحریفیں واقع ہو چکی ہیں اور ان کی حیثیت تاریخ کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے تاہم ان سب میں توحید اور قیامت کی تعلیم نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں اتنی کثرت سے موجود ہے کہ جس صحیفہ کو بھی پڑھیے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

یہذا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو جو تعلیم دی اگرچہ وہ صحیفہ کی شکل میں نہیں تھی بلکہ زبانی تعلیم و تلقین کی صورت میں تھی، لیکن ان کی ذریت کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل نے اس کو اپنے صحیفوں میں شکلِ تحریر بھی محفوظ کیا اور ان کے انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں برابر اس کی یاد دہانی بھی کرتے رہے جس کی ناقابلِ تردید شہادت آج بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے اور قرآن نے بھی جا بجا اس کا حوالہ دیا ہے۔

آپ کی ذریت کی دوسری شاخ ————— بنی اسمعیل ————— نے اس کو تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ تحریر و کتابت سے نا آشنا تھے۔ انھوں نے روایات کی صورت میں اس کو کچھ مدت تک باقی رکھا لیکن امتدادِ زمانہ سے اس پر رفتہ رفتہ ذہول کا پردہ پڑ گیا اور بدعات کے غلبہ نے اس کو بالکل ہی نسیا کر دیا۔ البتہ نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس کی نہ صرف از سر نو تجدید ہوئی بلکہ اس کی تکمیل بھی ہوئی اور وہی اس دینِ کامل کی اساس قرار پائی جو اب قیامت تک کے لیے اللہ کا حقیقی دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد لله علیٰ

احسانہ۔

لاہور

۲۰۔ زمبر ۱۹۷۹ء

۱۱۔ ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ







تذکرہ قرآن

۸۸

الغاشیة







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— الا علی ————— کی مشقی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ جس طرح سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اسی طرح اس میں بھی آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ البتہ اندازِ خطاب، طریقِ استدلال اور تفصیل و اجمال کے پہلو سے دونوں میں فرق ہے۔ اس میں پہلے وہ فرق و اختلاف واضح فرمایا گیا ہے جو قیامت کے دن نیکوں اور بدوں، ناعاقبت اندیشوں اور عاقبت بینوں کے نتائجِ اعمال اور ان کی زندگیوں میں رونما ہوگا اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا رونما ہونا اس کائنات کے خالق کی صفاتِ قدرت، ربوبیت اور رحمت کا بدیہی تقاضا ہے۔ پھر آخر میں اس مضمونِ تسلی کی وضاحت فرما دی گئی ہے جو سابق سورہ کی آیت: **فَإِذَا كُفُّواْ لَعْنَتِ الْمَذْكُورِ (الاعلیٰ - ۸۷-۹۰)** میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ آپ کی ذمہ داری لوگوں تک صرف حق پہنچا دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو لازماً قبول بھی کر لیں جو سبٹ دھرم اپنی ضد پراڑے ہوئے ہیں ان کے درپے ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ وہ ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہے۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۶) جو لوگ قیامت سے بے فکر ہو کر زندگی گزار رہے ہیں، قیامت کے دن ان کو جس

صورتِ حال سے سابقہ پیش آنے والا ہے، اس کا بیان۔

(۷-۱۶) جو لوگ قیامت سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاریں گے ان کو اس دن جو ابدی شادمانی

فائز المرامی حاصل ہوگی اس کی تصویر۔

(۱۷-۲۰) آفاق کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کا

خالق بڑی عظیم قدرت و حکمت والا، نہایت ہی مہربان، نہایت ہی کریم و بندہ نواز ہے۔ اس کی



اس قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا بدیہی تقاضا ہے کہ وہ ایک روز عدل لائے جس میں نیکوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اور بدوں کو ان کی بدیوں کی سزا دے۔ اگر اس کے بغیر یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی ایک دن تمام ہو جائے تو اس سے نہ صرف ان تمام صفات کی نفی ہو جاتی ہے بلکہ العباد باللہ یہ بات نکلتی ہے کہ اس نے ایک بالکل اندھیر نگری بنائی ہے اور اس کے نزدیک خیر و شر اور نیکی و بدی دونوں یکساں ہیں۔

(۲۱-۲۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین کہ آپ جس چیز سے لوگوں کو ڈرا رہے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس کی نشانیاں بالکل واضح ہیں۔ ہٹ دھرموں کی روش سے آپ بد دل اور عا یوس نہ ہوں۔ آپ کا فرض صرف لوگوں تک سختی کو پہنچا دینا ہے، لوگوں کے کفر و ایمان کے باب میں آپ مسئول نہیں ہیں۔ جو آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ بالآخر ان کی دایہی خدا ہی کی طرف ہوتی ہے اور وہ ان کا حساب کر کے رہے گا۔

---



# سُورَةُ الْغَاشِيَةِ

مَكِّيَّةٌ \_\_\_\_\_ آيات : ٢٦

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ① وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ②  
 عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ ③ تَصْلِي نَارًا حَامِيَةً ④ تُسْقَى مِنْ  
 عَيْنٍ أَنِيَّةٍ ⑤ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ⑥ لَا  
 لُيُوسِينَ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ جُوعٌ ⑦ وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ ⑧  
 لَسَعِيهَا نَاضِيَةٌ ⑨ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ⑩ لَا تَسْمَعُ فِيهَا  
 لَاغِيَةً ⑪ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ⑫ فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ⑬  
 وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ⑭ وَنَسَارِقٌ مِصْفُوفَةٌ ⑮ وَزَرَارِيُّ  
 مَبْشُورَةٌ ⑯ أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ⑰  
 وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ⑱ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ  
 نُصِبَتْ ⑲ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ⑳ فَذَكِّرْ ㉑ إِنَّمَا  
 أَنْتَ مُذَكِّرٌ ㉒ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ㉓ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى  
 وَكَفَرَ ㉔ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ㉕ إِنَّ إِلَيْنَا  
 إِيَابَهُمْ ㉖ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ㉗



ترجمہ آیات  
۲۶-۱

کیا تمہیں چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے! اس دن کتنے چہرے اترے  
اور تھکے ہارے ہوں گے۔ وہ دہکتی آگ میں پڑیں گے۔ کھولتے چشمہ کا پانی پلائے  
جائیں گے۔ ان کے کھانے کو صرف جھاڑ کا نٹے ہوں گے جو نہ موٹا کریں گے نہ بھوک  
ہی کو ماریں گے۔ ۱-۷

کتنے چہرے اس دن شگفتہ ہوں گے۔ اپنی کوشش پر شاد و مطمئن۔ اونچے باغ  
میں۔ جس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔ اس میں چشمہ ہو گا رواں۔ اس میں تخت ہوں گے  
اونچے بچھے۔ آنچورے قرینے سے دھرے اور غالیچے ترتیب سے لگے اور تکیے ہر طرف  
پڑے۔ ۸-۱۶

کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے، وہ کیسے بناٹے گئے! اور آسمان کو نہیں دیکھتے،  
کیسا اونچا کیا گیا! اور پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے، کس طرح کھڑے کیے گئے اور زمین کو  
نہیں دیکھتے، کس طرح بچھائی گئی! ۱۷-۲۰

تم یاد دہانی کرو، تم بس ایک یاد دہانی کر دینے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں  
مقرر ہو۔ رہا وہ جو منہ موڑے اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا بیشک  
ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے، پھر ہمارے ہی ذمہ ان سے حساب لینا ہے! ۲۱-۲۶



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَلَأْتُكَ حَبِثُ الْغَاشِيَةِ (۱)

اس انداز میں جو سوال ہوتا ہے وہ طلب جواب کے لیے نہیں بلکہ کسی چیز کے ہول و ہیبت قیامت اور یا اس کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں جو خطاب ہے اگرچہ عام بھی ہو سکتا ہے احوال قیامت لیکن قرینہ دلیل ہے کہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں چنانچہ اسی پر عطف کر کے آگے فرمایا ہے: فَذَكِّرُوا كَتَمُورِ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ (۲) (تم یاد دہانی کر دو، تم تو صرف ایک یاد دہانی کر دینے والے ہو)۔

‘غَاشِيَةٌ’ کے معنی ڈھانک لینے والی اور چھا جانے والی کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ قیامت کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آفت ایک ہمہ گیر آفت ہوگی جو سب پر چھا جائے گی، کسی کو بھی اس سے مفر نہیں ہوگا۔ اس کا احوال (حدیث) یہاں سنایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گیا ہے لیکن مقصود، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، ان کفار کو آگاہ کرنا ہے جو اذل و آشوت کو مانتے ہی نہیں تھے اور اگر کسی درجہ میں مانتے بھی تھے تو اپنے اس گمان کی بنا پر اس سے بالکل نچت تھے کہ ان کو جو کچھ یہاں حاصل ہے اس سے بڑھ کر وہاں حاصل ہوگا۔

وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۚ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۲-۳)

ادھر کا سوال، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، طلب جواب کے لیے نہیں بلکہ صرف تنبیہ کے لیے ان لوگوں کا تھا کہ سننے والے اس کو اچھی طرح سن لیں۔ اس کے بعد قرآن نے خود ہی اس کا جواب دیا کہ اس دن حال ہوتی کتنے چہرے بالکل اترے اور تھکے ہارے ہوں گے۔

‘خَاشِعَةٌ’ کے معنی جھکے ہوئے، پست اور اداس کے ہیں۔ ‘عَامِلَةٌ’ کے معنی محنت سے ٹھہل اور ‘نَّاصِبَةٌ’ کے معنی تھکے ہارے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن جب ان کی توقع کے برعکس حقیقت سامنے آئے گی کہ ان کو اپنے اعمال کی پاداش میں جہنم میں پڑنا ہے تو ان کے چہرے فاق ہو جائیں گے، ان پر ہوائیاں اترنے لگیں گی۔

‘وَجُودٌ’ سے مراد اگرچہ اشخاص ہیں لیکن ان کو تعبیر ‘وَجُودٌ’ سے اس لیے کیا ہے کہ مقصود ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کرنا ہے اور کیفیات کا اظہار سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر چہروں ہی سے ہوتا ہے۔

لَصُلِّي نَارًا حَامِيَةً ۚ تَسْقِي مِنْ عَيْنٍ اَنِيبَةٍ (۴-۵)

یہ اس چیز کا بیان ہے جو اس بدحواسی کا سبب بنے گی جو اوپر مذکور ہوئی یعنی وہ دوزخ کی بھڑکتی



آگ میں پڑیں گے اور کھولتے چشے کا پانی پیئیں گے۔ 'اِنَّیْنَهٗ' کے معنی ہیں جس کی گرمی اپنے آخری نقطہ پہ پہنچی ہوئی ہو۔

قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں مجرموں کی جس بدحواسی پر نشان حالی کا ذکر ہے اس کا تعلق اس وقت سے ہے جب ان پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ وہ دوزخ میں ڈالے جانے والے ہیں۔ سورہ قیامہ میں تصریح ہے کہ

دُوْجُوْهُ یَّوْمَیْذٍۭ بِاَسْرَةٍ ؕ اور اس دن بہت سے چہرے بگڑے ہوئے

تَنْظُنُّ اَنْ یَّفْعَلَ بِهَا فَاْقْرَةً ؕ ہوں گے۔ وہ گمان کرتے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے

(القیامۃ: ۵، ۲۴-۲۵) والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ ان کے دوزخ میں پڑنے کے بعد کے حالات بیان ہو رہے ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ دوزخ میں پڑنے کے بعد چہرے ادا س ہی نہیں ہوں گے بلکہ وہ آگ پر گھسیٹے جائیں گے اور مزید وہ سب کچھ ہوگا جو دوزخ کے احوال سے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے۔

لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ؕ لَا یَسْمِنُوْنَ وَلَا یُغْنٰی عَنْهُمۡ جُوعٌ (۶-۷)

پانی کے بعد یہ اس کھانے کا ذکر ہے جو دوزخ میں ان کو ملے گا۔ فرمایا کہ ان کو کھانے کی کوئی چیز وہاں میسر نہیں آئے گی۔ صرف ضریع چاہیں گے اور اس پر کھولتا ہوا پانی پیئیں گے۔ 'ضریع' ایک خاردار زہریلی جھاڑی ہے جس کو کوئی جانور نہیں چھوڑتا۔

دوزخیوں کی

غذا

مقصود کلام یہاں حصر نہیں ہے کہ ان کا کھانا صرف ضریع ہوگا۔ بلکہ یہ استثنائے منقطع ہے۔ حصر کا مضمون اس صورت میں پیدا ہوتا جب 'ضریع' کسی درجے میں بھی کوئی کھانے کی چیز ہوتی۔ جب وہ سرے سے طعام میں داخل ہی نہیں ہے تو استثناء سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کھانے کی کوئی چیز جب انہیں میسر نہیں آئے گی تو بھوک سے بے بس ہو کر وہ 'ضریع' زہر مار کریں گے جو دوزخیوں کے لیے وہاں موجود ہوگی۔ اس سے اسی نوع کی بعض دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو وہاں موجود ہوں گی اور دوزخی ان کو کھانے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں مذکور ہے کہ ان گنہگاروں کا کھانا زقوم بھی ہوگا،

اِنَّ شَجَرَتَۃَ الزَّقْوٰمِ اِلَّا طَعَامٌ ؕ بے شک زقوم کی جھاڑی گنہگاروں کی غذا

الْاَشِیْمَۃُ (الدخان: ۴۲، ۴۳-۴۴) ہوگی۔

اسی طرح ایک مقام میں 'غسلین' کا بھی ذکر آیا ہے۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غَسٰلِیْنِ ؕ اور ان کی غذا زخموں کا دھون ہوگی۔



لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ۝

جس کو صرف گنہگار ہی کھا  
سکیں گے۔

(الحاقة - ۶۹ = ۳۶ - ۳۷)

اس سے واضح ہوا کہ دوزخیوں کو کوئی چیز کھانے کی نہیں ملے گی، صرف وہ چیزیں ملیں گی جو نہ صرف یہ کہ کھانے کی ہیں نہیں بلکہ وہ ایسی ہیں کہ دوزخیوں کے سوا کوئی ان کو نگل بھی نہیں سکتا۔  
الْأَشْيَاءُ مِنْ دَلَالِغُنِي مِنْ جُوعٍ ۝ غذا کے اصل فائدے دو ہیں۔ جسم کی توانائی کو قائم رکھنا اور  
بھوک کی اذیت کو رفع کرنا۔ اس سے نہ جسم میں توانائی آئے گی اور نہ بھوک ہی رفع ہوگی۔ گویا صرف  
اس کے چبانے اور نگلنے کی اذیت ان کے حصے میں آئے گی۔

وَجُودٌ يُؤْمِيزُ نَاعِمَةً ۝ تَسْعِيهَا رَاضِيَةً ۝ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۸ - ۱۰)

اب یہ دوسرے گروہ، یعنی اہل ایمان کا بیان ہے۔ فرمایا کہ بہت سے چہرے اس دن شگفتہ و  
شاداب ہوں گے۔

یہی بات سورہ قیامہ میں وُجُودٌ يُؤْمِيزُ نَاعِمَةً ۝ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۲۲ - ۲۳) کے  
الفاظ میں گزر چکی ہے۔ اوپر منکرین قیامت کے چہروں کی مایوسی، افسردگی اور تھکاوٹ کا ذکر ہوا،  
یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا بیان ہے جنہوں نے دنیا کو آخرت کے لیے بڑا اور اس امتحان  
میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے چہروں پر ابدی فتح مندی کی بشارت اور شگفتگی جھلک رہی ہوگی۔  
تَسْعِيهَا رَاضِيَةً ۝ یہ بشارت ان کے چہروں پر اس وجہ سے نمایاں ہوگی کہ انہوں نے  
دنیا میں آخرت کے لیے جو کمائی کی اس کا حاصل ان کے سامنے ہوگا اور وہ اس سے پوری طرح  
مطمئن ہوں گے کہ ان کے ہر عمل کا صلہ ان کو بھرپور ملا اور ان کے رب نے جو وعدے ان سے کیے  
وہ سب پورے کیے۔ اس کی تفصیل آگے کی آیات میں بھی موجود ہے اور اس کے بعد والی سورہ میں  
بھی اس کا ایک خاص پہلو بیان ہوا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس کے بعض دقیق مضمرات پر روشنی  
ڈالیں گے۔

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ یہ آخرت میں ان کے مستقر و مقام کا پتہ دیا ہے کہ وہ اونچے بلع میں ہوں گے۔  
اونچے باغ، یعنی وہ باغ بلندی پر ہوں گے۔ ایک اچھے باغ کا تصور اہل عرب کے ہاں یہ ہے کہ  
باغ بلندی پر ہو، اس کے حاشیہ پر کھجوروں کے اونچے درخت ہوں تاکہ وہ دور ہی سے دلکش بھی معلوم  
ہو اور سموم و سیلاب وغیرہ سے محفوظ بھی رہے۔

لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاحِظَةً (۱۱)

اہل دوزخ سے متعلق قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ کے باڑے میں پہنچتے  
ہی وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے کہ فلاں نے ہم کو گمراہ کیا، وہ گمراہ نہ کرتا تو ہم ہا بیت پر ہوتے۔  
اہل جنت کی مجلس ہر شے سے محفوظ ہوگی



لیٹروں اور ان کے پیروؤں میں ٹوٹکار ہوگی۔ پیرو لیٹروں کے لیے دوزخ عذاب کا مطالبہ کریں گے۔  
 کہ انھوں نے ان کی راہ ماری اس وجہ سے یہ دگنے عذاب کے نزلدار ہیں۔ لیٹرو جواب دیں گے  
 کہ ہم نے تم کو وہی بنایا جو ہم خود تھے، تم نے خود اپنی شامت بلائی کہ جان بوجھ کر ہماری پیروی  
 کی۔ اس کے برعکس اہل جنت کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک  
 فتح مندی کی طرح ایک دوسرے کا خیر مقدم تحیت و سلام سے کریں گے، آپس میں مبارک سلامت  
 کے تبادلے ہوں گے، نہایت خوش گوار موڈ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ ان  
 کی مجلس محبت و اخلاص کی عطر بنیروں سے معمور ہوگی۔ سورۃ واقعہ میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے :

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا  
 إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا

وہ اس میں کوئی لغو یا گناہ کی بات نہیں  
 سنیں گے۔ بس ہر طرف مبارک سلامت ہی  
 کا چرچا ہوگا۔

(الواقعة - ۲۵-۲۶)

یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اہل جنت کی شراب بھی فتور عقل اور ہذیان پیدا کرنے والی نہیں  
 ہوگی کہ اس کے نشہ میں وہ اتنے از خود رفتہ ہو جائیں کہ زبان سے کوئی ناشائستہ کلمہ نکل جائے۔  
 فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۱۲)

جنت کے خوش گوار ماحول کے بعد یہ اس کے خوش نما مناظر کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں  
 چشمہ جاری ہوگا۔ یہ صرف اس چشمہ کا ذکر ہے جو باغ کی شادابی کے لیے ہوگا۔ اس سے یہ بات  
 لازم نہیں آتی کہ چشمہ ایک ہی ہوگا۔ چنانچہ سورۃ دہر میں ایک سے زیادہ چشموں اور ان سے نکلی  
 ہوئی متعدد شاخوں کا ذکر ہے لیکن ان رحمتوں کی نوعیت، جیسا کہ ان کی وضاحت ہو چکی ہے،  
 بالکل مختلف ہوگی۔ ان دونوں بیانیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

فِيهَا سُرُورٌ مَرُوعَةٌ ۖ وَكُتُوبٌ مَوْضُوعَةٌ ۖ وَنَعَارِقُ مَصْفُوعَةٌ  
 وَزَيَّا بِي مَبْشُورَةٌ (۱۳-۱۶)

جنت کا سامان۔ یہ اس سامانِ آرائش و زیبائش کا ذکر ہے جو اہل جنت کی آرائش کے لیے موجود ہوگا۔ اس  
 آرائش کی تفصیلات بھی مختلف سورتوں میں مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔ یہ اختلاف زیادہ تر تو  
 اجمال و تفصیل کی نوعیت کا ہے لیکن بعض مقامات میں وہ تفاوت بھی ملحوظ ہے جو اہل جنت کے  
 درجات و مراتب میں ہوگا۔ نیز ان کو پڑھتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے کہ یہ چیزیں تمثیل  
 کی صورت میں بیان ہوئی ہیں۔ علم غیب کی نادیدہ حقیقتیں تمثیل ہی کے پیرائے میں بیان ہو سکتی  
 ہیں اور ان کے لیے الفاظ اسی زبان اور اسی تہذیب و تمدن سے مستعار لینے پڑتے ہیں جس  
 سے مخاطب فی الجملہ آشنا ہوں۔



”مُذَوِّجٌ مَّذْذُوعَةٌ“ ان کے بیٹھنے کے لیے اونچے تخت ہوں گے۔ اس زمانے کے امراء و سلاطین کی نشست اونچے تختوں ہی پر ہوتی تھی اس وجہ سے تمثیل میں اسی کا ذکر ہوا ہے لیکن جنت ہر جنت کی خواہش کے مطابق ہوگی۔ وہ جس شکل میں جنت کی آرائش چاہے گا اس کی جنت اسی شکل میں آراستہ ملے گی۔

”وَ الْكُؤَابُ مَوْضُوعَةٌ“ ’الکُؤَابُ‘ جمع ہے ’کُؤَبُ‘ کی۔ ’کُؤَبُ‘ اور ’کُؤَبُ‘ (cup) ایک ہی چیز ہے۔ یہ پیالے، آب خورے، جام سب کے لیے آتا ہے۔ ’مَوْضُوعَةٌ‘ کے معنی ہیں قرینہ سے رکھے ہوئے۔

”وَنَسَارِقُ مَصْفُوفَةٌ“ ’نَسَارِقُ‘ قالمینوں اور غالیچوں کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی ان کی ہر نشست گاہ میں قالمین اور غالیچے ترتیب سے باہدگر ہو کر پہنچے ہوں گے۔ کوئی جگہ خالی نہیں ہوگی۔ ’ذُرَابِي مَيْثُوثَةٌ‘ ’ذُرَابِي‘ جمع ہے ’ذُرْبِيَّةُ‘ کی، یہ تکیوں اور نہالچوں کے معنی میں آتا ہے یعنی قالمینوں پر تکیے اور نہالچے ہر طرف بکھرے پڑے ہوں گے۔ بیٹھنے والا جہاں بیٹھے وہ اس کے لیے آرائش کا باعث ہوں گے۔ آج صوفیوں کا دور ہے لیکن ان پر بھی گدیاں اور تکیے رکھنے کا رواج ہے۔

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۖ وَنَفَثَتْ ۚ وَالسَّمَاءِ كَيْفَ دُفِنَتْ ۚ وَالِى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۚ وَنَفَثَتْ ۚ وَالِى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۱۷-۲۰)

یہ ان لوگوں کو جو مذکورہ جزاء و سزا سے بالکل نچیت زندگی گزار رہے تھے۔ آفاق کی بعض نہایت نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آخر وہ ان چیزوں پر کیوں غور نہیں کرتے جو خالق کی صفات ربوبیت و قدرت اور اس کی حکمت و عظمت کی اس طرح شہادت دے رہی ہیں کہ جس کے اندر ذرا بھی حق پسندی ہو وہ قیامت اور جزاء و سزا کا انکار نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ان نشانیوں کے ہوتے وہ اس بات پر کیوں اڑے ہوئے ہیں کہ کوئی نشانی عذاب ظاہر ہو یا قیامت آجائے تب ہی وہ پیغمبر کی بات مانیں گے۔

”أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ“ سب سے پہلے اونٹ کی طرف توجہ دلائی کہ آخر وہ اپنے سفر و حضر کے سب سے زیادہ خدمت گزار، وفا شعار اور جان نثار ساتھی اونٹ ہی پر کیوں غور کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کن صفات و خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کس طرح اس کو ان کا مطیع بنایا ہے کہ ایک عظیم الحجۃ اور طویل القامت جانور ہونے کے باوجود اس کی ناک میں نکلیں ڈال کر وہ بدھ جاہیں لیے پھرتے ہیں اور وہ بے چون و چرا ان کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ حضر میں ان کا رات دن کا ساتھی ہے، سفر میں ان کا بار بردار رفیق، صحرا میں ان کا سفینہ



ہے۔ ہفتہ ہفتہ بھرہ بھوک سے اور پیاس کا مقابلہ کرتا ہے۔ خاردار جھاڑیوں سے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور کسی بڑی سے بڑی مشقت بھی انکار نہیں کرتا۔ اس کا گوشت پوست، دودھ، ہر چیز مالک کے کام آتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا بول دہرازی بھی رائگاں جانے والی چیز نہیں۔۔۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اتنے گونا گوں فوائد و مصالح کے ساتھ یہ جانور آپ سے آپ پیدا ہو گیا اور انسان نے اس کو اتفاق سے پکڑ کر اپنے لیے سازگار بنا لیا ہے یا رب کریم نے اپنی قدرت و حکمت سے اس کو پیدا کیا اور اس کو انسان کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل اس دوسری بات ہی کی گواہی دیتی ہے۔ اگر یہ دوسری ہی بات قابل قبول ہے تو کیا انسان پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے جس نے اس کے لیے بغیر کسی استحقاق کے زندگی کی یہ آسائشیں فراہم کی ہیں ورنہ ایک دن اپنے رب کے آگے جواب دہی اور اپنے کفرانِ نعمت کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اونٹ کا ذکر بطور مثال محض ان خصوصیات کی بنا پر ہوا ہے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ مقصود ان تمام جانوروں کی طرف توجہ دلانا ہے جو قدرت نے انسان کے لیے مسخر کیے ہیں اور جن پر اس کی معاش و معیشت کا انحصار ہے۔ دوسرے مقامات میں قرآن نے ان کا حوالہ بھی دیا ہے اور مدعا اس حوالہ سے اس حقیقت کو انسان پر واضح کرنا ہے کہ نعمت منعم کا شکر واجب کرتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ایک ایسا ذراٹے جس میں شکر گزار اپنی شکر گزاری کا انعام پامیں اور ناشکر اپنے کفرانِ نعمت کی سزا بھگتیں۔ ان شاء اللہ سورہ عادیات کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث آئے گی۔

آسمان کی طرف اشارہ

’وَاللَّيْلِ كَيْفَ رُفِعَتْ‘ چونکہ مقصود یہاں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نمایاں چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے اس وجہ سے اونٹ جیسے طویل القامت جانور کا ذکر آیا تو وہیں سے آسمان کی طرف توجہ دلا دی ہے کہ وہ آسمان پر کیوں نہیں غور کرتے کہ کس طرح یہ چھت بلند کی گئی! یعنی ایسی ناپید کنار چھت بلند تو ہو گئی لیکن کسی کو وہ ستون نظر نہیں آتے جن پر یہ قائم ہے۔ پھر اس بھی عجیب یہ ماجرہ ہے کہ نہیں معلوم کہ کب سے یہ قائم ہے، لیکن کوئی ماہر سے ماہر انجینئر کسی بڑی سے بڑی دور بین کی مدد سے بھی، اس میں کسی معمولی سے معمولی رخنہ یا خلا کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ بے تو یہ زمین سے اتنی دور کہ اس کی مسافت کا علم کسی کو نہیں لیکن اسی کے سورج، چاند ستارے اور سیارے زمین کی رونق اور اس کے لیے روشنی، حرارت اور زندگی کا ذریعہ ہیں۔ اسی سے بارش نازل ہوتی ہے جس سے زمین کی تمام مخلوقات کو روزی حاصل ہوتی ہے۔

انسان سوچے کہ جس خالق کی قدرت و حکمت کا یہ حال ہے کہ وہ آسمان کو بنا سکتا ہے، کیا اس کے مکیب جانے کے بعد دوبارہ اس کو اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا! چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ یہ سوال اللہ تعالیٰ نے کیا ہے کہ تبار، تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟



وَالَّذِي يُضِلُّ كَيْفَ يُضِلُّ: آسمان اور اس کے عجائبات کی سیر کرانے کے بعد نگاہ کو پھر زمین زمین کے کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اس نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جو زمین و آسمان کے مابین خالق کائنات عجائبات کی قدرت و حکمت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ فرمایا کہ پہاڑوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح نصب کیے گئے طرف اشارہ ہیں۔ وہ زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ سب کے سمیت کسی سمت کو ٹھک جائے۔ وہ ہواؤں اور بادلوں کو بھی کنٹرول کرتے ہیں تاکہ بارش کی تقسیم قدرت کی حکمت اور اس کے نفاذ کے مطابق ہو۔ ہیں تو یہ پتھر کے لیکن قدرت نے ان کے اندر سے خلق کی سیرابی کے لیے شیریں پانی کے سوتے جاری کر رکھے ہیں۔ وہ قدرت کے بے شمار قیمتی خزانوں کے امین ہیں جن کو انسان برابر دریافت کرنے اور ان کو اپنے تمدن کی تعمیر و ترقی میں صرف کرنے میں دن سرگرم ہے۔ ان میں ایسے پہاڑ بھی ہیں جو ناقابل عبور ہیں لیکن قدرت نے ان کے اندر درے اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ وہ قوموں اور قوموں کے درمیان حجاب بن گئے رہ جائیں۔ انسان غور کرے کہ کیا یہ خالق کی عظیم قدرت، عظیم حکمت، اور اس کی عالم گیر ربوبیت پر شاہد نہیں ہیں! اور پھر غور کرے کہ کیا جو خالق ان صفات سے متصف ہے وہ انسان کو اس دنیا میں شتر بے ہمار بنا کے چھوڑے رکھے گا، کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ سب کا حساب کرے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے؟ کیا یہ اس کی ربوبیت اور اس کی حکمت کا بدیہی تقاضا نہیں ہے؟ کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ اس کی قدرت کے دائرہ سے خارج اور بعید از امکان ہے!!

وَالَّذِي الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِّحَتْ: اب یہ نگاہ کو پہاڑوں سے زمین پر اتارا اور دعوت دی کہ زمین پہاڑوں کو دیکھیں کہ کس طرح یہ ان کے قدموں کے نیچے بچھاٹی گئی ہے۔ کس طرح اس کو گوشے گوشے میں ان کی پرورش کے لیے ضرورت کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس کی سطح زمینوں پر یہ اپنے گھر بنا لیتے ہیں۔ اس کے میدانوں میں ان کے کھیت اور ان کے باغ و چین ہیں۔ اس کی نہریں، اس کے کنوئیں اور اس کے چشمے ان کے کھیتوں اور باغوں کو شاداب رکھتے ہیں، اس کے جنگلوں اور اس کی وادیوں میں ان کے چوپایوں اور گلوں کے لیے پیٹ بھرنے کے غیر محدود وسائل موجود ہیں۔ ان ساری چیزوں کو دیکھیں اور سوچیں کہ جس نے ان کو اس بنے بنائے گھر میں اتارا اور اس کی ساری چیزیں وہ برت رہے ہیں کیا اس کو اس امر سے کوئی بحث نہیں ہے کہ کون گھر کے مالک کی پسند کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور کون اس کو اپنے اب و جد کی میراث سمجھ کر اس میں اکڑتا اور ادھم مچاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ عقل یہی کہتی ہے کہ اس کو اس سے بحث ہے اور ہونی چاہیے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ العباد باللہ یا تو وہ بے حس و بلید اور خیر و شر کے شعور سے عاری ہے یا بالکل بے بس و مجبور ہے لیکن جس ذات کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور عظمت کی وہ نشانیاں آپ نے دیکھی ہیں، جن کا ذکر اوپر ہوا،



اس کو نہ بے حیثیت و بے شعور فرض کیا جاسکتا نہ عاجز و بے بس تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اس گھر میں انسان کو اتار کر دیکھ رہا ہے کہ وہ کیا بناتا ہے۔ بالآخر ایک دن اس امتحان کی مدت پوری ہوگی اور وہ سب کو اپنے حضور میں جمع کر کے ان کی نیکی اور بدی ان کے سلسلے رکھے گا۔ جس کی روش اس کی پسند کے مطابق رہی ہوگی اس کو وہ اپنی رحمت سے نوازے گا اور جس نے اس گھر میں فساد مچایا ہوگا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔

”کَيْفَ خُلِقْتُ“ اور ”کَيْفَ رُفِعْتُ“ وغیرہ کے لفظوں میں جو سوالات کیے گئے ہیں ان کے اندر اجمال ہے، اس کی تفصیل قرآن کی دوسری سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔ ہم نے اوپر جو وضاحت کی ہے انہی سورتوں کی روشنی میں کی ہے اور صرف اسی حد تک کی ہے جس حد تک اس سورہ میں ضروری تھی۔ مذکورہ چیزوں سے قرآن نے اپنے جن جن دعاوی پر دلیل قائم کی ہے اگر کوئی ان سب کو سمجھنا چاہے تو وہ قرآن کے ان تمام مقامات کا جائزہ لے جہاں زمین، آسمان، پہاڑ اور اونٹ کسی پہلو سے زیر بحث آئے ہیں۔

ترتیب بیان کی ندرت  
ترتیب جمع ہو گئی ہیں۔ مقصود تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چند نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ صدیوں کو فرار کی کوئی راہ نہ ملے۔ چنانچہ سب سے قریب کی نمایاں چیز اونٹ کی طرف پہلے اشارہ فرمایا جس کی نفع بخشی سے مخاطبوں میں سے کسی کے لیے مجال انکار نہیں تھی۔ اونٹ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد وہیں سے آسمان کی طرف توجہ دلا دی کہ ایک نظر اس کو بھی دیکھیں۔ پھر زمین کی طرف بازگشت ہوئی تو نیچے میں پہاڑ آگئے، ان کی طرف توجہ دلا دی۔ پہاڑوں کے بعد سطح زمین توجہ کے لیے اپنے اندر قدرتی کشش رکھتی ہے۔

ان میں سے دو نشانیاں ————— اونٹ اور زمین ————— ربوبیت کے پہلو سے زیادہ نمایاں ہیں اور دو ————— آسمان اور پہاڑ ————— خالق کی قدرت و حکمت کے پہلو سے۔ خالق کی انہی صفتوں پر قیامت، معاد اور جزاء و سزا کے پورے فلسفہ کی بنیاد ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں ہم برابر کرتے آرہے ہیں۔ اب دیکھیے اس ترتیب بیان نے نگاہ کی ایک ہی گردش میں کس طرح ان تمام نمایاں آثار کو سامنے کر دیا ہے جو اس فلسفہ کے حق ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔

فَذَكِّرْهُ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيِّطٍ (۲۱-۲۲)

انذار کے حق میں دلائل بیان کرنے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آپ کو تسلی دینے کے لیے التفات ہے کہ جو لوگ تمہارے انذار کو جھٹلا رہے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں جھٹلا رہے ہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات



کہ تمھارے اندازہ کے حق میں دلائل نہیں ہیں۔ دلائل تو زمین سے لے کر آسمان اور آسمان سے لے کر زمین تک چپہ چپہ پر ہیں لیکن ان سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جن کے اندر خشیت ہوتی ہے۔ انہی لوگوں کی طرف سابق سورہ میں سَبِّدَ کَبُّ مَنْ يَخْشَى (الاعلیٰ ۸۷: ۱۰۰) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ وہ لوگ جن کے دلوں پر مساوت چھا چکی ہے وہ ان نشانیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے چنانچہ سابق سورہ میں فرمایا ہے: وَيَجْجِبُهَا الْأَشْقَى (الاعلیٰ ۸۷: ۱۱) مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے رد و قبول سے بے نیاز ہو کر اپنی تذکیر و تبلیغ جاری رکھیں اور مطمئن رہیں کہ آپ کا فرض صرف تبلیغ و تذکیر ہی ہے۔ یہ ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کہ لازماً آپ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دیں۔ اللہ نے آپ کو یاد دہانی کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے ایمان کا ٹھیکہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ ایمان نہ لانے کی پریشانی آپ سے ہو۔

رَاۤءِ مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۖ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (۲۳-۲۴)

یہاں حرفِ استثناء سے پہلے کلام میں کچھ حذف ہے جو قرینہ سے سمجھا جاتا ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جو صاحبِ توفیق ہوں گے وہ آپ کی دعوت سے نفیس ٹھیں گے، رہے وہ جو منہ موڑیں اور کفر کریں گے تو اللہ ان کو سب سے بڑے عذاب کا مزا چکھائے گا۔ 'الْعَذَابُ الْاَكْبَرُ' سے مراد جہنم کا عذاب ہے جو دنیا کے تمام عذابوں سے بڑا ہوگا۔ اس دنیا کا کوئی عذاب نہ شدت میں اس کا متاثر کر سکتا نہ پائیداری میں۔ سابق سورہ میں اس کو اَلْاَلَمُ الْاَكْبَرُ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے لیکن مدعا ایک ہی ہے۔

اِنَّ اٰیٰتِنَا اٰیٰاَ بَہْمُمْ لَا تُدْرٰی عَلَیْہِمْ اَحْسٰ بَہْمُمْ (۲۵-۲۶)

یعنی کوئی اس منظر میں نہ رہے کہ یہ محض ایک دھمکی ہے۔ بلکہ یہ ایک اُل حقیقت ہے۔ ہر جان کی واپسی ہماری ہی طرف ہوتی ہے کسی اور کی طرف نہیں ہوتی ہے اور یہ بھی ہم پر واجب ہے کہ ہم لوگوں کا حساب کریں اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزاء و سزا دیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا ایک بازیچہ الغفال اور ایک بالکل بے مقصد و بے حکمت کا رخا ہے حالانکہ خالق کا کوئی کام بھی نہ حکمت سے خالی ہے نہ ہو سکتا ہے۔

بفصلِ انزویٰ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوتی۔ وہ دلائل و قیاسات پر مبنی ہے۔

لاہور

۱۱۔ نومبر ۱۹۷۹ء

۲۰۔ ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ







تذکرہ قرآن

۸۹

الفجر







بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ آسمان و زمین کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس مضمون پر ختم ہوئی کہ جس خالق نے ان چیزوں کو وجود بخشا اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی غیر محدود ربوبیت سے کسی عاقل کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ مقصود اس سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ جب وہ عظیم قدرت و حکمت رکھنے والا بھی ہے اور اس وسعت کے ساتھ اس نے اپنا خوانِ کرم بھی بچھا رکھا ہے تو اس کی ان صفات کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں سے باز پرس کرے جنہوں نے اس کی نعمتیں پا کر اس کی دنیا میں دھاندلی مچائی اور ان لوگوں کو انعام دے جنہوں نے شکر گزاری اور اطاعت شکاری کی زندگی بسر کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ اس کی رحمت و ربوبیت کے بھی منافی ہے اور اس کی قدرت و حکمت کے بھی۔

اس کے بعد نبی علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تم جس چیز سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو اس کے دلائل و شواہد آسمان و زمین کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ اگر ان لوگوں کو نظر نہیں آرہے ہیں تو تم اپنا فرض اذارا داکر دو۔ اندھوں کو راہ دکھانا تمہارا کام نہیں ہے۔

اس سورہ میں آفاق اور تالیخ کے بعض نہایت نمایاں آثار و واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ثابت فرمایا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق و مالک کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ جہاں نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے۔ قوموں کے ساتھ بھی اس کا یہی معاملہ ہے۔ ان کو جو ڈھیل ملتی ہے اس کے اذن سے ملتی ہے اور جب ان پر گرفت ہوتی ہے تو اس کے حکم سے ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ ہر وقت قوموں کی بنفیں پر رہتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر ایک کا امتحان ہو رہا ہے کہ وہ نعمت پا کر شکر کی روش اختیار کرتا ہے یا فخر و شکبار کی۔ اسی طرح شکل حالات میں صبر و ثابت قدمی کا ثبوت دیتا ہے یا مایوسی و دل شکستگی کا۔ پہلی روش ابدی فتح و فیروز مندی کی ضامن ہے اور دوسری دائمی خسران و نامرادی کی۔ اللہ کا مبارک بندہ وہ ہے جو نفس مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹا۔ نہ نعمت پا کر مغرور ہوا اور نہ فقر کی آزمائش سے دل شکستہ۔ انہی کو



رَاضِيَةً مَّوَحَّيَّةً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی تقسیم اس طرح ہے:

(۱-۵) آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ جو اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس حد تک چاہتا ہے اس کو ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے۔ (۱۴-۱۷) تاریخ کی بعض عظیم قوموں کا حوالہ اس حقیقت کے ثبوت میں کہ خالق کی یہی نگرانی دنیا کی قوموں پر بھی قائم ہے۔ جب وہ اپنے اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر خدا کے حدود کو لانگھنے کی جسارت کرتی ہیں تو ان کو بس ایک خاص حد ہی تک ڈھیل ملتی ہے۔ اس کے بعد لذنّان کی پکڑ ہوتی ہے اور ایسی سخت پکڑ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام عظمت و شوکت کے باوجود اس کے آگے سپر انداز ہو جاتی ہیں۔

(۱۵-۲۰) انسان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اپنا حق سمجھتا اور اس مغالطہ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں عزت و شرف رکھنے والا ہے اس وجہ سے اس کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نعمت سے محروم ہو جاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ خدا نے اس کی ناکداری کی ہے۔ حالانکہ نعمت ملے یا تنگی رزق سے سابقہ پیش آئے دونوں ہی حالتیں بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ پہلی حالت میں اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ انسان نعمت پا کر شکر کرنے والا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے والا بنتا ہے یا اکڑنے والا اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے والا بن کے رہ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے رب کی اس تقسیم پر قانع و صابر، راضی و مطمئن رہتا ہے یا خدا سے مایوس، شاکی اور بدست بہت بن جاتا ہے۔ حالانکہ خدا سے شاکی اور مایوس ہونے کے بجائے اسے اپنے اعمال پر نظر ڈالنی چاہیے کہ خدا کی نعمت پا کر یتیموں اور غریبوں کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہونا چاہیے تھا اور اس نے مال کی اندھی بہری محبت میں مبتلا ہو کر ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا!

(۲۱-۲۴) قیامت کے دن ان لوگوں کی حسرت و مایوسی کی تصویر جو خدا کے بخشے ہوئے مال کو پا کر اس کے پجاری بن کر بیٹھ رہے، اس کو اپنی آخرت سنوارنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

(۲۴-۳۰) ان لوگوں کی خوش حالی و فیروز مندی کا بیان جو یسوعی و عسرا و تنگی و فراخی دونوں میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے۔ نعمت ملی تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اپنے رب کے شکر گزار اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے والے رہے اور اگر تنگی رزق سے آزمائے گئے تو مایوس و دل شکستہ ہونے کی جگہ اپنی حالت پر صابر و قانع اور اپنے رب کے فضلہ پر راضی رہے۔



# سُورَةُ الْفَجْرِ

مَكِّيَّةٌ ————— آيات : ۳۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْفَجْرِ ۝<sup>۱</sup> وَلَيَالٍ عَشِيرٍ ۝<sup>۲</sup> وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝<sup>۳</sup> وَالْيَسْرِ ۝<sup>۴</sup> إِذَا كَيْسَرٌ ۝<sup>۵</sup> هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حَبْرِ ۝<sup>۶</sup> أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝<sup>۷</sup> إِرْمَادَاتِ الْعِمَادِ ۝<sup>۸</sup> الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝<sup>۹</sup> وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخِرَ بِالْوَادِ ۝<sup>۱۰</sup> وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝<sup>۱۱</sup> الَّذِينَ ظَفَعُوا فِي الْبِلَادِ ۝<sup>۱۲</sup> فَكَثُرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝<sup>۱۳</sup> فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝<sup>۱۴</sup> إِنَّ رَبَّكَ لِبِأْرِصَادٍ ۝<sup>۱۵</sup> فَآمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝<sup>۱۶</sup> وَآمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَارَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝<sup>۱۷</sup> كَلَّا بَلْ لَا تَكْرُمُونَ الْيَتِيمَ ۝<sup>۱۸</sup> وَلَا تَخْضُونَ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝<sup>۱۹</sup> وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاتِ أَكْلًا لَّمًّا ۝<sup>۲۰</sup> وَتُجِئُونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝<sup>۲۱</sup> كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝<sup>۲۲</sup> وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝<sup>۲۳</sup>

آيات  
۳۰-۱



وَجِئْتُكَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ  
وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۚ يَقُولُ يَلِيَّتَنِي قَدْ مَتَّ لِحَيَاتِي ۚ  
فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابُهُ أَحَدٌ ۚ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقُهُ  
أَحَدٌ ۚ يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ  
رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۚ  
وَادْخُلِي جَنَّتِي ۚ

ع  
۱۴

ترجمہ آیات

۲۰-۱

شاید ہے فجر اور دس راتیں اور جنت و طاق اور رات جب وہ چل کھڑی ہو۔

کیوں، ان میں تو ہے ایک عاقل کے لیے عظیم شہادت! (۱-۵)

دیکھا نہیں، کیا کیا تیرے خداوند نے عاد کے ساتھ! — ستونوں والے

ارم کے ساتھ — جن کا ثانی نہ ہوا ملکوں میں۔ اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے دادی

میں پتھر تراشے اور فرعون منجوں والے کے ساتھ! انھوں نے ملکوں میں سراٹھائے

اور ان میں بڑی اودھم مچائی تو تیرے خداوند نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے۔

— بے شک تیرا خداوند گھات میں رہتا ہے (۶-۱۵)

لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا خداوند اس کا امتحان کرتا اور اس

کو عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی

ہے اور جب اس کو جانچتا اور رزق میں کمی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے خداوند

مجھے ذلیل کر ڈالا۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم یموں کی قدر نہیں کرتے اور نہ مسکینوں کو کھلانے

پر ایک دوسرے کو ابھارتے اور دراشت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہو۔ اور مال کے عشق



میں متوالے ہو۔ (۱۶-۲۰)

ہرگز نہیں، اس وقت کو یاد رکھیں جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی اور تیرا خداوند صرف در صف فرشتوں کے جلو میں نمودار ہوگا اور جہنم حاضر کی جائے گی۔ اس دن انسان سوچے گا مگر کیا حاصل اس سوچنے کا! کہے گا، کاش میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ کر رکھا ہوتا! پس اس دن نہ اس کا سا عذاب کوئی دے سکتا اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا۔ (۲۱-۲۶)

اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ بل جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری بہشت میں۔ (۲۷-۳۰)



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرَةٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسُودُ (۱-۴)

ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ اس دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں کہ اس کائنات کا مدبر حقیقی اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ایک چیز کو نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو اچھل کر دیتا ہے۔ وہی جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھ سکے یا اس کے اختیار میں دخلت کر سکے۔

فَجْرٌ: فجر کی شہادت سے مراد وہ وقت ہے جب رات کی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا اور دن کی روشنی مشرقی افق سے نمودار ہوتی ہے۔ روزے کے احکام کے ضمن میں سورۃ بقرہ میں فرمایا ہے: **كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ** (البقرہ - ۱۸۷: ۲) (اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے)۔ لفظ فجر کے مقابل میں لفظ صبح سے مراد جو وقت ہے وہ نہ صرف فجر پر بلکہ طلوع آفتاب کے بعد کے وقت پر بھی محیط ہے۔ اس لیے **وَالْفَجْرِ** کے ہم معنی صبح کے لفظ سے جہاں قسم کھائی گئی ہے وہاں وضاحت کے لیے الفاظ بڑھائے گئے ہیں، مثلاً **وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسْتَ** (التکویر - ۱۸۰: ۸۱) (شاید ہے صبح جب وہ سانس لیتی ہے) یا **وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ** (المدثر - ۴: ۳۴) (شاید ہے صبح جب وہ ہویدا ہو جائے)۔

یہ معین ہونے کے بعد کہ فجر سے مراد آغاز صبح کا وہ وقت ہے جب شب کی تاریکی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اس آیت میں قسم کا موقع ٹھیک وہی قرار پاتا ہے جو سورۃ مدثر میں ہیں الفاظ دار و ہوا ہے: **وَاللَّيْلِ إِذَا يَدْبُرُهُ الْوَجْهُ** (المدثر - ۴: ۳۲-۳۴) (شاید ہے رات جب وہ منہ پوڑ چکے اور صبح جب وہ نمودار ہو جائے) کہ یہ (قیامت) عظیم حوادث میں سے ہے۔

ہم نے سورۃ مدثر کی تفسیر میں مذکورہ آیت کے ذیل میں واضح کیا ہے کہ رات کی تاریکی جب اپنے ڈیرے ڈالے ہوتی ہے تو اس میں صبح کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ فجر کا وقت ایک بڑے



تغیر کا پیغام لاتا ہے جس میں تاریکی کی بساط لپیٹ دی جاتی اور عالم ایک نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔  
 ٹھیک یہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہوگا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جس کی تاریکی صبح قیامت  
 کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ جس طرح رات کے بعد فجر ایک متعین نظام الاوقات کے تحت نمودار ہوتی  
 ہے اسی طرح ایک وقت آئے گا جب قیامت اچانک وارد ہو جائے گی۔ اس وقت سب دیکھ  
 لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آگئی۔

یہاں دَاَلْفَجْرِ کی قسم سے قرآن نے متنبہ کیا ہے کہ فجر کا وقت ہر روز ظہور قیامت کا مشاہدہ  
 ایک تمثیلی رنگ میں کراتا ہے۔ جس طرح تم رات میں سوتے اور صبح کو آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے  
 ہو اسی طرح مرنے کے بعد تمہارے اوپر وہ وقت بھی آئے گا جب صور پھونکا جائے گا اور تم صبح  
 قیامت کو اٹھ بیٹھو گے اور ایسا محسوس کرو گے کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہو۔ لہذا قیامت  
 کے ظہور کو بعد از امکان نہ سمجھو۔ احادیث میں صبح کو اٹھنے کی جو دعا سکھائی گئی ہے اس میں بھی  
 اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَيَالٍ عَشِيرٍ دس راتوں سے کون سی راتیں مراد ہیں؟ اس سوال کے مختلف جواب ہمارے  
 مفسرین سے منقول ہیں لیکن ان میں سے کسی قول کی کوئی قابل قبول دلیل ان سے منقول نہیں ہے۔  
 ان کی بنیاد محض اس مفروضہ پر ہے کہ یہاں ان کی قسم کھائی گئی ہے اور جس چیز کی قسم کھائی جائے ضرور  
 ہے کہ وہ کوئی مقدس چیز ہو حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ قرآن میں جو قسمیں وارد ہوئی ہیں  
 ان میں سے بیشتر کسی دعویٰ پر دلیل کے طور پر کھائی گئی ہیں۔ ان کے اندر تقدس تلاش کرنے کے  
 بجائے ہمیشہ ان کے استدلالی پہلو پر نظر جانی اور دیکھنا یہ چاہیے کہ زیر بحث دعویٰ کیا ہے اور  
 قسم کس پہلو سے اس پر شہادت ہے۔ نیز قرآن مجید کے ان دوسرے مواقع کو نگاہ میں رکھنا چاہیے  
 جن میں اسی قسم کا مضمون انہی الفاظ یا ان کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

اس سورہ کے عمود کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر غور کیا جائے تو عمود سے مطابقت رکھتے والی بات  
 ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ 'لَيَالٍ عَشِيرٍ' سے چاند کے عروج و محاق کی دس راتیں مراد لی  
 جائیں۔ چونکہ یہاں یہ نقطہ نکرہ کی صورت میں ہے اس وجہ سے ایک ہی ساتھ دس راتیں عروج  
 کی بھی مراد لی جا سکتی ہیں اور دس راتیں زوال کی بھی۔ گویا اس قسم میں چاند کے تدریجی عروج و زوال  
 کی پوری تصویر سامنے رکھ دی گئی ہے۔ سادہ اسلوب میں یہ مضمون سورۃ یس میں یوں بیان  
 ہوا ہے:

وَالْقَدْ مَرَّ زُلَّةٌ مِّنَ الزَّالِ  
 حَتَّىٰ عَادَ الْعُرْجُونَ الْقَدِيمُ  
 اور چاند کے لیے ہم نے مٹریں کھڑا رکھی ہیں  
 یہاں تک کہ (ان منازل کے طے کرنے میں) وہ کھجور



(دلیں - ۳۶ : ۳۹)

کی سوکھی ٹہنی کے مانند ہو کر رہ جاتا ہے

اس آیت میں چاند کی تصویر چشمِ تخیل کے سامنے اس طرح آتی ہے گویا وہ ایک فرمانبردار  
ناقمہ ہے جس کی نیکیں ایک غیبی ساربان کے ہاتھ میں ہے جو اس کو منزل بہ منزل ایک معینِ بلندی  
تک چڑھاتا اور پھر وہاں سے اس کو درجہ بدرجہ اسی طرح اتارتا ہے یہاں تک کہ قطع منازل  
کے اس پر مشقت سفر میں وہ سوکھ کر کاٹا بن کے رہ جاتا ہے۔

قسم کے اسلوب میں یہی حقیقت یوں بھی وارد ہوئی ہے :

وَالْقَمَرُ إِذَا اتَّسَقَ لَكَوْكَبًا طَبَقًا

شام ہے چاند جب وہ کامل ہو جائے

عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق - ۸۴ : ۱۸-۱۹) کہ تم بھی درجہ بدرجہ چرلے ہو گے۔

یہاں قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ  
کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معین پر وگرام اور تدریجی ارتقاء ہوتا ہے۔ قیامت اللہ تعالیٰ کے  
عدل کا بدیہی مقتضی ہے۔ اس کا ظہور تو لازماً ہوگا لیکن ہوگا اپنے وقت پر۔

ان نظائر کی روشنی میں اگر آیت کی توجیہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قرآن نے چاند کے  
عروج و زوال کی ان دس دس راتوں کا حوالہ دیا ہے جن میں چاند کا تغیر نہایت نمایاں ہوتا ہے اور  
وہ دن پر دن سابقہ حالت سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہ تغیر اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے  
اس کائنات کے شہون و حوادث کے ظہور کے لیے ایک تدریج رکھی ہے۔ حاملہ کی بار آوری اور وضع حمل  
میں ایک متعین مدت صرف ہوتی ہے۔ کفار و کاذبین کے جرائم پر اللہ تعالیٰ فوری گرفت نہیں کرتا۔  
بلکہ ان کی رسی دراز کرتا جاتا ہے اور جب یہ مہلت ختم ہوتی ہے بھی ان پر عذاب آتا ہے۔ اسکا  
طرح بحیثیت مجموعی دنیا بھی قیامت کی منزل کی طرف رداں دواں ہے اور بالتدریج اس کی طرف  
پہنچے گی اور یہ ٹھیک اس نظام الاوقات کے مطابق ہوگا جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔

’وَالشَّفْعُ وَالْوَسْطُ‘۔ ’شَفْعُ‘ کے معنی جفت اور ’وَسْطُ‘ کے معنی طاق کے ہیں جفت اور

طاق سے مراد اس کے جواب میں مفسرین سے اتنے اقوال منقول ہیں کہ ان کا استقصار

مشکل ہے۔ اقوال کی اس کثرت کی وجہ ہمارے نزدیک وہی ہے کہ لوگوں نے نظمِ کلام اور سیاق و

سباق کو پیش نظر رکھنے کے بجائے ساری توجہ صرف اس امر پر مرکوز رکھی کہ کسی مقدس چیز کو ان الفاظ کا

مصدق بنائیں۔ حالانکہ اگر نظر شہادت کے پہلو پر ہوتی تو غور کرنے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی آسان راہ

یہ تھی کہ ان مقامات پر نظر ڈالی جاتی جہاں قرآن نے ہر شے کے جوڑے جوڑے پیدا کیے جانے

کا ذکر کیا ہے اور اس سے حکمت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے مثلاً فرمایا ہے

’وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا ذَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ‘ (الذاریت - ۵۱ : ۴۹) (اور ہم نے ہر چیز کے اندر سے



جوڑے پیدا کیے تاکہ قیام و دہانی حاصل کر دے۔

ہر جوڑا دو طاقتوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوتے ہیں کہ ہر چیز ایک پہلو سے طاق ہے اور دوسرے پہلو سے جفت۔ اس امر واقعی کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن نے اس کائنات کے متعدد جوڑوں — زمین و آسمان، ظلمت و نور، دھوپ اور چھاؤں، نرا و مادہ — کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس سے نہایت اہم نتائج کی جیسا کہ 'لَعَلَّكُمْ تَتَذَكَّرُونَ' سے اشارہ لگتا ہے یاد دہانی فرمائی ہے، مثلاً اس حقیقت کی یاد دہانی کہ جب ہر چیز اپنے وجود کے اندر ایک ایسا خلا رکھتی ہے جو اس جوڑے سے مل کر ہی بھرتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنی غایت کو نہیں پہنچتی تو لازماً ایک ایسی کامل الوجود اور ہر نقص سے پاک ہستی ان اجزائے مختلفہ سے بالاتر موجود ہے جس کی حکمت و قدرت ان کے اندر ربط و اتصال اور سازگاری و ہم آمیزی پیدا کرتی اور ان کو با غایت و با مقصد بناتی ہے۔ اس ہستی کا اپنے وجود میں کامل اور ہر نقص سے پاک ہونا لازمی ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہوگی تو وہ اپنے سے بالاتر کی محتاج بن جائے گی اور یہ سلسلہ کہیں منقطع نہیں ہوگا۔ دوسرے اس حقیقت کی یاد دہانی کہ ہماری یہ دنیا بھی بحیثیت مجموعی اپنے وجود کے اندر اسی طرح ایک خلا رکھتی ہے جس طرح اس کے تمام اجزائے مختلفہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور یہ خلا اس وقت تک نہیں بھرتا جب تک اس کے ساتھ آخرت کو نہ مانے۔ اس کو نہ مانے تو یہ دنیا ایک حکیم کا بنایا ہوا کارخانہ نہیں بلکہ ایک کھلے ڈرے کا کھیل اور نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

جفت و طاق کا ذکر دس راتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے اور دس راتیں ہمارے نزدیک چاند کے عروج و محاق کی ہیں جو اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں کہ ہر چیز کی باگ اللہ وحدہ لا شریک کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ بعض پہلوؤں میں یہ راتیں جفت ہوتی ہیں بعض میں طاق لیکن کسی کے امکان میں نہیں کہ وہ جنت کو طاق یا طاق کو جنت بنا دے خواہ اس کی کتنی ہی تمنا رکھتا ہو۔ عید کے چاند کے لیے لوگ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں کہ اُمّیس کو نظر آجائے لیکن وہ تعمیل اپنے رب ہی کے حکم کی کرتا ہے، لوگوں کے جذبہ شوق اور جوش استقبال کی اسے ذرا پروا نہیں ہوتی۔

وَالْيُسْرُ إِذَا يَسُرُّ (۴)

یہ آخر میں رات کی شہادت پیش کی ہے اور اس کے ساتھ 'إِذَا يَسُرُّ' کی قید ہے یعنی خاص رات کی طور پر اس کے اس وقت کی طرف توجہ دلائی ہے جب وہ رخصت ہونے کے لیے چل کھڑی ہوتی ہے اور اُفق میں فجر کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس پر قرآن کے نظائر کی روشنی میں غور کیجیے، تو یہ نہایت اہم حقائق کی یاد دہانی کرتی ہے۔



ایک نواس حقیقت کی یاد دہانی کہ اس کائنات کے تمام عناصر مختلف خالق کائنات کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ رات آتی ہے تو بظاہر اس کا تسلط ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ کسی طرف سے دن کے نمودار ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن بالآخر اس تاریکی کے اندر سے ایک سفید دھاری مشرق سے نمایاں ہونی شروع ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ رات پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ سورج نمودار ہو جاتا ہے اور ظلمت شب کو اپنا بوریا بستر سنبھالنا پڑتا ہے۔ رات کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اس کی راہ روک کر کھڑی ہو جائے۔

دوسری یہ کہ رات کے رخصت ہونے اور دن کے جلوہ نما ہونے میں ان لوگوں کے لیے ظہور قیامت کی ایک تمثیل ہے جو قیامت کو بعد از امکان سمجھتے ہیں۔ اس کی تفصیل اور پرکڑ چکی ہے۔ تیسری ان لوگوں کو جو قیامت کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر یہ آنے والی ہے بھی تو ابھی اتنی دور ہے کہ اس کا خوف ذہنوں پر مسلط کر لینا کوئی دانش مندی نہیں، اس حقیقت کی یاد دہانی کہ خدا کے ہاں یہ دنیا اپنے انجام کے اسی طرح قریب آگئی ہے جس طرح سحر کے وقت بس اتنی سی کسر رہ جاتی ہے کہ کب سپید صبح نمودار ہو اور رات کی گیرائی ختم ہو جائے۔ انسان اس معاملہ کو اپنی محدود نظر سے دیکھتا اور اپنے منٹ سینکڑ کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دنیا پر جو نہیں معلوم کب سے انسان و حیوان، چرند و پرند سب کو ایک گہوارہ مہیا کیے ہوئے ہے، کوئی ایسی آفت آسکتی ہے جو اس کے نظام ہی کو تہ و بالا کر کے رکھ دے۔ لیکن خدا کے نظام میں صورت حال بالکل مختلف ہے، وہ قیامت کو دنیا کے پشت پا پر دیکھ رہا ہے۔ اس کے پیمانوں کے لحاظ سے قیامت بس آیا ہی چاہتی ہے۔ اسی حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ میں اور قیامت ساتھ ساتھ دو انگلیوں کی طرح ہیں۔

علاوہ ازیں اِذَا يَسِرُّكَ الْفَاطِطُ کے اندر ایک لطیف شہادت بھی ہے کہ کسی آدمائش کو بھی ایسی بلانہ سمجھو جو کبھی جان چھوڑے گی ہی نہیں۔ اس دنیا میں جس طرح فجر کا طلوع ہونا اور رات کا آنے کے بعد چلا جانا مشاہدہ کرتے ہو اور دیکھتے ہو کہ قدرت ان میں سے کسی کو بھی اس سے زیادہ ٹمکنے کا موقع نہیں دیتی جتنا اس کی دنیا کی مصلحت کے لیے ضروری ہے اسی طرح ٹیسر اور عسرا رنج اور راحت کی صورت میں جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ بھی انسان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے پیش آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو بس اتنی ہی دیر کے لیے مہلت دیتا ہے جتنی بندے کی تربیت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ انسان کو ان میں سے نہ کسی سے یا پس ہونا چاہیے نہ مفور، بلکہ ان کا مواجمہ صبر اور شکر کے ساتھ کرنا چاہیے اور بہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر آزمائش میں اس کے لیے خیر مضمون ہے۔



آیات اناہم پر مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ 'وَالْفَقِيرُ' اور 'وَالْمَلِيْلُ' اذًا یَسُو کی دونوں قسمیں دو متقابل چیزوں کی ہیں اور یح کی دو قسموں — 'وَلِيْلٍ عَشِيْرٍ' اور 'وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ' — کا تعلق ان دو متقابل چیزوں کے درمیان کی دو عظیم نشانیوں سے ہے جو اس دعوے پر دلیل ہیں جس کی طرف ہم نے آغازِ فصل میں اشارہ کیا ہے چونکہ ان آیات میں بنیادی حیثیت پہلی اور آخری دو قسموں کو حاصل ہے، باقی دو قسموں کی حیثیت ان کے توابع کی ہے، اس لیے بحث کی تکمیل کے لیے ہم ان دعاوی کی یاد دہانی بھی ضروری سمجھتے ہیں جن پر قرآن نے رات اور دن، صبح اور شام، تاریکی اور روشنی کے تضادات سے استدلال کیا ہے۔

• ان تضادات سے پہلی دلیل تو قرآن نے توحید پر قائم کی ہے اور جگہ جگہ یہ دکھایا ہے کہ یوں بظاہر تو یہ دنیا اپنے ہر گوشے میں تضاد کی ایک زرم گام ہے جس کا فطری نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ یہ وجود میں آ ہی نہیں سکتی اور آ بھی جاتی تو فوراً درہم برہم ہو جاتی لیکن تدبیر و تفکر کی نظر سے دیکھیے تو یہ حقیقت بالکل روشن ہے کہ ان تضادات کے اندر باہم دگر نہایت گہری موافقت و سازگاری ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ اس کے تضاد و عناصر باہمی تفاعل و تعاون سے نہایت صالح نتائج پیدا کرتے ہیں جو اس کے قیام و بقا کا ذریعہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان تضادات میں یہ توافق کون پیدا کرتا ہے؟ اس کا واحد صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ایک علیم و خبیر، حکیم و بصیر اور قوی و مقتدر ہستی ان تضادات سے بالاتر ہے جو ان کو باہم دگر جوڑتی، ایک حکیمانہ تناسب سے ان میں باہم تالیف و امتزاج پیدا کرتی اور پھر ان سے وہ صالح نتائج وجود میں لاتی ہے جو اس دنیا کے قیام و بقا کا ذریعہ ہیں اور لازماً وہ ایک ہی ہے اس لیے کہ اگر دوسرے ارادے بھی اس کی مزاحمت کرنے والے موجود ہوتے تو یہ دنیا تباہ ہو جاتی۔ 'لَوْ كَانَ فِيْهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا' (الانبیاء: ۲۱-۲۲)۔

• دوسری دلیل اس سے تو ان نے قیامت پر قائم فرمائی ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ یوں ہے کہ اس دنیا میں اس کے خالق نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت کو پہنچتی ہے۔ بغیر اس کے نہ وہ اپنی غایت کو پہنچتی اور نہ اس کے بدون اس کے وجود کی کوئی معقول توجیہ ہو سکتی بلکہ اس کے اندر ایسا خلا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عاقل مجبور ہو جاتا ہے کہ اس پر وہ ایک کا رعبث ہونے کا حکم لگائے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی حکم اس دنیا پر بھی لگ سکتا ہے اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ بلائیے کیونکہ اس کے اندر ایک ایسا خلا رہ جاتا ہے جو آخرت کو مانے بغیر کسی طرح بھی نہیں بھرتا۔ اس میں نیکی اور بدی، عدل اور ظلم میں ہر وقت، جو کشمکش برپا ہے اس کا فطری مطالبہ یہ ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا روز انصاف آئے



جس میں اس کا خالق پورے اقتدار کا اہل علم اور کامل مدد کے ساتھ لوگوں کا محاسبہ کرے۔ پھر اپنے اچھے بندوں کو صلہ دے اور وہ لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں جنہوں نے اس کی دنیا میں دھاندلی مچائی۔ اگر اس کے بغیر یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے، ایک دن یوں ہی ختم ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس کے خالق کے نزدیک خیر اور شر، نیک اور بد دونوں یکساں ہیں اور اس کا پیدا کیا جانا کوئی حکیمانہ فعل نہیں بلکہ ایک کارِ عبث اور کسی گھنڈے کا کھیل ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قیامت کے گھٹلا والوں کے سامنے یہ سوال رکھا گیا ہے کہ أَفَجَعَلُ الْمُؤْمِنِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۚ مَا تَكْفُرُونَ ۚ (النمل: ۲۸-۳۵) کیا ہم اپنے اطاعت شعار بندوں اور مجرموں کو یکساں کر دیں گے، تم کو کیا ہو گیا ہے، کیسے بے عقلی کے فیصلے کرتے ہو؟ اس مسئلہ پر سورہ مدثر کی آیاتِ قسم کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

— تیسری حقیقت اس سے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمائی ہے کہ جس طرح انسان کے مادی وجود کی بقا کے لیے دن کی روشنی اور حرارت بھی ضروری ہے اور رات کی خفگی اور تاریکی بھی، اسی طرح اس کی اخلاقی و روحانی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یسر و عسر، شگ و فراخی، صحت اور مرض کی آزمائشوں سے گزرا جائے تاکہ اس کے صبر و شکر کی تربیت ہو اور وہ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً کا مقام حاصل کرنے کا اہل بنے۔ قرآن میں یہ حکمت جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ آگے اس سورہ میں بھی اس کی وضاحت آرہی ہے اور خدا نے چاہا تو ہم سورہ ضحیٰ میں وَالضُّحٰی ۝ وَاللَّیْلِ اِذَا سَجَتْ (۱-۲) کے تحت بھی اس مسئلہ پر بحث کریں گے۔

— چوتھی حقیقت ان سے یہ واضح فرمائی گئی ہے کہ ان اعداد میں سے کسی کو بھی خدا نے بگٹ نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہر ایک کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی اپنے حدود سے سرمو تجاوز کر سکے۔ وہ خود اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ آزاد نہیں بلکہ خلق کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ رات آتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دے اور خلق کو دن کی روشنی اور آفتاب کی حرارت سے محروم رکھے بلکہ ایک مقررہ وقت کے اندر گھنٹہ اوپر سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ لازماً اسے اپنے ڈیرے اٹھانے اور دن کی روشنی کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح سورج طلوع ہوتا ہے تو اسے بھی لازماً متعین گھنٹوں کے بعد افق سے غائب ہونا پڑتا ہے، وہ یہ نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ کے لیے ہمارے سروں پر مستط ہو جائے، شب کی خفگی اور اس کے سکون سے ہمیں محروم کر دے۔ یہ شاید ہر شخص کرتا ہے اور یہ بدیہی شہادت ہے اس بات کی کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے کنٹرول میں ہے، وہی اس کو کھولتا بھی ہے اور وہی باندھتا بھی ہے۔ اس سے یہ بدیہی نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ کسی کو بھی، خواہ وہ کتنا ہی زور و اثر رکھنے والا ہو، خدا کی ٹھیل



سے اس گھنڈ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر ہے۔ جب سورج اور چاند، رات اور دن اس کے کنٹرول سے باہر نہیں تو انسان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ اپنے کو اس کے حیطہ اقتدار سے باہر سمجھے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف سلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ سورہ قصص میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَوْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَهُ غَيْرَ اللَّهِ  
يَأْتِيكُمْ بُضْيَاءٌ وَأَفْلَا تَسْمَعُونَ  
قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَوْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ  
مَنْ إِلَهُ غَيْرَ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بَلِيلٌ ....  
(المقصص - ۲۸، ۲۹، ۳۰-۳۱)

کہہ دو، تاؤ اگر اللہ تم پر قیامت تک برابر رات ہی مستطی کے رکھے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے ذرا سی روشنی لاسکے! تو کیا تم سنتے نہیں!! پوچھو، اگر اللہ تمہارے اوپر دن کو برابر قیامت تک کے لیے مستطی کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے ایک ہی رات لاسکے۔

اس سورہ کی قسموں میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ پہلو زیادہ نمایاں ہے اس وجہ سے اس کو خاص طور پر نگاہ میں رکھیے۔

هَلْ تَقِي فِرَارَكَ تَسْمَعُ لِدَىٰ حَجْرٍ (۵)

”حَجْرٌ“ کے معنی عقل کے ہیں۔ لفظ ”حَجْرٌ“ اور ”عقل“ دونوں کا لغوی مفہوم قریب قریب ایک ہی انسان کے ہے۔ ان دونوں ہی کے اندر روکنے اور باندھنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ عقل انسان کو ان چیزوں سے باز رکھنے کے لیے ایک باطنی لگام ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہیں اس وجہ سے اس کو ”حَجْرٌ“ کا فطری تقاضا سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اس آیت کا استفہامیسا سلوب اپنے اندر زبرد ملامت کا مفہوم بھی رکھتا ہے اور اتمامِ حجت کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے عقل جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ ان نشانیوں سے سبق حاصل کرے جو اس کے گرد پیش پھیلی ہوئی زبانِ حال سے اصلی راہ اور منزل کی نشان دہی کر رہی ہیں نہ کہ اس بات پر ضد کرے کہ جب وہ منزل سامنے آجائے گی تب وہ مانے گا کہ بے شک جن لوگوں نے اس سے خبردار کیا تھا انھوں نے سچ کہا تھا۔ اس وقت مانا بھی تو حسرت کے سوا اس کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا! یہ مضمون اسی سورہ کی آیات ۲۳-۲۴ میں آگے آ رہا ہے، وہاں، ان شاء اللہ، اس کی وضاحت ہوگی۔

اتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار ہیں جن کی طرف ان کو توجہ دلائی جا چکی ہے لیکن



ان میں سے کوئی نشانی بھی ان کو قائل کرنے والی نہ بنی۔ اب یہ وہ نشانیاں ان کے سامنے رکھی گئی ہیں جو سب سے زیادہ واضح اور قریب ہیں اور اہل عقل کے لیے ان کے اندر بہت بڑی شہادت موجود ہے۔ لیکن یہ مہٹا دھرم ان سے بھی فائدہ اٹھانے والے نہیں ہیں۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۱﴾ اِذْ مَرَّٰتِ الْاِمْصَادِ ﴿۲﴾ اَلَّتِي كَانَتْ تَكْفُرُ  
مِثْلَهَا فِي الْاِمْصَادِ ﴿۳﴾ (۶-۸)

تاریخ کی شہادت  
اوپر کی آفاقی نشانیوں کی شہادت کے بعد یہ قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کی شہادت بھی یہی ہے کہ اس دنیا کا خالق اس میں ابھرنے والی قوموں کے رویہ سے بے تعلقی نہیں رہتا بلکہ وہ برابر گھات لگائے ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ جب وہ بے راہ ہوتی ہیں تو وہ اپنی حکمت کے تحت ایک خاص مدت تک ان کو مہلت تو ضرور دیتا ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لیں، اگر اصلاح کرنی چاہیں ورنہ اپنا پیمانہ بھر لیں۔ پھر وہ ان کو پکڑتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کی ہستی ہی مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ اس بات کی صاف شہادت ہے کہ اس مجموعی دنیا کے لیے بھی ایک روز حساب آئے گا جس میں ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہوگا۔ پھر جو انعام کے مستحق ہوں گے وہ بھر لوں انعام پائیں گے اور جو سزا کے مستحق ٹھہریں گے وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔

عَاد کا ذکر پچاس سورتوں میں، بار بار مختلف پہلوؤں سے گزر چکا ہے، یہاں ان کا ذکر اِذْ مَرَّٰتِ الْاِمْصَادِ کے ساتھ ہوا ہے۔ اِذْ مَرَّٰتِ الْاِمْصَادِ کے ان اجداد میں سے ہیں جن سے ان کی عساکر اور تعمیری ترقیوں کا آغاز ہوا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو اِزْم بن سام بن نوح سے چلی۔

عِصَاد، اونچے ستونوں کو کہتے ہیں۔ یہ ان کی تعمیری ترقیوں کی تعبیر کے لیے اسی طرح کا کنا ہے جس طرح سورہ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے جو دو کرم کی تعبیر حِجَاتِ کا لُجَابِ وَقَدْ وَرَّثَ سَبِيلَهُ (سبا - ۲۴: ۱۳) کے الفاظ سے کی گئی ہے۔

قوم عاد نے سنگ تراشی کے آرٹ میں بہت ترقی کی۔ پہاڑوں کو تراشا کر ان کے اندر انھوں نے نہایت خوبصورت ایوان و محل بنوائے۔ ان کے امراء کا خاص ذوق یہ تھا کہ ہر اونچی جگہ پر ان کی کوئی یادگار تعمیر ہو جائے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے اس مہرمانہ اور نمائش پسندانہ شوقِ تعمیر پر ان کو ملامت بھی فرمائی۔

ملہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حوضوں کے مانند لگن اور لنگر انداز رہنے والی دیگوں کا ذکر ان کی فیاضی اور غرباء پروردی کی شہادت کے طور پر ہوا ہے۔



اَلَّتِي كُنْتُ يُخَلِّقُ مِثْلَهَا فِي الْبِلَادِ: تعبیری ترقیوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنے قد و قامت اور زور و قوت کے لحاظ سے بھی نہایت نمایاں تھے۔ ان سے پہلے یا ان کی معاصر قوموں میں سے کوئی قوم ان کی برابری نہ کر سکی۔

وَكُنُودًا الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۹)

عاد کے بعد یہ بالاجمال ثمود کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔ یہ لوگ عاد ہی کے بقایا میں سے تھے اور تعمیر و تمدن کے شوق میں ان کے وارث ہوئے۔ چنانچہ ان کو عادیثا نیہ بھی کہا گیا ہے۔ (۱۰) ادا القریٰ، ان کا مسکن تھی۔ اس کے پہاڑوں میں انھوں نے اپنے اسلاف کے طریقہ پر پہاڑوں کو تراش تراش کر اپنے لیے گھر بنائے جس کی طرف جَابُوا الصَّخْرَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَارِ (۱۰)

اقوامِ بائدہ کی تباہی کے بعد یہ فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کی طرف توجہ دلائی۔ ذی الْأَوْتَارِ کے لفظی معنی تو میخوں والے کے ہیں لیکن یہاں اوتار بطریق کنایہ فرعون کی فوجوں کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ فوجیں بالعموم خیموں میں رہتی ہیں اور خیمے میخوں سے نصب کیے جاتے ہیں اس وجہ سے عربی میں یہ تعبیر معروف ہے۔ فرعون کی فوجوں کی کثرت کا ذکر تورات میں بھی ہے اور قرآن میں بھی جگہ جگہ مثلاً — یونس، ط، القصص، اور الذاریت — میں آیا ہے۔ قدیم زمانے میں مستقل فوجیں رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ حملہ یا دفاع کی ضرورت کے لیے قبیلوں اور خاندانوں کے نوجوان بالکل وقت کے وقت اپنی خدمات پیش کرتے اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد منتشر ہو جاتے لیکن فرعون نے تورات سے معلوم ہوتا ہے، ملک کی حفاظت کے لیے مستقل فوج قائم کی جو مملکت کے مختلف حصوں میں برابر، اپنے ڈیروں خیموں کے ساتھ گشت کرتی رہتی۔ اس نے اپنے نوابوں اور امراء پر بھی یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ ایک خاص تعداد میں اسلحہ اکھوڑے اور رتھ تیار رکھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر حکومت کی مؤثر خدمت کر سکیں۔ اسی خصوصی امتیاز کی بنا پر فرعون کو ذی الْأَوْتَارِ کہا گیا۔

الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ

أَنْتَ سَوْطَ عَذَابٍ (۱۱-۱۳)

یہ ان قوموں کے اس رویہ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نجشی ہوئی حکمت اور اس کے عطیہ کیے ہوئے وسائل و ذرائع کو پا کر اپنے اپنے ملکوں میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ انھوں نے طغیان کی روش اختیار کر لی۔ یعنی وہ خدا سے بالکل بے نیاز و بے خوف ہو کر اس کھنڈ میں مبتلا ہو گئیں کہ انھیں جو کچھ حاصل ہے یہ ان کی اپنی ذاتی قابلیت و کارکردگی کا کرشمہ ہے جس میں



وہ ہر قسم کے تصرف کی مجاز ہیں۔ مالی وجاہ نہ ان کو کسی کا بخشا ہوا ملا ہے، نہ اس کو کوئی ان سے چھین سکتا اور نہ اس کے باب میں وہ کسی کے آگے مسئول ہیں۔

﴿اَكْثَرُ وَاَفْيَا الْفَسَادَ﴾ یہ مذکورہ بالا طغیان کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جانے کے بعد ان کے تدم زندگی کی صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے۔ انھوں نے اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد پھیل گیا۔

﴿تَصَبَّيْكُمْ رَبُّكَ سُوءَ عَذَابٍ﴾ یہ اس فساد کے غلبہ کا انجام بیان ہوا ہے کہ جب ان کے ہر شعبہ زندگی میں فساد سرایت کر گیا تو اس کا قدرتی انجام ان کے سامنے اس شکل میں آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کے کوڑے برسادیے۔ یہ عذاب جن جن شکلوں میں آیا اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

توہم کے باب  
میں سنت الہی

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ جب کسی قوم کو اپنی زمین میں اقتدار و اختیار بخشا ہے تو اس کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیا کرتا بلکہ وہ اس کی نگرانی کرتا رہتا ہے کہ وہ اس اقتدار کو کس طرح استعمال کرتی ہے۔ اگر وہ اس کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر استعمال کرتی ہے تو اس کو اس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے اور اگر وہ طغیان میں مبتلا ہو کر خدا کے حدود سے باہر نکل جاتی ہے تو اس کو اصلاح یا اتمامِ حجت کے لیے ایک خاص حد تک مہلت ملتی ہے۔ اگر اس مہلت سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ اس کا طغیان و فساد بڑھتا ہی جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فنا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا وجود نہ خود اس کے لیے نافع رہ جاتا نہ دوسروں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ بالکل اٹل ہوتا ہے۔ جب یہ صادر ہو جاتا ہے تو کوئی قوم، خواہ وہ کتنے ہی وسائل و ذرائع کی مالک ہو، نہ اس کی راہ روک سکتی نہ اس کا رخ ہی بدل سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی قوموں کو ان کے دورِ عروج میں پکڑا اور پکڑ کر اس طرح مسل دیا کہ ان کا نام و نشان ہی صفحہ دہر سے مٹ گیا۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِاْلْمُرْصَادِ﴾ (۱۴)

یہ ان تمام قسموں کا جو سورہ کی تمہید میں آئی ہیں اور ان تاریخی سرگزشتوں کا جن کی طرف اوپر اشارہ فرمایا ہے، خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے۔ گویا موقع و محل اور مدعا کے اعتبار سے اس آیت کو سورہ میں منقسم علیہ کی حیثیت حاصل ہے جس کی تاثر آفاق کے آثار بھی کر رہے ہیں اور تاریخ کے واقعات بھی۔

خود بحث

﴿مُرْصَادٌ﴾ گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آفاق اور تاریخ دونوں کے



شواہد اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ کائنات کا خالق اس کو پیدا کر کے اس سے الگ تھلک نہیں باہٹھا ہے بلکہ اس کی نگاہ ایک ایک چیز کی نگرانی کر رہی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس سے اوجھل ہو سکے۔ ہر چیز کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی قوم طغیان کی روش اختیار کرتی ہے تو وہ اس کو مہلت تو ضرور دیتا ہے لیکن اس کی ایک خاص حد مقرر ہوتی ہے جس کو لانگنے کی اجازت وہ نہیں دیتا۔ کوئی قوم اگر اس کو لانگنے کی جرات کرتی ہے تو وہ فوراً اس کو دھرتیا ہے اور پھر کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے چھوٹ سکے۔

یہ صورت حال اس امر کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ ایک حکیم و قدیر کا بسا یا ہوا، ایک یا مقصد و یا غایت کا رخا نہ ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کے ساتھ اس کے خالق کو جو تعلق ہے اور اس کے اندر قوموں کے عزل و نصب کا جو ضابطہ اس نے جاری کر رکھا ہے وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے ساتھ ایک روز جزا و جزا ہے جو لازماً ظہور میں آئے گا اور اس دن ہر شخص جس نے اپنی زندگی اپنے رب کے احکام کے تحت گزاری اپنے رب کی خوشنودی سے نوازا جائے گا اور جس نے اس کو ایک بازو پھٹا اطلاق سمجھ کر اس میں فساد مہیا یا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ ۖ لَا يَقُولُ رَبِّيَ  
أَكْرَمَنِي ۖ وَأَمَّا إِخَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۖ لَا يَقُولُ رَبِّيَ  
أَهَانَنِ (۱۵-۱۶)

یہ اس منالطہ سے پردہ اٹھا یا جس میں مبتلا ہونے والے نعمت پاکر طغیان و فساد کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور جو نعمت سے محروم رہتے ہیں وہ یا اس دنیا امیدی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ منالطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جس کو نعمت کی فراخی حاصل ہوتی ہے وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بڑی قدر و قیمت والا ہے اس وجہ سے اس نے اس کی شان بڑھا رکھی ہے۔ اس کے برعکس جو تنگی رزق میں مبتلا ہوتا ہے وہ گمان کرتا ہے کہ خدا کی نظروں میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اس وجہ سے اس نے اس کو ذلتیں جھیلنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس منالطہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلا فخر و غرور میں مبتلا ہو کر طغیان و فساد کی راہ پر چل پڑتا ہے اور دوسرا مایوسی و نامرادی کا شکار ہو کر یا تو صحیح زندگی بسر کرنے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے یا قسمت آزمائی کی ایسی راہیں اختیار کر لیتا ہے جو اس کو خدا سے نہایت ہی دور لے جا سکتی ہیں اور وہ بالکل شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں انسان کو تنگی کی حالت پیش آئے یا فراخی کی، جو حالت بھی پیش آتی ہے، نہ اس کی سرفرازی کی خاطر پیش آئی نہ اس



کی تزیل و توہین کے لیے بلکہ یہ دونوں ہی بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ کسی کو اللہ فراموشی بخشتا ہے تو اس سے مقصود اس کے شکر کو جانچنا ہوتا ہے کہ دیکھے وہ نعمتیں پا کر مغرور و متکبر اور دوسروں کو حقیر خیال کرنے والا بن جاتا ہے یا اپنے رب کا شکر گزار، فرمانبردار اور اس کے بندوں کا خدمت گزار بن کے زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو اس سے مقصود اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے کہ دیکھے وہ اپنے رب کے فیصلہ پر قانع و مطمئن، حالات کے مقابلہ کے لیے مضبوط و استوار اور اپنے کردار میں نچتہ و پائدار ثابت ہوتا ہے یا حوصلہ ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ انسان کے صبر و شکر کی پختگی ہی پر اس کے تمام دین کی پختگی کا انحصار ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں چیزوں کا امتحان برابر ہوتا رہتا ہے جس نے اپنے اندر یہ دونوں صفات پیدا کر لیں تو اس کو نفس مطمئنہ کی دولت گراں مایہ حاصل ہوگئی اور آگے آپ دیکھیں گے کہ اسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں رَاضِیۃ مَوْضِیۃ کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

كَلَّا بَلْ لَا تَكْفُرُونَ الْيَتِيمَ ۚ وَلَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ ۚ وَ تَأْكُلُونَ السُّؤَاتِ أَكْلًا نَّمًا ۚ وَ تَحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۚ (۲۰-۱۷)

اد پر بات اصولی رنگ میں فرمائی ہے لیکن ان آیات میں مکہ اور طائف کے مالداروں کو براہ راست خطاب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہارا یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے کہ جس کو مال کی فراوانی حاصل ہوتی ہے یہ اس کی عزت افزائی کی دلیل ہے۔ یہ عزت افزائی کے لیے نہیں بلکہ امتحان کے لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اپنی عزت کے پندار میں مبتلا ہو جائے یا اس کو یتیموں، مسکینوں کی خدمت اور ان کے اکرام و تواضع کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ محض تمہاری سفاہت ہے کہ تم خدا کے فضل و احسان کا بالکل الٹا مفہوم لیتے ہو۔ ہونا تو یہ تھا کہ تم اپنے رب کے شکر گزار بنو، یتیموں اور مسکینوں کی خدمت خود بھی کرتے اور دوسروں کو بھی اس پر ابھارتے لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم اپنی عزت کے گھنٹہ میں مبتلا ہو کر یتیموں کو حقیر سمجھتے اور مسکینوں کی مدد سے جی چراتے ہو۔

سوسائٹی میں یتیموں کے لیے یہاں لفظ 'اکرام' استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یتیموں کا مقام کے ہاں مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں مالدار لوگ ان کی کچھ مدد کر دیا کریں بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ سوسائٹی میں ان کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ وہ دھکے کھاتے نہ پھر یں بلکہ جہاں بھی جائیں لوگ ان کو احترام سے دیکھیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ خدا نے ان کو جو مال عطا فرمایا ہے اس کی کوئی وقعت خدا کے ہاں ہے تو اسی شکل میں ہے جب یتیموں کی خدمت کر کے ان کا مال اپنے لیے شرف کا مقام پیدا کرے۔ ورنہ وہ شرف کا ذریعہ نہیں بلکہ وبال اور رسوائی ہے۔



’تَحَصُّوْنَ‘ کے معنی ایک دوسرے کو کسی کام پر ابھارنے اور اکسانے کے ہیں۔ یعنی مسکینوں کے معاملے میں عند اللہ مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ ان کے آگے کچھ نوالے پھینک دیں بلکہ سوسائٹی کے اندر ان کی خدمت کے لیے یہ سرگرمی ہوتی چاہیے کہ ہر صاحبِ مقتدر خود بھی ان کی خدمت کرنے اور دوسروں کو بھی ابھارے۔ یہ نہ ہو کہ نہ خود دے اور نہ دوسروں کو کچھ دینے دے تاکہ اس کی نجی پر پردہ پڑا رہے۔

لفظ طعمائیں یا محدود معنوں میں نہیں بلکہ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ مقصود ان کی ضروریات کا اہتمام ہے۔

دَنَا كَلُونِ الثَّرَاتِ اَكَلًا تَمًا : كَمْ کے معنی جمع کرنے اور سمیٹنے کے ہیں اور رُتَا كَلُونِ عرب جاہلیت  
 یہاں ہڑپ کر جانے کے معنی میں ہے۔ یعنی مال کی محبت میں تم اس قدر اندھے ہو گئے ہو کہ تمہارے  
 اندر جو زور اور عصبیات ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مورث کی چھوڑی ہوئی املاک و جائیداد  
 سب سمیٹ کر وہ تنہا ہڑپ کر جائیں، دوسرے کمزور وارثوں، یہاں تک کہ مورث کے یتیم بیٹوں  
 بیٹیوں کو بھی اس میں سے حصہ نہ ملے۔ عرب جاہلیت میں بھی اگرچہ تقسیم وراثت کا ایک ضابطہ  
 تھا لیکن جس طرح اس زمانے میں اسلام کے نہایت واضح ضابطہ کے باوجود زور و اثر رکھنے والے  
 افراد و عاندل سے باز نہیں آتے بلکہ کھلم کھلا کمزور وارثوں کی حق تلفی کرتے ہیں اسی طرح اس  
 زمانے میں بھی زور آور لوگوں نے ایک من مانا ضابطہ بنا لیا تھا جس میں سارا حق اس کا تھا جو  
 قوی ہو، کمزوروں کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ اس گھنٹے کردار کی تہ میں جو چیز چھپی ہوئی ہے یہ اس کا سراغ دیا ہے۔ فرمایا کہ تمہارے اندر ساری قدر و قیمت بس مال کی رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ انسانیت، شرافت، عدل اور رحم کے جتنے اقدار بھی ہیں وہ سب اس کے نیچے دب کر دم توڑ چکے ہیں۔ مال کی محبت تمہارے دلوں پر اس طرح چھا گئی ہے کہ اب کسی اور اعلیٰ قدر کی اس کے اندر راہ پانے کی کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًا ۖ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۖ وَجِئْتُكُمْ يَوْمَ يَمِيزُ الْيَوْمِ بِذِيئَرَةٍ الْإِنْسَانِ وَالْأَنْثَىٰ ۖ لَا يَذْكُرُ إِلَّا إِلَهُهُ يُقُولُ بَلِيتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي (٢١-٢٢)



”كَلَّا إِذَا فُتِنَتِ الْأَرْضُ دَكَّ دَكَّاً ۚ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ الْأَرْضُ كَلْحَهَا وَسُوَّىٰ ۚ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ الْأَرْضُ كَلْحَهَا وَسُوَّىٰ ۚ“  
ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ جس کو مال ملتا ہے وہ اس خط میں پڑ جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سرفرازی اور عزت افزائی ہوئی ہے حالانکہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی کسی کو ملتی ہے تو سرفرازی کے لیے نہیں بلکہ صرف امتحان کے لیے ملتی ہے۔ ایک دن آٹے کا کہ ہر چیز نیت نالود کر دی جائے گی اور انسان کو صرف اپنے نتائج اعمال سے سابقہ پیش آئے گا۔

”كَذَٰلِكَ الْأَرْضُ“ کے معنی ہیں ”سَوَّىٰ صَوَّوْكَهَا وَهَبَّوْطَهَا“ زمین کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر اس کے تمام نشیب و فراز اور اونچ نیچ برابر کر دیے۔ قیامت کے دن زمین کا جو حال ہوگا اس کی تصویر سورہ کہف میں یوں کھینچی گئی ہے:

”إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۖ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا“  
زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے ہم نے اس کے لیے اس کو سنگھار بنا یا ہے تاکہ ہم امتحان کریں کہ لوگوں میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے اور ایک دن ہم اس سب کو جو اس کے اوپر ہے صفا چٹ

(الکہف - ۷۸-۷۹-۸۰) میدان کر دینے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے محض وقتی سنگھار کے طور پر ہے مقصود اس سے لوگوں کا امتحان ہے کہ لوگ اسی پر کچھ کر رہ جاتے ہیں یا اس کے ساتھ جو آخرت لگی ہوئی ہے اس کی فکر بھی کچھ کرتے ہیں۔ بالآخر ایک دن ایسا آنے والا ہے جب اس کا یہ سارا سنگھار چھین جائے گا۔ نہ اس کے دریا اور پہاڑ باقی رہیں گے، نہ وادی و کسار، نہ باغ و چین رہیں گے اور نہ ایوان و محل۔ صرف صفا چٹ میدان رہ جائے گا۔

”وَجَاعَدْتُكَ وَأَلَمَّا لَكُ صَفًا صَفًا“ یعنی آج تو اللہ تعالیٰ پس پردہ بیٹھا ہوا لوگوں کا امتحان کر رہا ہے لیکن اس دن یہ پردہ اٹھا دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے کرداروں کے جلو میں نمودار ہوگا۔ اس وقت اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر اس طرح لوگوں کے سامنے آ جائے گی کہ کسی کے لیے بھی اس میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کا نمودار ہونا کس طرح ہوگا تو اس کا تعلق احوال آخرت سے ہے جس کی تفصیلات تشابہات میں داخل ہیں ان پر اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔ ان کی زیادہ کھوج کرید کی جائے تو اندیشہ فتنہ میں پڑ جانے کا ہوتا ہے۔

”وَجِئْنَا يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الْمَذْكُورُ“  
یعنی اللہ تعالیٰ کے ظہور کے ساتھ وہ جنت اور دوزخ بھی بے نقاب کر دی جائیں گی جو جزا اور



سزا کے لیے پہلے سے تیار ہیں۔ سورہ میں اصل خطاب چونکہ معاندین سے ہے اس وجہ سے پہلے جہنم کا ذکر فرمایا کہ وہ لائی جائے گی۔ اس کو دیکھتے ہی وہ سارے لوگ، جو آخرت سے بے پروا رہے اپنی محرومی پر سرپیٹ لیں گے اور حسرت سے کہیں گے کہ کاش ہم نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ کر لیا ہوتا۔ فرمایا کہ یہ چیز پہلے ہی سوچنے اور کرنے کی تھی۔ جب وہ یہاں اس کو نہ چیت سکیں گے تو اتنی دور جا کر وہ اس کو چیتیں گے تو اس سے حسرت کے سوا اور کیا حاصل ہوگا!

’لَقَوْلٌ لِّيَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي‘ یہ وضاحت ہے اس چیتنے کی جس کی طرف اوپر والی آیت میں ’يَتَذَكَّرُ إِلَّا نَسَانُ‘ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس دن وہی لوگ جو آج قیامت سے آگاہ کرنے والوں کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں نہایت حسرت و اندوہ کے ہاتھ کہیں گے کہ کاش، اپنی اس زندگی کے لیے ہم نے دنیا کی زندگی میں کچھ کر لیا ہوتا! مطلب یہ ہے کہ وہ اس دن حسرت تو کریں گے لیکن ان کی یہ حسرت بے سود رہے گی۔ اس کی تلافی کا وقت گزر چکا ہوگا۔

فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابُهُ أَحَدًا وَلَا يُوثِقُ وِثْقَاهُ أَحَدًا (۲۵-۲۶)

یہ اس دن کے عذاب کی شدت اور بے پناہی کا بیان ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ جو عذاب دے گا اس طرح کا عذاب کوئی نہیں دے سکتا اور جس طرح کا باندھنا وہ باندھے گا اس طرح کا باندھنا کوئی نہیں باندھ سکتا۔ یہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ اس لیے کہ اس دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کی طرح اس کی تکلیفیں اور اذیتیں بھی فانی اور وقتی ہیں۔ بڑی سے بڑی تکلیف بھی کوئی دے گا تو موت بہر حال اس کو ختم کر سکتی ہے اسی طرح طویل سے طویل قید میں بھی کوئی ڈالے گا تو موت کا فرشتہ اس سے بھی رہائی دلا سکتا ہے لیکن آخرت کے عذاب اور اس کی قید سے رہائی دلانے کے لیے وہاں موت بھی نہیں ہوگی۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اذْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّتِي (۲۷-۳۰)

اس دن متحقین جنت کو جو بشارت براہ راست رب کریم کی طرف سے ملے گی یہ اس کی طرف متحقین اشارہ ہے۔ یہاں خاص ترجمہ کی چیز ’يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ‘ کا خطاب ہے جس سے جنت کے متحقین کو نوازا جائے گا۔ اس خطاب سے ان کے نفس کی اس خاص صفت پر روشنی پڑ رہی ہے براہ راست جس کی بنا پر وہ جنت کے مفدار قرار پائیں گے۔ اوپر آیات ۱۵-۱۶ میں ان تنک ظرفوں اور ٹھنڈوں کا حال بیان ہوا تھا جن کو نعمت ملتی ہے تو وہ بہک کر اترنے اور فخر کرنے والے بن جاتے ہیں اور جب ذرا تنگی رزق کی آزمائش پیش آجائے تو بالکل دل شکستہ ہو کر خدا سے مایوس اور شکاکی بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا انجام بیان ہوا۔ اب اس کے مقابل میں ان لوگوں کا حال اور انجام بیان



ہو رہا ہے جن کے قدم تنگی اور فراخی دونوں طرح کے حالات میں جادہ سختی پر استوار رہتے ہیں۔ نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اپنے شکر کا امتحان سمجھتے ہیں اور طغیان و فساد میں مبتلا ہونے کے بجائے کوشش کرتے ہیں کہ اپنے رب کے امتحان میں پورے اتریں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے وہ بھی اللہ کے بندوں پر احسان کریں۔ اسی طرح اگر ان کو تنگی رزق سے سابقہ پیش آتا ہے تو بے حوصلہ اور اپنے رب سے مایوس ہونے کے بجائے اس کو وہ اپنے صبر کا امتحان سمجھتے ہیں اور جان کی بازی لگا کر کوشش کرتے ہیں کہ اس امتحان سے سرخرو نکلیں، نہ دنیا میں ان کو اپنے ضمیر کے آگے شرمندہ ہونا پڑے نہ آخرت میں اپنے رب کے آگے۔ ان لوگوں کا دل چونکہ عسروئیس اور نرمی و سختی دونوں طرح کے حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن اور ڈانواں ڈول ہونے سے محفوظ رہتا ہے اس وجہ سے اس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہی لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہوں گے۔

”رَاجِعِي إِلَىٰ ذِيكَ رَاحِيَةً مَّرْضِيَّةً“ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین کا کلمہ ہے۔ ان لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد ہو گا کہ شاباش! تمہارے رب نے جس میدان امتحان میں تمہیں اتارا اس میں تمہاری بازی نہایت کامیاب رہی۔ اب تم اپنے رب کی طرف اس سرخروئی کے ساتھ لوٹو کہ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ہر طرح کے نرم و گرم حالات میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے اور ساتھ ہی تمہیں یہ سرفرازی بھی حاصل ہوئی کہ تم اپنے رب کی نظروں میں بھی پسندیدہ ٹھہرے۔ جس طرح تم اپنے رب سے کسی مرحلے میں گلہ مند نہیں ہوئے اسی طرح تمہارے رب نے تم کو بھی کسی مرحلے میں اپنے معیار سے فروتر نہیں پایا۔ تم اس سے راضی وہ تم سے راضی! ”فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّتِي“ یعنی تم امتحان پاس کر کے جنت کے مستحق ٹھہرے تو اب میرے خاص بندوں کے زمرے میں اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔

توفیق ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمدا للہ علی احسانہ۔

لاہور

۱۴۔ دسمبر ۱۹۶۹ء

۲۴۔ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ



تذکرہ قرآن

۹۰

البلد







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— الفجر ————— کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں انسان کی اس غلط فہمی پر متنبہ فرمایا گیا ہے کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ یہ خیال کر کے اکڑنے اور اترا نے لگتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی عزت افزائی فرمائی ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آ جاتی ہے تو بالوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی حق تلفی ہوئی ہے اور خدا نے اس کو ذلیل کر دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی حالت بھی نہ عزت افزائی کے لیے پیش آتی نہ ذلیل کرنے کے لیے بلکہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ بندے کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ نہ نعمت پا کر اکڑنے والا بنے نہ اس سے محروم ہو کر دل شکستہ و بالوس ہو بلکہ نعمت ملے تو اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنے اور اس نعمت میں اللہ کے دوسرے عاجمذ بندوں کو شریک کرے اور اگر کوئی اقتاد پیش آئے تو اپنی محرومی کا رونا روتے اور خدا کو کوسنے کے بجائے فیصلہ تقدیر پر صابر و راضی رہے۔ جو بندہ یہ روش اختیار کرتا ہے اس کا نفس نفس مطمئنہ ہے اور آخرت میں اس کو نَاصِیۃً مُّوَضَّیۃً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

اس سورہ میں اسی کلیہ کو قریش پر منطبق کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ سرزمین ————— سرزمین مکہ ————— اس زمانے میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا ہے، رزق کے وسائل سے بھی محروم تھی اور امن سے بھی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے رزق اور امن کی جو دعا فرمائی اس کی برکت سے یہاں رزق کی بھی فراوانی ہوئی اور امن کے اعتبار سے بھی اس علاقے کا یہ حال ہوا کہ یہاں کسی انسان تو درکنار کسی جانور کو بھی دکھ پہنچا ناگناہ ٹھہرا۔ اسی امن اور رزق کا یہ فیض ہے کہ اولاد اسماعیل یہاں خوب پھلی پھولی اور اس پورے ملک پر اس کو سیادت و قیادت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ نعمتیں پا کر اپنی پچھلی تاریخ پر لوگ بھول بیٹھے۔ اب یہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ ان کو



حاصل ہے ان کا پیدا کشتی حق ہے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنا ان کے دلوں پر بہت گراں گزرتا ہے۔ ان کی آنکھیں عبرت نگاہی سے محروم اور زبانیں حق و صبر اور نیکی و احسان کے ذکر سے گنگ ہو چکی ہیں۔ اب ان کا مال ان کی اپنی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کے لیے ہے۔ کوئی نہیں ہے جو یتیموں اور مسکینوں کی خدمت کی راہ میں کوئی قربانی پیش کرنے اور آخرت کی ابدی نائز المرامی حاصل کرنے کا حوصلہ کرے بلکہ سب نے جہنم کی راہ اختیار کر لی ہے۔

یہ سورتیں چونکہ بالکل ابتدائی دعوہ کی ہیں اس وجہ سے ان میں خطاب بھی بالعموم 'يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ' سے ہے اور ان میں جو دعوت یا اپیل ہے وہ بھی تمام تر انسانیت اور اس کے فطری مبادی پر مبنی ہے۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) سرزمین حرم اور بنی اسمعیل کی ابتدائی تاریخ سے اس بات کی شہادت کہ یہ علاقہ بالکل بے آب و گیاہ تھا جس میں زندگی نہایت مشقت کی زندگی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و عافیت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے یہ ایک پُر امن علاقہ بن گیا اور اس کے باشندوں کو رزق و مال کی فراوانی حاصل ہوئی۔

(۵-۷) اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا حق یہ تھا کہ لوگ اس کے شکر گزار اور اس کے غریب بندوں کے ہمدرد و مددگار بنتے لیکن حال یہ ہے کہ اگر راہِ خدا میں ان کو انفاق کی دعوت دی جائے تو کہتے ہیں کہ کہاں تک کوئی خرچ کرے؟ ڈھیروں مال تو اڑا چکے! گویا ان کو گمان ہے کہ خدا ان کی ان شاہ خرچیوں کو دیکھ نہیں رہا ہے!

(۸-۱۷) ان زر پرستوں کو ملامت کہ اللہ نے ان کو آنکھیں دی تھیں کہ ان سے عبرت حاصل کرتے، زبان اور ہونٹ دیے تھے کہ ان سے لوگوں کو یتیموں اور مسکینوں کی اعانت پر ابھارتے، نیکی اور بدی کا امتیاز دیا تھا کہ بدی کی ترغیبات کا مقابلہ کر کے نیکی کے کام کرتے، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرتے، ایمان والوں اور صبر و ہمدردی کی دعوت دینے والوں میں سے بنتے لیکن یہ سب کچھ پا کر وہ اپنے رب کے شکر گزار بننے کے بجائے اپنے نفس اور مالی کے پرستار بن کر بیٹھ رہے۔

(۱۸-۲۰) حالانکہ اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں بڑے اجر کے مستحق ٹھہرتے لیکن انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار اور اپنے لیے دوزخ کی آگ کا سامان کیا۔



# سُورَةُ الْبَلَدِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۲۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أَقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۱ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۲ وَ  
وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ ۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۴  
أَيَحْسَبُ أَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۵ يَقُولُ أَهْلَكْتُ  
مَالًا لُّبَدًا ۶ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۷ أَلَمْ نَجْعَلْ  
لَهُ عَيْنَيْنِ ۸ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۹ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۱۰  
فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۱۱ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۱۲ فَكَّ  
رَقَبَةً ۱۳ أَوْ أَطْعَمُ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۱۴ يَتِيمًا  
ذَا مَقْرَبَةٍ ۱۵ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۱۶ ثُمَّ كَانَ  
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَّاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَّاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۱۷  
أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْيَمِينَةِ ۱۸ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ  
أَصْحَابُ الشُّعْبَةِ ۱۹ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّوصَدَةٌ ۲۰

۱  
۲۰  
۱۵

نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس سرزمین کی — اور تم اسی میں مقیم ہو — ترجمہ آیات

۲۰-۱

اور باپ اور اس کی ذریت کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔ ۱-۴



کیا وہ گمان رکھتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں! کہتا ہے کہ میں نے ڈھیریں  
 مال اڑا دیا! کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں! ۵-۶  
 کیا ہم نے اس کو دوا نکھیں نہیں دیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے  
 اور اس کو دونوں راہیں نہیں سمجھا دیں! پھر اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ  
 کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قربت مند یتیم یا کسی  
 خاک آلود مسکین کو کھلاتا۔ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں  
 نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی خوش بخت لوگ ہیں۔ اور  
 جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ کم نجتی والے ہیں۔ وہ آگ میں موندے ہوئے  
 ہوں گے۔ ۸-۲۰

---



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ (۱)

یہاں 'لَا' اسی طرح آیا ہے جس طرح 'لَا أُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ' (القیمۃ - ۱: ۵) قسم سے پہلے اور بعض دوسرے مقامات میں آیا ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے 'لا' کا محل اس خیالِ باطل کی تردید کے لیے ہے جس کا سابق سورہ میں حوالہ ہے۔ سابق سورہ میں یہ بات استدلال گزر چکی ہے کہ لوگوں کو جب مال و جاہ کی نعمت ملتی ہے تو اس کو اپنی تدبیر و تدبیر کا کرشمہ سمجھ بیٹھتے اور اتراتے ہیں کہ وہ خدا کی نظروں میں بلند مرتبہ ہیں اس وجہ سے اس نے دوسروں کے مقابل میں ان کو یہ سرفراز می بخشا ہے۔ اس خیالِ باطل کی تردید سابق سورہ میں ایک دوسرے پہلو سے ہوئی ہے۔ اس سورہ میں اس کی تردید ایک اور پہلو سے آرہی ہے جس کا آغاز قسم سے ہوا ہے اور اس قسم سے پہلے 'لَا' ان کے زعمِ باطل کی تردید کے لیے ہے۔ گویا ان لوگوں کا یہ خیال اس قدر بے بنیاد اور لغو ہے کہ اس کی تردید میں اتنے توقف کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ دلیل بیان کر لینے کے بعد اس کی نفی کی جائے۔ یہ اسلوبِ کلام ہر زبان میں پایا جاتا اور اس موقع پر اختیار کیا جاتا ہے جب مقصود مخاطب کے خیال کی لغویت کا اظہار ہو۔

قسم یہاں بطور شہادتِ اصل و عوے کی تائید میں کھائی گئی جو آگے 'لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ' اور دوسری قسم 'فَإِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ' کے الفاظ میں مذکور ہے۔

'بِهَذَا الْبَلَدِ' سے مراد سرزمینِ مکہ ہے۔ سورہ تین میں بھی اس کی قسم 'وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ' (التین - ۳: ۹۵) کے الفاظ سے کھائی گئی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری قسموں کی طرح یہ قسم بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرزمینِ حرم کے تقدس کے پہلو سے نہیں بلکہ اس دعوے پر دلیل کے پہلو سے کھائی گئی ہے جو آگے مذکور ہے۔

فَأَنْتَ حِجْلٌ بِنَهْذِ الْبَلَدِ (۲)

یہ جملہ قسم کے بیچ میں، بطور جملہ معترضہ، قسم کی تائید و تصویب کے طور پر ہے۔ ضمیر خطاب ایک برحق کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو سکتے ہیں اور قریش بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں اصل جملہ معترضہ مدعا کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کسی ایسے دور دراز علاقے کی شہادت نہیں پیش کی جا رہی ہے جس کے حالات کا اندازہ کرنے اور جس کی تاریخ کا علم حاصل کرنے



کے لیے کوئی زحمت سفر اٹھانی پڑے بلکہ تم یہاں مقیم اور اس کے ماضی و حاضر سے اچھی طرح باخبر ہو۔ یہ تمہارا امن و مستقر اور تمہارا محبوب وطن ہے۔ اس کی تاریخ تمہاری اپنی ہی تاریخ ہے۔ اس کے گرم و سرد اور خشک و تر و دنوں سے تم گزرے ہوئے ہو۔ اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ حوت حوت حق ہے یا اس میں کوئی مبالغہ یا آلودہ ہے۔

وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ (۳)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کی شہادت جو سرزمینِ مکہ میں آباد ہوئی اور پھر تمام عرب میں پھیلی۔ لفظ 'وَالِد' کی تنکیر تفعیم شان کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور اس کا یہ نائدہ بھی ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مراد لیے جاسکتے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی۔ اسی طرح 'وَمَا وَلَدَ' میں جو تفعیم ہے وہ تمام بنی اسماعیل پر جاری ہے، خواہ ان کا تعلق بنی اسماعیل کی کسی شاخ سے بھی ہو۔

سرزمینِ مکہ کی پھیلی تاریخ کی طرف اشارہ 'لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ' کے معنی مشقت اور شدت کے ہیں۔ لفظ 'إِنْسَان' اگرچہ عام ہے اور اس کے عام ہونے کے کئی فائدے ہیں لیکن یہاں اس عام سے مراد خاص طور پر قرآن کے اولین مخاطب بنی اسماعیل بالخصوص قریش ہیں۔ سرزمینِ حرم میں ان کے بزرگ اجداد کی آدا اور سکونت اور ان کی ذریت کی ابتدائی تاریخ کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ آج اس سرزمین میں تم کو جو فراخی و رزق و رفاہیت حاصل ہے یہ نہ سمجھو کہ یہی حال ہمیشہ سے رہا ہے یا یہ حالت تمہاری ذہانت و قابلیت کی بدولت ہوئی ہے جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا ہے اس وقت یہ علاقہ ایک بالکل بنجر، بے آب و گیاد اور غیر مامون علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی خانہ بدوشی اور نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا اور ہر شخص اپنی زندگی اور اپنے گلے کی حفاظت کا ذمہ دار خود تھا۔ لوگوں کی حفاظت کے لیے کوئی نظام عدل اور قانون موجود نہیں تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا تو ان کے اور ان کی اولاد کے لیے یہ دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس دادی غیر ذی زرع میں ان کو رزق و فضل سے بھی بہرہ مند فرمائے اور امن سے بھی متمتع رکھے۔ یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ رزق کے دروازے بھی کھلے اور بیت اللہ کی تولیت اور اشہر حرم کی امن بخشی کی بدولت سفر و تجارت کی راہیں بھی فراخ ہوئیں جس سے ان کی معاشی حالت مشقت کی جگہ رفاہیت و خوش حالی میں



تبدیل ہو گئی یہاں تک کہ آج تم اس کے غرور میں نہ خدا کو خاطر میں لا رہے ہو نہ اس کے رسول کو بلکہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ جو کچھ تمہیں حاصل ہے یہ تمہارا پیدائشی حق ہے، تم اس میں ہر قسم کے تصرف کے مجاز ہو، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ تمہارے اس عیش اور اس آزادی میں خلل اندازہ ہو سکے۔

قریش کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ حرم کی اس تاریخ کی یاد دہانی کر کے ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر طغیان میں مبتلا ہو گئے تو یاد رکھیں کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی پاؤں میں کلہاڑی ماریں گے۔ سورہ ابراہیم میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے :

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا  
وَجَبِّئْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ  
الْأَصْنَامَ ۚ ذَاكَ النَّهْيُ  
الَّذِي كُفِّرْنَا عَنْهُ مِنَ النَّاسِ  
فَمَا نَكْفُرُ بِهِ فَإِنَّهُمْ  
مِنَ الْغَافِلِينَ ۚ فَتَبِعْنِي  
فَإِنَّهُ مُتَّبِعٌ ۚ وَمَنْ عَصَانِي  
فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۚ  
ذُنُوبَنَا إِنْ أَصْغَرَتْ  
مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ  
ذِي ذُرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ  
الْمُحَرَّمِ لَا رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ  
فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ  
تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ  
الشَّجَرِ ۚ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝

(ابراہیم - ۱۴ : ۳۵-۳۷)

اور جب کہ دعا کی ابراہیم نے اے میرے رب! اس سرزمین کو پُر امن سرزمین بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کی چھوٹ سے آلودہ ہوں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے تو لوگوں کے اندر سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو مغفرت فرمانے اور رحم کرنے والا ہے اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو ایک بن کھیتی کی زمین میں بسایا ہے، تیرے محترم گھر کے پاس، اے رب! اس لیے کہ یہ نماز کا اہتمام کریں تو لوگوں کے دل ان کی طرف تو مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما کہ یہ شکر گزاری کریں۔

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالیں تو ان سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئیں گے :

— یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قریش کو چند ایک غیر آباد اور بنجر علاقے میں جو بسایا تو اس لیے کہ اس کو مشرکانہ ماحول سے دور اور محفوظ رکھیں۔

— اس علاقہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تاکہ ان کی ذریت

قریش کو چند  
حقائق کی  
یاد دہانی



اس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مرکز بنائے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی فرمائی کہ اس مرکز اور ان کی ذریت کو خلق کی مرجعیت حاصل ہو۔

— یہ علاقہ اس وقت زمینی پیداوار اور امن سے بالکل محروم علاقہ تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے باشندوں کے لیے روزی کی فراخی کی بھی دعا فرمائی اور علاقہ کے لیے امن کی بھی۔

مقصود اس تفصیل سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ آج قریش کو جو مال و جاہ اور جو سطوت و اقتدار بھی حاصل ہے اس میں نہ ان کی ذاتی سعی و تدبیر کو کوئی دخل ہے اور نہ ان کے خاندانی استحقاق کو بلکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت ہے جس سے وہ بہرہ مند ہو رہے ہیں اور یہ برکت ان کے لیے غیر مشروط نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، بیت اللہ کے مقصد کی تکمیل اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے رسول پر ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ ان شرطوں کے پابند نہیں گئے تو ان کو یہ عزت و سرفرازی حاصل رہے گی ورنہ یہ سب چھین جائے گی۔

اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے قریش سے سورہ قریش میں مطالبہ فرمایا ہے کہ اگر بیت اللہ کی برکتوں سے وہ بہرہ مند رہنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اس گھر پر قابض اور اس کی برکتوں کے حقدار بنے رہیں۔ فرمایا ہے :

لَا يُفْلِحُ قُرَيْشٌ ۖ اِلٰى فِىْهِمْ رِحْلَةُ  
السَّيِّءِ وَالصَّيْفِ ۚ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ  
هٰذَا الْبَيْتِ ۚ الَّذِىْ اَطْعَمَهُمْ  
مِّنْ جُوعٍ ۚ قَاتَلَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۚ  
بوجہ اس کے کہ قریش کو الفت بخشی  
گئی جاڑے اور گرمی کے سفر کی توان  
کو چاہیے کہ اس گھر کے خداوند کی عبادت  
کریں جس نے قحط میں کھلایا اور خطرے  
سے نچت کیا۔

(القریش ۱-۶ : ۱-۴)

اَيُّسَبُّ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝۵

مطلب یہ ہے کہ جن کو اس سرزمین کی ابتدائی تاریخ معلوم ہے ان کے لیے تو اس کی موجودہ رفاہیت سے اس غلط فہمی میں پڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی

۱۔ بعض دوسری آیات سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے امت و سیادت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ مشروط بشرط تھا۔ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے جو ان کے طریقہ کو چھوڑ بیٹھیں۔



ہیں کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ جس نے ان کو ایک بے آب و گیاہ زمین میں یہ فراوانی و زرق بخشی وہ ان کو جب چاہے تباہ بھی کر سکتا ہے بالخصوص جب کہ انھوں نے اس مقصد کو بھی برباد کر دیا ہے جس کے لیے ان کو یہاں آباد کیا گیا اور جس کی خاطر ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

لَقَوْلُ أَهْلِكُمْ مَا لَا بَدَاءُ اَيْحَسِبُ اَنْ تَحْيِرَكَ اَحَدًا (۷-۶)

اور یہی آیت میں ان کی اس ذہنیت سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس میں مال و جاہ کی فراوانی فاسد ذہنیت نے ان کو مبتلا کر دیا تھا۔ اس آیت میں ان کے اس کردار سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے جو اس فاسد ذہنیت نے ان کے اندر پیدا کیا۔

جن کے اندر یہ گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کو جو مال و جاہ حاصل ہے یہ ان کا پیداؤنی حق اور ان کی قابلیت و ہنر کا کرشمہ ہے، ان کے اندر انفاق کا جذبہ بالکل مردہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ان کو نہ خدا کی پرہیزگاری نہ آخرت کی اس طرح کے لوگ اپنی بنجالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے مستحقین کے سامنے ہمیشہ اپنے وسیع مصارف کا رونا دہنہ رستے میں اور اس طرح ان کو بادر کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں ذاتی مصارف کے علاوہ قومی و اجتماعی مصارف پر اتنا خرچ کرنا پڑتا ہے کہ وسیع ذرائع آمدنی رکھنے کے باوجود مشکل ہی سے کچھ پس انداز ہوتا ہے۔ یہی طریقہ وہ ان لوگوں کو چپ کرنے کو اختیار کرتے ہیں جو ان کو خدا اور آخرت کے نام پر انفاق کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو وہ جواب دیتے ہیں کہ آخر کہاں تک خرچ کیے جائیں! ڈھیروں مال تو اسی طرح کے مصارف پر اٹھا چکے ہیں! مَا لَا بَدَاءُ اَيْحَسِبُ اَنْ تَحْيِرَكَ اَحَدًا کے معنی ہیں کثیر اور ڈھیروں مال۔

اَيْحَسِبُ اَنْ تَحْيِرَكَ اَحَدًا۔ یہ اس طرح کے شیخی بگھارنے والوں کو جواب ہے کہ یہ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کی ان فیاضیوں کو کوئی دیکھ نہیں رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ دیتے دلاتے کوڑی بھی نہیں لیکن اپنی شاد خرچیوں کا اشتہار بہت دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن ان کا یہ تمام زبانی جمع خرچ ان کے آگے بھی آ جائے گا اور خلق کے سامنے بھی۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۚ وَلَسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۚ وَهَدَيْنَا السَّبْعَ دِيْنًا (۸-۱۰)

یعنی یہ لوگ مال و دولت پا کر اسی میں کھوٹے گئے حالانکہ اللہ نے ان کو اس سے بھی بڑی نعمتیں دی تھیں، اگر یہ ان کے بھی تدردان ہوتے تو اس طرح خرف ریزوں کے عشق میں اندھے ہو کر اس ابدی بادشاہی کو نہ گنوا بیٹھتے جو اس فانی دولت کے ذریعے وہ حاصل کر سکتے تھے۔ فرمایا کہ وہ غور کریں کہ کیا ہم نے ان کو دو آنکھیں نہیں دیں کہ وہ ان سے اپنے گرد پیش کا ہاتھ لیں اور



دیکھیں کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو مال و جاہ سے نوازا اور دوسری طرف ان کے آگے پیچھے ایسے یتیم و نادار، غریب و لاچار اور کمزور و بیمار بھی ہیں جو نان شبینہ کو محتاج، تن ٹھکانے سے مجبور، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہم نے آنکھیں دے کر ان کو یہ منظر اس لیے دکھایا کہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے رب کے شکر گزار بنیں کہ اس نے محض اپنے فضل سے ان کو اس طرح کی کسی آزمائش سے محفوظ رکھا اور پھر اس شکر گزاری کا حق یوں ادا کریں کہ پوری نیامنی سے ان ضرورت مندوں پر اپنا وہ مال صرف کریں جو ان کے رب نے اس طرح کے لوگوں کے حق کی حیثیت سے ان کی تحویل میں دیا۔

مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کا کوئی صحیح مصرف ہے تو یہی عبرت نگاہی اور اثر پذیری ہے۔ اگر وہ یہ کام نہ کریں تو ان کے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔

وَلِسَانًا ذَّ شَفِیْتَيْنِ یعنی آنکھوں کے ساتھ اس نے انسان کو ایک زبان اور دو ہونٹ بھی عنایت فرمائے تاکہ وہ جو کچھ دیکھے اور محسوس کرے اس پر خود بھی عمل پیرا ہو اور اپنی زبان سے دوسروں کو بھی اس پر ابھارے تاکہ اس کی تشویق و ترغیب سے دوسروں کے اندر بھی وہ نیکی پھیلے۔ سابق سورہ میں اسی چیز کی طرف وَلَا تَخْضَوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمَسْكِیْنِ (الفجر- ۸۹: ۱۸) اور تم مسکینوں کو کھلانے پر لوگوں کو نہیں ابھارتے کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ اور اس سورہ میں آگے اسی مضمون کی تکمیل ان الفاظ میں کی ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِحُسْنِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَمٰةِ (۱۷) (پھر وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی)۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسان جس نیکی کا احساس کرے اس کے انجام دینے کے لیے خود بھی اقدام کرے اور دوسروں کو بھی اس کے لیے ابھارے۔ یہ چیز اس کے فرائض میں داخل ہے ورنہ اس کی نیکی ادھوری رہ جائے گی۔ معاشرہ سے متعلق بھی ہر شخص پر اس کی صلاحیت کے اعتبار سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کو ادا کیے بغیر کوئی شخص عند اللہ بری نہیں ہو سکتا۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، ان شاء اللہ سورہ عصر کی تفسیر میں تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (العصر- ۳: ۱۳) کے تحت اس پر مفصل بحث آئے گی۔

ایک خاص  
نکتہ  
یہاں ایک ضمنی نکتہ بھی قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ زبان کے ساتھ دو ہونٹوں کا ذکر فرمایا ہے جو زبان کو ادھر ادھر نیچے دونوں طرف سے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز جتنی ہی قیمتی، جتنی ہی اثر آفرین اور جتنے ہی گہرے اور دور رس نتائج پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ اتنی ہی احتیاط سے محفوظ کی جانی ہے تاکہ اس کے استعمال میں کوئی بے احتیاطی اور بے پردائی راہ نہ پائے۔



زبان بھی انسان کے نہایت قیمتی اور موثر اسلحہ میں سے ہے۔ یہ ایک شمشیر جو ہر دار ہے اس وجہ سے قدرت نے اس کو میان میں چھپا کر انسان کو کپڑا یا تاکہ وہ اس کو وہیں میان سے باہر نکالے جہاں وہ ضرورت پیش آئے جس کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہے لیکن یہ عجیب بدتمنی ہے کہ بالعموم لوگ اس سے اصل کام لینے کے بجائے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لیتے ہیں۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ۔ یعنی شاہدہ دشوَر اور نطق و بیان کی صلاحیت دینے کے نیکی اور بدی علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر یہ فضل بھی فرمایا کہ اس کو دونوں راستے بھی دکھا دیے۔ دونوں کا شعور انسان راستے سے اشارہ انہی دونوں راستوں کی طرف ہے جن کا ذکر سورہ دہر میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے: کی فطرت میں کہ

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا  
فَرَّامًا كَفُورًا (الدھر - ۷۶: ۷۷)

ہم نے اس کو راہ بھی دکھا دی۔ چاہے وہ  
شکر کرنے والا بنے یا ناشکر بنے۔

اس سے زیادہ واضح لفظوں میں سورہ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ دَمًا سَوَّكَاهُ خَالِهَهَا  
فُجُورُهَا وَتَقْوَاهَا

اور شاید یہ نفس اور اس کی اعلیٰ ساخت  
پس ہم نے اس کو اہام کر دی اس کی

(الشمس - ۹۱: ۹۰ - ۸)

یہ اسی حقیقت کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم سورہ قیامہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں کہ بدی کا بدی ہونا اور نیکی کا محبوب ہونا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر دو بعیت فرمادیا ہے۔ انسان اگر بدی کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدی کے شعور سے محروم ہے بلکہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بدی کو بدی جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

فَلَا أَفْتَحُ الْعُقَبَةَ ۖ وَمَا أَزِلُّكَ مَا الْعُقَبَةُ (۱۱-۱۲)

اب یہ مخاطبوں کی ناقدری و ناشکری کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعور و ادراک، نعمتوں کی نطق و بیان اور ہدایت کی روشنی سے جو نواز ا تو اس کا حق یہ تھا کہ یہ نیکی اور ہمدردی خلق کی راہ ناقدری پر کے عقبات عبور کرنے کی کوشش، اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں شامل ہونے کا شرف اور اظہارِ کسبِ راضیہ مَرْضِیَّة کی بادشاہی حاصل کرتے لیکن یہ اپنی زرپرستی اور لپیٹ بھمتی کے سبب سے یہ حوصلہ نہ کر سکے بلکہ ان کا مال ان کے لیے زنجیر پا بن گیا۔

عُقَبَةُ کے معنی گھاٹی اور اِفْتِحَام کے معنی چڑھنے یا کوئی مشکل کام کرنے کے ہیں۔ نیکی اور

یہاں اس لفظ سے نیکی کے ان کاموں کی طرف اشارہ ہے جو ہمدردی خلق اور بندگی رب کے بدی کے

نہایت اعلیٰ کام ہیں اور جن کی بعض مثالیں آگے مذکور ہیں۔ ان کاموں کو انجام دینے کے لیے چونکہ مزاح میں

انسان کو اثر و قربانی سے کام لینا پڑتا ہے جو انسان پر شاق ہے اس وجہ سے اس کو اِفْتِحَامِ عِقَبَةِ فرق



(گھاٹی پار کرنے سے) تعبیر فرمایا۔ یہاں وہ حقیقت ملحوظ رہے جس کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جتنے بھی اعلیٰ کلام ہیں ان کے لیے چونکہ نفس کو اس کی نقد لذتوں سے موڑ کر بالکل مختلف سمت میں لے جانا پڑتا ہے اس وجہ سے وہ بہت شاق گزرتے ہیں۔ اس کے برعکس ادنیٰ کاموں کی لذتیں نقد ہیں اس وجہ سے نفس ان کی طرف فوراً چل پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں۔ یہی حقیقت حَقَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِہِ (جنت مشکلات سے گھیر دی گئی ہے) دالی حدیث میں بھی واضح فرمائی گئی ہے۔

خدا کے مقرب بننے کے لیے کہ یہ انداز سوال کسی چیز کی عظمت و شان یا اس کی ہونا کی کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ بازیاں کھیلنے یہاں مقصود مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ تم صرف چند رسوم ادا کر کے خدا کے مقرب اور جہتے بننے کے خواب دیکھ رہے ہو حالانکہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے گھاٹیاں پار کرنی اور بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں۔ مال کے بیماری بن کر تم اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ سنو کہ اس کے لیے تمہیں کیا کیا کام کرنے ہیں۔

فَلَنْ رَقَبَةٍ ۖ اَوْ اَطْعُمُوْهُمْ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۖ تَيِّمًا ۙ اِذَا مَسْرَبَةٍ ۙ اَوْ مَسْكِيْنَ ۙ اِذَا مَسْرَبَةٍ (۱۳-۱۶)

اس سلسلہ میں سب سے پہلے فَلَنْ رَقَبَةٍ (گردن آزاد کرنے) یعنی غلام آزاد کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہاں وہ بات پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم تہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورتیں بالکل ابتدائی دور کی ہیں اس وجہ سے ان میں اہل عرب سے خطاب بھی بیشتر فقط انسان سے ہوا ہے اور جن باتوں کے ان سے مطالبے کیے گئے ہیں وہ بھی تمام تر انسانیت اور فطرت کے بلپی تقاضوں پر مبنی ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرنا اور کرنا بھی ان نیکیوں میں سے ہے جن کے نیکی ہونے میں کسی معقول آدمی کو شک نہیں ہو سکتا۔ اہل عرب بھی اس کو ایک نہایت اعلیٰ نیکی کا کام سمجھتے رہے ہیں۔ قرآن نے اپنی دعوت کے بالکل ابتدائی دور میں سے اس انسانی خدمت کو اپنی سرفہرست نیکیوں میں شامل کر لیا اور اس وقت کر لیا جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں لوگ اس نیکی کے لیے بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے سورہ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآن نے کس طرح ابتداء ہی سے اس نیکی کی تبلیغ شروع کی اور پھر کس طرح بالتدریج اپنے نظام کے اندر غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد تقیموں اور مسکینوں کو کھلانے کا ذکر فرمایا کھلانا، ظاہر ہے کہ اپنے محدود مفہوم میں نہیں بلکہ وسیع معنوں میں مایحتاج پوری کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس کے ساتھ فِيْ يَوْمٍ



رَدِّیْ مَسْخَبَةٍ (بھوک اور قحط کے زمانے میں) کی قید اپیل کو مؤثر بنانے کے لیے ہے۔ یہ کام ہے تو ہمیشہ نیکی کا لیکن قحط کے زمانے میں اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ "مِثْمًا" کے ساتھ ذَا مَقْصُوبَةٍ (قرابت مند) کی قید بھی دعوت کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔ یوں مقدار تو ہر یتیم مدد کا ہے لیکن قرابت دار یتیم کا سخی خاص طور پر دو چند ہو جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مُسْکِنًا کے ساتھ ذَا مَسْجُوبَةٍ (غاک آلود) کی صفت بھی اسن تلقین کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔  
ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۱۷)

یہ آگے کا قدم ہے جو ان لوگوں کو اٹھانا چاہیے۔

جن کی آنکھوں میں عبرت لگا ہی اور دلوں میں اثر پذیر ہوئی ہے ان سے اوپر بیان کی نیکی کرنے والوں ہوئی نیکیوں کی بھی توقع کی جاتی ہے اور یہ توقع بھی ان سے کی جانی چاہیے کہ وہ ایمان لائے والوں کو نیکی کا داعی اور صبر اور ہمدردی خلق کی دعوت دینے والوں میں سے بنیں گے۔ اگر وہ نہ بنیں تو یہ دلیل بھی بننا چاہیے اس بات کی کہ ان کے روحانی و اخلاقی ارتقار کی راہ میں کوئی غیر فطری رکاوٹ ہے جس کو وہ عبور نہ کر سکے۔

یہاں مَرْحَمَةً (ہمدردی) کے ساتھ صبر کا ذکر اسی طرح آیا ہے جس طرح سورہ عصر نیکی کے کاموں میں سخی، اور صبر کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ اس کی وجہ نیکی کے کاموں کا وہ مزاج ہے جس کی کاغاس مزاج طرف ہم اتحار عقبہ کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ نیکی کے کام بالعموم نفس کی خواہشوں اور ان کے لیے کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے انجام دینے کے لیے انسان کو نفس کی مزاحمت کرنی اور ایک صبر کی ضرورت چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ یہ چڑھائی وہی لوگ چڑھ سکتے ہیں جن کے اندر صبر کی خصلت مستحکم ہو۔ صبر کا اصل مفہوم عزیمت و استقامت ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہ ہو وہ کوئی کام بھی پامردی کے ساتھ نہیں کر سکتے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جن کو نیکی کا درس دیا جائے ان کو ساتھ ہی صبر و استقامت کی بھی تلقین کی جائے۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، سورہ عصر کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کے تمام اطراف بحث میں آئیں گے۔

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا ۖ بَأْسُهُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۚ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَيَّدَةٌ (۱۸-۲۰)

یہ آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو نیکی کے مذکورہ کاموں کا حوصلہ کریں گے اور جو ان سے محروم رہیں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے تو وہ خوش بخت اور بامراد ہیں اور جو اللہ کی باتوں کی تکذیب ہی پر اڑے رہیں گے وہ بد بخت و نامراد ہیں، وہ آگ کے اندر بند کر دیے جائیں گے۔ انجام کا ذوق یہاں تقابل کے اصول پر پہلے ٹکڑے میں اتنی بات مخدوف ہے کہ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ جنت



کے بالا خانوں میں ہوں گے۔

لفظ 'مَيْمَنَةٌ' 'یمین' (دہنے) سے بھی ہو سکتا ہے اور 'یمین' (مبارک اور خوش نختی) سے بھی لیکن یہاں یہ 'مَشْئِمَةٌ' کے مقابل میں آیا ہے جو لازماً 'شوم' (نحوست اور بد نختی) سے ہے۔ اس وجہ سے اس کو بھی 'یمین' سے لینا پڑے گا۔ میں نے ترجمہ میں اسی پہلو کو اختیار کیا ہے۔ ویسے یہ فرق محض لفظی ہوگا۔ اصل مدعا اُن کے کلام کے اعتبار سے کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا۔ قرآن میں ان دونوں گروہوں کو 'أَصْحَابُ الْيَمِينِ' اور 'أَصْحَابُ الشِّمَالِ' سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ سورۃ حاقۃ میں اس تعبیر کی وجہ بھی بتا دی گئی ہے کہ نیکوں کو ان کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور بدوں کو ان کے بائیں ہاتھ میں، ان دونوں تعبیروں میں بس یہ فرق ہے کہ ایک میں ان کی ظاہری تقسیم کا اعتبار ہے، دوسری میں ان کی معنوی تقسیم کا۔ جن کو ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے ظاہر ہے کہ وہ خوش نخت ہوں گے اور جن کو ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے ان کی بد نختی اور محرومی بھی امر بدیہی ہے۔

'عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ' - 'ادسد الباب' کے معنی ہیں 'دروازہ بند کر دیا' مطلب یہ ہوا کہ ان کو آگ میں موند کراد پر سے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ 'اعاذنا اللہ من ذلک'۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فتللہ الحمد۔

لاہور

۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۹ء

۱۱۔ صفر ۱۴۰۰ھ



تذکرہ قرآن

۹۱

الشمس







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### سُورہ کا عمود، سابق سُورہ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

سابق سورہ ————— البلد ————— میں قریش کے لیڈروں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ جب تم اس وادھی مکہ میں بسائے گئے اس وقت یہاں زندگی نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ یہ ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے یہاں تم کو رزق و فصل کی فراوانی حاصل ہوئی اور تم پھلے پھولے۔ تو یہ نعمتیں پاکر خدا سے اکڑنے والے اور اس کی زمین میں فساد برپا کرنے والے نہ بنو ورنہ یاد رکھو کہ جو خدا یہ سب کچھ دے سکتا ہے وہ جب چاہے اس کو چھین بھی سکتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔

اس سورہ میں ان کو طغیان و سرکشی کے انجام سے ڈرایا ہے۔ اس کی تہدید یوں استوار فرمائی ہے کہ دیکھتے ہو کہ کائنات بظاہر اضمحلال کی ایک رزم گاہ ہے لیکن خدائے قادر و قیوم ان اضمحلال میں سے کسی کو ان کے حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیتا جس کا فیض یہ ہے کہ یہ اضمحلال نہ صرف یہ کہ آپس میں ٹکراتے نہیں بلکہ پوری سازگاری کے ساتھ اس کائنات کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی اس سازگاری ہی پر اس کے بقا کا انحصار ہے ورنہ یہ دنیا چشم زدن میں درہم برہم ہو جاتی۔

اس کے بعد نفس انسانی کی تشکیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو حال اس عالم اکبر کا ہے وہی حال عالم اصغر یعنی نفس انسانی کا بھی ہے۔ یہ بھی خیر و شر کے تضاد و اعیان و محركات سے مرکب ہے اور خالق نے انسان کی طرقت میں خیر و شر کا امتیاز بھی ودیعت فرمایا ہے اور خیر سے محبت اور شر سے نفرت کا ذوق بھی بخشا ہے۔ اس کا اقتضایہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے توازن کو قائم رکھے اور برے داعیات کو خیر کے داعیات پر غلبہ نہ پانے دے ورنہ وہ طغیان و فساد میں مبتلا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنی دنیا میں طغیان و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اس کو وہ اسی حد تک ڈھیل دیتا ہے جس حد تک وہ اس دنیا کی مصلحت کے مطابق پاتا ہے۔ جب یہ اس حد سے متجاوز ہونے لگتا ہے تو خالق کائنات اس کا سرکچل دیتا ہے اور ان لوگوں سے اپنی دنیا کو پاک کر دیتا ہے جن کا وجود بحیثیت مجموعی اس کے لیے زہر ناک بن جاتا ہے۔



آخر میں اپنی اس سنت کے ظہور کی شہادت کے طور پر عرب کی پھپھی قوموں میں سے ایک ایسی قوم کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے جس کی شوکت و صولت سے قریش واقف تھے اور جس کے طغیان و فساد کا ذکر ان کے لٹریچر میں موجود تھا۔ ان کی مثال سے قریش کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے اور ڈرایا ہے کہ اگر انہی کی طرح تمہارا مزاج بھی فاسد ہو گیا تو تم بھی خدا کے بے امان عذاب کی زد میں آ جاؤ گے اور پھر کوئی تمہاری مدد کے لیے نہیں اٹھے گا۔

اس روشنی میں پوری سورہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

---



# سُورَةُ الشَّمْسِ

مَكِّيَّةٌ ۱۵ آیات :

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ① وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا ② وَالنَّهَارُ إِذَا  
 جَلَّهَا ③ وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَاهَا ④ وَالسَّمَاءُ وَمَا بَيْنَهَا ⑤  
 وَالْأَرْضُ وَمَا طَحَاهَا ⑥ وَنَفْسٌ وَمَا سَوَّاهَا ⑦ فَالْهَمَّهَا  
 فُجُورُهَا وَتَقْوَاهَا ⑧ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ⑨ وَقَدْ  
 خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ⑩ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ⑪ إِذَا نُبِئَتْ  
 أَشْقَاهَا ⑫ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ⑬  
 فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ⑭ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ  
 فَسَوَّاهَا ⑮ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ⑯

شاہد ہے آفتاب اور اس کا پڑھنا اور چاند جب اس کے پیچھے لگے اور

دن جب اسے چمکا دے اور رات جب اسے ڈھانک لے اور شاہد ہے آسمان اور

جیسا کچھ اس کو اٹھایا اور زمین اور جیسا کچھ اس کو سجھایا اور نفس اور جیسا کچھ اس

کو سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس

کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔ ۱۰-۱

۱۵-۱  
 ۱۴  
 ۱۵

ترجمہ آیات  
 ۱۵-۱



نمودنے جھٹلایا اپنی سرکشی کے باعث۔ جب کہ اٹھ کھڑا ہوا ان کا سب  
 سے بڑا بدبخت تو اللہ کے رسول نے آگاہ کیا کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے  
 کی باری سے خبردار! تو انھوں نے اس کو جھٹلادیا اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں تو اللہ  
 نے ان کے گناہ کی پاداش میں ان پر اپنا عذاب الٹ دیا اور ان کا ستھراؤ کر دیا اور  
 وہ نہیں ڈرنا کہ اس کے پیچھے کیا ہوگا۔ ۱۱ - ۱۵

---



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۖ وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا ۖ وَالنَّهَارُ إِذَا جَلَّهَا ۖ وَاللَّيْلُ

إِذَا يَغْشَاهَا ۖ (۴۰:۱)

یہ آفاق کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو باہم دگر جوڑے جوڑے ہونے یا اضدادانہ دوسرے الفاظ میں زوجین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اشیاء کے جوڑے جوڑے ہونے سے قرآن نے توحید ان کی باہمی معاوا اور جنار و سزا پر جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔ یہاں جس سازگاری خاص پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہر چند سورج اور چاند، دن اور رات میں سے ہر چیز کی شکل و صورت، ان کے ظہور کے طریقے، ان کے مزاج اور اس کائنات پر ان کے اثرات میں بڑا فرق ہے جس کے سبب سے یہ دنیا اضداد کی ایک رزم گاہ معلوم ہوتی ہے لیکن مدبر کائنات نے ان اضداد کو اس طرح اس عالم کی مشین میں فٹ کیا ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں ان میں کسی قسم کا تضاد واقع ہو بلکہ یہ نہایت سازگاری کے ساتھ اپنے اپنے دائروں میں کائنات کی مجموعی مصلحت میں رات دن سرگرم ہیں۔ نہ سورج چاند کے حدود میں مداخلت کرتا، نہ چاند اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتا، نہ دن کی یہ تاب کہ وہ اپنے وقت سے پہلے برآمد ہو جائے اور نہ رات کی یہ مجال کہ وہ دن کو اس کی ڈیوٹی پوری کرنے سے پہلے ہی برخاست کر دے: لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ (یس: ۳۶-۴۰) (نہ سورج کے لیے روا کہ وہ چاند کو جلے اور نہ رات ہی دن سے سبقت کرنے والی بن سکتی)۔

ان اضداد کی یہ باہمی سازگاری ہی ہے جس پر اس کائنات کے بقا کا انحصار ہے۔ اگر اس سازگاری و فرمانبرداری کے بجائے ان کے اندر طغیان و سرکشی پیدا ہو جائے تو یہ عالم چشم زد میں درہم برہم ہو جائے۔ اس وجہ سے خالق کائنات نے ان کو ان کے حدود کا پابند کر رکھا ہے اور یہ اپنے وجود سے زمین پر بسنے والوں کو یہ درس دیتے ہیں کہ وہ بھی خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کریں۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں گے تو زمین میں فساد برپا کریں گے اور زمین کا خداوندان لوگوں کو گوارا نہیں کرے گا جو اس کے ملک میں فساد برپا کریں۔

وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا ۖ وَالْأَرْضِ وَمَا طَرَحَاهَا (۵۰:۵-۶)

یہ آسمان اور زمین کی ساخت، ان کی عظمت اور ان کی فیض بخشی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی

آسمان و زمین کی ساخت میں انسان کے لیے سبق



اپنے بنانے والے کی عظیم قدرت، بے نہایت حکمت اور غیر محسوس درجہ بڑبڑت کی شہادت دیتے ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے لیے ناممکن نہیں ہے، اس کی حکمت اکتھاہ اور اس کی رحمت درجہ بڑبڑت ہمہ گیر ہے۔ اس کی اس قدرت، حکمت اور درجہ بڑبڑت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کو اس میں شریک بنائے تاکہ نہ چھوڑے بلکہ دیکھے کہ جن کے لیے اس نے یہ سب کچھ بنایا وہ اس میں کیا بنا رہے ہیں اور پھر ان کے رویہ کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔ اگر وہ البتہ کرے تو اس کی یہ تمام قدرت و حکمت اور یہ ساری درجہ بڑبڑت و رحمت بے معنی اور بے سارا کا رخانہ ایک کارِ عبث بن کے رہ جائے گا۔

’مَا‘ موصولہ اور ’مَا بَنَاهَا‘ اور ’مَا طَخَّسَهَا‘ میں ’مَا‘ سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مصدر یہ اور ’مَا‘ ہے یا موصولہ؟ ہمارے نزدیک یہ مصدر یہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو موصولہ ماننے تو اس سے خدا کو مراد لینا پڑے گا در آنحالیکہ یہ قسمیں خدا کی نہیں بلکہ اس کی آیات قدرت و حکمت کی ہیں اور خاص طور پر ان کے ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو انسان کے اندر اس عبرت نگاہ کو پیدا کریں جو اس تعلیم کے قبول کرنے کے لیے راہ کھولے جو سورہ میں دی گئی ہے۔ اوپر کی قسمیں سورج، چاند، دن اور رات کی ہیں اور ان کے ساتھ ’اِذَا تَلَّهَا‘، ’اِذَا جَلَّهَا‘، ’اِذَا يَغْشَاهَا‘ وغیرہ کی قیدیں نگاہ کے زاویہ کو ٹھیک رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ اس سیاق میں اگر یہ بات کہی جائے کہ ’اور میں قسم کھاتا ہوں آسمان کی اور اس اللہ کی جس نے اس کو بنایا، تو اس قسم کی نوعیت اور پر کی قسموں سے بالکل مختلف ہو جائے گی۔ اس کا ایک ٹکڑا تو شہادت کے مفہوم میں اور دوسرا تعظیم و تقدیس کے مفہوم میں لینا پڑے گا جس کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کی شہادت پیش کی ہے، اپنی ذات کی شہادت نہیں پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں ’مَا‘ اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں بھی نہیں ہے۔

’مَا‘ مصدر کے متعلق یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ فعل کو صرف مصدر کے معنی میں کر دینے ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ اس فعل میں جو قدرت، جوشان، جو حکمت، جو فیض بخشی، جو قدرت اور جو حیرت انگیز صنعت گری مضمون یا ظاہر ہوتی ہے ان سب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً آسمان کے ساتھ ’وَمَا بَنَاهَا‘ جو فرمایا تو اس کے معنی ہوں گے، اور شاہد ہے آسمان اور اس کی حیرت انگیز ساخت، اور اس کے اندر آسمان کے وہ تمام عجائبات اور کوششیں مضمون ہوں گے جن کی طرف قرآن نے گونا گوں اسلوبوں سے توجہ دلائی اور اپنے مختلف بنیادی دعاوی پر ان سے دلیل قائم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ’مَا‘ موصولہ کے اندر ان استدلالی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ’مَا‘ مصدر کے لیے اسی وسعت و جامعیت کے سبب سے اردو میں



اس کا ترجمہ نہایت مشکل ہے۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے بعض فاضل مترجموں نے اس کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب موجود نہ ہونے کے سبب سے پورا مفہوم ادا نہیں ہو سکا۔ میں نے بھی اپنے ترجمہ میں اس کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اپنی تقصیر کا اعتراف ہے کہ میں بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکا۔

’وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَّهَا‘ کو بھی اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سورۃ غاشیہ میں فرمایا ہے: ’وَالْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ‘ (الغاشیہ - ۸۸: ۲۰) ادا اس کے تحت ہم نے واضح کیا ہے کہ اس اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمون ہے جو قرآن نے دوسرے مقامات میں زمین کے آثار و عجائب سے متعلق بیان فرمائی اور اس سے اپنے مختلف دعادی پر دلیل قائم کی ہے۔ گویا جن حقائق پر غور کرنے کے لیے سورۃ غاشیہ میں ’کَيْفَ‘ سے ابھارا ہے انہی پر غور کرنے کے لیے یہاں ’مَا‘ مصدریہ سے کام لیا ہے۔ لیکن دونوں کے محل استعمال میں ایک دقیق فرق بھی ہے جس پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۖ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۗ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهَا ۗ  
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (۱۰-۷)

آفاقی شہادتوں کے بعد یہ نفسیاتی شہادت کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اگر خود اپنے نفس پر غور کرے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ خالق نے اس کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودلیعت کر دیا ہے۔ یہ شعور ظاہر ہے کہ اسی لیے ودلیعت ہوا ہے کہ انسان ان میں سے نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے اپنے کو بچائے۔ اور اس سے یہ بات بھی بدیہی نتیجہ کے طور پر نکلی کہ فلاح وہی پائے گا جو اپنے کو بدی سے پاک رکھے گا اور وہ نامراد ہوگا جو اس کو گناہوں سے آلودہ کرے گا! اسے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوتے کہ اپنے آپ کو غیر مسئول اور تتر بے مہار سمجھنے کا تصور انسان کے خود اپنے نفس کی شہادت کے خلاف ہے۔

’نَفْسٍ‘ کی تشکیل تفصیل، تکثیر اور تفخیم سب کے لیے ہو سکتی ہے لیکن میرے نزدیک یہاں یہ تفخیم شان کے لیے ہے پیچھے قسموں ہی کے سلسلہ میں اس کی نہایت واضح مثالیں گزر چکی ہیں۔ مثلاً سورۃ بروج میں فرمایا ہے: ’وَشَهِيدٌ مِّمَّنْ شَهِدَ‘ (۳) سورۃ بلد میں ہے: ’وَوَالِدٌ ذَا لُبٍّ‘ ان کی وضاحت متعلق سورتوں میں ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہاں ’وَمَا سَوَّاهَا‘ ہے جس سے نفس انسانی کی حیرت انگیز حکیمانہ تشکیل اور اس کی نہایت اعلیٰ ظاہری و باطنی صلاحیتوں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

’وَمَا سَوَّاهَا‘ میں بھی ’مَا‘ مصدریہ ہے اور یہ جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی، نفس انسانی کی اس



حکیمانہ تشکیل و تقویم کی طرف توجہ دلا رہا ہے جس کی وضاحت قرآن نے جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے فرمائی اور اس سے استدلال کیا ہے کہ قدرت ان اعلیٰ صلاحیتوں کی چیز محض ایک کارِ عبث اور کھلونے کے طور پر نہیں بنا سکتی اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک دن یہ اپنی صلاحیتوں اور نعمتوں سے متعلق اپنے خالق کے آگے جواب دہ ہو۔

لفظ تَسْوِيَةً پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی تخلیق میں جو تکمیلی مرحلہ ہوتا ہے یہ اس کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے، جیسے فرمایا ہے: 'الَّذِي خَلَقَ تَسْوِيَةً' (الاسطیٰ - ۲: ۸۷) (جس نے خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک سنوارے) اس سے معلوم ہوا کہ یہاں قسم میں نفس انسانی کی تخلیق کا صرف ابتدائی مرحلہ پیش نظر نہیں ہے بلکہ وہ تکمیلی مرحلہ بھی مد نظر ہے۔ جب وہ قدرت کے ایک شاہکار کی حیثیت سے نمایاں ہوا اور خود اپنے وجود سے اس حقیقت کا شاہد بن گیا کہ اس دنیا میں ذمہ داریوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں وہ خدا کا خلیفہ اور اس کے آگے مسئول ہے۔

'فَالْتَمِهْهَا فَجُودَهَا وَتَقْوَمَهَا' یہ عمل تسویہ کی تفصیل ہے۔ انسان کی تخلیق کا تکمیلی مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایک نور یزدانی ودیعت فرمایا جس سے اس کے اندر یہ شعور پیدا ہوا کہ کیا چیز اس کے لیے نیکی اور خیر ہے اور کیا چیز بدی اور شر۔ سابق سورہ میں اسی حقیقت کی طرف 'وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ' (البلد - ۱۰: ۹۰) کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے اور اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورہ قیامہ اور سورہ دھر کی تفسیر میں اس کے ہر پہلو پر جامع بحث ملے گی۔

الہام خیر و شر کا لازمی تقاضا  
قَدْ اخْلَجَ مِنْ نَكْمَاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا: یہ الہام خیر و شر کا لازمی تقاضا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز بخشا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ خیر کو اختیار اور شر سے اجتناب کرے۔ یہی طریقہ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی کی راہ کھولے گا۔ اگر اس کے برعکس اس نے شر و فساد کی راہ اختیار کی تو یہ چیز اس کی بدبختی و نامرادی کا سبب بنے گی۔

'دَسَّهَا' دراصل 'دَسَّهَا' کے مادہ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو خاک میں ڈھانک دینے اور مٹی میں ملا دینے کے ہیں۔ یہی لفظ بدل کر 'دَسَّهَا' ہو گیا ہے اور اس تبدیلی سے اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے، یعنی اس کو بالکل خاک میں ملا دیا۔ عربی میں اس طرح کے تغیر کی مثالیں موجود ہیں مثلاً 'تَضَلَّتْ' سے 'تَضَلَّتْ'۔

ہم نے اس کو الہام خیر و شر کا بدیہی تقاضا اس وجہ سے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو نعمت بھی بندے کو عطا فرماتا ہے اس کا حق واجب یہ ہے کہ بندہ اس کو اس کے صحیح مصرف میں استعمال



کرے۔ اسی میں اس کی مہبود اور درحقیقت یہی اس نعمت کا شکر ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا خود اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں گراتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جس کو عدل نے دو آنکھیں بخشی ہیں اس پر واجب ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر راہ کے عقبات اور نشیب و فراز دیکھتا ہوا چلے۔ اگر وہ آنکھیں موند کر چلے گا تو اس کا کسی کھڈ میں گرنا بعید نہیں اور اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی کسی دوسرے پر نہیں ہوگی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قسموں کا مقسم علیہ کیا ہے؟ بعض لوگوں نے قَدْ اَخْلَجَ ان سورا  
مَنْ دَكَّهَا مِنْ دَشَّهَا کو مقسم علیہ قرار دیا ہے لیکن صاحب کشاف کو اس سے انکار مقسم علیہ  
ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا انکار بے جا نہیں ہے۔ یہاں جو قسمیں مذکور ہیں ان میں سورج، چاند، دن  
اور رات کی قسمیں تو جیسا کہ ہم نے وضاحت کی، اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ اس کا ثبات  
کے تمام عناصر کی باگ ایک قادر و قیوم کے ہاتھ میں ہے جو ان میں سے کسی کو اس کے محور و مدار سے  
برسرِ تجاذب کی اجازت نہیں دیتا ورنہ یہ سارا عالم اپنے اضداد کے تصادم سے درہم برہم ہو جائے۔  
اس کے بعد آسمان و زمین کی قسمیں اس عالم کے ضائع کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی طرف  
اشارہ کر رہی ہیں اور مقصود ان سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ اس کی ان صفات کا لازمی تقاضا  
ہے کہ اس دنیا میں وہ کسی کو ستر بے ہمار بنا کے چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ ہر ایک کے سامنے اس کے  
محاسبہ کا دن آنا لازمی ہے۔ یہ خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔  
تیسری قسم نفس انسانی کی تشکیل کی قسم ہے جو ایک انفسی شہادت کی حیثیت رکھتی ہے،  
جس کی وضاحت خود قرآن نے یوں فرمائی ہے کہ جب خالق نے خود انسان کی فطرت کے اندر خیر اور  
شر کا امتیاز و دلالت فرمایا ہے تو لازماً اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اپنے کو خیر سے آراستہ کرے گا وہ  
فلاح پائے والا بنے گا اور جو اپنے کو شر کو مسلط کرے گا وہ نامراد ہونے والوں میں سے ہوگا۔  
اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قَدْ اَخْلَجَ مَنْ دَكَّهَا مِنْ دَشَّهَا یہاں  
مقسم علیہ کے طور پر نہیں بلکہ آخری قسم کے ایک خاص پہلو کی وضاحت کے طور پر ہے۔ مقسم علیہ  
یہاں ایسا ہونا چاہیے جو تمام قسموں کے لازمی نتیجہ کو اپنے اندر سمو لے اس وجہ سے مجھے صاحب  
کشاف کی رائے قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں جواب قسم مخدوف ہے۔ اس کے حذف کرنے کی  
وجہ یہ ہے کہ اس آخری ٹکڑے نے مقسم علیہ کی طرف ایک اشارہ کر دیا اس وجہ سے اس کے اظہار  
کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مقسم علیہ کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا  
ہے کہ وہ ساری بات مقسم علیہ کی حیثیت سے مخدوف مافی جاسکتی ہے جو قسموں سے متبادر ہونی  
ہے۔ یہاں اس کو جامع الفاظ میں بیان کرنا تو مشکل ہے لیکن ایک نمایاں پہلو کی تعبیر یوں کی جاسکتی







اس سورہ میں ثمود سے متعلق جو اشارات ہیں وہ قریش کے سامنے ان کی پوری تاریخ رکھ دینے کے لیے کافی تھے۔ یہ عرب بائودہ میں سے ہیں جن کی بستیاں اور جن کی روایات اہل عرب کو وراثت میں ملیں۔ ان سے متعلق ان کی روزمرہ کی گفتگوؤں میں بہت سی مثالیں پھیلی ہوئی تھیں۔ قرآن مجید ہمارے اس دعوے پر خود سب سے بڑی حجت ہے۔ قرآن کے دلائل نقل کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

”شعرا نے بھی ان کا ذکر ایک جانی پہچانی ہوئی قوم کی حیثیت سے کیا ہے..... ان کی شوکت و عظمت ضرب المثل تھی۔ خنساء نے کہا ہے:

ولاقاہ من الایام یوم کما من قبل لم یخلد تدار

(اور اس کو گردشِ روزگار نے فنا کر دیا جس طرح اس سے پہلے تدار کو دوم

حاصل نہیں ہوا)

شعر میں تدار سے مراد احمر ثمود ہے جو قوم کا سردار تھا اور جس نے اونٹنی کو گزند پہنچایا۔ جس طرح عاد میں قیل بن قیل بن عمر گزرا ہے اسی طرح قوم ثمود میں یہ نہایت سرکش اور مطلق العنان سردار تھا۔ مشہور جاہلی شاعر اذہ اودی نے ایک قصیدے میں اپنی قوم کے پاجیوں کو قیل اور تدار سے تشبیہ دی ہے:

فینا معاشر لعدینا القومہم دان بتی قومہم ما افسدوا عادوا

(ہم میں کچھ ایسے اشرار ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے لیے بنایا تو کچھ بھی نہیں اور اگر

ان کی قوم نے ان کے لگاڑے ہوئے کو بتایا تو انہوں نے اس کو پھر لگاڑ دیا)

لا یوشدون ولن یروعوا المرشدہم والیہل منہم معاد الغی میعاد

(نہ خود راہ دیکھتے اور نہ راہ دکھانے والوں کی سنتے، جہالت اور سرکشی، دونوں

ان میں ساتھ ساتھ موجود ہیں)

اضحوا کقیل بن عمرو فی عشیۃ اذا اہلکت بالذی سدی مہاد

(وہ اپنی قوم میں قیل بن عمرو کی مثال ہیں جس کی کرتوتوں کی بدولت عاد تباہ ہوئے)

ادبعده کقد ارحین تابعہ علی الغوایۃ اقوام قد بادوا

(یا اس کے بعد وہ تدار کی مثال ہیں جس کی پیروی لوگوں نے گمراہی میں کی اور تباہ ہوئے)

اس سے معلوم ہوا کہ ثمود کی سرکشی، ان کے لیڈروں کی گمراہی اور ان کے عبرت انگیز انجام کی تفصیل

اہل عرب میں اس طرح معلوم و معروف تھی کہ ان کے شعرا بے تکلف اپنے اشرار میں ضرب المثل کی طرح ان کا ذکر کرتے اس وجہ سے قرآن کا یہ اجمالی حوالہ اہل عرب کے لیے اجمالی نہیں تھا



وہ انہی چند لفظوں سے ان کے طغیان کے برے انجام کی پوری تفصیل سمجھ سکتے تھے۔

’كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا‘ میں لفظ ’طَغْوَى‘ پر خاص طور پر نظر ہے اس کے معنی سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے کھلم کھلا بغاوت کے ہیں۔ خاص طور پر وہ سرکشی جس کی مرتکب کوئی قوم اس وقت ہوتی ہے جب کہ حق اس پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہو۔ اس لفظ پر نگاہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق سورہ کے عمود سے ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کو یہ آگاہی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کسی قوم کے طغیان کو پسند نہیں کرتا۔ جو قوم یہ روش اختیار کرتی ہے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس لفظ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ثمود نے اپنے رسول کی تکذیب اس وجہ سے نہیں کی کہ ان پر حق واضح نہیں تھا بلکہ انھوں نے حق کے واضح ہونے کے باوجود محض سرکشی کے سبب سے تکذیب کی۔

’إِذَا نَبَعَتْ أَشْجَاهَا‘ یہ ان کے طغیان کی تفصیل ہے۔ ’أَشْجَى‘ سے اشارہ ثمود کے لیڈر قرار کی طرف ہے جس کی شقاوت پوری قوم کی تباہی کا سبب ہوئی۔ ’انبعات‘ کے معنی اٹھنے اور کمر بستہ ہونے کے ہیں اور اس سے مراد اس کا اس جرم کے لیے کمر بستہ ہونا ہے جس نے پوری قوم پر قہر الہی کے دروازے کھول دیے۔ اس اجمال کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ جب قوم ثمود کے پیغمبر — حضرت صالح — نے لوگوں کو عذاب سے ڈرایا تو قوم نے سرکشی کے سبب سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو اس عذاب کی کوئی نشانی دکھا دی جائے ورنہ وہ ان کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے مطالبہ پر ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی نقصان پہنچا یا تو عذاب تم پر ٹوٹ پڑے گا۔ ساتھ ہی ان کے لیے ایک امتحان بھی مقرر کر دیا کہ گھاٹ پر پانی پینے کی باری اس کے لیے مخصوص ہوگی۔ ایک دن یہ پانی پیے گی اور ایک دن تم اپنے جانوروں کو بلاؤ گے۔ بھلا یہ پابندی وہ کب گوارا کرنے لے تھے۔ انھوں نے اپنے لیڈر سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ جوش میں اٹھا اور اونٹنی کی کونچیں اس نے کاٹ دیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تین دن کی ان کو مہلت دی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرتی چاہیں تو کر لیں لیکن وہ اس مہلت سے اور بھی معذور ہو گئے بالآخر عذاب نے ان کو بے نام و نشان کر دیا۔

’فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا‘ جب حضرت صالح علیہ السلام نے دیکھا کہ فی الواقع یہ بدبخت عذاب کی دیوار توڑ دینے پر تل ہی گیا ہے تو انھوں نے آخری تنبیہ فرمائی کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کی پانی پینے کی باری سے خبردار رہو، ورنہ عذاب الہی آدھکے گا۔



نَاقَةُ اللَّهِ، کا نصب برنبٹے تذکرہ ہے۔ یعنی یہاں کوئی فعل محذوف مانیں گے جو آگاہ اور خبردار کو دینے کے معنی میں ہوگا۔ فعل کے حذف کر دینے میں یہ بلاغت ہے کہ سامع کی پوری توجہ اصل بات پر مرکوز کر دی جائے۔ کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے یہ اسلوب ہماری زبان بلکہ ہر زبان میں موجود ہے۔

كَذَّبُوا فَعَقَرُوْهَا یعنی انھوں نے جس طرح پہلے عذاب کی دھمکی کو جھٹلایا تھا اسی طرح پیغمبر کی اس آخری وارننگ کی بھی کوئی پروا نہیں کی بلکہ ان کی تکذیب کر دی کہ یہ محض ایک دھونس اور ڈر داوا ہے۔ چنانچہ جو کچھ کرنا تھا بے دھڑک کر گزرے۔

عَقَرُ کے معنی اونٹ کی کونچیں کاٹ دینے کے ہیں۔ اس کے بعد اونٹ لازماً مر جاتا ہے اس وجہ سے لازم معنی کے طور پر قتل کر دینے کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن لفظ کا اصل مفہوم وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

یہاں ایک بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اونٹنی کے قتل کا ارتکاب قوم کے اندر سے قرآن کے اگرچہ ایک ہی شخص نے کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مجرم پوری قوم کو ٹھہرایا اور اس کی سزا بھی پوری قوم کو دی۔ اس سے قرآن کے فلسفہ تاریخ کا یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے جرم میں پوری قوم کو سزا دیتا ہے اگر قوم اس جرم پر راضی ہو۔ اس کے دباؤ سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو اپنی اشتیاق کی حد تک اس کی اصلاح کے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں کر گزریں اور اگر کچھ نہ کر سکتے ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے بیزار اور کنارہ کش رہیں۔ اس سے نیچے نہ ایمان کا کوئی درجہ ہے نہ خدا کی بکڑ سے بچنے کی کوئی سبیل۔

قَدْ مَدَّ مَرَعِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ۔ دَمْدَمَہ کے معنی ہلاک کر دینے کے ہیں لیکن اس کے اندر قوم کے عذاب کی شدت اور بے پناہی کا مضمون بھی مضمون ہے جو مجرد ہلاک کر دینے کے لفظ سے واضح نہیں ہوتا۔ اگر اس کو ٹھیک ٹھیک تعبیر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تب ان کے خداوند نے ان کے اوپر دھما دھم عذاب برسا دیا۔ قرآن میں خَصَبَتْ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوَاطِیْ عَذَابٍ (الفجر - ۸۹: ۱۳) اور ان پر تیرے خداوند نے عذاب کے کڑے برسا دیے کا اسلوب بیان بھی استعمال ہوا ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ سورہ قمر کی آیت، اے کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان پر جو عذاب آیا وہ سرسبز بادلوں، ٹراک باری، ہولناک کڑک دھماک اور طوفانی ہوا کا مجموعہ تھا۔ اس طرح کے عذاب کے لیے لفظ دَمْدَمُ نہایت موزوں ہے۔

بِذُنُوبِهِمْ یعنی یہ عذاب ان کے اوپر ان کے اس جرم کے سبب سے آیا کہ انھوں نے اللہ اور اونٹنی عذاب رسول کی تنبیہ کے باوجود اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی۔ یہ اونٹنی عذاب الہی کی نشانی تھی اور کی نشانی تھی جیسا کہ سورہ قمر کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، یہ بطور امتحان مقرر کی گئی تھی کہ اندازہ ہو جائے کہ قوم



کا طغیان کس درجے تک پہنچ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جسم کے بعد اگر ان کو ڈھیل ملتی تو وہ خود اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر گزرتے اور یہ وہ جو ہم ہے جس کی مہلت اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں دیتا بلکہ جب کسی قوم نے رسول کے قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی گئی ہے۔ اس سنت الہی کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈروں نے دارالندوہ اور اپنی نجی مجلسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے شروع کر دیے تھے۔ یہ مشورے چونکہ خفیہ تھے اس وجہ سے قرآن نے بھی علانیہ کی بجائے اشارات کی زبان میں ان کو آگاہ ہی دے دی کہ اگر وہ کوئی ارادہ بدلنے دل میں پرورش کر رہے ہیں تو درحک اس کے نتائج پر نگاہ ڈال لیں۔

فَسَوْفَ يَعْلَمُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے ان پر اپنا عذاب برسا یا تو ان کا بالکل ستھرا ڈک کر رکھ دیا۔ ضمیر مفعول کا مرجع نمود اور ارض نمود دونوں ہو سکتے ہیں۔

نہ نادرجا ماندو نے نادری!

وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا (۱۵)

یعنی اللہ تعالیٰ جب اسی طرح کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اپنی اس سنت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اس دنیا کی مصلحت اور بہبود کے لیے اپنے محیط کل علم اور اتھاہ قدرت کے تحت ٹھہرا رکھی ہے اس وجہ سے نہ اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے اس کے اس فیصلہ میں کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ یہ ڈر ہوتا ہے کہ کوئی اس کو چیلنج کر سکتا ہے۔ وہ کسی کے آگے نہ مستول ہے اور نہ کسی کا اس پر زور ہے۔ اس سے ضمناً ان تعویذات کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو تورات کی کتاب پیدائش میں اس کے لادلوں نے ملائے ہیں، مثلاً

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا بڑے ہیں۔

نب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا (پیدائش - باب ۵: ۶)

اسی طرح طوفان نوح کے ذکر کے بعد ہے:

”اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب سے میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہیں بھیجوں گا کیونکہ انسان کے

دل کا خیال لڑکپن سے بڑا ہے اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیلے، ماروں گا۔“ (پیدائش - باب ۲۱)

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ خالص حمد للہ علی احسانہ۔

لاہور

۱۶ - جنوری ۱۹۸۰ء

۲۷ - صفر ۱۴۰۰ھ



تذکرہ قرآن

۹۲

الیل







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ — الشمس — کی مشقی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ ان کے ظاہر اور باطن میں اتنی گہری مشابہت و مماثلت ہے کہ ایک عام آدمی بھی ان کی یکسانی و ہم رنگی کو محسوس کر سکتا ہے۔

سابق سورہ میں نفس انسانی سے متعلق فرمایا ہے: قَدْ أَخْلَجَ مَنْ ذُكِّهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهََا (الشمس - ۹۱ : ۹ - ۱۰) (فلاح پاٹی جس نے اس کو پاکیزہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا) اس سورہ میں اسی بنیادی مسئلہ کو لیا اور بتایا ہے کہ نفس کو کیا چیز آلودہ کرتی اور اس سے اس کو بچانے کی کیا تدبیر ہے اور کیا چیز اس کو پاکیزہ بناتی ہے اور یہ پاکیزگی اس کو کس طرح حاصل ہوتی ہے۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) آفاق و انفس کی شہادت اس بات پر کہ قیامت حق ہے۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پہنچتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا — آخرت — ہے جو اس کو با مقصد بناتا ہے ورنہ یہ بالکل اندھیر نگری بن کے رہ جائے گی جس میں خیر و شر دونوں یکساں ہو جائیں گے و ناخائیکہ ان میں فرق ایک امر بدیہی ہے۔

(۵-۷) وہ کہ دارا در عقیدہ جو آدمی کو آخرت کی کامرانیوں کا اہل اور اس راہ کو اس کے لیے آسان بناتا ہے۔

(۸-۱۰) وہ عقیدہ و عمل جو اس کے لیے ہلاکت کی راہ کھولتا اور جہنم کے کھڑ میں گراتا ہے۔



(۱۱-۱۴) قریش کو تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری صرف تمہیں ہدایت کی راہ دکھا دینا ہے سو یہ کام اس نے کر دیا۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ وہ اس راہ پر تمہیں چلا بھی دے۔ یہ راہ اختیار کر دے تو اس میں تمہارا اپنا ہی بھلا ہے ورنہ یاد رکھو کہ دنیا اور آخرت دونوں خدا ہی کے قبضہ میں ہیں۔ نہ یہاں کوئی خدا سے بچا سکے گا اور نہ وہاں کوئی کام آنے والا بنے گا۔

(۱۵-۲۱) اس امر کی وضاحت کہ کس کردار کے لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور کس کردار کے لوگ اس سے محفوظ رکھے جائیں گے اور ان کو کیا صلہ ملے گا؟

---



# سُورَةُ الْبَيْلِ

مِکَّہ ۲۱ آیات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 وَالْبَيْلُ إِذَا يَغْشَى ① وَالنَّهَارُ إِذَا تَجَلَّى ② وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ ③  
 وَالْأُنْثَى ④ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى ⑤ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى ⑥  
 وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى ⑦ فَسَنِيَرُهُ لِلْيُسْرَى ⑧ وَأَمَّا مَنْ  
 بَخِلَ وَاسْتَغْنَى ⑨ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى ⑩ فَسَنِيَرُهُ  
 لِلْعُسْرَى ⑪ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى ⑫ إِنَّ  
 عَلَيْنَا لَلْهُدَى ⑬ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَى ⑭ فَأَنْذَرْتُكُمْ  
 نَارًا تَلَظَّى ⑮ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ⑯ الَّذِي كَذَّبَ  
 وَتَوَلَّى ⑰ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ⑱ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ  
 يَتَزَكَّى ⑲ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى ⑳  
 إِلَّا ابْتِغَاءً وَجْهَ رَبِّهِ الْأَعْلَى ㉑ وَكَسُوفٌ يَرْضَى ㉒

شاہد ہے رات جب کہ چھا جاتی ہے اور دن جب کہ چمک اٹھتا ہے اور نزع آہ

۲۱-۱

شاہد ہے نروادہ کی آفرینش کہ تمھاری کماٹی الگ الگ ہے۔ ۲۰-۱

سوحس نے التفیق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو پہنچانا



اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بنجالت کی اور بے پروا ہوا  
 اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دے دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔ ۵-۱۰  
 اور اس کے کیا کام آئے گا اس کا مال جب وہ کھڑے میں گرے گا! ہمارا کام  
 سمجھا دینا ہے! اور ہمارے ہی اختیار میں ہے آخرت بھی اور دنیا بھی۔ سو میں  
 نے تم کو آگاہ کر دیا دیکھتی آگ سے۔ ۱۱-۱۳

اس میں وہی پڑے گا جو نہایت بد بخت ہوگا، جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔  
 اور اس سے محفوظ رکھا جائے گا وہ خدا ترس جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کو  
 دیتا ہے اور جس کی کسی پر کوئی عنایت بدلے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے خدائے  
 برتر کی خوشنودی کے لیے ہے۔ اور وہ نہال بھی ہو جائے گا۔ ۱۴-۲۱

---



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۖ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۖ وَمَا خَلَقَ الذَّكَوَّةَ وَالْأُنثَىٰ (۱-۳) ہر چیز کے  
یہ رات اور دن، نر اور مادہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس طرح کی قسمیں جو قرآن میں آئی ہیں ان جوڑے جوڑے  
کی ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آرہے ہیں کہ یہ کسی دعویٰ پر شہادت کے لیے آئی ہیں۔ رات اور دن ہر نئے نئے  
نر اور مادہ میں نسبت زوجین کی ہے اور یہ دونوں مل کر اس مقصد کو پورا کرتے ہیں جس کے لیے خالق پرستار  
نے ان کو پیدا کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر خلا ہے جو جوڑے کے ساتھ مل کر ہی پورا  
ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ان کے وجود کی نہ کوئی افادیت باقی رہتی اور نہ ان کی صلاحیتوں کی کوئی توجیہ  
ہو سکتی۔ قرآن نے ان اضداد کے اندر توافق کے پہلو سے توجید پر بھی دلیل پیش کی ہے جس کی وضاحت  
اس کے محل میں ہو چکی ہے اور تیسرے شہادت پیش کی ہے جو یہاں مقصود ہے۔ مثلاً سورہ  
ذاریات میں فرمایا ہے: وَهِيَ كَلِمَتِي ۖ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذاریت - ۵۱: ۴۹)  
(اور ہم نے ہر چیز میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو) یعنی اس بات کی یاد دہانی حاصل  
کر دو کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے اور یہ اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پہنچے گی۔ اس نکتہ  
کی وضاحت سورہ ذاریات کی مذکورہ آیت کے تحت ہو چکی ہے اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی  
اس پر مفصل بحث ہوئی ہے۔ آگے مقسم علیہ کی وضاحت کرتے ہوئے بھی ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔  
وَمَا خَلَقَ الذَّكَوَّةَ وَالْأُنثَىٰ ۚ هَٰذَا هُمَا نَزْدِيكَ مَصْدَرٌ هُوَ - سابق سورہ کی آیت وَالسَّمَاءِ دَمًا  
بَنَاهَا (الشمس - ۵۱: ۵۰) کے تحت ہم اس پر بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔  
إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ (۴)

یہ وہ اصل دعویٰ ہے جو اوپر کی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ یعنی کائنات میں ہر چیز کا جوڑا جوڑا نیک اور بد  
ہونا اور اپنے جوڑے ہی کے ذریعہ سے ہر چیز کا اپنی غایت اور مقصد کو پہنچنا چاہتا ہے کہ اس دنیا کا  
بھی جوڑا ہے اور وہ ہے آخرت جو لازماً ظہور میں آئے گی تاکہ یہ دنیا اپنی غایت اور اپنے مقصد کو پہنچے  
ورنہ یہ بالکل عبث اور بے غایت بن کے رہ جائے گی۔ اگر آخرت نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ  
خالق کے نزدیک نیکی کرنے والے اور بدی کرنے والے دونوں یکساں ہیں۔ ایک حکیم خالق کی شان کے  
یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ نیک اور بد دونوں کی جدوجہد اور کماٹی کو یکساں کر دے۔

لفظ 'سعی' جدوجہد کے معنی میں بھی آتا ہے اور نتیجہ جدوجہد یعنی کماٹی کے معنی میں بھی۔ یہاں



اسی دوسرے معنی میں ہے۔ قرآن میں اس معنی کی نظیر موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے: **وَأَنْ تَكُونَ**  
**لِلنَّاسِ آيَةً** (النجم ۵۴: ۳۹-۴۰) (اور یہ کہ انسان کو نہیں ملے گی مگر اپنی  
کماٹی اور بے شک اس کی کماٹی عنقریب ملاحظہ میں آئے گی)۔

قیامت کا  
اثبات اس  
کی ضرورت  
کے پہلو سے

’نشئی‘ جمع ہے ’نَشِيتٌ‘ کی جس کے معنی متفرق اور الگ کے ہیں یعنی عقل اور فطرت کا  
بدیہی تقاضا ہے کہ نیکوں اور بدوں دونوں کی سعی کا نتیجہ ایک ہی شکل میں نہ برآمد ہو بلکہ ان کی جدوجہد  
کے اعتبار سے الگ الگ ہو۔ جنہوں نے نیکی کماٹی ہو وہ اس کا صلہ فحل و انعام کی شکل میں پائیں  
اور جنہوں نے بدی کماٹی ہو وہ اس کے انجام سے دوچار ہوں۔ گریہ قیامت کا دعویٰ یہاں اس کی اصل  
ضرورت کے پہلو سے سامنے رکھا ہے کہ اس کا آنا اس وجہ سے ضروری ہے کہ قیامت اور جزا و سزا  
کے بغیر یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک کھنڈر ہے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے چنانچہ قیامت کو نہ  
ماننے والوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا ہے کہ: **أَفَحَسِبْتُمْ أَنْتُمْ أَنْتُمْ خَلْقْتُمْ عِبَادًا أَنْتُمْ خَلَقْتُمْ**  
**لَا تُؤْمِنُونَ** (المومنون - ۲۳-۱۱۵) (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بالکل عبث پیدا کیا  
ہے، تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے!) یہی سوال منکرین قیامت ہی سے، دوسرے مقام  
میں بانداز تعجب، یوں کیا گیا ہے: **أَفَتَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ** (ما لکم وقفہ کیف تفلکون  
(القلوب - ۶۸: ۳۵-۳۶) (کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے مانند کر دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم  
کیسے فیصلے کرتے ہو؟)

اس فرق کی  
تفصیل جو نیکوں  
اور بدوں کی  
کماٹی میں ہوگا

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيسُنَّهُ إِلَىٰ يَسْرَىٰ (۵-۷)  
یہ تفصیل ہے اس فرق و اختلاف کی جو لازماً نیکوں اور بدوں کی کماٹی میں رونما ہوگا اور جس  
کو رونما ہونا چاہیے بھی۔ فرمایا کہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا، اپنے رب سے ڈرے گا، اچھے  
انجام کو سچ مانے گا اس کو تو ہم آسان راہ چلائیں اور آسانی کی منزل تک پہنچائیں گے۔  
'أَعْطَىٰ' کے بعد 'وَاتَّقَىٰ' کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس اتفاق سے مقصود  
دعاء و نمائش یا کوئی اور دنیوی چیز نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تمنا اور ایک ایسے دن کا خوف  
ہو جس دن نیک عمل کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں بنے گی۔ اس کی وضاحت سورہ ہر میں یوں ہوئی ہے:

يَوْمَ نَبْلُغُ الْأَبْصَارَ ۖ وَتُجْعَلُ الْأَنْفُسُ كَالْأَفْجَارِ ۖ وَمُتَوَسِّلِينَ  
كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۖ وَيُطْعَمُونَ  
الطَّعَامَ عَلَىٰ حَبِّهِ مُسْكِنًا ۖ وَيَتَنَبَّهُونَ  
وَأَسِيرًا ۖ إِنَّمَا يُطْعَمُ كُفْرًا ۖ وَتُجْعَلُ  
لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا تَشْكُرُ ۖ

وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور ایک ایسے دن  
سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہوگی۔ وہ ضرور تمند  
ہونے کے باوجود، مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے  
ہیں۔ اس نیت کے ساتھ کہ ہم تم کو صرف اللہ کی  
خوشنودی کی خاطر کھلاتے ہیں، نہ کہ تم سے کسی بدلے



رَأَيْنَا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا  
مَجُوسًا قَتَطَرِيْدًا ۝  
کے طالب ہیں، نہ کسی شکریہ کے۔ ہم اپنے رب  
کی طرف سے ایک سخت اکل کھرے دن کے ظہور  
سے ڈرتے ہیں۔ (الدھر- ۷۶: ۷۷-۱۰)

’وَصَدَقَ بِالْحُسْنَى‘۔ ’حُسْنَى‘ کا موصوف لفظ عاقبتہ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ مخدوف  
ہے یعنی وہ اتفاق اور نیکی کے اچھے انجام پر ایمان رکھتے ہیں یہ ان کی نیکی کے اصل محرک کا پتہ دیا ہے  
کہ آخرت کے خوف کے ساتھ ان کے اندر یہ ایمان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی ہر نیکی کا بھرپور صلہ ہے۔  
جس شخص کے اندر نہ آخرت کا خوف ہو نہ وہ یہ ایمان رکھتا ہو کہ آخرت میں اس کی رائی کے  
برابر کی نیکی کا بھی مسلمہ ملنے والا ہے، وہ اول تو کچھ خرچ کرنے کا حوصلہ کر سکتا ہی نہیں اور کمرے گا  
بھی تو لازماً اپنے کسی دنیوی مفاد کو سامنے رکھ کر رہے گا۔ یہ اتفاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک بالکل برکت  
ہے۔ سورہ ماعون میں فرمایا ہے: اَرْءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالذِّبْنِ ۚ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ  
الْمُتَيْمِّمَ وَلَا يَخْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ (الماعون- ۱۰۷: ۱۰۸-۳) (تم نے دیکھا اور جزا کے تھلانے والے  
کو! یہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں ابھارتا)۔

’فَسَنِّيْسِرُّكَ لِلْيُسْرَى‘۔ ’يُسْرَى‘ کا موصوف بھی ’حُسْنَى‘ کے موصوف کی طرح مخدوف ہے۔  
یعنی ’العاقبة الیُسْرَى‘ یہ اس سنت الہی کا حوالہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جو  
شخص نیکی کی راہ اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس راہ کی مشکلات آسان کرتا اور اس  
کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کی توفیق بخشتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ  
سُبُلَنَا (العنکبوت- ۲۹: ۶۹) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ہم ان کو اپنے راستوں کی  
ہدایت بخشیں گے)۔ یہاں اس کی منزل کو ’یُسْرَى‘ سے اس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ اس کا حساب آسان  
ہوگا، چنانچہ فرمایا ہے: فَأَمَّا مَنْ أَدْرَاكَ يَكْتَبُهُ بِسْمِئِهِ ۖ فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حِسَابًا  
يُسْرًا (الانشقاق- ۸۲: ۸۷-۸۸) (اور وہ جس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں پکڑا یا جائے گا تو  
اس کا حساب نہایت آسان ہوگا)۔

’وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَى ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى ۖ فَسَنِّيْسِرُّكَ لِلْعُسْرَى‘ (۸-۱۰)

یہ مقابل کردہ یعنی ان لوگوں کا بیان ہے جو اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھتے ہیں۔ جو اپنے مال  
پر مار گنج بن کر بیٹھے اور آخرت سے بالکل نچرت ہیں، جو نہ کسی جزاء و انعام کے قائل اور نہ اس کے انجام  
لیے کوئی بازی کھیلنے کا حوصلہ رکھتے۔ فرمایا کہ ان کا حشر مذکورہ بالا کردہ سے بالکل مختلف ہوگا۔  
ان کو اللہ تعالیٰ اس راہ پر چلنے کے لیے ڈھیل دے دے گا جو ان کو نہایت کٹھن منزل پر لے جا چھوڑے گی۔  
یہاں بھی ’عُسْرَى‘ کا موصوف مخدوف ہے اور ’تیسیر‘ اجمال یعنی ڈھیل دینے کے مفہوم میں ہے۔



قرآن میں یہ سنت الہی جگہ جگہ بیان ہوتی ہے کہ جو لوگ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان کی باگ ان کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان کو اپنے نفس سے کوئی مزاحمت نہیں کرنی پڑتی اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی راہ نہایت ہموار ہے۔ نفس کی پیروی کرتے ہوئے وہ خوش خوش زندگی کی آخری منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو اس مرحلہ سے سابقہ پیش آتا ہے جس کو قرآن نے سَأَذِقُكَ صَعُودًا وَالْمَدْثَرِ (۴۰: ۱۷) میں اس کو چڑھاؤں کا ایک کٹھن چڑھائی سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں اسی مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کی زندگی ہوتی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی راہ پر چلنے کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔ ان کو قدم قدم پر اپنے نفس کی خواہشوں سے نڑائی کرنی پڑتی ہے اور اس نڑائی ہی سے ان کو بالتدریج وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو راہ کے عقبات عبور کرنے میں ان کو مدد دیتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان کے سامنے خَادُخُلِي فِي عِبَادِي ۝ رَادُخُلِي جَنَّاتٍ لَا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا أَنْهَارٌ کی آخری منزل آ جاتی ہے۔

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى (۱۱)

یہ 'مَا' نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور سوالیہ بھی۔ دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا لیکن سوالیہ میں زیادہ زور ہے اس وجہ سے میں نے اسی مفہوم کو لیا ہے۔ یہ بانداز سوال ان لوگوں کو تنبیہ اور ملامت ہے جو مال رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے جی چراتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے شخص کو اس کا مال اس وقت کیا نفع پہنچائے گا جب وہ جہنم کے کھڈ میں گر جائے گا!۔ مطلب یہ ہوا کہ مال کا اگر کوئی منتقل فائدہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں خرچ کر کے اس کو اپنی ابدی زندگی کے لیے محفوظ کرے۔ اگر ایسا نہ کیا تو یہ مال اس کے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ نافع نہ ہوا بلکہ ہمیشہ کے لیے موجب وبال بنا۔

إِنَّا عَلَيْنَا لِلْهُدَىٰ ۖ وَإِنَّا لَنَالُ الْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ (۱۲-۱۳)

یہ وہی تنبیہ نسبتہ زوردار لفظوں میں ہے کہ ہمارا کام لوگوں کو راہ دکھانا ہے سو یہ کام ہم نے اپنا رسول بھیج کر اور اپنی کتاب نازل کر کے کر دیا۔ یہ ذمہ داری ہماری نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو اس راہ پر چلا بھی دیں۔ یہ لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ راہ اختیار کریں۔ جو یہ راہ اختیار کریں گے وہ فلاح پائیں گے جو گمراہ کریں گے وہ اس کا انجام دیکھیں گے۔

وَإِنَّا لَنَالُ الْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ۔ یہ مذکورہ بالا تنبیہ پر مزید اضافہ ہے کہ لوگ یہ بات بھی اچھی طرح یاد رکھیں کہ آخرت ہو یا دنیا دونوں کے معاملات ہمارے ہی اختیار میں ہیں۔ نہ کوئی اپنی تدبیر اور اپنے زور سے اس دنیا میں کچھ بنا سکتا اور نہ آخرت میں کچھ بنا سکے گا۔ اگر کسی کو اپنے خاندانی شرف یا اپنے خیالی معبودوں پر ناز ہے تو وہ یاد رکھے کہ آخرت میں اس طرح کی مزعوم چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ ہر شخص کو صرف اللہ وحدہ لا شریک سے سابقہ پیش آئے گا۔ سورہ نجم آیت ۲۵ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

سے شامل ہو جائے میرے بندوں میں اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں۔



ادیرایت میں دَامًا مِّنْ بُخِلٍ وَاسْتَعْنَىٰ کے الفاظ جو آئے ہیں یہاں ان پر دوبارہ ایک نظر ڈال لیجیے۔ مال دار بخیلوں کے ذہن میں یہ خیال سما یا ہوا ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے ان کی اپنی تدبیر اور اپنے تدبیر کا ثمرہ ہے اس وجہ سے وہ اپنے کو خدا سے بالکل بے نیاز سمجھ بیٹھتے ہیں۔ قارون کو جب یاد دہانی کی گئی کہ وہ خدا کے بخشے ہوئے مال میں خدا کے حق کو پہچانے تو اس نے جواب دیا کہ اِنْسَانًا اُدْتِنْتُهُ عَلٰی عَمَلٍ عِنْدِي (الفصل ۲۸-۷۸) یہ تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملا ہے (یعنی میں نے اس کو اپنی قابلیت و ذہانت سے حاصل کیا ہے، خدا سے اس کو کیا تعاقب کہ اس میں اس کا بھی کوئی حصہ ہو! یہی ذہنیت کم و بیش ہر سرمایہ دار کی ہوتی ہے۔ قرآن نے اِنَّا لَنَاْلُ الْاٰخِرَةَ وَالْاُولٰٓئِیَ سے الفاظ سے اس شیطانی تصور پر بھی ضرب لگا دی ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ بھی خدا ہی کا دیا ملتا ہے اور آخرت میں جو کچھ ملے گا وہ بھی خدا ہی کے دیے ملے گا۔ نہ آخرت میں اس کا کوئی شریک و ہمیم ہے نہ دنیا میں۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظٰی ؕ لَا يَصْلٰہَا اِلَّا الْاَشْقٰی ؕ الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلٰی ؕ

وَسَيُجَنَّبُہَا الْاَتْقٰی ؕ الَّذِیْ یُوْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكٰی (۱۴-۱۸)

اصولی طور پر حقیقت بیان کر دینے کے بعد یہ خاص طور پر بھی قریش کو مخاطب کر کے واضح فرمادیا کہ ضروری تھا کہ تمہیں پہلے سے آگاہ کر دیا جائے اس وجہ سے میں نے تمہیں اس بھڑکنے والی آگ سے آگاہ کر دیا ہے جس میں وہی لوگ پڑیں گے جو نہایت بد بخت، تکذیب کرنے والے اور منہ موٹنے والے ہوں گے۔ اور وہ اس سے محفوظ رکھے جائیں گے جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے خرچ کریں گے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ مقابلہ یہاں کم شقی اور زیادہ شقی یا زیادہ متقی اور کم متقی میں نہیں ہے بلکہ رسول کی تکذیب کرنے والوں اور اس کی تصدیق کرنے والوں میں ہے۔ رسول اتمامِ حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے ٹھکانے والے سب 'اَشْقٰی' ہوتے ہیں۔ چنانچہ 'اَشْقٰی' کی صفت 'الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلٰی' آئی بھی ہے جس سے مقصود اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہاں زیرِ بحث وہ لوگ ہیں جو رسول کی تکذیب اس کے سامنے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو سب سے زیادہ شقی ہیں اور یہ اس جہنم میں پڑیں گے جس کی آگ پہلے سے ان کے لیے تیار اور شعلہ زن ہے۔ برعکس اس کے رسول کے انذار سے چوکنے ہو کر جو لوگ روزِ حساب کی تیاریوں میں لگ گئے، اپنے نفس کو آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کرنے لگے وہ سب 'اَشْقٰی' ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے ایسے وقت میں رسول کی بات مانی جب معاشرہ بحیثیتِ مجموعی اس کا دشمن تھا اور ایسے وقت نیکی کی راہ پر چلے جب اس پر چلنے کا حوصلہ کرنے والے بہت تھوڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کے ابتدائی رد کے ساتھ قبول کا درجہ 'سابقین' اور 'مقربین' کا ہے جس میں بعد والوں کو شامل ہونے کی سعادت کم ہی حاصل ہوگی۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ دوزخ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو زیادہ شقی ہوں گے، عام شقی دوزخ میں نہیں جائیں گے، لیکن یہ بات نہایت کمزور ہے۔ اگر اس کو صحیح مانیں تو ایک شخص



اس آیت سے یہ استنباط بھی کر سکتا ہے کہ دوزخ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو اعلیٰ درجہ کے متقی (اتقی) ہوں گے، عام متقی اس سے محفوظ نہیں رہیں گے یا یہ استدلال کر سکتا ہے کہ جنت کے حقدار صرف اتقی ہوں گے، عام متقی اس سے محروم رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں صحیح نہیں ہیں جن لوگوں نے بھی اس طرح کی کوئی بات کہی ہے ان کو غلط فہمی صرف آیات کا موقع و محل نہ سمجھنے سے پیش آئی ہے۔ ہم نے موقع و محل کی وضاحت کر دی ہے جس کے بعد اس طرح کی غلط فہمیوں کی راہ مسدود ہو گئی ہے۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ (۱۹-۲۰)

یہ عِبُوَّتِیْ مَعَالَهُ یَتَذَكَّرُ کی وضاحت ہے۔ یعنی تزکیہ نفس کے مقصد کے لیے وہ انفاق اللہ تعالیٰ مقبول ہے جو کے نزدیک وزن رکھتا ہے جو صرف اس کی خوشنودی اور رضا جوئی کی خاطر کیا جائے، یہ غرض نہ ہو کہ کسی رضا الہی کے کو مضمون احسان کر کے اس سے کسی شکل میں اس کا بدلہ چاہا جائے۔ ادھر سورہ دہر کی آیت لَا تُبَدِّلُ لَیْسَ ہو۔ مِنْكُمْ جَزَاءٌ وَلَا تَشْكُرُوا (اللہ ہر۔ ۶، ۷) (ہم کسی بدلے یا شکریہ کے طالب نہیں ہیں) ہم نقل کر آئے ہیں جو مضمون اس آیت کا ہے وہی مضمون دوسرے نکتوں میں یہاں بھی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ اور کسی کا اس پر احسان نہیں جس کا وہ بدلہ دے۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے اس ترجمہ کو غلط نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ جو شخص اس پر کچھ خرچ کرے جس نے پہلے اس پر کوئی احسان کیا ہے تو یہ انفاق اللہ کی رضا کے لیے نہ ہوگا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ احسان کرنے والے پر احسان کرنا اس درجہ کی نیکی نہ سہی جو کسی احسان نہ کرنے والے پر کی جاتی ہے لیکن آخر یہ نیکی کیوں نہیں ہے؟ ایک غریب نے آپ کو کبھی پیاس میں پانی پلا دیا تھا، کیا آپ اس کو بھدک میں روٹی کھلا دیں گے تو آپ کا یہ فعل رضائے الہی کے لیے نہ ہوگا۔

ہم نے آیت کا جو ترجمہ کیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ ہمارے نزدیک یہ ترجمہ زبان کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور تاویل کے پہلو سے بھی اس میں کوئی الجھن نہیں پیدا ہوتی۔

وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ (۲۱)

یہ ان لوگوں کو بشارت ہے جو اس طرح کے انفاق کی سعادت حاصل کریں گے جس کا ذکر اوپر ہوا فرمایا کہ وہ نہال ہو جائیں گے۔ ان دو نکتوں کے اندر رب کریم نے جو کچھ بخش دیا ہے اس کی تعبیر سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ یہ وہی نَاصِيَةٌ مَوْضِيَّةٌ کی ابدی بادشاہی جس کا ذکر اس کے محل میں ہو چکا ہے۔ ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلَّهِ أَوَّلًا وَآخِرًا۔



تدبر قرآن

۹۳

الضحی







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلق

یہ سورہ اور بعد کی سورہ ————— اَلْحَشْرِ ————— دونوں توام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس مشن پر مامور فرمایا ہے اس میں آپ نائز المرام ہوں گے۔ راہ میں جو رکاوٹیں اس وقت نظر آ رہی ہیں یہ سب دھڑ ہو جائیں گی۔ یہ مضمون پچھلی سورتوں میں بھی آیا ہے۔ البتہ دوسرے مطالب کے ضمن میں آیا ہے لیکن ان دونوں کا خاص مضمون ہی یہی ہے۔ ان کے آئینہ میں آپ کی زندگی کے تمام مراحل گویا آپ کے سامنے رکھ دیے گئے ہیں۔ ان میں تسلی کا جو انداز اختیار فرمایا گیا ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورہ شحیٰ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب دعوت کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ آپ آگے کی راہ مسدود پا کر دل گرفتہ رہنے لگے اور سورہ اَلْحَشْرِ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مخالفت کی شدت کے علی الرغم انقیاد میں کامیابی کے کچھ آثار بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

پہلے آفاق کے شواہد سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح اس دنیا کی مادی صلاحیتوں کو بردے کا رلانے کے لیے دن کی حرارت و روشنی کی بھی ضرورت ہے اور رات کی خفگی اور تاریکی کی بھی اسی طرح انسانی فطرت کے مخفی جواہر کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان عسر اور کسر، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت، دونوں طرح کے حالات سے گزارا جائے۔ جو لوگ زندگی کی تربیت میں ان امتحانوں کا مقام سمجھتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کی اعلیٰ صلاحیتیں ان سے پروان چڑھتی ہیں اور جو ان سے عہدہ براہونے کی حکمت سے نادانفہ ہوتے ہیں یا اپنی پست ہمتی کے سبب سے ان سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لیے قدرت نے ان کو مقدر



کیا ہے وہ اپنے آپ کو اس مقام بلند سے محروم کر لیتے ہیں جو اس امتحان سے گزرے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔

اس اصولی حقیقت کے بیان کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے تسلی دی ہے کہ اس وقت جس امتحان سے آپ گزر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے کسی بے اتفاقی یا آپ پر کسی عتاب کے سبب سے نہیں پیش آیا ہے بلکہ یہ اسی امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد آپ کو بشارت دی ہے کہ آپ اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں یہ مقدمہ ہے ایک ایسے دور کا جو اس سے بہت بہتر ہوگا اور اس میں آپ کا رب کریم ان فیروز مندپوں اور کامرانیوں سے آپ کو نوازے گا جو آپ کو نہال کر دیں گی۔

اس کے بعد آپ کی زندگی کے بعض ان مراحل کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو بعثت سے پہلے یا ابتدائے بعثت میں آپ کو پیش آئے اور جو ناطہ ہر کھٹن تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے آپ کو نکالا اور اس طرح نکالا کہ دنیا کی راہیں بھی آپ کے لیے فراخ ہوئیں اور روحانی فتومات کے دروازے بھی کھلے۔

آخر میں آپ کو ان نعمتوں کے حقوق ادا کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا گیا جو آپ کو حاصل ہوئیں۔ اس میں ضمناً ان لوگوں پر تعرض بھی ہے جن کا ذکر سابق سورتوں میں آیا ہے کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ سے اکڑنے اور اس کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والے بن گئے۔



# سورۃ الضحیٰ

مکیہ ۱۱۰ آیات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 وَالضُّحَىٰ ۝۱ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ  
 وَمَاقَلَىٰ ۝۳ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝۴ وَلَسَوْفَ  
 يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝۵ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝۶  
 وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝۷ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝۸  
 فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰  
 وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

۱۱  
۱۸

شاید ہے وقتِ چاشت اور شاید ہے رات جب پرسکون ہو جاتی ہے

ترجمہ آیات  
۱۱-۱

کہ تیرے خداوند نے نہ تجھے چھوڑا اور نہ تجھ سے بیزار ہوا۔ اور بعد کا دور تیرے لیے

پہلے سے بہتر ہوگا۔ اور تیرا خداوند تجھے عطا فرمائے گا پس تو نہال ہو جائے گا۔ ۱-۵

کیا اس نے تجھے یتیم پایا تو ٹھکانا نہ دیا! جو یاٹے راہ پایا تو راہ نہ دکھائی!

اور محتاج پایا تو غنی نہیں کیا! ۶-۸

تو جو یتیم ہے اس کو مت دباؤ اور جو سائل ہو اس کو نہ جھڑکیو، اور اپنے

پروردگار کی نعمت کا بیان کیجیو۔ ۹-۱۱



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ (۱-۲)

ضحیٰ چاشت کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا اور انسان رات میں آرام کے بعد از سر نو تازہ دم ہو کر، جدوجہد کے میدان میں اترتا ہے۔

رات اور دن کی شہادت قرآن میں، موقع کی مناسبت سے، مختلف پہلوؤں سے پیش کی گئی ہے جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں اس کے ساتھ 'اِذَا سَجَىٰ' کی قید لگی ہوئی ہے۔ 'سَجَىٰ' کے معنی 'دُکھا' اور 'سُکُن'، یعنی ٹھک جانے اور ساکن ہو جانے کے آتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہاں رات کا وہ وقت پیش نظر ہے جب وہ دن کے شور و شغب اور ابتدائے شب کے ہنگاموں سے نکل کر اچھی طرح ٹھک جاتی اور انسان کو سکون و راحت بخشنے کے قابل بن جاتی ہے۔ گویا لفظ 'ضُحَىٰ' سے جو حصہ دن کا مراد لیا گیا ہے 'وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ' سے اس کے بالمقابل شب کا حصہ مراد لیا گیا ہے۔

یہ دن اور رات غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اپنی شکل و صورت، اپنے مزاج اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اگرچہ بالکل مختلف ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود انسان بھی اپنی زندگی کے لیے ان کا محتاج ہے اور یہ دنیا بحیثیت مجموعی بھی اپنی بقا کے لیے ان کی حاجت مند ہے اور خالق کائنات کی یہ بہت بڑی رحمت و عنایت ہے کہ اس نے دن کے ساتھ رات اور رات کے ساتھ دن کو وجود بخشا اور ان دونوں کے تفاعل سے وہ مصالح پورے ہوتے ہیں جو اس دنیا کے بقا کے لیے ضروری ہیں۔ قرآن نے ان دونوں کے تفاعل کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے، مثلاً،

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ  
لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا  
دہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے رات کو تاریک  
بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو  
روشن بنایا تاکہ تم اس میں جدوجہد کرو۔

رہونسی - (۱۰: ۶۷)

سورہ قصص میں فرمایا ہے:

وَمِنْ رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ  
اُدْبَارَ اس کی رحمت میں ہے کہ اس نے تمہارے لیے

لے اس آیت میں حذف و ایجاز کا جو اصول ملحوظ ہے اس کی وضاحت آیت کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔



الْیَلَّ وَالنَّهَارَ لِنَشْكُرُوا  
فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ  
ذَلَّلَكُمْ تُشْكُرُونَ ۝  
(القلم - ۲۸: ۷۳)

رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون  
جمل کرو اور دن میں اس کے رزق و فضل  
کے طلب کرنے والے بنو اور نہ تاکہ تم اپنے رب  
کے شکر گزار رہو۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَبْلُ (۳)

یہ وہ اصل مدعا ہے جس کو مبراہن کرنے کے لیے ادھر کے آفاقی شواہد کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب رنج اور راحت  
یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں سورج کی روشنی اور حرارت بھی ضروری ہے اور رات کی تاریکی اور  
سکون بھی اسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے عسر اور کسر، نرمی اور درشتی، فقر  
اور غنی کی آزمائشیں بھی ضروری ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ جیسا کہ سورہ فجر میں وضاحت فرمائی  
ہے اپنے بندے کے صبر یا شکر کا امتحان کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس وقت اگر تم منہ لگوں کی مخالفت  
اعوان و انصار کی قلت اور اسباب و وسائل کی کمی سے دوچار ہو یا آسمانی دروہانی کمک کی جتنی ضرورت  
محسوس کر رہے ہو اتنی تمہیں نہیں پہنچ رہی ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اب تمہارے رب  
نے تمہیں چھوڑ دیا ہے یا تم سے بیزار ہو گیا ہے بلکہ یہ تمہاری تربیت کے لیے تمہارا امتحان ہے  
تاکہ تم اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔

اس آیت کے اندر یہ سارا مضمون مضمون ہے جو ادھر کی آیات سے بھی واضح ہو رہا ہے اور  
آگے کی آیات اور اس کے بعد کی سورہ سے بھی، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، واضح ہو گا لیکن بتقدائے  
ایجاز مقسم علیہ کی حیثیت سے سب سے نمایاں تسلی کے مضمون کے اسی پہلو کو کیا گیا ہے جس کے آپ  
اس دور میں خاص طور پر محتاج تھے یعنی یہ اطمینان دلادیا گیا کہ جن حالات سے اس وقت آپ دوچار  
ہیں اس کی وجہ آپ کے معاملہ سے اللہ تعالیٰ کی بے تعلقی یا ناتوازی نہیں بلکہ سنت الہی کے مطابق  
آپ کی تربیت ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ مکی دور میں قریش کی مخالفت جب زیادہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے  
آپ کو خاص پریشانی جو ہوئی وہ یہی ہوئی کہ مبادا ان لوگوں کی اس بیزارگی میں آپ کی کسی کوتاہی  
یا بے تدبیری کو کوئی دخل ہے جو اللہ تعالیٰ کے عقاب کا سبب ہوئی جس کے باعث یہ حالات  
پیش آرہے ہیں۔ آپ کا یہ احساس ظاہر ہے کہ ایک نہایت کم شکن احساس تھا چنانچہ آگے والی سورہ  
میں اس کو کم شکن بوجھ سے تعبیر فرمایا گیا ہے: "وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي أَنْقَضَ  
ظَهْرَكَ" (الحج - ۹۴: ۲۱-۳)

اس پریشانی میں قدرتی طور پر آپ کو سب سے زیادہ بے چینی کے ساتھ وحی الہی کا انتظار ہوتا



اس لیے کہ یہی واحد چیز ہے جو تاریک حالات میں روشنی بھی دکھا سکتی ہے اور اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہوتا کہ آپ فریضہ دعوت رب کے منشا کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا اس میں کوئی کوتاہی یا بے تدبیری ہو رہی ہے۔ لیکن وحی کا معاملہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ حضور کو انتظار اور پریشانی ہو تو وحی نازل بھی ہو جائے۔ چنانچہ ان حالات میں وحی کے وقفہ سے آپ کی پریشانی فطری طور پر دوچند ہو جاتی۔ حضور کی ان پریشانیوں کا ذکر مکی سورتوں میں جگہ جگہ ہوا ہے اور ہم ان کی پوری وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو سورہ اطلہ اور سورہ قیامہ کی تفسیر میں متعلق مباحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اس آیت میں آپ کو جو تسلی دی گئی ہے وہ اسی طرح کے حالات میں دی گئی ہے، ضروری نہیں کہ کفار میں سے کسی کے اس طعنہ کے جواب میں کہ اس شخص کو اس کے رب نے چھوڑ دیا۔ یہ آیت اتری ہو۔ کفار یہ مانتے کب تھے کہ اللہ تعالیٰ سے آپ کا یا آپ کی دعوت کا کوئی خاص ربط ہے اور وہ آپ پر وحی بھیجتا ہے! وہ تو آپ کو کاہن اور شاعر کہتے تھے۔ پھر یہ کہ وحی کے آنے یا نہ آنے کا تجربہ صرف حضور کو ہوتا تھا، کفار کو کیا معلوم کہ وحی کا سلسلہ قائم ہے یا بند؟ جہاں تک تبلیغ و دعوت کا تعلق ہے وہ آپ نے ایک دن کے لیے بھی کبھی بند نہیں کی کہ کفار کو یہ طعنہ دینے کا موقع ملے کہ اب یہ شخص اپنے منصب پر مامور نہیں رہا یا اس کے رب نے اس کو چھوڑ دیا۔

وَلَا اخِذْنَا خَيْرَ لَكَ مِنَ الْاُولٰی (۴)

یہاں 'اخِذْنَا' اور 'اُولٰی' کے الفاظ دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عام مفہوم یعنی دعوت کے دورِ آخر اور دورِ اول یا اس کے حاضر و مستقبل کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ اسی تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ اس وقت جو حالات ہیں وہ بدل جائیں گے اور مستقبل ماضی و حاضر سے بہت بہتر ہوگا۔ اس مضمون کی بشارت خفی اور جلی دونوں طرح قرآن نے جگہ جگہ دی ہے اور قدیم صحیفوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں ان میں آپ کی دعوت کے آغاز کو رائی کے دانے کی تمثیل سے سمجھایا ہے جو ہوتا تو نہایت چھوٹا ہے لیکن جب اگتے ہو تو اس کا پورا سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پرندے اس میں سیرا لیتے ہیں۔

تسلی کے مضمون  
کی مزید وضاحت

لفظ 'خَيْرٌ' سے یہاں جو بشارت دی گئی ہے وہ ایک جامع بشارت ہے جس کے اندر دین کے غلبہ و تمکّن، مکہ کی فتح، دشمنوں کی پامالی اور دین میں داخل ہونے والوں کی کثرت کے وہ سارے پہلو جمع ہو گئے ہیں جو سابق سورتوں میں بھی بیان ہوئے ہیں، آگے والی سورہ میں بھی ان کی طرف اشارہ

ایک جامع

بشارت



ہے اور سورہ نصر میں بھی ان کی وضاحت آئے گی۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (۵)

فرمایا کہ عنقریب تمہارا رب تمہیں دے گا اور تم نہال ہو جاؤ گے۔ یہاں اگرچہ واضح نہیں فرمایا کہ کیا دے گا لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہی خیر ہے جس کی بشارت اوپر والی آیت میں دی گئی ہے اور جو مادی ہے ان تمام فیروز مندلیوں اور کامرائیوں پر جو بعد کے ادوار میں اسلام کو حاصل ہوئیں۔ چونکہ ابھی یہ ساری باتیں پردہ غیب میں تھیں اس وجہ سے 'يُعْطِيكَ' کے مفعول ثانی کو ظاہر نہیں فرمایا لیکن اس کے بعد 'فَتَرْضَىٰ' کے لفظ نے کسی قدر اس شاندار مستقبل کی جھلک دکھا دی کہ اتنا دے گا کہ بس تم نہال ہو جاؤ گے! — اس ایک ہی لفظ کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتا۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۖ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۖ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (۶-۸)

یہ اسی بات کو جو اوپر آیت ۴ میں ارشاد ہوئی کہ تمہارا مستقبل ماضی سے بہتر ہوگا، مؤکد <sup>حضور کی زندگی کے</sup> کرنے کے لیے خود حضور ہی کی زندگی کے بعض سبق آموز حالات کی طرف توجہ دلائی کہ غور کرو تو تمہیں <sup>بہتر اور غایت</sup> اپنی ہی زندگی اس حقیقت کی نہایت عمدہ تفسیر نظر آئے گی۔ <sup>کی طرف اشارہ</sup>

سب سے پہلے آپ کی یتیمی کا حوالہ دیا۔ یتیمی اول تو خود ہی ایک بہت بڑی مصیبت ہے لیکن معاشرہ اگر اس حد تک بگڑا ہوا ہو جس کی تصویر پچھلی سورتوں میں کھینچی گئی ہے تو اس میں یتیم کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'كَلَّا بَلْ لَّا تَكُونُونَ الْيَتِيمَ' (الفجر: ۸۹-۹۰) (ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم کی کوئی عزت نہیں کرتے) اسی طرح حضور ہی کے خاندان کے بعض افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: 'فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ' (الماعون: ۱۰۴-۱۰۵) (وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

لیکن حضور کے حال پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہوا کہ باوجودیکہ آپ کے والد ماجد نے کوئی قابل ذکر ترکہ نہیں چھوڑا لیکن آپ کے دادا اور ان کے بعد آپ کے چچا نے آپ کی پرورش کی اور نہایت عزت اور شفقت کے ساتھ پرورش کی۔ عام حالات میں دادا کے دل میں یتیم پوتے کے لیے شفقت اور چچا کے دل میں یتیم بھتیجے کے لیے عزت و محبت کا پایا جانا کوئی نادر بات نہیں بلکہ انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے لیکن ایک فاسد معاشرہ میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ایک نادر الوجود بات ہے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی یتیم پر اپنے جمال و محبت کا وہ پر تو ڈال دے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ڈال دیا کہ ان کی پرورش ان کے سب سے



بڑے دشمن فرعون نے اپنے محل میں کی۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ - یہ اس روحانی العالم کا بیان ہے جو آپ پر بعد کے دور میں ہوا۔

معلوم ہے آپ کو جو رسوم و روایات خاندان کے بزرگوں سے وراثت میں ملیں ان پر آپ کی سلیم فطرت ایک لمحہ کے لیے بھی مطمئن نہ ہو سکی اور دوسری کوئی ایسی روشنی تھی نہیں جو آپ کے لیے سرمایہ تسکین بن سکتی۔ آسمانی مذاہب کے پیرو جو آپ کے گرد و پیش تھے ان کا حال 'البقرة'، آل عمران اور دوسری مدنی سورتوں سے واضح ہو چکا ہے کہ ان کے عقائد و اعمال اس قدر منہج ہو چکے تھے کہ کوئی جو یا نئے حقیقت ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت حال نے آپ کو ایک شدید قسم کی ذہنی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ آپ کی اسی کشمکش کو یہاں 'وَوَجَدَكَ ضَالًّا' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ 'ضال' یہاں گمراہ کے معنی میں نہیں بلکہ جو یا نئے راہ کے معنی میں ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ابتدائی دور میں بھی فطرت کی بدیہیات سے کبھی منحرف نہیں ہوتے لیکن فطرت صرف عقائد و اعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ تمام عقائد اور ان کے سارے تفصیلات و لوازم کی نہ وہ تشریح کر سکتی اور نہ تمام اعمال و اخلاق کی صحیح صحیح حد بندی اس کے بس میں ہے اس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج ہی رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر اس کا دل گواہی دے رہا ہے اس کی صفات اور ان صفات کے تقاضے اور مطلبے کیا ہیں؟ اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں؟ زندگی کی ایسی ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری، اپنے بعید ترین گوشوں میں بھی، خالق کی پسند کے مطابق ہو جائے؟ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں اس وقت تک نہ انسان کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا اور نہ رب کے ساتھ اس کا تعلق ہی استوار ہو سکتا۔ یہی سوالات ہیں جو پوری شدت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر زندگی کے اس دور میں مستولی تھے جس کی طرف 'وَوَجَدَكَ ضَالًّا' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت نہ ضلالت کی ہے اور نہ اس کو ہدایت سے تعبیر کر سکتے بلکہ صحیح الفاظ میں یہ جستجوئے راہ کی سرگردانی ہے۔ گویا ایک شخص چوراہے پر کھڑا ہو اور فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کس سمت میں قدم بڑھائے۔ بعثت سے پہلے غار حراء کی تنہائیوں میں آپ انہی گتھیوں کو سلجھانے میں گم رہے۔

ایک جوائے راہ  
کی سرگردانی  
اور خدا کی  
دست گیری

بعثت سے پہلے  
جستجوئے راہ

بعثت سے پہلے عرب میں دین حنیفی کے پیروؤں کا حال کتا بوں میں اس طرح بیان ہوا



ہے کہ ان میں سے بعض افراد ایسی شدید الجھن میں مبتلا تھے کہ وہ بیت اللہ سے ٹیک لگا کر حرم میں بیٹھ جاتے اور نہایت حسرت کے ساتھ کہتے کہ اے رب! ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں ورنہ اسی طرح کرتے۔ یہی حال اس وقت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی رہا ہو گا جب تک آپ ایمان کی حقیقت اور کتاب سے روشناس نہیں ہوئے۔ چنانچہ قرآن میں اسی حالت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: **وَكَذَلِكَ أَفْهِمْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَذَرِّحِي مَا أَكْتُبُ فَلَا إِلَّا يَمَانٌ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا** (الشوریٰ - ۴۲: ۵۲) (اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر میں سے ہے، زخم کتاب سے آشنا تھے اور ایمان سے لیکن ہم نے اس وحی کو روشنی بنایا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں) اس حالت کو سورہ یوسف میں 'غفلت' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے **وَأَن كُنْتَ مِنْ نَّبِيِّهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ** (یوسف - ۱۲: ۳) (اور بے شک اس سے پہلے تم اس سے بے خبروں میں سے تھے)۔

**دَوَّجِدَ لَكَ عَائِلًا غَنِيًّا** فرمایا کہ ہم نے تمہیں محتاج پایا تو غنی کر دیا۔ غنا اور فقر کا جتنا تعلق ملا ہے حقیقی غنا کا اسباب دو سائل سے ہے اس سے زیادہ قلب کے احوال سے ہے۔ آدمی کا سینہ ایمان سے خالی ہو تو وہ محتاج ہے اگرچہ اس کے پاس تارون کا خزانہ ہو اور اگر ایمان سے اس کا سینہ معمور ہے تو وہ غنی ہے اگرچہ وہ حضرت یحییٰ کی طرح کل کی پوشاک پہنتا اور جنگلی شہداء اور ٲیوں پر گزارہ کرتا ہو۔ یہی حکمت یوں سمجھائی گئی ہے کہ **الغنى غنى القلب** (حقیقی غنا دل کا غنا ہے) یہ حقیقی غنا ایمان، اللہ کی معرفت اور اس کی کتاب کے نور سے پیدا ہوتا ہے جس کو یہ دولت حاصل نہیں ہوئی وہ دنیا کی حرص سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا اور جو حرصیں ہے اس کا کاسہ گدائی کبھی نہیں بھرتا۔

کاسہ چشم حویلیاں پڑنے شد

یہ دنیا علم اسباب ہے اس وجہ سے اس میں انسان اسباب کا محتاج ہے۔ اگر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدہ خدیجہ کے مال سے کچھ فائدہ پہنچا تو یہ حضرت خدیجہؓ اور ان کے مال کی ایسی خوش بختی ہے جو اس زمین پر کسی مال اور کسی صاحب مال کو مشکل ہی سے حاصل ہوئی ہوگی لیکن وہ غنا جس کا یہاں ذکر ہے مجرد مال سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہیں حاصل ہوتا بلکہ یہ اصل اس ہدایت کا ثمرہ ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے اور جس کی صحیح تعبیر وہ شرح صدر ہے جس کی تفصیل بعد کی سورہ **النَّاسُ شَرٌّ** میں ہے جو اس کی تو ام ہے، آئے گی۔ جن لوگوں نے اس غنا کو تمام تر حضرت خدیجہ

کے مال کا نتیجہ قرار دیا ہے ان کی نظر صرف ظاہر پر ٹپک گئی حالانکہ اصل حقیقت اس سے ماوراء ہے جو دیکھی نہیں جاسکتی بلکہ صرف سمجھی جاسکتی ہے۔ یہاں اشارات پر تامل فرمائیے۔ آگے آخری آیت کے تحت بھی اور سورہ **النَّاسُ شَرٌّ** میں بھی اس کے بعض مخفی پہلو ان شاء اللہ زیر بحث آئیں گے۔



فَأَمَّا الَّتِي تَمَّ فَلَا تَقْهَرُ وَأَمَّا السَّائِلُ فَلَا تَنْهَرُ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ  
فَحَدِّثْ (۹-۱۱)

انعامات کا

حق

یہ ان انعامات کا، جو اوپر مذکور ہوئے، حق بیان ہوا ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس میں ان لوگوں پر نہایت لطیف تعریف بھی ہے جن کا حال پچھلی سورتوں میں بیان ہوا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائیں ان کو اس کا انعام سمجھنے اور اس کے شکر گزار ہونے کی بجائے وہ اس گھنڈ میں مبتلا ہو گئے کہ یہ جو کچھ ان کو ملا ہے یہ اسی کے حقدار ہیں۔ فرمایا کہ تم یہ روش نہ اختیار کرنا بلکہ تمہاری یتیمی کی حالت میں تمہارے رب نے جس طرح تم کو پناہ دی اسی طرح تم یتیموں کو پناہ دینا، ان پر شفقت اور کرم کی نظر رکھنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا۔ آیت دُنَّا كَذَّبْنَا السَّالِفَاتِ أَكْثَلًا كَمَا دَا لَفَجَرُوا (۸۹: ۱۹۰) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ جاہلی معاشرہ میں زور آور عصابات اور اقرباء کمزور وارثوں اور یتیموں کے حقوق دبا بیٹھتے اور ساری وراثت تنہا سمیٹ لیتے۔ 'فَلَا تَقْهَرُ' کے الفاظ میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ 'فَلَا تَقْهَرُ' کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کو کمزور پا کر اس کو دبانے اور اس کے حقوق غصب کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم پر ظاہر ہے کہ اس بنا پر نہیں گئی کہ آپ سے اس قسم کے کسی جرم کے صدور کا امکان تھا بلکہ یہ بالواسطہ قریش کے ان زور آوروں کو تنبیہ ہے جن کو پچھلی سورتوں میں ان کے اسی قسم کے غصب حقوق پر سرزنش فرمائی گئی ہے لیکن وہ اپنے رویے کی اصلاح کے بجائے رسول کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سورہ میں ان کو نظر انداز کر کے رسول کو ہدایت فرمادی کہ دوسرے جو رویہ بھی اختیار کریں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، تمہیں بہر حال یتیموں کے حقوق کی حفاظت کرنی ہے۔

دوسرے انعام

کا حق

وَأَمَّا السَّائِلُ فَلَا تَنْهَرُ؛ یہ اس انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر دو جگہ صَآلَا فَهَذِي کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ لفظ سائل یہاں محدود معنی میں نہیں بلکہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خواہ سائل اپنے پیٹ اور تن کی کسی ضرورت کے تحت سوال کرے یا اپنی کسی ذہنی و عقلی الجھن سے متعلق سوال کرے یا اپنے دین سے متعلق سوال کرے، غرض جس طرح کی بھی مدد و رہنمائی کا طالب ہو حتیٰ الامکان اس کی مدد و رہنمائی کی جائے اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے معذرت پیش کر دی جائے، اس کو جھڑکا اور ڈانٹا نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنا کہ ایک دور تم پر بھی ایسا گزرا ہے جب تم ہر آپ سوال تھے اور ان سوالوں نے تمہاری زندگی نیتق میں ڈال رکھی تھی بالآخر تمہارے رب نے تمہاری ہر خلش دور فرمائی اور تمہارے



ہر سوال کا جواب دیا۔ اس کا حق یہ ہے کہ تم بھی سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جن کا حال یہ ہے کہ خدا نے ان کو دے رکھا ہے تو مسکینوں اور سائلوں سے تزش روٹی سے پیش آتے ہیں اور اگر ابھی کسی گردش میں خدا ان کو پکڑ لے تو کہیں گے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا، اس وقت ان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ انھوں نے خدا کے بندوں کو کس طرح ذلیل کیا ہے۔

”وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر لوگوں کو اللہ ”وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى“ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ ہم اس کی وضاحت کرتے ہوئے کی حکمت سے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے صرف وہ غنا مراد نہیں ہے جو حضور کو حضرت خدیجہ کے مال سے حاصل ہوا بلکہ اصل اس سے دین کی وہ حکمت اور شریعت کی وہ دولت مراد ہے جس کی شان قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ ”وَمَنْ يُؤْتِبِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا“ (البقرة - ۲ : ۲۹۹) اور جس کو حکمت عطا ہوئی اس کو خیر کثیر کا خزانہ بخشا گیا۔ یہاں لفظ ”فَحَدِّثْ“ خاص طور پر نگاہ میں رکھئے۔ یہ مال کی نعمت کے لیے نہیں بلکہ حکمت کی نعمت ہی کے لیے موزوں ہے۔ فرمایا کہ جس حکمت کے خزانے سے تمہارے رب نے تم کو بہرہ ور کیا ہے اس کی تحدیث کرو یعنی جس طرح تمہارے رب نے تمہیں مفت بخشا ہے تم بھی اس کو مفت بانٹو، فیاضانہ بانٹو، ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کا چرچا کرو اور ہر نرم و انجمن کو اس کے ذکر سے معمور کر دو۔

رب کریم کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَاُحَمِّدُ لِلّٰهِ عَلَىٰ إِحْسَانِهِ۔

لاہور

۶۔ فروری ۱۹۸۰ء

۱۹۔ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ







تذکرہ قرآن

۹۲

المنشراح







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ کی مثنیٰ ہے۔ سورہ ضحیٰ کے بعد یہ بغیر کسی تمہید کے اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا سابق سورہ میں جو مضمون اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاَدٰی (الفصحی - ۹۳: ۶) اور اس کے بعد کی آیات میں بیان ہوا ہے اسی کی اس میں تکمیل کر دی گئی ہے۔ بس اتنا فرق نظر آتا ہے کہ سابق سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن الطاف و عنایات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا ذریعہ بنایا ہے ان کا تعلق بعثت سے قبل یا ابتدائے بعثت کے دور سے ہے اور اس میں جن انصاف و احسانات کا حوالہ دیا ہے وہ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب آپ کی دعوت کا چرچا مکہ سے نکل کر عرب کے دوسرے گوشوں میں بھی پہنچ چکا ہے۔

سابق سورہ میں آپ کو یہ بشارت دی گئی کہ دعوت کے پہلو سے آپ کا مستقبل آپ کے ماضی اور حاضری سے بہت بہتر ہوگا، آپ اس وقت جن مشکلات سے دوچار ہیں وہ قانونِ قدرت کے مطابق آپ کی تربیت کے لیے ہیں وہ جلد دور ہو جائیں گی۔ اس سورہ میں اس بشارت کی صداقت کے چند نمائندہ شواہد کا حوالہ دے کر تاکید کے ساتھ آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں آپ کو جو دشواری بھی پیش آئے گی اس کے پہلو بہ پہلو فیروزِ مندی بھی ہوگی بشرطیکہ آپ عزم و جزم کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ کریں۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے اس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس ذہنی پریشانی سے دوچار رہے اس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرحِ صدر کی جس نعمت سے سرفراز فرمایا ہے پہلے اس کا حوالہ ہے اس کے بعد آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ جس طرح آپ نے اب تک دیکھا ہے کہ ہر شکل کے بعد آسانی نمودار ہوتی ہے اسی طرح آئندہ



بھی آپ کی دعوت کے مراحل طے ہوں گے اور کسی مرحلے میں بھی یہ کام رکنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد تکمیل دعوت کی منزل کی طرف اشارہ اور اس مرحلہ کی کامرانیوں کے حصول کی تدبیر بتائی گئی ہے۔

---



# سُورَةُ الْمُنَشَّرِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمُنَشَّرُ لَكَ صَدْرَكَ ① وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ②  
الَّذِي أَقْبَضَ ظَهْرَكَ ③ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ④  
فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑤ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑥ فَإِذَا  
فَرَغْتَ فَأَنْصَبْ ⑦ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ⑧

آیات  
۸-۱

ع  
۱۹

کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا اور جو بوجھ تمہاری کمر کو توڑے دے رہا  
تھا اس کو تمہارے اوپر سے اتار نہیں دیا! اور تمہارا آوازہ بند نہیں کیا۔ ۱-۴  
تو ہر مشکل کے ساتھ آسانی، بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۵-۶  
پس جب تم فارغ ہو تو کمر بستہ ہو اور اپنے رب سے کو لگاؤ۔ ۷-۸

ترجمہ آیات  
۸-۱



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الْمُنشَخُ لَكَ صَدْرَكَ ۖ وَوَضَعْنَا عَنْكَ فُوزَكَ (۲-۱)

وہ سنتِ الہی  
جو دعوتِ حق  
کی کامیابی کے  
لیے مقرر ہے

سابقہ سورہ کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کی تفصیل بیان ہو چکی ہے جو بعثت سے پہلے آپ کو جستجوئے حقیقت کی راہ میں اور ابتدائے بعثت کے دور میں مخالفوں کی مخالفت کی شدت اور اعوان و انصار کی قلت کے سبب سے لاحق ہوئیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ بشارت بھی دی گئی کہ اس وقت آپ جن حالات و مشکلات سے دوچار ہیں یہ وقتی و عارضی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جلد دور فرمادے گا اور آپ کی دعوت کا مستقبل اس کے ماضی و حاضر سے بہت زیادہ روشن ہوگا۔ بعد میں جب وحیِ الہی کی روشنی نے آپ کے دل کے خلیجان دور کر دیے اور حقیقت روشن ہو کر سامنے آگئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم اور مزید حوصلہ افزائی کے لیے اپنی وہ سنت بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمادی جو اس نے دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے مقرر فرما رکھی ہے اور جس سے لازماً ہر داعیِ حق کو سابقہ پیش آتا ہے اور جو آگے اس سورہ کے اصل مضمون کی حیثیت سے 'فَانْ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا' (۵) (بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

سینہ کو کھول دینے سے مقصود وہ بعیرت و معرفت پیدا کرنا ہے جو صحیح ایمان کا ثمرہ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ پر وہ اعتماد و توکل پیدا ہوتا ہے جو تمام قوت اور عزم کا سرچشمہ ہے۔ اگر یہ ایمان موجود ہو تو بڑی سے بڑی مزاحمت بھی انسان کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتی اور اگر یہ نہ ہو تو بغیر کسی مزاحمت کے بھی انسان شکست کھا جاتا ہے۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ فُوزَكَ ۖ یہ جملہ معنایاً پہلے ہی جملہ پر عطف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ ہم نے اسی کے تحت کیا ہے۔ سورہ نبا کی تفسیر میں اس اسلوب کی وضاحت ہو چکی ہے۔

الْبِذِّي الْقَصَّ ظَهْرَكَ (۳)

غم بالائے غم!

یہ اس 'وِذْر' (بوجھ) کی صفت ہے کہ اس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔ یہ وہی بارِ غم ہے جو بعثت سے پہلے آپ کے دل پر اس سبب سے تھا کہ آپ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں و حیران تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا پھر جب اللہ نے آپ پر ہدایت کی راہ کھول دی تو اس غم پر مزید اضافہ اس سبب سے ہوا کہ آپ کی پوری قوم اس کی دشمن بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔



اس غم کو الَّذِیْ اَلْقَفْنَ ظُهُرَکَ (کمر شکن) کی صفت سے تعبیر کرنا کوئی مبالغہ نہیں بلکہ بحقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس ہدایت سے آپ کا سینہ کھول دیا اس کے متعلق آپ کا یہ احساس ایک امر فطری تھا کہ جس طرح اس نے آپ کے سینہ میں گھر کر لیا اسی طرح ہر سینہ میں اس کو اتر جانا چاہیے۔ لیکن اس توقع کے خلاف جب آپ نے دیکھا کہ جتنے ہی دعوت کی راہ میں آپ کی سرگرمی بڑھتی جا رہی ہے اتنی ہی اس سے لوگوں کی وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو قدرتی طور پر آپ کو یہ گمان گزرا کہ شاید آپ کی جدوجہد میں کوئی کمی یا غامی ہے جس کے سبب سے دعوت اثر انداز نہیں ہو رہی ہے۔ یہ گمان کر کے آپ جدوجہد میں مزید اضافہ کرتے چلے جاتے لیکن اس سے بھی جب صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو آپ کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ علاوہ ازیں اس طرح کے حالات میں اگر دھم کے آنے میں کچھ وقفہ ہو جاتا تو یہ وقفہ بھی آپ کے غم و الم میں اضافہ کر دیتا کہ مبادا یہ اللہ تعالیٰ کے کسی عتاب کے سبب سے ہو۔ حضور کی ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے جس طرح یہاں تسلی دی گئی ہے اسی طرح سورہ طہ میں بھی دی گئی ہے:

طہ ۵ مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ  
الْقُرْآنَ لِتَشْفٰی ۝۱۱۱ لَا تَذِکْرَۃً  
لِّمَنْ یَّخْشٰی ۝۱۱۲  
یہ سورہ طہ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس  
لیے نہیں اتارا ہے کہ اپنی زندگی اجیرن بنا  
لو۔ یہ تو بس ان لوگوں کے لیے یاد دہانی  
ہے جو ڈرنے والے ہوں۔

(طہ - ۲۰: ۱-۳)

وَدَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (۴)

یعنی کیا یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے تمہارا آواز بلند کیا! 'لَکَ' جس طرح پہلی آیت میں اختصار سے  
تائید اور نصرت کے اظہار کے لیے ہے اسی طرح یہاں بھی ہے۔ یعنی تمہاری تقویت و حوصلہ افزائی  
کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہارا ذکر و درود رنگ پھیلا دیا۔

اس آیت سے سورہ کا زمانہ نزول معین ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں اتری ہے جب آپ دعوت کا چرچا  
کی دعوت کا چرچا عرب کے اطراف و اکناف میں پھیلنے لگا ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مکہ کے سادات  
جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دعوت دی، وہ تو ایک عمر تک دعوت اور داعی کی  
مخالفت پر جمے رہے لیکن حج کے موسم میں باہر کے جو لوگ آتے ان کے ذریعہ سے یہ دعوت مکہ کے اطراف  
خصوصیت کے ساتھ مدینہ کے انصار میں پھیل گئی۔ پھر بالتدریج نہ صرف عرب کے دور و قریب کے قبائل  
بلکہ اطراف کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کا ذکر پہنچ گیا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہا کہ یہ آواز دینے والی  
نہیں ہے بلکہ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ بچہ بچہ کی زبان پر اس کا چرچا ہوگا اور گوشہ گوشہ  
اللہ اکبر کی صدا سے گونج اٹھے گا۔



فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۵-۶)

اصل سبق

یہ وہ اصل سبق ہے جو اوپر کے پیش کردہ شواہد کی روشنی میں دینا مقصود ہے اور جس کو اس سورہ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے۔ فرمایا کہ جب تم اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ دیکھ رہے ہو تو اس کی اس سنت پر اطمینان رکھو کہ اس نے 'یُسْرًا' کا دامن 'عُسْرًا' کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ یعنی آسانی ظاہر تو ہوگی ضرور لیکن آزمائش کے دور سے گزرنے کے بعد سابق سورہ میں یہی حقیقت آفاق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات سے ثابت کی گئی ہے۔ اس سورہ میں خاص حضورؐ کی زندگی کے تجربات ہی کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ زیادہ مؤثر ہو سکیں۔

یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ایک ہی بات دو مرتبہ فرمائی گئی ہے۔ یہ تکرار محض تاکید کے لیے نہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ 'عُسْرًا' اور 'یُسْرًا' دونوں اس دنیا میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک گھاٹی کسی نے پار کر لی تو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی نئی گھاٹی سے اس کو سابقہ نہیں پیش آتا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے۔ چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس جہان میں ہر مسافر کو نشیب و فراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی دہرو منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ حق کے راستہ پر چلنے والوں سے بھی ہے جو لوگ اس راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ راہ سے تمام عقبات خود بخود دور ہو جائیں بلکہ ان کو دور کرنے کے لیے خود ان کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے یہ ضمانت ضرور ہے کہ اگر وہ راہ کی رکاوٹوں کے علی الرغم بہت نہیں ہاریں گے اور جتنی قوت ان کے رب نے ان کو بخشی ہے اس کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے تو وہ ان کے لیے ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرے گا جس سے تازہ دم ہو کر وہ آگے کے سفر کے لیے مزید عزم و حوصلہ حاصل کر لیں گے اور ایک کے بعد دوسری مشکل سے لڑتے اور اس کو سر کرتے ہوئے بالآخر منزلِ مطلوب پر پہنچ جائیں گے۔

اس امتحان کی حکمت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ منافق اور غلصہ راست باز اور ریاکار میں امتیاز کرتا ہے تاکہ ہر ایک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے کسی کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس کے ساتھ نا انصافی کی گئی ہے۔ اگر یہ امتحان نہ ہوتا تو کھوٹے اور کھرے میں وہ امتیاز نہ ہو سکتا جو ہر ایک پر حجت قائم کر دے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۚ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ (۷-۸)

یہ آخری منزل کے لیے جدوجہد کی ہدایت ہے۔ 'انصَبْ' کے معنی جدوجہد اور محنت

آخری منزل کے لیے جدوجہد



کرنے کے ہیں۔ فرمایا کہ دعوت کی راہ کے عقبات طے کرتے ہوئے جب وہ مرحلہ آجائے کہ اللہ کی نصرت بے نقاب ہو جائے، مکہ فتح ہو جائے، دشمن گھٹنے ٹیک دیں اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگیں تو پھر تم کس کے آخری منزل کی تیاری کے لیے جدوجہد کرو اور کلیتہً اپنے رب کی طرف جھک پڑو۔ گویا بیک وقت ان آیات میں دو باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

ایک نوبہ بشارت کہ آپ تمام مشکلات راہ کو عبور کرتے ہوئے دعوت کی آخری منزل پر کامیاب کے ساتھ پہنچنے اور اپنی عظیم ذمہ داری سے سرخروئی کے ساتھ فارغ ہونے کا شرف حاصل کریں گے۔ دوسری یہ کہ کامیابی کی آخری منزل پر پہنچ جانے کے بعد بھی آپ کے لیے کمر کھول دینے کا وقت نہیں آئے گا بلکہ تقائے رب کی منزل کے سفر کے لیے آپ کو مزید اہتمام سے کمر کس کے تیاری کرنی پڑے گی۔ اسی آخری ہدایت کی تعمیل کا اہتمام تھا کہ آخر دور حیات میں آپ کا انہماک عبادت الہی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ بعض لوگوں نے آپ کا یہ حال دیکھ کر سوال کیا کہ حضور آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: اَفَلَا كُنْ عِيْدًا شَكُوْرًا (تو کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں!)۔

یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی۔ اس کی پوری تفصیل سورہ نصر میں آئے گی۔ سورہ یہاں ہم نقل کیے دیتے ہیں:

اِذَا جَاءَ نَفْسًا لِلّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝	جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور دیکھو کہ
رَاٰی النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ	لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل
اَفْوَا جَا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد
وَاسْتَغْفِرْ لَهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا	کے ساتھ اور اس سے مغفرت مانگو۔ وہ بڑا
(النصر۔ ۱-۴)	ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی غنائت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ اولاً و آخراً۔

لاہور

۱۵۔ فروری ۱۹۸۰ء

۲۷۔ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ







تذکرہ

۹۵

التین







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کی ترتیب

اس سورہ کا عمود جنار و سزا کا اثبات ہے۔ اس کی تمہیدیوں اٹھائی جے کہ دنیا میں انبیائے کرام کی بعثت و دعوت کے جو اہم مراکز ہیں پہلے ان کا ذکر بصورت قسم یعنی بطور شہادت کیا اور اس کی روشنی میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر، نہایت اعلیٰ فطرت اور نہایت برتر صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اس برتری کو قائم رکھنے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو پورا چڑھانے کے لیے اس نے یہ سنت ٹھہرائی ہے کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے اور اس راہ کی صعوبتوں کا عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کریں گے تو وہ اپنی اس جدوجہد کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو نفس پرستی اور تن آسانی کے باعث اس راہ کے عقبات کو پار کرنے اور اس کی صعوبتوں سے بردا آزما ہونے کا حوصلہ نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور وہ بالآخر اس کھڈ میں گریں گے جو یہ راہ اختیار کرنے والوں کے لیے مقدر ہے۔

یہاں پچھلی دونوں توام سورتوں میں آیات "فَأَمَّا مَنْ آتَىٰ وَالْفَقْرَ ۖ وَآتَىٰ بِطِلْفٍ ۖ فَمِنْ دُونِ سُوْرَتُوْنَ" اور آیت "فَاتَّخَذَ مَعَ الْكُفْرِ مَيْمَنًا ۖ وَآتَىٰ بِطِلْفٍ ۖ فَمِنْ دُونِ سُوْرَتُوْنَ" کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان میں بھی ایک دوسرے پہلو سے یہی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے جو اس سورہ میں پیش کی گئی ہے۔ اس سے سابق اور لاحق دونوں سورتوں کا تعلق واضح ہو جائے گا۔ آخر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ بالکل حق و عدل پر مبنی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس کی نظر میں نیک و بد دونوں یکساں ہیں حالانکہ یہ بات بالبدلت باطل ہے۔ جس خدا نے لوگوں کو نیکی اور بدی کا شعور دیا ہے لازم ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر نیک اور بد میں امتیاز کرنے والا اور ہر ایک کے ساتھ اس کے استحقاق کے مطابق معاملہ کرنے والا ہو۔

آگے سورہ عصر میں بھی یہی حقیقت ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو بھی سامنے رکھ لیجیے تو اس سورہ کے رخ کو معین کرنے میں آسانی ہوگی۔ فرمایا ہے :



وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ  
 إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
 وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ  
 (العصر - ۱۰۳: ۱-۳)

زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے  
 مگر وہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک  
 عمل کیے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو  
 حق اور صبر کی تلقین کی۔



# سُورَةُ التِّينِ

مِکَّۃٌ ۸ آیات :

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ① وَطُورِ سِينِينَ ② وَهَٰذَا الْبَلَدِ  
 الْأَمِينِ ③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ④  
 ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ⑤ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا  
 الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ⑥ فَمَا يُكَذِّبُكَ  
 بَعْدُ بِالذِّكْرِ ⑦ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ ⑧

شاید میں جبل تین اور کوہ زیتون اور طور سینین اور یہ پیرا من سرزمین - ۱-۳ ترجمہ آیات

۸-۱

کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا، پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال

دیا جب کہ وہ خود کرنے والا بنا بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام

کیے۔ سوال کے لیے ایک دائمی صلہ ہے۔ ۲-۶

نواب کیا ہے جس سے غم جزاء و سزا کو جھٹلاتے ہو! کیا اللہ سب حاکموں سے

بڑھ کر حاکم نہیں! ۷-۸







گمان کیا ہے۔ بلکہ جبلِ زیتون ہے جو حضرت مسیح کی دعوت اور عبادت کے مرکز کی حیثیت سے معروف ہے اور انجیل میں جس کا ذکر بار بار آیا ہے۔

مولانا اس کے متعلق اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”ہمارے نزدیک یہ بھی مقام کا نام ہے۔ چونکہ زیتون کی پیداوار یہاں زیادہ تھی اس وجہ سے عربوں کے اس طریق تسمیہ کے مطابق، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ زیتون کے نام سے موسوم ہو گیا۔ یہ یقیناً وہی پہاڑ ہے جس کا انجیل میں اکثر ذکر آتا ہے اور جس پر حضرت مسیح علیہ السلام عبادت اور دعا کے لیے جایا کرتے تھے۔ لوتاب ۲: ۳۷ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

’اور دن میں وہ ہیکل میں تعلیم دیتا تھا اور رات میں نکل جاتا تھا اور اس پہاڑ پر شب بسر کرتا تھا جس کا نام کوہِ زیتون ہے۔‘

سلف کے اقوال سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ زیتون سے مراد بیت المقدس ہے اور قتادہ کہتے ہیں کہ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں بیت المقدس واقع ہے۔

وَطُورِ سَيْنَا ۝ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ (۲-۳)

ان دونوں کا مقام ہونا تو بالکل واضح ہے لیکن طورِ سینین میں لفظ سینا، جو سینین طورِ سینا ہو گیا ہے، اس کی تحقیق مولانا کے نزدیک یہ ہے:

قرآن میں ایک جگہ طُورِ سَيْنَا ۝ المومنون - ۲۳ بھی آیا ہے یعنی ایک جگہ یہ ثبوت کی صورت میں ہے اور دوسری جگہ جمع سالم کی شکل میں۔ جیسے عربی میں جمعاً اور اَجْمَعُونَ متعمل ہیں۔ تو رات میں کہیں سینا آیا ہے اور کہیں سینیم اور معلوم ہے کہ عبرانی میں سینیم جمع کی علامت ہے۔ لہ

بلدِ امین سے ظاہر ہے کہ مکہ مراد ہے لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاف الفاظ میں مگر بلدِ امین کیوں نہیں کہا، صفت کے ساتھ کیوں اس کا ذکر کیا۔ اس سوال کا جواب ہم آگے ان شاء اللہ جب مقسم علیہ سے ان قسموں کے تعلق کی وضاحت کریں گے، دیں گے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝

لہ ہم اس کتاب میں واضح کوچکے ہیں کہ عربی میں بعض مرتبہ کسی چیز کی جمع اس کی وسعت اطراف کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے عبرانی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے۔



إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (۴-۶)

اصل دعویٰ جس کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا تمہیں کھائی گئی ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے لیکن ہماری سنت یہ ہے کہ جو لوگ اس انعام کی قدر کرے اور ان کی فطرت کے اندر جو ہدایت ہم نے ودیعت کی ہے اس کو پروان چڑھاتے اور پھر نبیل کھائی گئی ہیں کی دعوت قبول کر کے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو تو ہم دائمی اجر سے نوازتے ہیں لیکن جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے وہ ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان کو ہم اسی گڑھے میں پھینک دیتے ہیں جس سے بچانے ہی کے لیے ہم نے ان پر یہ انعام کیا تھا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔ تَقْوِيمٌ کالغوی مفہوم تو کسی چیز کو سیدھا کرنا، مثلاً کہیں گے: قوم ت السرمح فاستقام۔ میں نے نیزے کو سیدھا کیا تو وہ سیدھا ہو گیا) پھر اسی مفہیم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی شے کو کسی خاص مقصد کے لیے موزوں اور مناسب بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

انسان کو اللہ نے نہایت اعلیٰ بلکہ ایک عظیم غایت (بِالْحَقِّ) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ غایت یہ ہے کہ اس دنیا کے دارالامتن میں وہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی باطل ترغیبات و ترہیبات سے بچتا ہو زندگی کی اس صراطِ مستقیم پر گامزن رہے جو اس کے رب نے اس کے لیے کھولی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ابدی بادشاہی بخشے گا اور اگر وہ شیطان کی ترغیب سے بہک کر یا اس کی ترغیب سے ڈر کر اس صراطِ مستقیم کو چھوڑ بیٹھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاکت کی اسی وادی میں پھینکنے کے لیے چھوڑ دے گا جو وہ اپنے لیے پسند کرے گا۔ انسان کو اس غایت کے اعتبار سے، اللہ تعالیٰ نے نہایت بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اس کی ظاہری ساخت بھی گواہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کی باطنی صلاحیتیں بھی اتنی اعلیٰ ہیں کہ اس زمین کی تمام مخلوقات میں سے صرف وہی ان کا اہل بن سکا ہے۔ پچھلی سورتوں میں، مختلف اسلوبوں سے، یہ بات بیان ہوئی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر میں امتیاز بخشا ہے۔ یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ بالطبع وہ خیر کو پسند کرنے والا اور شر کو ناپسند کرنے والا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ وہ ذی عقل اور ذی ارادہ ہستی ہے، دوسری مخلوقات کی طرح عقل اور ارادہ سے محروم نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے اس کو پیدا کیا ہے اس کے لیے تمام ضروری صلاحیتوں سے اس کو آراستہ بھی کیا ہے۔

وہ سنت میں کہ تحت اللہ تعالیٰ انسان نے ساتھ ساتھ تاج

تَعَزَّوْا عَنْهُ مُنْفِیِّیْنَ۔ یہ اس سنت کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ



اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ انسان چونکہ ذی ارادہ ہستی ہے اس وجہ سے اس احسن تقویم کے شرف سے بہرہ یاب رہنا یا اس سے محروم ہو جانا اس کے اپنے رویہ پر منحصر ہے۔ اگر وہ اس کی قدر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مدارج بلند کرتا ہے اور اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتا بلکہ نیچے ہی کی طرف جھکا رہتا ہے تو اس کو وہ نیچے ہی کی طرف لوٹا دیتا ہے اور بالآخر وہ تمام سرفرازیوں سے محروم ہو کر، لڑکھڑاتا ہوا قعر جہنم میں گر پڑتا ہے۔

’اَسْفَلَ‘ میرے نزدیک طرف اور ’سَفِلَيْنِ‘ ’رَدْدُنْہُ‘ کی ضمیر مفعول سے حال ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیچے کی طرف اس وجہ سے پھینکتا ہے کہ وہ نیچے کی طرف جانے ہی کی رغبت کرتا ہے، بلندیوں پر چڑھنے کا حوصلہ نہیں کرتا۔

مکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہو کہ سفلین جمع ہے تو وہ ضمیر واحد سے کس طرح حال پر سکتا ہے؛ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن اس کا مرجع ’الْإِنْسَانُ‘ ہے جو معنًا جمع ہے چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کے لیے ضمیر واحد بھی آتی ہیں اور جمع بھی۔

’إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ‘۔ یہ ان لوگوں کی صفت ان لوگوں کی بیان ہوئی ہے جن کو اللہ تعالیٰ اس بلاکت سے محفوظ رکھتا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ’اَحْسَنُ تَقْوِيْمٍ‘ صفت جو بخت پر پیدا کیے جانے کی قدر و قیمت سمجھتے اور ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کرنے کی توفیق پاتے ہیں وہ محفوظ ان کو اللہ تعالیٰ نیچے نہیں پھینکتا بلکہ ان کو عزت و رفعت بخشتا ہے اور وہ ایک ابدی زندگی میں رہتے ہیں ابدی انعام سے نوازے جاتے ہیں۔

’غَيْرُ مَمْنُونٍ‘ کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس کے معنی غیر منقطع اور دائم کے ہیں بعض لوگوں نے اس کی تاویل اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن وہ عربیت کے خلاف ہے۔ اصل دعوے کو متعین کرنے کے بعد اب آئیے اس سوال پر غور کیجیے کہ مذکورہ بالا تفسیر کس طرح اس دعوے پر دلیل ہیں جو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

## جبل تین کی شہادت جزا پر

سب سے پہلے جبل تین کی قسم کھاٹی گئی ہے اور دلائل کی روشنی میں اوپر وضاحت ہو چکی ہے۔ جبل تین کی کہ اس سے مراد کوہ جودی ہے۔ اس پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کے قانون مکافات کے دو اہم واقعات پیش آئے ہیں اور ان کی تفصیل قدیم صحیفوں میں موجود ہے۔ ایک حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ اور دوسرے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ۔ ان میں سے پہلے واقعہ کا ذکر مولانا فرہادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورہ تین میں یوں کیا ہے:



”تین وہ پہلا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے جزا و سزا کا پہلا واقعہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام نے خدا کا عہد بھلا دیا اور اپنے حاسد کے فریب میں اگر ممنوعہ درخت کا پھل کھا بیٹھے تو ان کو اور ان کی بیوی کو جزا کے قانون سے دو چار ہرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو سزا فرمائی تھی اس سے وہ محروم کر دیے گئے اور جنت کی خلعت ان سے چھین لی گئی۔ .... اور یہ واقعہ ان کی پوری نسل کے لیے ایک یادگار واقعہ قرار پایا۔ چنانچہ قرآن میں متعدد جگہ اسی پہلو سے اس کو یاد دلایا گیا ہے، مثلاً فرمایا ہے: **يٰۤاٰدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكَ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اٰدَمَ مِنَ الْجَنَّةِ يَتَّبِعْ عَنْهُمَا لِبَاسُهُمَا (الاعراف - ۲۰: ۲۱)** (اے آدم کے بیٹو! کہیں شیطان تم کو درغلانہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا چھوڑا، جنت کے خلعت سے محروم کر کے)۔

”یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جو تواریخ میں مذکور ہے کہ حفرات آدم دحوا (علیہما السلام) نے جنت کی خلعت سے محروم ہونے کے بعد جس درخت کے پتوں سے اپنے تن ڈھانکے وہ انجیر کا درخت تھا۔“

”اس واقعہ کے بعد قرآن میں تصریح ہے کہ حفرات آدم دحوا (علیہما السلام) نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان پر ہدایت نازل کرنے اور اس ہدایت کی پیروی کرنے والوں کو اجر دینے کا وعدہ فرمایا۔ پہلے عہد کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا عہد تھا جو اس نے حضرت آدم سے کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبلِ تین کا واقعہ اپنے اندر دو مختلف پہلو رکھتا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے ایک طرف حضرت آدم سے ایک نعمت چھپینی اور دوسری طرف ایک عظیم نعمت ان کو بخشی۔ چھپینی اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کے عہد کو فراموش کر دیا تھا اور بخشی اس وجہ سے کہ غفلت کے بعد وہ متنبہ ہو گئے اور انھوں نے توبہ کی۔“

جبلِ تین کے پاس جزا کا دوسرا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا اس کی تفصیل مولانا رحمۃ اللہ علیہ لیں پیش کرتے ہیں :-

”ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اسی پہاڑ کے پاس ظالموں کو تباہ کیا اور نیکو کاروں کو طوفان سے نجات دی اور برکت بخشی۔ قرآن مجید میں ہے :-

وَنَبِّیُّنَا اٰدَمُ الْبَلٰغِی مَآءِکَ  
وَالنِّسَاءُ اَقْلٰغِی وَغِیْضَ الْمَآءِ  
اور حکم دیا گیا، اے زمین اپنا پانی  
مذب کرے اور اے آسمان اے تھم جا۔



وَقُفِّنِي الْأُمُوتَ مَا سَتَّوْتُ عَلَى  
الْجُودِيِّ دَقِيلٌ بَعْدَ الْإِلْقَامِ  
الْفُلِيِّينَ (هود - ۱۱: ۴۴)

پانی اتر گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور  
کشتی کوہِ جودی پر ٹنک گئی اور اعلان  
کر دیا گیا کہ ظالموں کے لیے ہلاکی ہو۔

آگے حضرت نوح کی دعا کے بعد ان کو یہ ہدایت ہوئی :

قَبِيلُ نُوحٍ اهْبِطْ بِسَلَامٍ  
مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ  
وَعَلَى أُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ  
وَأُمَمٌ سُمَّتُحَهُمْ ثُمَّ  
يَمْشُهُمْ مِّنْ عَذَابِ  
الْعَذَابِ (هود - ۱۱: ۴۸)

کہا گیا، اے نوح، اتر ہماری طرف  
سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے  
اوپر اور ان قوموں پر جو تمہارے ساتھ  
ہیں اور تمہارے سوا اور قومیں بھی ہوں گی  
جن کو تم کچھ دن پہرہ مند ہونے کا موقع  
دیں گے۔ پھر ان کو ہمارا دردناک  
عذاب پکڑے گا۔

..... اس سے معلوم ہوا کہ جبلِ ثمن اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے طور کا ایک  
یادگار مقام ہے۔

## کوہِ زیتون کی شہادت جزا پر

کوہِ زیتون پر جزا کا جو واقعہ پیش آیا ہے اس کی تفصیل مولانا یوں پیش کرتے ہیں :

”اسی پہاڑ پر خدا نے اپنی شریعت یہود سے چھینی اور وہ سلسلہ ابراہیمی کی دوسری  
شاخ کے حوالہ کر دی۔ یہ واقعہ حضرت مسیح کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتا ہے۔ انجیلوں  
میں اس کی جو تفصیلات موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روز آپ شب بھر جاگ کر  
اپنے رب سے دعا و مناجات کرتے رہے کہ ان کی قوم یہود کی کشتی غرق ہونے سے بچ جائے  
لیکن تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا۔ بالآخر وہ قوم کے مستقبل سے باپوس ہو گئے۔ بالخصوص جب آپ  
کو معلوم ہوا کہ یہود آپ کے قتل کے درپے ہیں تو اس بات سے آپ کو اور بھی غم ہوا کیونکہ  
آپ کو معلوم تھا کہ اگر یہود نے اس طرح کا کوئی اقدام کیا تو ان پر سنت الہی کے مطابق اللہ  
تعالیٰ کی لعنت ہو جائے گی اور وہ اپنی امانت ان سے چھین کر دوسروں کے حوالے کر  
دے گا۔ متی ۲۳: ۳۴ میں ہے :

یسوع نے ان سے کہا کہ تم نے کتابِ مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں  
نے رد کیا۔ وہی کوئے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔



یہ عبارت زبور - ۱۱۸: ۲۲ - ۲۳ کی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کا حوالہ دے کر اپنی طرف سے اس کی شرح یوں فرمائی:

”اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا۔“

یہود سے یہ آسمانی بادشاہت چھیننے جلنے کا واقعہ کوہ زیتون پر پیش آیا۔ انجیلوں میں اس ماجرے کی ساری تفصیلات موجود ہیں۔“

### طور سینین کی شہادت جزا پر

طور سینین کی شہادت کی تفصیل کرتے ہوئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”طور سینین کی شہادت جزا پر بالکل واضح ہے۔ یہی مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ایک مظلوم و مقہور قوم پر اپنی عنایت مبذول فرمائی اور اس کے صبر کے صلہ میں دشمنوں کے پنجہ سے اس کو نجات دے کر اس کا سراونچا کیا اور پھر اس کو ایک ایسی شریعت عطا فرمائی جو منکروں اور دشمنوں کے لیے یکسر تازیانہ عذاب تھی۔ یہ واقعہ مظلوموں پر لطف و نوازش اور ظالموں پر قہر و غضب کی نہایت واضح مثال ہے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ اور قوم فرعون کے واقعات جہاں بیان ہوئے ہیں اس حقیقت کی طرف اشارات موجود ہیں۔ مثلاً:

وَلَقَدْ كَلِمْتُ رَبِّيَ الْحُسْنَىٰ	اور تمہارے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل
عَلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ أَنِّي مَبْعُودٌ	کے لیے پورا ہوا۔ بوجہ اس کے کہ
وَدَمَرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ	انہوں نے صبر کیا اور ہم نے تباہ
فِرْعَوْنَ وَتَمُودَ وَمَا	کر ڈالیں وہ علمائے جو فرعون اور اس
كَانُوا يَعْبُدُونَ	کی قوم بناتے رہتے اور وہ عیسٰی
(الاعراف - ۷۰: ۱۳۷)	بھی جو وہ ٹیٹوں پر چڑھتے رہتے تھے۔“

مولانا نے یہ فصل وضاحت سے لکھی ہے لیکن یہ واقعات معلوم ہیں اس وجہ سے ہم نے صرف مختصر اقتباس پر کفایت کی ہے۔ جن کو تفصیل مطلوب ہو وہ اصل کتاب کی مراجعت کریں۔



## بلدایین کی شہادت جزا پر

بلدایین سے مراد ظاہر ہے کہ مکہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک مامون گھر بنایا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: **ذَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا** (آل عمران - ۳ : ۹۷) اور جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی کافروں سے ہجرت کر کے اس علاقہ میں آئے ہیں یہ بالکل غیر آباد و غیر مامون تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے لیے رزق وامن کی دعا فرمائی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی جس کی بدولت اس علاقہ میں رزق کی بھی فراوانی ہوئی اور یہ امن سے بھی معمور ہوا۔ اور یہ دونوں نعمتیں لوگوں کو حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے گھر کی برکت سے ملیں۔ چنانچہ فرمایا ہے: **فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۚ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ** (قریش - ۱۰۹ : ۳ - ۴) پس چاہیے کہ لوگ اس گھر کے خداوند کی بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خوف سے نچنت کیا۔ حضرت ابراہیم پر یہ انعام ان کی ان جاں بازیوں اور قربانیوں کے صلے میں ہوا جو انھوں نے کلمہ توحید کی سر بندی کی راہ میں پیش کیں۔ پھر جب انھوں نے اس سے بھی بڑے امتحان یعنی بیٹے کی قربانی کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بھی بڑے انعام یعنی قوموں کی امامت کے منصب سے نوازا۔ اس وقت حضرت ابراہیم نے سوال کیا کہ کیا اس امامت کے انعام میں میری ذریت بھی شامل ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میرا یہ وعدہ ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے۔ یعنی تم کو جو کچھ ملا ہے وہ تو انعام ہے تمھاری جاں بازیوں اور دنا داریوں کا اس وجہ سے تمھاری ذریت میں سے وہی اس انعام میں شریک ہوں گے جو تمھارے طریقہ کے پیرو ہوں گے۔ رہے وہ جو اس راہ سے منحرف ہو جائیں گے تو وہ اپنے اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے خدا کے قانون مکافات کی رُو سے مقدّر ہے۔ قرآن میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے:

وَإِذَا بَلَغَ ابْنُ إِسْمَاعِيلَ رَبَّهُ  
بِكَلِمَةٍ قَاتَمَهُنَّ ط قَالَ  
إِنِّي حَاجٌّ بِكَ إِلَيْنَا مِمَّا د  
قَالَ دَمِنْ ذُرِّيَّتِي ط قَالَ  
لَا يَنَالُ عَهْدِي  
الظَّالِمِينَ .

اور یاد رکھو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے  
چند باتوں سے جانچا تو اس نے وہ پوری کر  
دکھائیں تو فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا  
ہوں تو اس نے سوال کیا کہ کیا میری ذریت میں  
سے بھی؟ ارشاد ہوا کہ میرا یہ عہد ان لوگوں  
سے متعلق نہیں ہے جو اپنی جانوں پر ظلم  
ڈھانے والے نہیں گے۔



اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مقام نہ صرف اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکانات کا ایک مظہر ہے بلکہ اسی سرزمین ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی عام منادی کرائی ہے کہ کون لوگ اس کے فضل و العام کے حق دار ہوں گے اور کون اس کے قہر و غضب کے سزاوار ٹھہریں گے۔

ناموں کی ترتیب سے تعلق ایک اصول ملحوظ ہے۔ استاد امام اس کا یہ جواب دیتے ہیں:

”اس میں ترتیب جمع شمل بالمثل کی ملحوظ ہے۔ پہلے آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا اس لیے

کہ تقدم زمانی کے لحاظ سے اسی کا ذکر ہونا تھا۔ پھر مسیح علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر ہوا اور یہ

اس مماثلت کے سبب سے ہوا جو حضرت آدم اور حضرت مسیح کے درمیان ہے اور جس کا

ذکر قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں یوں فرمایا ہے: **إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ**

**كَمَثَلِ آدَمَ ۚ اَلَّذِي خَلَقْنَا مِنْ طِينٍ ۖ وَجَعَلْنَاهُ نَمُوكًا ۖ وَنَزَّلْنَاهُ مِنْ سَمَوَاتٍ ۚ وَجَعَلْنَاهُ فِي سُلَاسٍ ۚ** (۵۹: ۳)

.....

”اس کے بعد ان دو مقاموں کا ذکر آتا ہے جن کا تعلق حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور ان دونوں رسولوں میں جو مماثلت ہے وہ بھی قرآن سے واضح ہے۔ چنانچہ قریش کو فخریٰ طیب کر کے فرمایا ہے:

**إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكَ رَسُولًا شَاهِدًا ۖ** ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا

**عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۖ** تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے

فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا؟ (المزمل - ۱۵: ۴۳)

تورات کی کتاب استثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بشارت وارد ہے اس میں بھی یہ مماثلت موجود ہے:

”اور میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس کو حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب انہی سے لوں گا۔“

**فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدَ بِالَدِينِ ۚ أَلَيْسَ اللَّهُ بِحَكِيمٍ خَبِيرٍ ۚ** (۸-۷)

”فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدَ بِالَدِينِ“۔ اس آیت کی تاویل مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر

میں یوں فرماتی ہے:

”اس آیت کی تاویل میں دو قول ہیں:



فَمَا يَكْذِبُكَ  
الْآيَةُ كِتَابِي

ایک یہ کہ پس اے انسان! ان واضح شہادتوں کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارے میں تیری تکذیب کرتی ہے۔ یہ تاویل مجاہد نے اختیار کی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس میں تو مخاطب آنحضرتؐ ہیں تو انھوں نے فرمایا: معاذ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس میں مخاطب انسان ہے۔ زمخشری نے یہی تاویل اختیار کی ہے لیکن ذہاب کا کذب، میں تکذیب کے معنی حاصل علی التکذیب یعنی تکذیب پر ابھارنے کے لیتے ہیں۔ اگر یہ معنی ثابت ہو جائیں تو یہ تاویل نہایت واضح ہے لیکن اس کی تائید میں انھوں نے کوئی دلیل نہیں دی ہے۔

”دوسری تاویل یہ ہے کہ پس اے پیغمبر! اس کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارے میں تمھاری تکذیب کرتی ہے! قرآن نے یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اس پہلو سے تو یہ تاویل صحیح ہے کہ اس میں الفاظ کے مشور معنی سے کوئی انحراف نہیں ہے لیکن سیاق کلام اور موقع استفہام کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو یہ تاویل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اول تو دو استفہاموں کے ساتھ آنحضرتؐ مسلم کو یہاں مخاطب کرنے کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسرے فَمَا يَكْذِبُكَ کا زور اور لفظ بَعْدُ کی تاکید تو یہ تاویل لینے کی صورت میں بالکل ہی منغی رہ جاتی ہے۔ سیاق اور حسن نظم سے اقرب تاویل وہی معلوم ہوتی ہے جو مجاہد نے اختیار کی ہے۔ اس میں لفظ اپنے اصل مفہوم پر باقی بھی رہتا ہے اور اس کے ان دونوں معنوں کے لحاظ سے جو اد پر بیان ہوئے یہاں دو تاویلیں نہایت محکم اور خوبصورت بن جاتی ہیں: ”ایک یہ کہ اے انسان! ان شہادتوں کے بعد اب کون سی شہادت اور دلیل ہے جو دو توبہ جزا کے بارے میں تیرے عقیدے کی تکذیب کرتی ہے۔ اس صورت میں مخاطب انسان ہوگا اور جو لوگ جزا پر یقین رکھنے والے ہیں ان کو اس کلام سے تقویت اور تائید حاصل ہوگی اور جو لوگ جزا کے بارے میں مذہب ہوں گے ان کو اس پر غور کرنے کی تحریک ہوگی۔“

”پھر لفظ فَمَا کے حسن استعمال پر غور کیجیے۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ انسان نے انکار کی راہ ہمیشہ تقلید اور ضد کی بنا پر اختیار کی ہے۔ اس راہ میں دلائل نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ دلائل اور شہادتوں کی اس پوری کائنات میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو جزا کے انکار کے حق میں ہو۔ اس وجہ سے انسانوں کو مخاطب کر کے یہ دعوت دی کہ وہ تقلید سے ہٹ کر دلائل پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا یہاں کوئی ایک چیز بھی ایسی ہے جو جزا کے عقیدے کو غلط ثابت کر رہی ہو۔“

”دوسری تاویل یہ کہ حقائق اور دلائل کی ان شہادتوں کے بعد آخر وہ اوہام اور آرزوئیں کیا ہیں جو جزا کے بارے میں انسان کو فریب میں مبتلا کر رہی ہیں۔“

اس صورت میں روئے سخن منکرین کی طرف ہوگا۔ قرآن میں اس قسم کے خطاب کی نظیریں



موجود ہیں، مثلاً،

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا نَعْبُدُكَ  
بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝  
اے انسان! تجھے تیرے رب کریم کے  
بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال  
رکھا ہے؟ (الافطار - ۸۲ : ۶)

ان دونوں

استغفاروں

کا مدعا

ان دونوں استغفاروں کا مدعا مولانا یوں واضح فرماتے ہیں:

اب دونوں استغفاروں کے مدعا پر غور کیجیے۔

پہلے استغفار کا مدعا دونوں تاویلوں کی صورت میں یہ ہوگا کہ مجازات کے اس قدر دلائل سامنے  
آجانے کے بعد انسان کو چاہیے کہ اس کا اقرار کرے اور ان شبہات سے اپنے کو بچائے جو لوگوں  
کی طرف سے یا خود اس کے اپنے نفس کی طرف سے اس کے دل میں پیدا ہوں۔

دوسرے استغفار اَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمُ الْحَكَمِينَ کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مجازات کا اقرار کریں  
اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ گو یا پوری بات یوں ہوئی کہ کیا اللہ تعالیٰ تمام  
حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو یوں ہی چھوڑ دے گا، ان  
کے اچھوں اور بدوں میں کوئی امتیاز نہ کرے گا۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ لَنْتُمْ  
كَيْفَ تَحْكُمُونَ (الفلق - ۶۸ : ۲۵-۲۶) کیا ہم فرماں برداروں کو نا فرمانوں کی طرح  
کر دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے! تم کیسے فیصلے کرتے ہو!)

یہ امر بیاں ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں انسان کے احسن تقسیم پر پیدا کیے جانے کا جو ذکر ہے اس  
کا خاص پہلو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خیر و شر میں امتیاز بخشا ہے اور اس کے اندر عدل سے محبت اور ظلم  
سے کراہت و دلالت فرمائی ہے اس چیز کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کے اندر جو انسان کا خالق ہے،  
عدل اور خیر سے یہ محبت اور ظلم و شر سے کراہت بدرجہ کمال موجود ہو۔ پھر ہمیں سے یہ بات بھی نکلی کہ اس کی  
یہ صفت اس پر واجب کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں تمام خلق کا انصاف کرے۔ جنہوں نے  
نیکی کاٹی ہو ان کو اچھا ملے اور جنہوں نے بدی کاٹی ہو ان کی بدی کے مطابق سزا دے۔ اگر وہ  
ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اَحْكَمُ الْحَكَمِينَ نہیں ہے حالانکہ وہ بالبداهت اَحْكَمُ  
الْحَكَمِينَ ہے۔ اس کی اس صفت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس سورہ کی تفسیر بیشتر اہم فراہی کی عربی تفسیر سورۃ التین سے ماخوذ ہے۔ صرف بعض مقامات میں  
ہم نے حذف و اضافہ سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ تفسیر تمام ہوئی۔ فَاَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی  
فَضْلِهِ وَاحْسَانِهٖ۔  
لاہور

۲۴ - فروری ۱۹۸۰ء

۷ - ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ



تذکرہ قرآن

۹۶

العلق







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ————— التین ————— کی مشنی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں تادیبی شواہد اور فطرت انسانی کی اعلیٰ ساخت سے حقیقت نمایاں فرمائی ہے کہ انسان کے لیے فلاح کی راہ یہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ جو لوگ یہ راہ اختیار نہیں کرتے وہ بالآخر تباہی کے کھڈ میں گر کے رہتے ہیں اور اپنے اس انجام کے وہ خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسی کلیہ کی روشنی میں اس سورہ میں قریش اور ان کے لیڈروں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے بالکل الٹی چال چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے فضل و کرم سے ان کی رہنمائی کے لیے اپنا صحیفہ ہدایت اتارا لیکن ان کے طغیان کا حال یہ ہے کہ اللہ کا جو نیدہ ان کے لیے ایمان و عمل صالح کی راہ کھول رہا ہے یہ اس کے جانی دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ اپنے رب کی نماز پڑھتا ہے تو یہ شامت زدہ لوگ اس کے بھی روادار نہیں ہیں بلکہ اس سے بالجبر روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

### ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے :

(۱-۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ اپنے اس رب کے نام سے، جو سارے جہان کا خالق ہے، تم ان لوگوں کو اس کا فرمان واجب الاذعان سناؤ۔ اسی نے انسان کو خون کے ایک تھکے سے بنایا اور وہ اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ ان کو پڑھ کر سناؤ اور اپنے رب کے اس فضل عظیم کو یاد دلاؤ کہ اس نے امتیوں پر یہ عظیم احسان فرمایا ہے کہ ان کی تعلیم کے لیے اس تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا اور ان کو وہ باتیں بتائیں جو وہ نہیں جانتے تھے۔

(۶-۸) قریش کے لیڈروں کے طغیان پر سرزنش کہ یہ مالی وجاہ کے گھنڈ میں خدا سے بے نیاز بے پروا ہو بیٹھے ہیں حالانکہ ایک دن سب کو اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے تیرے رب ہی کی طرف



لوٹنا ہے۔

(۹-۱۳) ان سرکشوں کو خاص طور پر تہدید و وعید جو اللہ کے رسول کو نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ نہایت غضب آلود لہجہ میں یہ سوال کہ اگر اللہ کا بندہ ہدایت پر ہو یا تقویٰ کی بات بتا رہا ہو اور یہ سرکش تکذیب اور اعراض کر رہے ہوں تب .....! یعنی اس قسم کے سرکشوں کو اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ ان کی ان حرکتوں کا کیا انجام ہو سکتا ہے!

(۱۴-۱۸) ان سرکشوں پر مزید اظہار غضب اور ان کو چیلنج کہ کیا ان کو ہوش نہیں ہے کہ خدا ان کی یہ تمام گستاخانہ حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ ان بدتمیزیوں سے باز نہ آئے تو وہ دن آ رہا ہے جب ہم ان کی ناکار اور گنہگار پیشانیوں کو گھسیٹیں گے۔

(۱۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کہ ان سرکشوں کی بے ہودگیوں کی ذرا پرواہ نہ کرو۔ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب تر ہو جاؤ۔



# سُورَةُ الْعَلَقِ

مَكِّيَّةٌ ۱۹ آیات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ① خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ③ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِكَبَّاسٍ ⑥ إِنَّ رَأَاهُ اسْتَغْنَى ⑦ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَى ⑧ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ⑨ عَبْدًا إِذَا صَلَّى ⑩ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَى ⑪ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَى ⑫ أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ⑬ أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَى ⑭ كَلَّا لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ⑮ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ⑯ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ⑰ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ⑱ كَلَّا لَا تَطِعُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ⑲

پڑھ اپنے اس خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے تھکے سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطے سے۔ اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ۱-۵

ہرگز نہیں، بے شک انسان سرکشی کر رہا ہے اپنے تئیں بے نیاز سمجھ کر۔



بے شک تیرے خداوند ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

فرا دیکھو تو اس کو جو روکتا ہے ایک بندے کو، جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ بھلا  
دیکھو تو، اگر وہ ہدایت پر ہوا یا نیکی کا حکم دینے والا ہوا.....! بھلا دیکھو تو، اگر  
اس نے جھٹلایا اور منہ موڑا.....! کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے! ۹-۱۴  
ہرگز نہیں، اگر یہ باز نہ آیا تو ہم اس کو گھسیٹیں گے، چوٹی پکڑ کر، جھوٹی نابکار،  
گنہگار چوٹی! پس وہ بلاوے اپنی پارٹی کو، ہم بھی بلائیں گے سرہنگوں کو! ۱۵-۱۸  
ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مان اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ ۱۹



# ۱- الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (۱)

لفظ 'اقْرَأْ' (پڑھو) صرف اسی مفہوم میں نہیں آتا جس مفہوم میں ایک استاد اپنے شاگرد سے کہتا ہے: 'پڑھو!' بلکہ یہ 'اقْرَأْ' علی الناس یا ائتد علی الناس یعنی دوسروں کو دعوت دینے بطریق دعوت سنانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، کے معنی میں مثلاً ان کفار کو مخاطب کر کے جو قرآن کے سنانے میں مزاحم ہوتے تھے، فرمایا ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۲)

جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(الاعراف - ۷ : ۴۰۴)

سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

وَإِذَا تَرَأْتِ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا (۳)

اور جب تم لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنا دے تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک مخفی پردہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۴۵)

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ یعنی اس قرآن کو اپنے اس خداوند کے نام سے پڑھ کر سناؤ جو ایک نہایت سارے جہان کا خالق ہے۔ یہ ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اس کو اپنے خداوند کے فرمان واجب اہم تنبیہ الاذعان کی حیثیت سے پیش کر دو تاکہ لوگ یہ جانیں کہ جو کلام ان کو سنایا جا رہا ہے وہ براہ راست رب درجہان کا کلام ہے۔ نہ یہ داعی کا کلام ہے، نہ کسی اور شخص کا اور نہ یہ کسی سائل کی درخواست ہے کہ رد کر دی تو وہ رد ہو جائے۔ بلکہ یہ اس خالق و مالک کا کلام ہے جس کو حق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو حکم دے اور لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بے چون و چرا اس کی تعمیل کریں، اس کو کوئی معمولی چیز سمجھ کر ٹالنے، مذاق اڑانے یا اس کی مخالفت کرنے کی جرات نہ کریں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن مجید براہ راست اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس سے پہلے کسی کتاب کو یہ شرف حاصل نہیں کہ وہ کُل کی کُل اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ پر مشتمل ہو۔ اس وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم



کو ہدایت ہوئی کہ اس کو اپنے خداوند کے نام سے پیش کر دے تاکہ اس کی اصلی عظمت لوگوں پر واضح ہو اور وہ اس کی مخالفت کر کے اپنی شامت نہ بلائیں۔ قدیم صحیفوں میں حضورؐ سے متعلق جو پیشین گوئیاں ہیں ان میں بھی یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ آپ جو کچھ کہیں گے خدا کے نام سے کہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو خدا کے نام پر کہی ہوئی اس کی باتوں کو رد کریں گے۔ گویا ان الفاظ سے قرآن کی اصلی عظمت بھی واضح کر دی گئی ہے اور قریش کو ڈرا بھی دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس کی مخالفت کرنی چاہتے ہیں تو اپنے اس فعل کے انجام کو دوزخ تک سوچ لیں۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲)

یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں تمام کائنات کے پیدا کیے جانے کا ذکر ہوا۔ اب یہ خاص اہتمام کے ساتھ انسان کے پیدا کیے جانے کی طرف اشارہ ہے۔

عَلَقٌ: خون کی پھٹکی یا تھکے کو کہتے ہیں۔ انسان کی خلقت کے ابتدائی مراحل کی یاد دہانی قرآن میں جگہ جگہ فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورہ حج، سورہ مومن، سورہ سجدہ، سورہ قیامہ اور سورہ دھر وغیرہ میں۔ کما یاد دہانی ہم ہر جگہ تمام اہم الفاظ کی بھی وضاحت کرتے آرہے ہیں اور اس خاص پہلو کی طرف بھی ہم نے توجہ دلا دی ہے جو اس یاد دہانی سے پیش نظر ہے۔ اس سے مقصود بالعموم تین حقیقتوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے:

۱۔ ایک یہ کہ جس خالق کی قدرت و حکمت کا یہ حال ہے کہ وہ خون کی ایک حقیر پھٹکی کو عاقل و مدبر اور سمیع و بصیر انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہو جائے گا۔

۲۔ دوسری یہ کہ انسان کی تخلیق میں خالق کی جو قدرتیں اور حکمتیں نمایاں ہیں وہ دلیل ہیں کہ یہ عبث اور بے غایت نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے ایک روز حساب لازماً آنا ہے اور یہ اپنے اعمال کی جزا یا سزا ضرور پائے گا۔

۳۔ تیسری یہ کہ جس انسان کی پیدائش اتنے حقیر اور ذلیل عنصر سے ہوئی ہے اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی پاکی و پاکدامنی یا اپنے حسب و نسب کی حکایت زیادہ بڑھائے اور غرور و شکبار کا مظاہرہ کرے۔

قرآن کے بعض مقامات میں بیک وقت ان تمام حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن بعض جگہ ان میں سے ایک یا دو مدنظر ہیں۔ یہاں موقع کلام اشارہ کر رہا ہے کہ ان میں سے اوپر کی دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ خالق کائنات کا کلام خاص اس کے نام سے لوگوں کو پہنچا اور ان کو یاد دہانی کرو کہ جس خالق نے انسان کو خون کی پھٹکی سے وجود بخشا ہے وہ قادر ہے کہ اس کو دوبارہ پیدا کر کے اس کے اعمال کا محاسبہ کرے۔



اِقْرَأْ بِرُؤُوسِ الْاَكْثَرِ مِمَّا الَّذِي عَلَّمَكُم بِالْقَلَمِ (۳-۴)

یہ اِقْرَأْ سابتاً اِقْرَأْ سے بدل کے طور پر آیا ہے اور یہ اسی حکم کی تاکید ہے جو اوپر دیا گیا ہے البتہ اس میں اظہار احسان کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ قریش اللہ تعالیٰ کے اس فضل عظیم کی تذکر کریں کہ اس نے ان کی ہدایت کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ یہ امر واضح رہے کہ اس سے پہلے بنی اسماعیل کے پاس حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیلؑ کی تعلیمات سے متعلق اگر کچھ روایات تھیں تو وہ زبانی روایات کی شکل میں تھیں اور امتداد زمانہ سے ان کی شکل بھی متغیر ہو چکی تھی۔ دوسرے انبیاءؑ کی تعلیمات بھی زبانی ہی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام عشرہ تو فرود لکھ کر دیے گئے لیکن موجودہ تورات کی حقیقت بس قلم بند کی ہوئی روایات کی ہے۔ اس کے اندر یہ امتیاز ناممکن ہے کہ کون سی بات اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں ہے اور کون سی بات مجہول راویوں کے الفاظ میں لیکن قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کا ہر لفظ اول تو براہ راست نطق الہی ہے، پھر اس کو زبانی روایات پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کو عین اللہ تعالیٰ کے لفظوں میں تحریری طور پر محفوظ کیا گیا اور یہ کلام، جیسا کہ سورۃ قلم اور سورۃ قیامت کی تفسیروں میں وضاحت ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے تحت کرایا تا کہ کسی حرف میں سرِ مرکوثی تغیر نہ ہونے پائے۔

اس اہتمام خاص کی طرف یہاں عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے اور اس میں مزید احسان شبہ نہیں کہ یہ عربوں پر ایک عظیم احسان ہوا۔ اول تو جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وحی کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام اس سے پہلے کسی قوم کے لیے بھی نہیں کیا گیا، ثانیاً اہل عرب اُچی ہونے کے باعث قلم کے استعمال سے اچھی طرح واقف نہ تھے لیکن قرآن کی بدولت انھوں نے اس کے ذریعہ وہ عظیم آسمانی خزانہ محفوظ کیا جو صرف انہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے سرمایہ زندگی ہے۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمُ (۵)

یہ اسی انعام و احسان کا ایک اور پہلو ہے کہ صرف تعلیم بالقلم ہی کا احسان ایموں پر نہیں کیا بلکہ مزید احسان یہ بھی کیا کہ ان کو وہ باتیں بتائیں اور سکھائیں جو وہ نہیں جانتے تھے۔ لفظ اِنْسَان اگرچہ عام ہے لیکن قرآن کے پہلے مخی طبع چونکہ اُچی عرب ہی تھے اس وجہ سے یہاں اصلاً ہی مراد یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکالنے کے لیے ان پر اپنی یہ کامل ہدایت نازل فرمائی ہے۔ ان پر حق ہے کہ وہ اس کی تذکر کریں۔ سورۃ جمعہ میں یہی مضمون یوں آیا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمَمِ رُسُلًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ

اٰیٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُم

وہی ہے جس نے امتھایا ایوں میں ایک رسول انہی میں سے وہ ان کو سناتا ہے اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے



اَفَكَيْتَ وَالْحِكْمَةَ وَارْتَاكَ نَدَا  
مَنْ تَبَدَّلَ لَقِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ؕ  
(الجمعة - ۲: ۶۲)  
کتاب اور حکمت درآئین یکہ وہ اس  
سے پہلے نہایت کھل ہوئی گرا ہی  
میں تھے۔

یہی مضمون، الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ، البقرة: ۱۵۱، البقرة: ۱۹۸ اور آل عمران: ۶۴ میں  
بھی گزر چکا ہے اور ہم بقدر کفایت اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

اس آیت میں جہاں اظہار احسان ہے وہیں اس کے اندر قریش کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ اگر  
انھوں نے اپنے رب کی اس سب سے بڑی نعمت کی قدر نہ کی تو سوچ لیں کہ ان کی اس ناپاسی اور اس  
طغیان کا نتیجہ ان کے سامنے کس شکل میں آ سکتا ہے!  
كَذٰلِكَ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِٖ لَاسْتَعْتٰی (۶-۷)

یہ ان کے اس رویہ کا بیان ہے جو انھوں نے اس ہدایت کے معللے میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ  
وہ اس رحمت کی قدر کرنے کے بجائے نہایت سرکشی کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور اس کی وجہ  
یہ ہے کہ ان کو جو مال و اسباب حاصل ہے اس کو پا کر وہ اب خدا سے اپنے کو بالکل مستغنی خیال  
کرنے لگے ہیں۔

اس آیت کا آغاز 'کَلَّا' سے ہوا ہے اس سے مقصود قریش کی ان سخن سازیوں کی تردید ہے  
جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی تکذیب کے لیے کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی یہ سخن سازیوں محض  
حقیقت پر پردہ ڈانے کے لیے ہیں۔ ان کے انکار کی اصل علت ہے تو خدا سے ان کی بے نیازی اور دنیا  
کی محبت لیکن نمائش یہ کر رہے ہیں کہ گویا ان کے پاس کچھ شبہات ہیں جن کا کوئی تسلی بخش جواب ان کو نہیں  
مل رہا ہے۔

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرَّجْعُی (۸)

'رَجْعُی' مصدر ہے 'رَجَعْتُ' کے وزن پر، لوٹنے کے معنی میں۔

فرمایا کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں کرنے دو یا لاخوان کو لوٹنا تمھارے رب ہی کی طرف ہے جس سے یہ  
مستغنی اور بے خوف ہیں۔ اس وقت ان کے طغیان کی حقیقت ان کے سامنے کھل جائے گی۔ اگر ان کو گمان  
ہے کہ ان کے مزعومہ شرکا ان کے مولیٰ و مرجع بنیں گے تو ان کے اس دہم سے بھی پردہ اٹھ جائے گا۔ یہ  
دن بادشاہی صرف اللہ کی ہوگی اور اس کی پکڑ سے پناہ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اَدْعٰیْتُ السَّدْحٰی یٰنُفٰثٰی لَا عَبْدًا اِذَا صَلَّی (۹-۱۰)

یہ ان کے اس طغیان کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرمایا کہ بھلا دیکھو تو اس  
کو جو ایک بندے کو روکتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے! یہ قریش کے ان اشقیاء کی طرف اشارہ ہے جو  
قریش کے گندوں  
کے طغیان کی  
ایک مثال



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی نماز سے روکتے تھے۔ بندے پر اس کے رب کا اولین حق اس کی بندگی ہے اور بندگی میں اولین درجہ نماز کا ہے اس وجہ سے جو بندہ نماز پڑھ رہا ہے وہ اپنے رب کا سب سے بڑا حق ادا کر رہا ہے اور سزا دار ہے کہ سب اس کے اس کام کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھیں اور اس کے عمل کو قابل تقلید جانیں۔ اگر کوئی اس چیز سے روکنے کی جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بندے کو سب سے بڑے فرض اور خدا کے سب سے بڑے حق سے روک رہا ہے۔ اَدْعُتُّنَّکَ اسلوب پر ہم جگہ جگہ چکے ہیں کہ یہ اس وقت لاتے ہیں کہ جب کسی کی نہایت نامناسب حرکت پر لوگوں کو توجہ دلانی یا اس پر نیکیر کرنا ہو۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں بھلا دیکھا تم نے اس کو، کیا تم نے اس کا حال دیکھا، اذرا اس کو تو دیکھو۔

اَلَّذِیْ سے ضروری نہیں کہ کوئی ایک معین شخص ہی مراد ہو بلکہ یہ اس طرح کی بے ہودہ حرکت کرنے والوں کو مثال کر دینے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے عمل میں کر چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے روکنے والا صرف ابو جہل ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے گنڈے بھی تھے اور یہ گنڈے صرف حضور ہی کی نمازوں میں مزاحم نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ کے دوسرے بندوں کے ساتھ بھی وہ اسی طرح کی بدتمیزیاں کرتے تھے۔

اَدْعُتُّنَّکَ اَنْ کَانَ عَلَی الْہُدٰی ؕ اَوْ اَمَرَ بِالْتَّقْوٰی (۱۱-۱۲)

یعنی اس مجنونانہ اقدام سے پہلے سے سوچنا تھا کہ اسلام دشمنی کے جوش میں اسے اتنا اندھا نہیں اقدام سے بن جانا چاہیے کہ اپنے انجام کا بھی کچھ ہوش نہ رہے۔ آخر امکان اس بات کا بھی تو ہے کہ یہ اللہ کا پیٹھ سوچنے بندہ نیکی اور ہدایت پر ہوا اور اپنے قول و عمل سے تقویٰ کی راہ دکھا رہا ہو اور یہ اس کو اس سے روک کی ضرورت کو اپنی شامت کو دعوت دے رہا ہو! مطلب یہ ہے کہ آخر کس دلیل سے وہ اپنے کو برحق سمجھ کر وہ کام کرنے اٹھ کھڑا ہوا جو شیطان کے کرنے کا ہے!

اَدْعُتُّنَّکَ اَنْ کَذَّبَ دَتُوْنٰی (۱۳)

یہ اس دوسرے امکان کا حوالہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی کوئی بتائے کہ اگر یہی دوسرے امکان تکذیب کرنے والا اور حق سے منہ موڑنے والا ہوا تب ....! یعنی تب تو اس نے اپنے لیے جہنم کا حوالہ دروازہ خود اپنے ہی ہاتھوں کھولا! یہاں عربیت کا وہ قاعدہ ملحوظ رہے جس کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ شرط کا جواب اس وجہ سے بھی حذف کر دیا جاتا ہے کہ اس کی سنگینی احاطہ بیان سے باہر ہوتی ہے۔ یہاں اسی وجہ سے جواب محذوف ہے۔ اس کی ایک مثال سورہ یونس میں بھی موجود ہے۔

رسول کی تکذیب کرنے اور اس کی دعوت سے منہ موڑنے والوں کا انجام سورہ ییل میں یوں بیان ہوا ہے:



لَا يَمْلِكُهَا إِلَّا الْأَشْفَىٰ الَّذِي  
كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ  
اس جہنم میں وہی بد بخت خسلائق  
پڑیں گے جنہوں نے جھٹلایا اور  
منہ موڑا۔ (اقبل - ۹۲ : ۱۵ - ۱۶)

الْمُتَعَمِّرِينَ يَا اللَّهُ يَسِّرْ (۱۴)

یعنی کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ ساری تعدیاں دیکھ رہا ہے! اگر وہ دیکھ رہا ہے اور ضرور دیکھ رہا ہے تو اس کا انتقام وہ ضرور لے گا۔ وہ عادل، رحیم، عزیز اور غفور ہے۔ اس کے بندے اگر اس کی بندگی سے روکے جائیں تو وہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ تماشائی بن کر اس کا تماشا دیکھتا رہے۔

كَلَّا لَئِنْ تَمَرَيْتَهُ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (۱۵)

یہ اس قسم کے سرکشوں کو نہایت تند الفاظ میں وعید ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ 'نَاصِيَةُ' پیشانی اور پیشانی پر پکھڑے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں۔ 'نَسْفَعُ' کسی چیز کو مٹھٹی میں پکڑ کر کھینچنے اور گھسیٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ سورہ رحمان میں اسی طرح کے سرکشوں کے بارے میں فرمایا ہے: 'فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ' (الرحمن - ۵۵، ۵۶) پس وہ چوٹیوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶)

یہ 'النَّاصِيَةُ' سے بدل ہے۔ گھرو دونوں میں معرفہ اور نکرہ کا فرق ہے لیکن نکرہ موصوف ہو تو معرفہ سے بدل پڑ سکتا ہے۔ یہاں اس جوش غضب پر خاص طور سے نگاہ رہے جو اس آیت کے ہر لفظ سے ابل رہا ہے۔ ان نابکاروں کی چوٹی کا ذکر انتہائی غضب آلود الفاظ میں فرمایا: نابکار اور گنہگار چوٹی!! — چہرہ اور پیشانی آدمی کی ذات کے سب سے اثر فحشے ہیں اس وجہ سے ان سے بعض اوقات اس کی پروری شخصیت تعبیر کر دی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ آدمی کی پیشانی کے پے سب سے بڑا اثر فحشہ سجدوں کا نشان ہے۔ اگر کوئی شخص اتنا شقی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود سجدہ نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو سجدہ کرنے سے روکتا بھی ہے تو ایسا نابکار و گنہگار سزاوار ہے کہ اس کی چوٹی پکڑ کر اس کو گھسیٹا اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۖ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۱۷ - ۱۸)

یہ ان سرکشوں کو چیلنج ہے کہ اگر کسی کو اپنی قوت و جمعیت پر بڑا ناز ہے تو وہ اپنی ٹولی کو بلائے، ہم بھی اپنے سرہنگوں کو بلائیں گے اور دیکھیں گے کہ ان کے اندر کتنا زور ہے! — اس چیلنج کا عملی امتحان بعد کے دور میں سب سے پہلے بدر کے معرکہ میں ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ خدا کے سرہنگوں

سرکشوں کو

چیلنج



کے آگے قریش کی پوری قوت و جمعیت کس طرح غبار بن کر اڑ گئی۔

’نادی‘ کے اصل معنی مجلس اور سوسائٹی کے ہیں۔ یہاں مراد وہ افراد ہیں جو کسی رشتہ و عصبیت کے تحت باہم دگر وابستہ ہیں۔ موقع و محل کا لحاظ کر کے اس کا اس کا ترجمہ ’ٹوٹی‘ یا پارٹی ہو سکتا ہے۔ ’ذَبَانِيَّةٌ تُجْمَعُ بِمَعْنَى ذَبْنِيَّةٌ‘ کی جس کے اصل معنی تو دفاع کرنے والے کے ہیں لیکن یہ پولیس اور پیادوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ میں نے موقع و محل کا لحاظ کر کے اس کا ترجمہ ’سہرہنگوں‘ کیا ہے۔ گویا یہ خدائی ٹاسک فورس کے وہ کردہی ہیں جو خاص نوعیت کی وقتی مہمات پر بھیجے جاتے ہیں۔

كَلَّا لَا تَتْلُوهُ دَأْسُ عِبَادٍ وَاقْتَرِبُ (۱۹)

فرمایا کہ اگر کوئی سر پھرا تمھیں خدا کے آگے سجدہ کرنے سے روکتا ہے تو اس کی اس حرکت کو غلط میں نہ لاؤ بلکہ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب تر ہو جاؤ۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ قرآن نے جگہ جگہ نماز ہی کو مبرور عزیمت اور فتح باب نصرت کی کلید بتایا ہے اور سجدہ نماز کا سب سے اعلیٰ رکن ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کس کی مجال ہے کہ تمھیں اس چیز سے روک دے جو تمھاری زندگی کی غایت اور خدا سے تعلق کا واحد وسیلہ ہے۔ اگر کوئی ایسی جسارت کرتا ہے تو تم اس کے شر سے خدا کی پناہ چاہو جس کا واحد طریقہ اس کے آگے سر بسجود ہونا ہے۔

## ۲۔ سورہ کا زمانہ نزول

سورہ علق کی تفسیر تمام ہوئی۔ اب اس پوری سورہ پر مذکور کی نگاہ ڈال کر اس کے زمانہ نزول پر غور کیجیے۔ کسی سورہ کے زمانہ نزول کے معین کرنے میں سب سے زیادہ مدد اس کے مضمون، اس کے لب و لہجہ اور اس کے خطاب و انداز خطاب ہی سے ملتی ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس سوال کو تمھیدی مباحث میں چھیڑنے کے بجائے یہاں اٹھایا ہے تاکہ اس مسئلہ میں ہمارے مفسرین کے درمیان جو اختلاف ہے آپ خود اس کا فیصلہ کر سکیں۔

۔۔۔ اس کے زمانہ نزول سے متعلق مشہور قول تو یہ ہے کہ قرآن میں سب سے پہلے یہی سورہ نازل ہوئی۔ بعض پوری سورہ کو سب سے پہلے نازل ہونے والی قرار دیتے ہیں لیکن اکثریت پوری سورہ کو نہیں بلکہ اس کی صرف ابتدائی پانچ آیتوں کو یہ درجہ دیتی ہے۔ اس قول کی بنیاد صحیحین کی ایک روایت پر ہے۔

۔۔۔ دوسرا قول صاحب کشف کا ہے، جو انھوں نے اپنی تفسیر میں بدیں الفاظ نقل کیا ہے اکثر المفسرین علی ان الفاظ اول ما نزل ثم سورة القلم اور اکثر مفسرین اس قول پر



ہیں کہ سورہ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی پھر سورہ قلم۔ بعض مفسرین نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن بعض نے اسے اختیار بھی کیا ہے۔

• ایک تیسرا قول یہ ہے کہ سورہ مدثر سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اس قول کے قائلین بھی غالباً اس کی ابتدائی آیات ہی کو سب سے پہلے نازل ہونے والی قرار دیتے ہوں گے اس لیے کہ باقی سورہ کالب و لہجہ اور انداز خطاب سورہ علق کی طرح اتنا تیز و تند ہے کہ اس کو سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ قرار دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

میرے نزدیک یہ پوری سورہ بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ آیتوں کا مزاج بھی بعد کی آیتوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ سورہ کا انداز خطاب و کلام اتنا تیز و تند ہے کہ بالکل پہلی ہی سورہ میں یہ انداز سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اختیار فرمایا گیا۔ علاوہ ازیں سورہ کے الفاظ میں کوئی قرینہ یا اشارہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے اس کا دو الگ الگ قسطوں میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہو۔ ہذا ما عندی والعلوم عند اللہ وعلیہ احکمو واتمروا خود عنوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاہور

۴۔ مارچ ۱۹۸۰ء

۱۶۔ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ



تذکرہ قرآن

۹۷

القدس







بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

قرآن مجید نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے خلق پر جو احسانِ عظیم فرمایا اور تعلیم بالقلم کا اہتمام کر کے اس کی حفاظت اور خلق کی ہدایت کا جو سامان کیا اس کا ذکر سابق سورہ میں بالاجمال ہوا ہے۔ اب اس سورہ کا موضوع ہی نزولِ قرآن ہے۔ اس میں خاص اس مبارک رات کی نشان دہی فرمائی گئی ہے جس میں اس کا نزول ہوا اور ساتھ ہی اس رات کی وہ اہمیت و عظمت بیان ہوئی ہے جو دوسری راتوں کے بالمقابل اس کو حاصل ہے۔ اگرچہ یہ باتیں اسرارِ کائنات سے تعلق رکھنے والی ہیں مگر پوری حقیقت دوسرے نہیں سمجھ سکتے لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہے جس سے اہل علم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس کے بیان سے مقصود قرآن کے مخاطبوں کو آگاہ کرنا ہے کہ وہ اس کتاب کے معاملے میں جو رویہ اختیار کریں وہ چند باتوں پر پوری سنجیدگی سے غور کر کے اختیار کریں۔

— ایک یہ کہ یہ کتاب کسی شخص کی ذاتی املاک کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اس حکیم کے تحت اور خود اپنے اہتمام میں اتاری ہے۔

— دوسری یہ کہ اس کی نوعیت کسی ہنگامی اور وقتی واقعہ کی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس رات میں اتار دیا ہے جو نظامِ عالم میں اس کے ہاں امورِ ہمہ کی تقسیم و تنفیذ کے لیے مخصوص ہے۔ یہ ایک ہی رات ہزار راتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے امور طے پاتے ہیں۔ اس کی رحمتوں سے جو اپنے کو محروم کر لیتے ہیں وہ پھر کسی اور راہ سے ان کو حاصل نہیں کر سکتے۔

— تیسری یہ کہ اس میں کسی شیطانی چھوٹ کا کوئی ادنیٰ دخل بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات کو کامل سلامتی کی رات بنایا ہے جو شیاطین کی گردش، ان کی مداخلت اور ان کی دراندازیوں سے بالکل مامون ہے۔







# سُورَةُ الْقَدْرِ

مَكِّيَّةٌ \_\_\_\_\_ آيات: ۵

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝  
 لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنْزِيلُ الْمَلَكِ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

۱- آیت  
 وقف النبی  
 علی اللہ ورسولہ  
 ۲- آیت  
 ۳- آیت  
 ۴- آیت  
 ۵- آیت

ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے ! ترجمہ آیات ۵-۱

شب قدر ہزار ہیندوں سے بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور روح اترتے ہیں، ہر امر میں، اپنے رب کی اجازت کے ساتھ۔ ۱-۴

وہ یکسر امان ہے ! یہ صبح کے نمودار ہونے تک ہے ۵



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۱)

قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے لیے قرآن نازل کر کے فرمایا۔ اب اس سورہ میں اسی کا حوالہ، بغیر کسی تمہید کے، دے کر بتایا کہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ 'اَنْزَلْنَاهُ' میں ضمیر معمول اگرچہ بظاہر مرجع کے بغیر لگتی ہے لیکن قرینہ بالکل واضح ہے اس وجہ سے اس طرح ضمیر لانے میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ غور کیجیے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں ایک سورہ کے بعد دوسری سورہ جو آتی ہے تو وہ بغیر کسی تعلیق کے نہیں آجاتی بلکہ سابق اور لاحق دونوں میں نہایت گہرا ربط ہوتا ہے۔

اُنَّا میں جو زور اور تاکید ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب نہ اس کے پیش کرنے والے کی ذاتی اچھ کا نتیجہ ہے نہ اس میں کسی شیطانی تحریک یا دوسرے کو کوئی دخل ہے، جیسا کہ اس کے مخالفین سمجھتے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی جانب سے خلق کی تعلیم و ہدایت کے لیے اتاری ہے، کسی دوسری طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ سے مراد تقدیر امور یا تقسیم امور کی وہ رات ہے جس کا ذکر سورہ دخان میں بدین الفاظ گزر چکا ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَهٍ  
إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ۚ فِيهَا يُفْرَجُ  
كُلُّ أَمْرٍ فَكِيْمٍ ۚ لَأَمْرًا مِنْ عِنْدِنَا  
إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝

ہم نے اس (قرآن) کو ایک نہایت مبارک رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کرنے والے ہیں۔ اسی رات میں تمام حکیمانہ امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ خاص ہمارے حکم سے بے شک ہم رسول بھیجتے رہتے۔

(الدخان - ۴۴ : ۴۳-۴۲)

اس آیت پر تدبر کی نظر ڈالیے تو اس سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نکلتی ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مبارک رات خاص اس کام کے لیے مقرر فرمائی ہے جس میں وہ تمام امور، جو اس عالم میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں، ان ملائکہ کے سپرد کیے جاتے ہیں جو ان کو نافذ کرتے ہیں۔

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، قرآن کا نزول اور قریش کو انذار ان اہم امور میں سے



ہیں جن کی تنفیذ کا کام اسی مبارک رات میں متعلق فرشتوں کے حوالہ ہوا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اہم اسکیموں اور عظیم منصوبوں میں سے ہے اور فوری ہے کہ یہ اپنے آخری مراحل تک پہنچے۔

اس رات میں قرآن کے اتارے جانے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن اسی ایک رات میں اتار دیا گیا ہو بلکہ اس کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ اس میں اتارے جانے کا فیصلہ ہو گیا، جبریل امینؑ کو یہ کام سپرد کر دیا گیا اور پہلی وحی اسی رات میں نازل ہو گئی۔ اس کے بعد اگر قرآن ٹھوڑا ٹھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا اور تیس سال کی مدت میں تمام ہوا تو اس بات میں اور اس آیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

وَمَا أَذْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۲)

یہ شب قدر کی عظمت و برکت واضح فرماتی ہے کہ وہ ایسی با عظمت و بابرکت رات ہے کہ اس کی عظمتوں اور برکتوں کا کما حقہ اندازہ نہیں کرایا جاسکتا۔ اس کی یہ عظمت و برکت اس وجہ سے ہے کہ اس میں اس کائنات سے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔ جب اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے وہ دن بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے سال بھر کے منصوبے طے کرتی ہیں تو اس رات کی اہمیت کا اندازہ کن کر سکتا ہے جس میں پوری کائنات کے لیے خدائی پروگرام طے ہوتا اور سارے جہان کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ فیصلے رحمت اور عذاب، نصب اور عزل، فتح اور شکست، دونوں طرح کے امور سے متعلق ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ اس کی طرف سے ہوتے ہیں جس کا ہر فیصلہ عدل، رحم اور حکمت پر مبنی اور جس کا ہر کام اس مجموعی دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس رات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے مجموعی حیثیت سے مبارک ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ دخان کی مذکورہ آیت میں اس رات کو 'لَيْلَةُ مُبَارَكَةٍ' سے تعبیر فرمایا ہے اور آگے اس سورہ میں اس کو ہزار مہینوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے اس کی ان صفتوں کے بیان سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، قرآن کے مخالفوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ ایسی عظیم اور مبارک رات میں نازل ہونے والی کتاب کو اگر کسی نے کہا نت، نجوم اور شاعری کے قسم کی کوئی چیز سمجھا تو وہ گہرا و پشیمین میں امتیاز کرنے سے قاصر رہا۔ اس مبارک رات میں شیطانی القاد کی تمام راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ اس میں وحی کا ابر نیساں برستا ہے جس کا ایک ایک قطرہ ایک گوہر گراں مایہ ہوتا ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ (۳)

یہ اس رات کی برکت بیان ہوتی ہے کہ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ بہتری بظاہر عین البرکت



ہے کہ حصول مقصد کے اعتبار سے ہے جس طرح اس مادی دنیا میں فصلوں، موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے اسی طرح روحانی عالم میں بھی ان کا اعتبار ہے۔ جس طرح خاص خاص چیزوں کے ہونے کے لیے خاص خاص موسم اور ہینے ہیں، ان میں آپ بونے ہیں تو وہ پردان چڑھتی اور مٹھتی ہیں اور اگر ان موسموں اور ہینوں کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں تو دوسرے ہینوں کی طویل سے طویل مدت بھی ان کا بدل نہیں ہو سکتی اسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے خاص موسم اور خاص اوقات و ایام مقرر ہیں۔ اگر ان اوقات و ایام میں وہ کام کیے جاتے ہیں تو وہ مطالبہ نتائج پیدا کرتے ہیں اور اگر وہ ایام و اوقات نظر انداز ہو جاتے ہیں تو دوسرے ایام و اوقات کی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی ان کی صحیح قائم مقامی نہیں کر سکتی۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ جمعہ کے لیے ایک خاص دن ہے۔ روزوں کے لیے ایک خاص مہینہ ہے۔ حج کے لیے خاص مہینہ اور خاص ایام ہیں۔ و توف عرفہ کے لیے معینہ دن ہے۔ ان تمام ایام و اوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی عبادتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے اجر و ثواب کی کوئی حد نہایت نہیں ہے لیکن ان کی ساری برکتیں اپنی اصلی صورت میں نہیں ظاہر ہوتی ہیں جب یہ ٹھیک ٹھیک ان ایام و اوقات کی پابندی کے ساتھ عمل میں لائی جائیں۔ اگر البتہ ہو تو وہ برکت فوت ہو جاتی ہے جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔

یہی حال لیلۃ القدر کا ہے۔ یہ بڑی برکتوں اور رحمتوں کی رات ہے۔ بندہ اگر اس کی جستجو میں کامیاب ہو جائے تو اس ایک ہی رات میں خدا کے قریب کی وہ اتنی منزلیں ملے کر سکتا ہے جتنی ہزار راتوں میں نہیں کر سکتا۔ ہزار راتوں کی تعبیر بیان کثرت کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور بیان نسبت کے لیے بھی لیکن مدعا کے اعتبار سے روزوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا۔ مقصود یہی بتانا ہے کہ اس رات کے پردوں میں روح و دل کی زندگی کے بڑے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ جو اس کی جستجو میں سرگرم رہ سکیں اور اس کو پانے میں کامیاب ہو جائیں!

اس رات سے متعلق یہ بات تو مسلم ہے کہ اس میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ یہ رمضان کی کوئی رات ہے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ قرآن رمضان کے مہینے میں نازل ہوا، شَهِدُوا مَضَابِ التَّيْمِ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ (البقرة - ۱۸۸) (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) رہا یہ سوال کہ یہ رمضان کی کون سی تاریخ ہے تو روایات کے اختلاف کے سبب سے اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے بس زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں اس کے ہونے کا گمان غالب ہے۔

لیلۃ القدر  
کی تیسین  
میں اختلاف

اس باب میں جو روایات وارد ہیں ان کے اختلاف کے باعث بعض لوگوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ یہ رمضان ہی کے مہینہ کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی دوسرے مہینہ میں بھی اس کے پائے



جانے کا امکان ہے؟ اسی طرح یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ اس کی میعاد ایک سال ہے یا اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے؟ ان سوالوں کے اطمینان بخش جواب کا انحصار تمام روایات باب کی تحقیق و تنقید پر ہے اور یہ ایک طویل بحث ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے ان کی طرف یہاں صرف اس مقصد سے اشارہ کر دیا ہے کہ اہل علم ان پر نگاہ رکھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو حدیث پر اپنی پیش نظر کتاب لکھنے کا موقع عنایت فرمایا تو شاید اس میں یہ سوالات زیر بحث آئیں۔

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالسُّورُوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أُمِّيَّةٍ (۴)

یہ اس رات کے تقدیر امور یا تقسیم امور کی رات ہونے کی وضاحت ہے۔ فرمایا کہ اس میں اس رات ملائکہ اور جبریل امین ان تمام معاملات میں جو زمین میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی منظوری کا اصل کام لے کر اترتے ہیں۔ یہی بات سورہ دخان میں 'فِيهَا يُنَزَّلُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ أَمْثَلُ مِنْ بَشَرًا' (الدخان - ۴۴: ۴-۵) (اسی رات میں تمام حکیمانہ امور کی تقسیم ہوتی ہے خاص ہمارے حکم سے) کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت جو امور طے کر رکھے ہیں وہ اس رات میں تقسیم ہوتے ہیں اور متعلق فرشتے اللہ تعالیٰ کے اذن (SAVCATION) سے ان کی تنفیذ کے لیے زمین میں اترتے ہیں۔ لفظ 'السُّورُوحُ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ حضرت جبریل امین کے لیے ہے۔ چونکہ ملائکہ کے زمرے میں ان کا درجہ بہت اونچا ہے اس وجہ سے ان کا ذکر خاص طور پر ہوا۔

سَلَّمَ تَقْدِيرُ حَقِّي مَطْمَعِ الْفَجْرِ (۵)

یہ اس رات کے اس پہلو کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر 'خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرِ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ یہ رات کلینۃ امان ہی امان ہے اور اس کی یہ برکت طلوع فجر تک محیط ہے۔

'سَلَّمَ' میرے نزدیک بتدانے معذوف کی خبر ہے۔ پورا جملہ 'سَلَّمَ' ہے۔ پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینے کے لیے مبتداء کو حذف کر دیا ہے۔ جس طرح 'ذَيْدٌ عَدْلٌ' میں لفظ 'عَدْلٌ' میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے اسی طرح 'سَلَّمَ' میں بھی مبالغہ کا مفہوم ہے۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

لفظ 'سَلَّمَ' میں یوں تو ہر قسم کی آفات سے محفوظ ہونے کی ضمانت ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک رات میں شیاطین کی ہر قسم کی دواؤدش پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ جس طرح وحی کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ملائکہ اعلیٰ کے حدود میں ان کی مداخلت کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں، جس کی تفصیل قرآن میں موجود ہے، اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر



میں شیاطین آسمانی کرفیو کے تحت ہوتے ہیں اور ان پر یہ کرفیو طلوع فجر تک نافذ رہتا ہے۔ جس کے سبب سے نہ وہ اس اہم رات کے اسرار معلوم کرنے کے لیے کوئی نقل و حرکت کر سکتے اور نہ شب مبارک کی برکتوں میں کوئی خلل پیدا کر سکتے۔ ہذا ما عندی والعلہ عند اللہ وعلہ اکمل واظم۔

لاہور

۱۳ - مارچ ۱۹۸۰ء

۲۵ - ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ



تدبر القرآن

٩٨

البينة







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ ہر ایک سورہ ————— القدر ————— کہ مثنیٰ ہے۔ اس میں قرآن کی عظمت بیان ہوئی ہے اور اس میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین دونوں گٹھ جوڑ کر کے اس وقت قرآن کی تکذیب کے لیے جو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کے باب میں انھیں کوئی واقعی شبہ ہے بلکہ اس کا سبب محض ان کا احتکبار ہے۔ وہ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں کہ اگر ان کو کوئی کھل ہوئی نشانی دکھا دی جائے تو وہ اس کو مان لیں گے لیکن یہ محض ان کا فریب ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان کو قائل کرنے والا نہیں بن سکتا۔ یہ اس کو دیکھ کر بھی اپنے استکبار پر پردہ ڈانے کے لیے کوئی بات بنا ہی لیں گے۔ اہل کتاب آج مشرکین کی جو پشت پناہی اور قرآن کی تکذیب کے لیے ان کو جو اعتراضات القاء کر رہے ہیں اگر اپنی تاریخ کے آئینہ میں اپنے کردار کو دیکھیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس طرح کے معجزے کا مطالبہ وہ آج کر رہے ہیں اسی قسم کے معجزوں کا مطالبہ ان کے پیشروؤں نے اپنے زمانے میں اپنے پیغمبروں سے کیا اور وہ ان کو دکھا بھی دیے گئے لیکن سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی انھوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا۔ ایمان لانے کے لیے اصل چیز اللہ کی خشیت ہے۔ جن کے اندر یہ خشیت موجود ہے وہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ رہے وہ جن کے دل پتھر ہو چکے ہیں وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں خواہ ان کو کتنی ہی بڑی نشانی دکھا دی جائے۔

### ب۔ سورہ کا زمانہ نزول

بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ ان لوگوں کا ذہن اس طرف اس وجہ سے گیا کہ اس میں مشرکین مکہ کے ساتھ اہل کتاب کے رویہ کا بھی حوالہ ہے لیکن محض اتنی بات کسی سورہ کو مدنی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ سورتوں کے پچھلے گرد پ آپ کی نظروں سے اگر گزر چکے ہیں تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر گرد پ کی آخری علی سورتوں



میں مشرکین مکہ کے رویے کے ساتھ ساتھ اہل کتاب کے رویے کی طرف بھی اشارے ہوئے ہیں جو بالآخر ریج تحفی سے جلی ہوتے چلے گئے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک نئی رسالت اور ایک نئی دعوت کا معاملہ ایسا معاملہ نہیں تھا جس سے اہل کتاب، بالخصوص یہودی، بالکل غیر متعلق رہتے۔ ان کے علماء اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر ایک نئی بعثت کا اندیشہ پہلے سے رکھتے تھے پھر وہ اس نئی دعوت کو نظر انداز کیسے کر سکتے تھے۔ البتہ شروع شروع میں انھوں نے اس کی مخالفت میں کوئی عملی حصہ اس وجہ سے نہیں لیا کہ قریش کی مخالفت کا انداز دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ اس دعوت کو ختم کر دینے کے لیے یہ خود ہی کافی ہیں لیکن جب دیکھا کہ دعوت قریش کے علی الرغم و بنے کے بجائے بڑھ ہی رہی ہے تو انھوں نے بھی ان کی پشت پناہی شروع کر دی، اول اول تو انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ اعتراضات و سوالات قریش کو سکھائے تاکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں اور آپ کو زچ کرنے کی کوشش کریں۔ پھر اپنی مذہبی برتری کے زعم میں انھوں نے نبی کی شناخت کے لیے بعض خود ساختہ علامتیں مقرر کیں اور قریش کو مشورہ دیا کہ وہ نئے مدعی نبوت کو ان کی بتاتی ہوئی کسوٹی پر پرکھیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ ہمارے صحیفوں میں تو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی نبی کی نبوت کی تصدیق نہ کریں جب تک اس کی پیش کی ہوئی قربانی کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ نہ اترے۔ قرآن نے ان کی اس طرح کی شرارتوں کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ اور یہ کام انھوں نے دعوت کے ابتدائی دور ہی سے شروع کر دیا تھا اس وجہ سے باجائگی سورتوں میں بھی ان کی طرف اشارہ ہوا۔ اس سورہ میں بھی اسی نوعیت سے قریش کے ساتھ ان کے گٹھ جوڑ کا ذکر فرمایا۔

## ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۳) پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین قریش کے جو اشارے تمھارے درپے مخالفت ہیں، یہ گمان نہ کرو کہ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی ہٹ سے باز آجائیں گے اور اس قرآن کو مان لیں گے۔ یہ تو اسی وقت مانیں گے جب آسمان سے کوئی فرشتہ صحیفے پڑھتا ہوا اترے اور وہ اس کو دیکھیں کہ وہ صحیفے لیے اتر رہا ہے۔

(۴-۵) اس کے بعد اہل کتاب پر تعزیریں ہیں کہ یہ ناہنجار لوگ آج رسول کی مخالفت کے جوش



میں قریش کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں حالانکہ ان کی بدبختی کا یہ حال ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے معجزے دیکھے لیکن پھر بھی ان کو اللہ کے دین پر قائم رہنا نصیب نہ ہوا بلکہ یہ سب کچھ دیکھ کر اندھے بنے رہے اور دین کی ان اساسات پر بھی متفق نہ رہ سکے جن میں کسی اختلاف کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

(۶-۸) آخر میں اہل کتاب اور قریش دونوں کے استکبار پر ضرب لگائی ہے کہ یہ اپنے کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اس وجہ سے رسول کی دعوت کو خاطر میں نہیں لارہے ہیں حالانکہ یہ بدترین خلائق ہیں۔ یہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اللہ کے نزدیک درجہ صرف ان بندوں کے لیے ہے جو غیب میں رہتے اپنے رب پر ایمان لائیں اور عمل صالح کریں نہ کہ ان مغروروں کے لیے جو سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے تب مانیں گے۔

---











باز آنے والے نہیں ہیں، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانی آجائے۔  
یعنی اللہ کی طرف سے ایک فرستادہ، پاکیزہ اوراق پڑھتا ہوا، جس میں صاف احکام  
لکھے ہوئے ہوں۔ ۱-۲۔

حالانکہ اہل کتاب کھلی ہوئی نشانی آجانے کے بعد ہی اختلاف میں پڑے۔ ان  
کو حکم یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، بالکل  
یکسو ہو کر اور نماز کا اہتمام رکھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سیدھی ملت کا دین ہے۔ ۲-۵  
بے شک اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر کیا، وہ دوزخ کی آگ میں  
پڑیں گے، اسی میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ یہی لوگ بدترین خلائق ہیں! ۶۔

بے شک جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ بہترین خلائق ہیں۔ ان  
کا صلہ ان کے رب کے پاس ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ  
ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ خدا ان سے راضی وہ خدا سے راضی! یہ صلہ اس کے لیے  
ہے جو اپنے خداوند سے ڈرا۔ ۷-۸۔



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كُذِّبَتْ اِلَيْهِمْ اَنْذَارًا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْكَرًا حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۱)

یہاں 'كُذِّبَتْ' فعل ناقص کے مفہوم میں نہیں بلکہ جس طرح 'وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا' اہل کتاب (النساء - ۴، ۱۷) اللہ علیم و عظیم ہے میں ہے اسی طرح یہاں بھی فعل تام کے مفہوم میں ہے اور مشرکین اس وجہ سے اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے قرآن اور رسول کا ضدی گروہ کا کفر کیا وہ اپنی ہٹ سے باز آنے والے نہیں ہیں جب تک کھلی نشانی نہیں دیکھ لیں گے۔  
'كُذِّبَتْ' کا مفعول یہاں، قرینہ کی وضاحت کی بنا پر محذوف ہے۔ یعنی جنہوں نے قرآن اور رسول کا انکار کر دیا ہے۔

'اہل کتاب' اور 'مشرکین' کا ذکر یہاں بحیثیت دو گروہوں کے ہے جو اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ مشرکین علانیہ طور پر اور اہل کتاب، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، خفیہ طور پر۔ لفظ 'مشرکین' جب یوں آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو مشرکین قریش یا مشرکین بنی اسمعیل کے لیے بطور علم آتا ہے۔ اس استعمال کی مثالیں قرآن میں متعدد مائت واضح موجود ہیں۔

'مِنْ' یہاں اپنے معروف استعمال یعنی تبعیض ہی سے لیے ہے اس لیے کہ یہاں مشرکین اور اہل کتاب میں سے اس گروہ کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اسلام کی مخالفت کے لیے اندھا بہرا بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں گروہوں میں سب ایک ہی طرح کے نہیں تھے بلکہ ان میں ایسے سنجیدہ افراد بھی تھے جو اسلام لائے اور اگر اسلام نہیں لائے تو کم از کم اس معاملے میں وہ میانہ رو یا غیر جانبدار رہے۔ قرآن میں اس طرح کے لوگوں کا ذکر تحسین کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں 'مِنْ' اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے کہ یہ صرف اس گروہ کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اپنے مطلوبہ معجزات دیکھے بغیر کوئی بات سننے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

'حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ' یہ ان ضدیوں کی وہ شرط بیان ہوئی جس کے پورے ہوئے بغیر وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ 'بَيِّنَةُ' کے معنی کھلی ہوئی نشانی کے ہیں۔  
'کھل ہوئی نشانی' سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کو کوئی ایسا واضح معجزہ دکھایا جائے جس کے انکار کی کوئی



گنجائش باقی نہ رہے۔ ان کے اس مطالبہ کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے ان کے ذہن کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

سورہ نساء میں اہل کتاب کے مطالبہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے :

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ  
تُنْزِلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ  
السَّمَاءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَى  
أَكْبَرًا مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوا  
أَرِنَا آيَةَ جَهَنَّمَ  
اهل کتاب تم بے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر  
آسمان سے براہ راست ایک کتاب اتار دو تب  
وہ مانیں گے۔ ان کا یہ مطالبہ کچھ عجیب نہیں۔ موسیٰ  
سے تو انھوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔  
انھوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو تب  
ہم مانیں گے۔ (النساء - ۴ : ۱۳۵)

اسی طرح مشرکین سے متعلق قرآن نے سورہ مدثر میں بیان فرمایا ہے :

بَلْ يُبْدِي كَلِمًا مَّرِيَّةً  
فِيهِمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنشَرَةً  
بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ  
اس کو کھلے ہوئے صحیفے پکڑ لئے جائیں۔  
(المدثر - ۷۲ : ۵۲)

یعنی وہ اس قرآن کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جو وحی کے ذریعے سے صرف ایک شخص پر  
نازل ہوتا ہے بلکہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ آسمان سے ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ صحیفے  
اتریں۔ تب وہ یقین کریں گے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے کتاب اتاری ہے۔

رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۚ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۲۱-۲۰)

یہ 'البینۃ' کی وضاحت ہے کہ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم سے منوانا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے  
کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرشتہ براہ راست پاک اور اچھوتے اوراق پڑھتا ہوا اترے جس  
میں نہایت واضح اور قطعی احکام مرقوم ہوں۔

'رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ' کے الفاظ سے واضح ہے کہ ان کا ہنسیہ تھا کہ انسانوں میں سے اٹھا ہوا کوئی  
رسول جو مدعی ہو کہ اس پر وحی آتی ہے، ان کو مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف  
سے آنے والا کوئی فرشتہ چاہتے ہیں جو پاک اور اچھوتے اوراق پڑھتا ہوا اترے۔

'صُحُفًا مُّطَهَّرَةً' 'صَحِيفَةٌ' ورق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتہ کی بات  
بھی اس صورت میں باد رکریں گے جب وہ خدا کی طرف سے صرف خبر دینے والا نہ ہو بلکہ جو کچھ لائے،  
لکھے ہوئے اوراق میں لائے اور اس کو پڑھ کر سنائے۔ ان اوراق کے لیے 'مُطَهَّرَةً' کی صفت میں یہ  
مضمون مضمون ہے کہ یہ اوراق بالکل پاکیزہ اور اچھوتے ہوں، خدا اور فرشتہ کے سوا کسی جن و بشر نے ان



کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔

’فِيهَا كُتِبَ قِسْمَةُ‘ مذکورہ شرائط کے اوپر ایک مزید شرط یہ بھی کہ ان اوراق میں ادھر ادھر کی نہت سی سرگزشتیں اور حکایتیں نہ ہوں بلکہ سیدھے سیدھے قطعی اور واضح احکام ہوں کہ وہ ان کو سن کر تے لکھ جان لیں کہ ان کا رب ان کو کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے روکتا ہے۔

’کُتِبَ‘ جمع ہے ’کُتِبَ‘ کی۔ سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ یہ لفظ قرآن میں شریعت کے احکام کے معنی میں بھی آیا ہے۔ یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔

’قِسْمَةُ‘ کے معنی سیدھے، واضح اور قطعی کے ہیں۔ یعنی ہمیں قطعی احکام بتائے جائیں، غیر متعلق باتیں سننے کے خواہش مند ہم نہیں ہیں۔ اس لفظ میں ان شریروں کی طرف سے قرآن مجید پر جو تعرض ہے وہ اہل ذوق خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح تو رات کے احکام عشرہ الواح میں لکھ کر دیے گئے تھے اسی طرح واضح احکام، اوراق میں لکھے ہوئے لے کر فرشتہ آسمان سے ہمارے اوپر اترے تب ہم مانیں گے کہ یہ خدا کی اناری ہوئی کتاب ہے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۴)

یہ مطالبہ چونکہ اہل کتاب کی ایجادات میں سے تھا جو انھوں نے قریش کے لیڈروں کو اس لیے اہل کتاب سکھایا تھا کہ وہ اس کو قرآن کے خلاف استعمال کریں، اس وجہ سے قرآن نے اس کا جواب انہی کو سننے انشاء رکھ کر دیا۔ فرمایا کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے جب بھی یہ ماننے والے سامی مطالبہ نہیں ہیں۔ ان کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کو جو شریعت دی گئی تھی وہ نہایت کھلے ہوئے معجزات کے جوابہ جلو میں دی گئی تھی، ان کے پیغمبر، حضرت موسیٰ نے قدم قدم پر ان کو قدرت خداوندی کے وہ کوشمے دکھائے جو کسی قوم کو ان سے پہلے نہیں دکھائے گئے، تو رات کے احکام عشرہ ان کو الواح میں لکھ کر دیے گئے۔ ان سے شریعت کا عہد لیتے وقت پہاڑ ان کے اوپر چھتری کی طرح اڑھا دیا گیا، ان کے لیے صحرا میں سایہ اور من و سلویٰ کا انتظام کیا گیا، پہاڑ سے ان کے لیے اکٹھے بارہ چشمے جاری کر دیے گئے لیکن یہ سارے کوشمے اور معجزے دیکھنے کے بعد شریعت الہی کے ساتھ و ناداری کا حق انھوں نے یوں ادا کیا کہ سامری سے ایک بچہ بنا کر اس کی پر جاشروع کر دی کہ یہی ہمارا معبود ہے۔ ان کے اسی فساد سے ان کے اندر سب سے پہلے انتشار پیدا ہوا جو امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا گیا یہاں تک کہ اختلاف کے سوا کوئی چیز بھی ان کے درمیان مشترک نہیں رہ گئی۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَا حُفَاؤَ دِيْعِيْمُوْا



الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (۵)

یہ اس تفریق کی مثال ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ دین کی بنیادی چیزیں میں سے کوئی چیز بھی ایسی باقی نہیں رہ گئی ہے جس پر یہ قائم و استوار ہوں بلکہ ہر چیز میں ان کی راہیں الگ الگ ہو گئیں یہاں تک کہ اپنے اس اختلاف کی بدولت وہ ان کو ضائع کر بیٹھے۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں اسی کے لیے اطاعت کو خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، لیکن انھوں نے دین کی یہ بنیادی تعلیم برباد کر دی۔ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں انھوں نے ایک بچھڑے کی پرستش کی، عزیر کو ابن اللہ اور اپنے علماء و فقہاء کو اَدْبَابِائِہِمْ دُوتِ اللہ بنایا۔ جادو اور اعمالِ سفلیہ اختیار کر لیے یہاں تک کہ دوسری قوموں کے بتوں کی بھی پوجا کی جس پر ان کے نبیوں نے نہایت درد انگیز الفاظ میں نوحہ کیا۔

اسی طرح انھیں نماز اور زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا تھا لیکن نماز انھوں نے جیسا کہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے بالکل ہی ضائع کر دی یہاں تک کہ ثورات میں اس کا ذکر بھی باقی نہیں رہا۔ ثورات میں قربانی کا ذکر آتا ہے لیکن نماز کا ذکر بمنزلہ صفر ہے۔ یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہوا۔ رسمی طور پر تو وہ باقی رہی لیکن اس کے اصلی حقدار فقراء و غرباء کی جگہ بنی لادی کے علماء و فقہاء بن گئے اور ان کے علماء و فقہاء کی خست و سجات کا جو حال رہا ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو انجیلوں اور دوسرے نبیوں کے صحیفوں میں ان کی زر پرستی کی جو تصویر کشی گئی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

ذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ یہ جواب ہے ان کے اس مطالبہ کا جو اَدْرِیْہَا کُتِبَ قِیْمَۃُہُ کے الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ فی الواقع سیدھے اور واضح دین ہی کے طالب ہیں تو یہ احکام تو انھیں سیدھے اور فطری دین ملتِ ابراہیم کے احکام کی حیثیت سے دیے گئے تھے تو انھوں نے آسمان کو کیوں برباد کیا؟ اور یہ قرآن بھی ان کو انہی واضح اور قطعی باتوں کی طرف بلا رہا ہے تو اس کی مخالفت کے درپے کیوں ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب جو سوالات اٹھا رہے ہیں یہ محض ان کے حسد کی پیداوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ خود اپنے کو اللہ کی شریعت سے محروم کیے بیٹھے ہیں اسی طرح دوسرے بھی اس سے محروم ہی رہیں۔

ذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ یہ اصل میں ذَٰلِكَ دِیْنُ النَّبِیِّۃِ الْقَیِّمَۃِ ہے قِیْمَۃ کا موصوت

یہاں حذف ہو گیا ہے اور اس قسم کا حذف قرینہ موجود ہو تو عربی میں معدوم ہے۔ اس اسلوب بیان سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ دین کی یہی وہ بنیادی تعلیمات ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کی دونوں شاخوں کو ان کے جدِ علیٰ کی وراثت کی حیثیت سے منتقل ہوئیں۔ تو حیف ہے، اگر انہی کی مخالفت کے لیے دونوں شاخیں گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کریں۔

دین قیّم



یہ امر واضح رہے کہ ملتِ ابراہیم کا تعارف قرآن میں جگہ جگہ مِلَّةٌ قَیِّمَةٌ کی صفت سے کرایا گیا ہے۔ اس ملت پر مفصل بحث اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک آیت کے حوالہ پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

قُلْ إِنِّي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قَيِّمًا مِثْلَ آبِرَاهِيمَ حَنِيفًا ج (الانعام - ۶: ۱۶۱)

کہہ دو۔ میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے۔ نظری دین، ملتِ ابراہیم کی طرف یکسو ہو کر۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۶)

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا ہے جو قرآن کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین سے۔ ساتھ ہی اس میں ان کے اس کبر و غرور پر بھی ضرب لگائی ہے جو اس تکذیب کا سبب بنا۔

فرمایا کہ جو بھی قرآن کی تکذیب کر کے کفر کے ترکب ہوئے ہیں وہ سب جہنم میں بھر دیے جائیں گے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے۔ اہل کتاب ہو کر جھٹولنے اسی اندھے پن کا ثبوت دیا جس کا مظاہرہ مشرکین نے کیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کسی رعایت کے مستحق ٹھہریں۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہے کہ یہ اس جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل کیے جائیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ چند دنوں کے بعد اس سے ان کو نکلتا نصیب ہو جائے۔ یہاں اہل کتاب کے اس زعم پر نظر رہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے کہ ان کا گمان یہ ہے کہ ادل تو دوزخ کی آگ سے ان کو کوئی سابقہ پڑنے والا نہیں ہے اور پڑا بھی تو وہ چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں ہوگا۔

أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ یہ ان کے کبر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین کے سردار قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط جو لگاتے تھے کہ جب تک کوئی فرشتہ آسمان سے اچھوتے صحیفے پڑھتا نہیں اترے گا یا جب تک ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کھلے صحیفے نہیں پکڑائے جائیں گے اس وقت تک وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دعوائے رسالت میں سچے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ شرط وہ اس غرور کی بنا پر لگاتے تھے کہ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو جو دنیوی اعتبار سے ان سے فرد تر بھی ہے، خدا کا رسول مان کر اس کی اطاعت کا قلاوہ اپنی گردن میں کس طرح ڈال لیں! ان کا یہ غرور ان کے لیے قبولِ حق سے مانع بنا حالانکہ حق خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جس کے آگے گردن جھکا دینا ہر ایک پر



واجب ہے خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا غلام۔ اگر کوئی شخص حق سے اکڑتا ہے تو وہ ابلیس کی ذریت میں سے ہے اور ابلیس کی ذریت بدترین خلائق ہے جس کا ٹھکانا صرف جہنم ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (۷)

ان بندوں کا بیان جو انکب سے پاک رہے

یہ اللہ کے ان بندوں کا بیان ہے جو کبر و غرور کی آلائش سے پاک رہے اس وجہ سے ان کے اندر حق کا احترام باقی رہا۔ انھوں نے جب رسول کی دعوت سنی تو اس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جس طرح کا مطالبہ مغروروں نے کیا بلکہ وہ اللہ کی کتاب پر ایمان لائے اور عمل صالح کی راہ پر چل پڑے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو بہترین خلائق ہیں۔ اس لیے کہ انسان کی قدر و قیمت مال و اسباب اور خاندان و نسب سے نہیں بلکہ اس کے عقلی و اخلاقی اوصاف سے ہے۔ جن کے اندر یہ اوصاف موجود ہیں اللہ کے نزدیک وہی اثرات و سادات ہیں اگرچہ وہ روم یا حبش کے غلام ہوں اور جو ان اوصاف سے محروم ہیں وہ اللہ کے نزدیک ارذل خلائق ہیں اگرچہ وہ قرشی و ہاشمی سادات ہوں۔ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے قریش کے بیٹروں کی وہ پھبتیاں ذہن میں تازہ کر لیجیے جو وہ ان غریب مسلمانوں پر چیت کرتے تھے جو شروع شروع میں اسلام لائے تھے۔ ان کی طرف سے اس تڑپن و تذلیل کے بعد رب السموات والارض کی طرف سے ان کی اس سرفرازی سے کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کے سر کتنے اونچے ہوئے ہوں گے!

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور مبیا کہ سورہ تین میں ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو بہترین ساخت اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر یہ اپنی قدر پہچان لے تو یہ 'خیر البریۃ' ہے، خدا کی مخلوقات میں کوئی اس کے برابر کا نہیں۔ اور اگر یہ اپنی حقیقی قدر و قیمت سے بے خبر رہ کر زندگی گزارے تو یہ 'شد البریۃ' اور 'رَدُّنْهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ' کا بالکل صحیح مصداق ہے۔ پھر یہ اتنی لپٹی میں گر رہا ہے جو صرف اسی کے لیے خاص ہے۔ خدا کی کوئی اور مخلوق اس لپٹی تک نہیں گرتی۔ جس طرح انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کے زوال کی بھی کوئی حد نہایت نہیں ہے۔ بڑی ہی اعلیٰ بات کہی ہے ان حکماء نے جنھوں نے کہا ہے کہ اے انسان! تو اپنے کو پہچان!

جَنَازًا مُّسَوِّدَةً رَّبُّهُمْ جَنَّتٌ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ (۸)

یہ اللہ کے ان بندوں کا صلہ بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ اس دنیا میں ان کے لیے جو آزمائشیں مقدر ہیں، ان سے تو انھیں بہر حال گزرنا ہے لیکن اپنے رب کے پاس ان کے لیے اقامت کے ایسے باغ ہیں جن میں نہیں جاری ہوں گی اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہوں گے۔



”جَنَّتْ عَدْنٌ“ کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

”رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ“ یعنی اس جنت میں اللہ بھی ان سے راضی اور وہ بھی اس سے راضی۔ اللہ ان سے اس وجہ سے راضی کہ انھوں نے بندگی کا حق اس طرح ادا کیا جس طرح ان کو ادا کرنا چاہیے تھا اور جو ان کے رب کے معیار پر پورا اترتا اور وہ اللہ سے اس وجہ سے راضی کہ ان کے رب نے نہ صرف وہ وعدے پورے کیے جو ان سے کیے تھے بلکہ ان کو وہ کچھ بخشا جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکے تھے۔

”ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ“ فرمایا کہ یہ مقام ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے رب سے، غیب میں رہتے ہوئے، مطلب یہ ہے کہ جو احمق سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں وہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔ ان کا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں انسان کا اصلی امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ان حقائق پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی ہے۔ وہ کان اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزارے اور نہ اس بات کا منتظر رہے کہ سب کچھ سامنے دکھا دیا جائے تو وہ تب ماننے لگے گا۔ جس نے یہ امتحان پاس کر لیا وہی اس بات کا مستحق ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل عظیم سے نوازے۔ جو اس میں ناکام رہا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اور اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل کا کوئی حصہ عطا کرے۔

بنو فیق ایزوی ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ - فَالْحَمْدُ لِلَّهِ حَمْدًا كَثِيرًا۔

لاہور

۲۴ - مارچ ۱۹۸۰ء

۶ - جمادی الاول ۱۴۰۱ھ







تدبر القرآن

۹۹

الزلزال







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن انسان کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ اس کی ہر نیکی و بدی خواہ اس نے کتنے ہی پردوں کے اندر چھپ کر کی ہو، اس کے سامنے رکھ دی جائے گی اور وہ اس کی جزایا سزا پائے گا۔ اس دن ہر شخص اپنے اعمال سے متعلق خود جواب دہ ہوگا۔ کوئی دوسرا نہ اس کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی اس کا سفارشی بنے گا۔

اس مدعا کو واضح کرنے کے لیے پہلے اس پہل کی تصویر کھینچی گئی ہے جو قیامت کے دن اس زمین میں برپا ہوگی اور جس کے نتیجے میں وہ سب کچھ باہر آ جائے گا جو اس کے اندر مدفون ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ایام سے اپنی ساری کہانی کہہ سناٹے گی تاکہ انسان پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس نے اس کے اندر کہاں کہاں کیا کچھ چھپایا اور کیا کیا کہا اور کیا ہے۔ اس کے بعد ہر ایک اپنی نیکی بھی دیکھے گا، اگر اس نے کوئی نیکی کی ہوگی اگرچہ وہ کتنی ہی حقیر ہو اور وہ برائی بھی دیکھے گا جس کا وہ مرتکب ہوا ہوگا اگرچہ وہ برائی کتنی ہی چھوٹی ہو۔

پچھلی سورتوں کے مطالب اگر ذہن میں محفوظ ہیں تو اس سورہ کے انداز کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں کچھ زحمت نہیں ہوگی۔ قیامت کے باب میں منکرین کے بڑے مغالطے تین تھے۔ ایک یہ کہ یہ زمین آسمان بھلا درہم برہم کس طرح ہو سکتے ہیں؟ دوسرا یہ کہ انسان کے تمام اقوال و افعال کا بھلا کوئی احاطہ کر سکتا ہے کہ ان کا حساب کرنے بیٹھے؟ تیسرا یہ کہ اگر یہ باتیں ممکن بھی فرض کر لی جائیں جب بھی خود ان کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے، ان کے شر کا واپس اپنی سفارش سے ان کو ہر آفت سے بچالیں گے اور ان کو خدا کے ہاں بڑے بڑے درجے دلوائیں گے۔ اس سورہ میں ان کے ان تینوں مغالطوں پر ضرب لگائی گئی ہے۔







# سُورَةُ الزَّلْزَلِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ  
 أَثْقَالَهَا ② وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ③ يَوْمَئِذٍ  
 تُخَدِّثُ أَخْبَارَهَا ④ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ⑤ يَوْمَئِذٍ  
 يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ⑥ فَمَنْ  
 يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ⑦ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ  
 ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ⑧

جب کہ زمین ہلادی جائے گی جس طرح اس کو ہلانا ہے۔ اور زمین اپنا بوجھ باک، تڑپا آیت

نکال پھینکے گی اور انسان پکاراٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے! اس دن وہ اپنی

دستان کہہ سنائے گی، تیرے خداوند کے ایما سے۔ ۵-۱

اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر

بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھے گا۔ ۸-۶



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱)

جب اس طرح اِذَا اُسے کسی چیز کا بیان ہوتا ہے تو مقصود اس کی یاد دہانی ہوتی ہے یعنی اس وقت کو یاد رکھو، اس دن سے ہوشیار رہو، جب کہ ایسا ایسا ہوگا۔ آپ چاہیں تو اس مخفی مضمون کو ترجمے میں ظاہر بھی کر سکتے ہیں۔

زُلْزَالَ آیات تو ہے فعل زُلْزِلَتْ کی تاکید کے لیے جس طرح مفعول مطلق آیا کرتا ہے، لیکن یہاں زمین کی طرف اس کی اضافت سے مضمون میں ایک خاص اضافہ ہو گیا ہے جس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ آیت کا صحیح زور سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس خاص اسلوب کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جب کہ زمین ہلا دی جائے گی اس طرح جس طرح زمین کو ہلانے کا حق ہے یا جس طرح اس کا ہلایا جانا مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہلانے جانے کا صحیح تصور آج ممکن نہیں ہے، پورے کرہ ارض کا بھنجھوڑا جانا اور اس طرح بھنجھوڑا جانا جس طرح خدا نے مقدر فرمایا ہے تصور سے ایک مافوق حادثہ ہے لیکن یہ پیش آنے والا ہے اس وجہ سے اس کو یاد رکھو، اس سے غافل رہ کر زندگی نہ گزارو۔

وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا (۲)

اِثْقَالُ کے معنی بار اور بوجھ کے ہیں۔ یہاں اس کا اول مصدر ہے جس میں زمین سے زمین میں دفن ہیں اور قیامت کے دن زمین ان کو نکال باہر کرے گی لیکن لفظ عام ہے اس وجہ سے اس سے وہ خزانے اور دینے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور ان جرائم کی یاد گاریں بھی جن کا مجرموں نے ارتکاب کیا اور زمین میں ان کو چھپایا۔ سورہ الشقاق کی آیت وَالْقَتُّ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ (الانشقاق - ۴: ۸۴) (جو کچھ اس کے اندر ہوگا وہ اس کو ڈال کر فارغ ہو جائے گی) میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے اور آگے سورہ عادیات کی آیت إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ (الحدیث - ۱۰۰: ۹) زاور حب کہ قبریں اگلوائی جائیں گی کے تحت بعض اشارات ان شاء اللہ مزید آئیں گے۔

وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا (۳)

انسان کی بدحواسی اس ہولناک صورت حال کا انسان پر جو اثر پڑے گا یہ اس کی تعبیر ہے کہ وہ بدحواس ہو کر بیکار اٹھے گا کہ اسے یہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ کسی طرح ٹپکنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے اور اپنے



اندر کی ہر چیز باہر نکال دے رہی ہے! اسی طرح کی گھبراہٹ مجرموں پر اس وقت بھی طاری ہوگی جب ان کے اعمال کا رجسٹر کھلے گا۔ اس وقت بھی وہ کہیں گے: "مَالٍ هَذَا الْكِتَابُ لَا يَغَارِدُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا" (الکھف - ۱۸: ۱۹) عجیب ہے یہ کتاب! کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ گیا ہو!

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا لَا يَأْتُ رَبَّكَ آدْحَىٰ لَهَا (۴-۵)

یعنی اس دن زمین وہ تمام نیکیاں اور بدیاں جو اس کی پشت پر کی گئی ہیں خدا کے حکم سے سنا ڈالے گی۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ تصریح ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ مجرموں کے اعضاء کو ناطق بنا دے گا اور وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے یہاں تک کہ ان کی کھالیں بدن کے روٹنے (بھی ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ سورۃ ختم السجدۃ میں فرمایا ہے:

وَقَالُوا الْحُكُودُ هُمْ لَمْ يَشْهَدُوا  
عَلَيْنَا طَقَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي  
أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ -

اور مجرمین اپنی کھالوں سے پوچھیں گے کہ آخر تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گی کہ جس خدا نے آج ہر چیز کو گو یا کر دیا ہے اس نے ہمیں بھی گو یا کر دیا۔

(ختم السجدۃ - ۴۱: ۲۱)

اس دنیا میں انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اسی زمین کے اوپر یا نیچے کرتا ہے اس وجہ سے یہ انسان کے اعمال و اقوال کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس طرح انسان کے اعضاء و جوارح اور اس کے بدن کے روٹیں روٹیں کو اس کے خلاف گواہی دینے اور اس کی زندگی کا ریکارڈ سنانے کے لیے گو یا کر دے گا اسی طرح زمین کو بھی ناطق بنا دے گا کہ وہ ہر ایک کا ریکارڈ سنا دے۔

بَيِّنَاتٌ دَلِيلٌ آدْحَىٰ لَهَا لَفْظٌ دَحَىٰ یہاں ایماء اور اشارہ کے مفہوم ہیں ہے۔ اس معنی میں یہ قرآن میں یہ اللہ کے حکم استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ زمین ایسا اس وجہ سے کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اس کے لیے سے ہوگا ایسا ہوگا۔ سورۃ ختم السجدۃ کی مذکورہ بالا آیت قَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ میں جو بات فرمائی گئی ہے وہی بات یہ ذرا مختلف اسلوب میں یہاں ارشاد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا اور ہر چیز خدا کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہوگی۔ چنانچہ سورۃ الشقاق میں زمین ہی سے متعلق ارشاد ہے: "وَأَذِنتُ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ" (الانشقاق - ۵: ۸۴) (اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے یہی زیبا ہے)۔

يَوْمَئِذٍ يُفْعَلُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّبُرْدٍ وَاعْتِمَالِهِمْ (۶)

اَشْتَاتٌ کے معنی متفرق، اکیلے اکیلے، تنہا تنہا کے ہیں۔ یعنی اس دن لوگ قبروں سے اس طرح نکلیں گے کہ کسی کے ساتھ نہ اس کے اہل خاندان ہوں گے، نہ اعزہ و اقربا، نہ اس کا جھٹھا ہوگا، نہ خدم و خشم، نہ ملاک



جاؤاد، نہ اعوان و انصار اور نہ مزعمہ شرکاء و شفعاء بلکہ ہر ایک اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے رب کے حضور تنہا حاضر ہوگا۔ یہ مضمون قرآن کے دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورہ مریم میں فرمایا ہے: **وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَرْدًا** (مریم - ۱۹، ۹۵) (اور ان میں سے ہر ایک اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تنہا)۔ سورہ النعام میں فرمایا ہے: **وَلَقَدْ جِئْتُمُوَنَا فَوَادَيْ كَمَا خَلَقْنَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ** (النعام - ۴ : ۹۴) (اور تم آئے ہمارے پاس تنہا تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا)۔

**لِيُرَوَّاْ اَعْمَالَهُمْ**۔ یہ اس حاضری کی غایت بیان ہوتی ہے کہ یہ اس لیے ہوگی کہ ان کو ان کے اعمال دکھا دیے جائیں کہ دنیا کی زندگی میں انہوں نے کیا کارگزاری انجام دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دکھا دینے سے مقصود اس کا نتیجہ یعنی اس کا مزہ چکھانا ہے یعنی فعل نتیجہ فعل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ **فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ** (۷-۸)۔ یہ اس اجمال کی تفصیل بیان ہوتی ہے۔ فرمایا کہ جس نے ذرہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کے سامنے آئے گی اور جس نے ذرہ کے برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اس کے سامنے آئے گی۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ہر مومن و کافر کی ہر چھوٹی بڑی نیکی یا بدی اس کے سامنے آئے گی تو ضرور لیکن اس قاعدے کے مطابق آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان فرمایا ہے یعنی ایک مومن یہ دیکھے گا کہ اس سے نیکیوں کے ساتھ فلاں فلاں غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی فلاں فلاں نیکیوں کو ان کا کفارہ بنا دیا ہے۔ اسی طرح ایک کافر یہ دیکھے گا کہ اس نے بدیوں کے ساتھ کچھ نیک کام بھی کیے ہیں لیکن اس کے وہ نیک کام اس کے فلاں برے اعمال و عقائد کے سبب سے ضبط ہو گئے، اس وجہ سے وہ ان کے صلہ سے محروم رہا۔

اس قاعدہ پر پرکھے جانے کے بعد نجات پانے والوں اور ہلاک ہونے والوں کے لیے جو ضابطہ مقرر ہوا ہے وہ سورہ قارعہ میں یوں بیان ہوا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَهُوَ  
فِي عِيشَةٍ رَّاٰ ضَيِّقَةٍ ۖ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ  
مَوَازِينُهُ ۖ فَامُّهُ هَادِيَةٌ ۖ  
پس جس کے پلے بھاری ہوں گے وہ تو  
دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلے  
ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا دوزخ کا  
کھٹ ہوگا۔

(القارعة - ۱۰۱ : ۴ - ۹)

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ واللہ علی فضلہ و احسانہ۔

لاہور

۳۱ - مارچ ۱۹۸۰ء

۱۳ - جمادی الاول ۱۴۰۱ھ



تذکرہ  
مدیرِ قرآن

۱۰۰

الغدیت







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں انسان کے ناشکرے پن پر اس کو تنبیہ اور ملامت ہے۔ اس کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں وہ جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے ان وسائل و ذرائع ہی سے حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ جب سب کچھ خدا کی عنایت سے حاصل ہوا ہے تو اس پر خدا کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کرنا بھی واجب ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ خدا کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتیں اور صلاحیتیں خود اسی کے خلاف استعمال کرتا ہے اور اس بات کی ذرا پروا نہیں کرتا کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ سینوں کے راز تک بھی اگلوائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پورے علم کے ساتھ ہر ایک کا محاسبہ کرے گا اور ہر شخص کو جزا یا سزا دے گا۔

گویا اس سورہ کا اصل مضمون تو وہی ہے جو سابق سورہ — المزلزال — کا ہے لیکن دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں اس دن کی تصویر ہے جس دن یہ سب کچھ ہوگا اور اس سورہ میں اس کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

ترتیب بیان اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے تصرف میں جو حیوانات دیے ہیں ان میں سے خاص طور پر جنگی گھوڑوں کی ان جاں فشانیوں، جاں بازیوں اور قربانیوں کا بطریق قسم حوالہ دیا ہے جو وہ اپنے آقا یعنی انسان کی اطاعت و خدمت کی راہ میں کرتے ہیں اور پھر انسان کی ناشکری و ناسپاسی پر اس کو ملامت کی ہے کہ آخر وہ اپنے ان غلاموں اور مملوکوں کی اس وفادار و زبردش سے یہ سبق کیوں نہیں سمجھتا کہ وہ بھی کسی مالک کا مملوک، کسی رب کا مربوب اور کسی آقا کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت میں سرگرم رہے۔

آخر میں انسان کے نجل اور اس کی زر پرستی پر ملامت کی ہے کہ وہ پاتا تو سب کچھ خدا سے



ہے لیکن وہ اسی سے اپنے مال کو بچانے اور چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ کہاں اور کب  
 تک چھپائے گا! ایک دن زمین کے سارے ذہینے اور دلوں کے سارے راز آشکارا ہو کر  
 رہیں گے! عاقل وہ ہیں جو اس دن کے لیے تیاری کریں۔

---



# سُورَةُ الْعَدِیَّتِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۱۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْعَدِیَّتِ صُبْحًا ① فَالْمُورِیَّتِ قَدْحًا ② فَالْمُغِیْرَتِ  
صُبْحًا ③ فَاتْرُنْ بِهِ نَقْعًا ④ فَوْسَطُنْ بِهِ جُمْعًا ⑤ إِنَّ  
الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ⑥ وَلَئِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ⑦ وَإِنَّهُ  
لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ⑧ أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي  
الْقُبُورِ ⑨ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ⑩ إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ⑪

گواہی دیتے ہیں ہانپتے، دوڑنے والے گھوڑے، ٹاپوں کی ٹھوکر سے

چنگاریاں نکالنے والے، صبح کے وقت دھاوا کرنے والے، دوڑ سے غبار

اٹھانے والے اور غبار کے ساتھ غول میں گھس جانے والے۔ ۱-۵

کہ انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے اور وہ اپنے رویہ پر خود گواہ ہے۔

اور وہ دولت کار سیا ہے۔ ۲-۸

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبریں اگلاوائی جائیں گی اور دلوں کے بھید

نکلوائے جائیں گے۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے اچھی طرح باخبر

ہوگا۔ ۹-۱۱



## الفاظ و سالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْحَدِيثُ ضَبْحًا (۱)

’حدیث‘ کے معنی دوڑنے والے کے ہیں لیکن یہاں یہ جنگی گھوڑوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔  
 دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے چار صنعتیں، جو ترتیب کے ساتھ آئی ہیں، وہ جنگی گھوڑوں کے سوا کسی اور چیز پر منطبق نہیں ہوتیں۔ بعض لوگوں نے اس سے مزدلفہ میں اونٹوں کو مراد لیا ہے، لیکن اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ آگے کی صنعتیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اونٹوں کی نہیں ہو سکتیں۔

ایک راے یہ بھی ہے کہ اس سے غازیوں کے گھوڑے مراد ہیں۔ لیکن اس تفصیل کے لیے بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ خاص طور پر تقسم علیہ سے تو یہ بات بالکل ہی بے جوڑ ہو جائے گی۔ تقسم علیہ یہاں اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ (۱۲۶) (بے شک انسان اپنے رب کا نہایت ناشکر ہے) ہے، اس تقسم علیہ کو غازیوں اور مجاہدین کے گھوڑوں کے ساتھ کیا ربط ہو سکتا ہے!

یہ قول اور ادرا پر مزدلفہ کے اونٹوں سے متعلق جس قول کا حوالہ گزرا ہے یہ دونوں قول اس عام دہم پر مبنی ہیں کہ جس چیز کی قسم کھاٹی جائے ضروری ہے کہ وہ کوئی مقدس چیز ہو۔ ہم اس دہم کی تردید اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ تقسم بہ کے لیے مقدس ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت رکھنے والی چیز اس کا اس دعوے پر شہادت ہونا ہے جو اس کے بعد مذکور ہوتا ہے۔ آگے ہم تفصیل سے بتائیں گے کہ گھوڑوں کی قسم کن کن پہلوؤں سے انسان کی ناشکری و ناپاسی کی دلیل ہے۔ ’ضَبْحٌ‘ وہ خاص آواز نکالنے کے لیے آتا ہے جو گھوڑے ہانپتے ہوئے اپنے نھنوں سے نکالتے ہیں۔ ان کے ہانپنے کا یہ خاص انداز اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے ان کو انسان کی محکومی میں دیا ہے اس کو وہ نہایت وفاداری و جان نثاری سے پورا کرنے والے اور انسان کی مقصد برآری میں اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر رکھ دینے والے ہیں۔

فَالْمُؤَدِّيَةُ قَدْ حَا (۲)

’ف‘ کے ذریعہ سے جب عطف ہوتا ہے تو، جیسا کہ ہم اس کے محل میں وضاحت کر چکے ہیں، ترتیب پر بھی دلیل ہوتا ہے اور اس بات پر بھی کہ تمام صنعتیں ایک ہی موصوف سے تعلق رکھنے والی ہیں۔  
 ’مُؤَدِّيَاتٌ‘، ’اِيْدَاؤُ‘ سے ہے جس کے معنی چھماق یا کسی چیز سے آگ نکالنے کے ہیں۔  
 ’قَدْ حَا‘ ضرب لگانے، ٹھوکر لگانے اور ایک چیز کو دوسری سے ٹکرانے کے معنی میں یہاں ہے۔



یہ انسان کی مقصد برآری میں گھوڑوں کی سرگرمی اور آتش زیر پاٹی کی تعبیر ہے کہ وہ اس طرح دڑتے  
ہیں کہ ان کی سموں کی ٹھوکر سے چنگاریاں جھپرتی ہیں۔ گھوڑوں کے چونکد آہنی نعل ہوتے ہیں اس وجہ سے  
جب وہ دشمن پر دھاوا کرنے کے لیے پتھر ملی زمینوں پر دڑتے ہیں تو ان کی سموں کی ضرب سے  
چقماق کی طرح چنگاریاں نکلتی ہیں۔ گویا وہ اپنے مالکوں کی رضا جوئی میں آگ کے انگاروں پر دڑ  
رہے ہیں۔

كَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا (۳)

یہ وہ اصل مقصد بیان ہوا ہے جس کے لیے وہ یہ جان بازی کرتے ہیں یعنی وہ دشمنوں اور حریفوں  
پر شب خون مارتے ہیں۔ عرب میں حریفوں پر غارتگری کا سب سے موزوں وقت صبح ہی کا سمجھا  
جاتا تھا اس وجہ سے یہاں 'صُبْحًا' کی تید لگی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں غارتگری کے الارم کے طور پر  
'فَاصْبَاحًا' کا جو نعرہ تھا اس میں بھی صبح کا حوالہ اسی پہنچا ہے، یہاں تک کہ لفظ 'صَبَّحَ' عربی میں حمد  
اور غارتگری کے لیے ایک معروف لفظ بن گیا۔

فَأَشْرَبَ بِهِنَّ لُغْمًا (۴)

'إِشَادَةً' کے معنی اٹھانے اور ابھارنے کے اور 'لُغْمًا' کے معنی گردوغبار کے ہیں۔  
'بِهِنَّ' میں 'ب' ظرف کے مفہوم میں لیجیے اور ضمیر کا مرجع 'صُبْحًا' قرار دیجیے تو مطلب یہ ہوگا  
کہ جب وہ صبح کو غارتگری کرتے ہیں تو اس وقت وہ گردوغبار کا ایک طوفان اٹھا دیتے ہیں یعنی  
ان کا حملہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی جانب سے ایک طوفانی آندھی آگئی۔  
اور اگر 'بِهِنَّ' کو اس تگاپورے متعلق مانیے جو غداۃ کے اندر مضمر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا  
کہ وہ اپنی اس تگاپورے خیار ابھار دیتے ہیں۔

دروں ہی شکلوں میں مقصود اس کلام سے ان کی جنگی اہمیت کا اظہار ہے۔ یعنی ان کا آنا نسیم  
کا آنا نہیں بلکہ ایک آندھی کا آنا ہوتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا (۵)

'بِهِنَّ' میں 'ب' یہاں ملا بست کے مفہوم میں اور ضمیر کا مرجع 'لُغْمًا' ہے۔ یعنی وہ اسی آندھی  
اور طوفان کے ساتھ دشمن کے ایک پورے غول کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کے نیروں اور تلواروں  
کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ انہیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے مالکوں کا مقصد عزیز ہوتا ہے۔ اس کی  
خاطر وہ ہر خطرے سے بے خوف ہو کر اقدام کرتے ہیں اور یہی ان کے شایان شان ہے۔

رَأَى الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ (۶)



گھوڑوں کے معنی ہیں ناشکرا، ناسپاس، تنہا خور، اپنے مالک کی عنایتوں کا ناقدر۔ مطلب یہ ہے کہ جو انسان گھوڑوں کی یہ ساری باتیں دیکھتا ہے اور ان کی قربانیوں سے بہرہ مند ہوتا ہے لیکن اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ بھی اپنے رب کا غلام ہے اور اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی کی طرح اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم و سیدہ سپر رہے، وہ نہایت ناشکرا اور لئیم ہے۔ کیونکہ وہ جانور ہو کر اپنے مالک کا حق پہچانتے ہیں اور یہ انسان ہو کر اپنے خداوند کا حق نہیں پہچانتا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ گھوڑوں کا ذکر بطور مثال ہے۔ یہی وفاداری و جاں نثاری ان تمام گھوڑوں کے حیوانات میں پائی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کیے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے جگہ جگہ ان کا بھی ذکر کر کے انسان کی حسن شکر کو ابھارا ہے۔ خاص طور پر اونٹ کی صلاحیتوں اور خدمتوں کا ذکر تو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ اس کی جفاکشی اور اس کے صبر سے انسان کو سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے کہ جس طرح وہ اپنے آقا کی تابعداری کرتا ہے اسی طرح انسان کا فرض ہے کہ اپنے اس آقا کی تابعداری کرے جس نے اونٹ جیسے عظیم اور کثیر المنافع جانور کو اس کی تابعداری میں دے دیا ہے۔

گھوڑوں کے خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جنگ اور دفاع کے لیے خاص طور پر اس دور میں، بڑی اہمیت رکھتے تھے جب ہر خاندان اور قبیلہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خاندان قبیلہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے امیل جنگی گھوڑے رکھنے پڑتے تھے اور ان گھوڑوں کی ان کے ہاں بڑی عظمت و اہمیت تھی۔ یہ گھوڑے عربی شاعری کا خاص موضوع ہیں۔ یہاں اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے محض ان کے ذوق کا اندازہ کرنے کے لیے کسی حماسی کا ایک شعر نقل کرتا ہوں جو بالکل بروقت زبانِ قلم پر آگیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

وفی فرس نہد عتیق جعلتہ حجا بالبیٹی ثم اخذ متہ عبدا

(اور میں اپنا مال ایک جوان اور امیل گھوڑے کے لیے خرچ کرتا ہوں جس کو میں نے اپنے گھر کا پاسبان بنایا ہے اور پھر میں نے اس کی خدمت کے لیے ایک غلام رکھ

گھوڑا ہے)

انسان کے لیے گھوڑوں کی یہ قدر و قیمت، ظاہر ہے کہ ان کی خدمات اور جاں بازیوں کی بنا پر ہے جو وہ انسان کی انجام دیتے ہیں۔ اگر یہ خدمتیں وہ انجام نہ دیتے تو انسان نہ ان پر اپنا مال خرچ کرتا اور نہ اپنے قصبہ دلوں میں ان کی مدح سراہی کرتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اس حقیقت سے



ناواقف نہیں ہے کہ غلام کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی خدمات پر ہے لیکن خود اپنے معاملے میں وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ جس رب کا غلام ہے حکم تو اس کا ایک نہ ملنے لیکن انعام دنیا اور آخرت دونوں میں سب سے بڑھ کر پائے۔

انسان کی ناشکری کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ انسان نہ گھوڑوں ہی کا خالق ہے اور نہ ان چیزوں ہی کا خالق ہے جن پر ان کی پرورش کا انحصار ہے تاہم وہ نہایت بے جگری سے انسان کی خدمت محض اس وجہ سے کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بھی خالق ہے اور اس کے کام آنے والے تمام جانوروں اور معاش و معیشت کے جدا اسباب و وسائل کا بھی لیکن وہ خدا کی بندگی کے حقوق و فرائض سے بے پروا ہے۔

وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ (۷)

فرمایا کہ اس کے اس ناشکرے پن پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود اس انسان خود پر سب سے بڑا گواہ ہے۔ یہ فقرہ اسی طرح کا ہے جس طرح سورہ قیامہ میں فرمایا ہے: **يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْكَ كَثْرَتُ نَفْسِكَ وَلَا ذُرِّيَّتُكَ إِلَّا الْيَمِينُ** (۵۰-۴۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے گواہ ہے اور پر حجت ہے اگرچہ وہ کہتے ہی غدا مت تراشے)۔

جو باتیں انسان کی فطرت کے بدیہی مقتضیات میں سے ہیں وہ دلیل کی محتاج نہیں ہوتیں۔ ان کے حق میں سب سے بڑی گواہی خود انسان کی فطرت اور اس کے ضمیر کے اندر موجود ہوتی ہے۔ انسان اگر ان سے گریز اختیار کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملے بلکہ ان کو وہ اپنے نفس کی سفلی خواہشوں کے خلاف پاتا ہے اس وجہ سے ان سے گریز کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خود تو صرف انہی گھوڑوں کی قدر کرتا ہے جو اس کی کوئی قابلِ قدر خدمت انجام دیتے ہیں لیکن اپنے مالک اور رب کے متعلق یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے ہاں نیکو کار اور بدکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس نے ان کے ساتھ جو معاملہ اس دنیا میں کیا ہے اس سے بہتر معاملہ آخرت میں کرے گا، خواہ اس کے ایک حکم کی بھی وہ تعمیل نہ کرے بلکہ ساری زندگی اپنے نفس کی غلامی میں گزارے۔

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (۸)

یہ اس کے ناشکرے پن پر اس کے کردار سے دلیل پیش کی ہے کہ وہ مال کی محبت میں عرق کردار کی ہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو تو دیکھتا ہے کہ وہ جان کی بازی لگا کر اور نیزوں کے مقابل میں سینہ سپر گواہی ہو کر جو کچھ حاصل کرتے ہیں سب مالک کے حوالے کرتے ہیں، اپنے کسی حق کا مطالبہ نہیں کرتے



مالک جو کچھ ان کے آگے ڈال دیتا ہے اس پر تانغ رہتے ہیں لیکن اس کا حال یہ ہے کہ یہ جو کچھ اپنے رب کی بخشش و عنایات سے پاتا ہے اس کو اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے اور اس پر مار گنج بن کر بیٹھ رہتا ہے، اس میں مالک کا کوئی حق تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا اور اگر کوئی اس کے لیے اس کو یاد دہانی کرے تو اس کو جواب دیتا ہے کہ اس کے مال کو خدا سے کیا تعلق۔ یہ تو اس نے اپنی محنت و قابلیت سے حاصل کیا ہے۔ اِنَّمَا اُوْتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (الفصل - ۲۸: ۷۸) (یہ تو مجھے اس علم کی بدولت ملا ہے جو میرے اپنے پاس ہے)۔

لفظ خَيْرُ یہاں مال کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ عربی میں معروف ہے اور قرآن میں بھی یہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ محبت کی اصلی حق دار وہ ذات ہے جو انسان کی خالق و مالک ہے اور جس کے فضل سے انسان کو وہ سب کچھ ملتا ہے جو اس دنیا میں وہ پاتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے سچے اہل ایمان کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مرعد ایسا آتا ہے جس میں ان کے نفس اور ان کے رب کے مطالبات میں تصادم ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی محبت میں مضبوط ثابت ہوتے ہیں اور نفس کے مطالبے کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرہ ۱۶۵-۱۶۷) (اور جو اہل ایمان ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ سخت اللہ کی محبت میں ہوتے ہیں)۔ اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو ناشکرے اور ناشکرے ہوتے ہیں وہ اپنے رب سے زیادہ اپنے مال کے پرستار ہوتے ہیں۔

أَفَلَا يَعْلَمُونَ إِذَا بُعِثُوا فِي الْقُبُورِ ۖ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ (۹-۱۰)

یہ ناشکرے اور زر پرست انسانوں کو تنبیہ ہے کہ کیا وہ اس دن کو نہیں جانتے جب وہ سب کچھ جو قبروں میں ہے اگلا لیا جائے گا اور جو کچھ لوگوں کے سینوں میں ہے وہ نکلا لیا جائے گا۔ قبروں کے اندر سے مردوں کو نکلوانا تو بالکل واضح ہے لیکن یہاں یہ بات زر پرستوں کی تنبیہ کے سیاق میں فرمائی گئی ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے وہ دینے بھی مراد ہیں جو نجیل مال دار، خدا اور اس کے بندوں کے حقوق مار کر، زمینوں میں دفن کر چھوڑتے ہیں۔ 'بُعِثُوا' کے معنی ہیں کسی جمع کی ہوئی چیز کو جائزہ لینے کے لیے پراگندہ اور متفرق کر دینا۔ یعنی اس دن کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ ہر چیز سب کے سامنے آ جائے گی۔

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ یعنی دینوں کی طرح سینوں کے سارے راز بھی اکٹھے کر لیے جائیں گے تاکہ ہر شخص پر حجت قائم کی جاسکے کہ کس نے کون سا عمل کس محرک کے تحت کیا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ کوئی شخص کتنا ہی غلط کام کرے لیکن وہ اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے کوئی اچھا محرک تلاش کرنے کی ضرورت کو شش کرتا ہے تاکہ اپنے ضمیر کو بھی چپ کر سکے اور دوسروں کی

امان کے ریکارڈ

کے ساتھ محرکات

اعمال کا ریکارڈ

بھی خدا کے سامنے ہوگا



تنقید و تحقیر سے بھی اپنے کو بچا سکے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو اپنے کو مذہبی روپ میں پیش کرتے یا  
تبادلت کے مقام پر فائز ہوتے یا ہونے کے متمنی ہوتے ہیں وہ تو اس کے بغیر کوئی کام کر ہی نہیں  
سکتے۔ وہ اپنے باطن کو خلق کی نگاہوں سے چھپائے رکھنے کے لیے اس طرح کا کوئی لبادہ ضرور ایجاد  
کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے شاطروں کو اس آیت میں متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اس دن ان کے اعمال کے  
ریکارڈ کے ساتھ ساتھ ان کے محرکات کا سارا ریکارڈ بھی ان کے ادران کے رب کے سامنے ہوگا۔  
مسابقہ سورہ — الذلزال — کی آخری آیات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک  
نظر ڈال لیجیے تاکہ اس کے سارے پہلو واضح ہو جائیں۔

إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ (۱۱)

یہ بات اوپر والی تنبیہ ہی کو مؤکد کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اعمال اور  
ان کے محرکات سے اچھی طرح باخبر تو آج بھی ہے، لیکن آج ہر چیز کو آشکارا کرنا اس کی حکمت کے  
غلاف ہے البتہ وہ دن اسی لیے ہوگا کہ سارا ریکارڈ ہر شخص کے سامنے رکھ دیا جائے۔ چنانچہ جب  
وہ رکھ دیا جائے گا تو دوسرے بھی جان بیس گے کہ ان کا رب ان کے ظاہر و باطن دونوں سے کتنا  
آگاہ ہے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد لله علی فضلہ واحسانہ۔

لاہور۔

۷۔ اپریل ۱۹۸۰ء

۲۰۔ جمادی الاول ۱۴۰۱ھ







تدبر القرآن

١٠١

القارعة







بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

اس سورہ میں یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ جس قیامت سے ڈرایا جا رہا ہے اس وقت اگرچہ کسی کو نہیں معلوم لیکن اس کا آنا یقینی ہے جس طرح کوئی اچانک آکر دروازے پر دستک دیتا ہے اسی طرح وہ اچانک آدھکے گی۔ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔ اس دن کسی کے پاس کوئی قوت و جمعیت نہیں ہوگی۔ لوگ قبروں سے اس طرح پراگندہ نکلیں گے جس طرح برسات میں پتنگے نکلتے ہیں۔ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ کوئی بھی کسی دوسرے کی مدد کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہوگا۔ اس دن قلعے، مورچے، حصار تو درکنار پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ دھنکی ہوئی آؤں کی مانند ہو جائیں گے۔ اس دن مرنے والے ہی کام آنے والے بنے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی میزانِ عدل قائم کرے گا۔ جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ جنت کے عیشِ جاوداں میں ہوگا اور جس کی بدیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ دوزخ کے کھڈ میں بھرکتی آگ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔







# سُورَةُ الْقَارِعَةِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۱۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آیات  
۱-۱۱

الْقَارِعَةُ ① مَا الْقَارِعَةُ ② وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ③  
يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ④ وَتَكُونُ الْجِبَالُ  
كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ⑤ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ⑥ فَهُوَ فِي  
عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ⑦ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ⑧ فَأَمُّهُ  
هَارِيَةٌ ⑨ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ ⑩ نَارُ حَامِيَةٍ ⑪

ع  
۱۱  
۲۶

کھٹکھٹانے والی!

ترجمہ آیات  
۱-۱۱

کیا ہے کھٹکھٹانے والی!

اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی! ۱-۳

اس دن لوگ منتشر تینگوں کے مانند ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اودن کے

مانند ہو جائیں گے۔ ۲-۵

تو جس کے پتے بھاری ہوں گے وہ تو دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور جن کے پتے

ہلکے ہوئے تو اس کا ٹھکانا کھٹکھٹ ہوگا۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ کیا ہے! دیکھتی آگ! ۶-۱۱



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

‘الْقَارِعَةُ’ (۱)

یہ قیامت کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے معنی ہیں ٹھونکنے والی، کھٹکھٹانے والی۔ ‘قَرَعَ الْبَابَ’ کے معنی ہیں اس نے دروازہ کو ٹھونکا یا کھٹکھٹایا؛ اس نام سے قیامت کے اس خاص پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس طرح کوئی رات میں آنے والا دروازے کو ٹھونکتا اور گھر کے تمام سونے والوں کو دفعہ ہڑبڑا دیتا ہے، وہی حال قیامت کا بھی ہوگا۔ اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم کہ کب آدھکے۔ اس کا ظہور اچانک ہوگا اور وہ بالکل دفعہ سارے عالم میں ایک ہی لمحہ برپا کر دے گی۔ اس کے اسی نام کے اندر یہ نتیجہ بھی مضمر ہے کہ جب یہ اس کائنات کی سب سے بڑی ہلچل ہے اور اس کا وقت کسی کو نہیں معلوم ہے تو سلامتی اسی میں ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔

یہ اسلوب بیان جو یہاں اختیار فرمایا گیا ہے ایک الارم کی نوعیت کا ہے تاکہ تمام کان رکھنے والے اس مبتدا کی خبر سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ گویا قیامت جس نوعیت کی ہڑبڑاہٹ اس دنیا میں پیدا کرے گی اسی نوعیت کی ہڑبڑاہٹ یہاں اس کا نام پیدا کر رہا ہے۔ سورہ حاقہ میں بھی یہی اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے اور اس کی بقدر ضرورت وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

مَا الْقَارِعَةُ (۲)

اس سوال نے اس الارم کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا کہ جو لوگ اس کو کوئی معمولی بات سمجھ کر اس سے بے پروا ہیں وہ چوکنے ہوں اور کان کھول کر اس کا حال سن لیں اور اس کے لیے جس تیاری کی ضرورت ہے اس کی فکر کریں۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ (۳)

اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس میں سوال کے ساتھ ساتھ مخاطب کی غفلت، بے پرواہی اور ناواقفیت، مبنی پرانوسوس اور حسرت کا اظہار بھی ہے کہ تم کیا جانو یا کیا سمجھو کہ وہ اچانک



ٹوٹ پڑنے والی آفت کیا ہے اور ان لوگوں پر کیا گزرے گی جو بار بار کی تنبیہ و تذکر کے باوجود اس کا مذاق اڑاتے بارہے ہیں۔

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (۴)

اس دن جس صورت حال سے سابقہ پیش آئے گا یہ اس کا بیان ہے کہ اس دن لوگ پراگندہ اس دن  
پتنگوں کے مانند ہوں گے۔ نہ کسی کے ساتھ اس دن اس کا خاندان و قبیلہ ہوگا، نہ کسی کی کوئی جماعت کوئی کسی کا  
جمعیت ہوگی اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہوں گے جن کے اعتماد پر لوگ نچتے ہیں۔ بلکہ لوگ ساتھ نہیں  
قبروں سے متفرق نکلیں گے اور ہر ایک کو سابقہ صرف اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ سورہ زلزال دے گا  
میں فرمایا ہے:

يَوْمَ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا  
لِّيُرَوَّاْ أَعْمَالَهُمْ  
(الزلزال - ۹۹: ۶)

اس دن لوگ قبروں سے متفرد ہو کر  
نکلیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال  
دکھائے جائیں۔

سورہ مومنوں میں فرمایا ہے:

فَاِذَا انْفُخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ  
بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُوْنَ  
فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ  
فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ  
مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ  
فَاُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُواْ أَنْفُسَهُمْ فِيْ  
جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ

پس جب صور بھونکا جائے گا تو ان کے  
آپس کے کسی رشتے اس دن ختم ہو جائیں گے  
اور وہ ایک دوسرے سے مدد کے طالب نہ  
ہو سکیں گے۔ پس جن کے نیکیوں کے پلے  
بھاری ہوں گے وہی نلاج پانے والے نہیں گے  
اور جن کے پلے ہلکے ہوں گے تو وہی لوگ  
ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے

(المومنون - ۲۲: ۱۰۱ - ۱۰۳)

میں ڈالا، وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑے۔

اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کی تصویر سورہ معارج میں یوں کھینچی

گئی ہے:

وَلَا يَسْأَلُ حَبِيْبٌ حَبِيْبًا  
يَوْمَئِذٍ وَلَهُمْ يَوْمَئِذٍ الْمُجْرِمُونَ  
يَقْتَدِي مِنْ عَذَابٍ يَوْمَئِذٍ  
بَيْنِيْهِ وَصَاحِبَتِيْهِ وَآخِيْهِ  
فَصِیْلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيْهِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ

اور اس دن کوئی دوست اپنے دوست کو  
نہ پوچھے گا باوجودیکہ وہ ان کو دکھائے  
جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ کاش! وہ  
اپنے بیٹوں، اپنی بیوی اور اپنے بھائی  
اور اس خاندان کو، جو اس کو پناہ دیتا



جَمِيعًا لَا تُمْنِحِيهِ ۝ ہے، فدیہ میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے کو چھڑالے جائے۔ (المعارج - ۱۰: ۱۴)

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ (۵)

اس دن سارے استحكامات، ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ یعنی جس طرح دھنکی ہوئی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے اسی طرح پہاڑوں کا ذرہ ذرہ بھی پراگندہ ہو جائے گا۔

پہاڑوں کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے ہوا کہ قیامت کے منکرین پہاڑوں کو غیر فانی خیالی کر کے بطور استہزاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تھے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو وہ پہاڑوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی؟ ان کے اس سوال کا حوالہ اور اس کا جواب قرآن مجید میں مذکور ہے۔

رُحُفٌ اس دن کو کہتے ہیں جو دھنک کر اور رنگ کر کاٹنے کے لیے تیار کی جا چکی ہو۔ اس طرح کی اون کا ریشہ ریشہ الگ ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں اس کی تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ تشبیہ میں اصل مقصود اون کی پراگندگی کو نمایاں کرنا ہے نہ کہ اس کے رنگ کو۔

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ لَا فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ (۶-۷)

اس دن واحد کام آنے والی چیز آدمی کے نیک اعمال ہوں گے۔ ہر شخص کے اعمال تو لے جائیں گے۔ جس کی میزان بھاری ہوگی وہ تو فلاح پائے گا اور جس کی میزان ہلکی رہ جائے گی وہ نامراد ہوگا۔ اس دن جو میزان نصب ہوگی وہ خاص میزان ہوگی جو لوگوں کے اعمال ہی کے تولنے کے لیے نصب کی جائے گی۔ سورہ انبیاء میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

وَنُفِخَ السُّورُ الْيُسْطُ اور ہم قیامت کے دن کے لیے خاص میزان عدل یَوْمَ الْقِيَمَةِ (الانبیاء - ۲۱: ۲۷) مقرر کریں گے۔

اس دن اور اس میزان کا خاص وصف سورہ اعراف میں یہ بیان ہوا ہے کہ اس دن وزن صرف حق کے اندر ہوگا، باطل کے اندر سرے سے کوئی وزن ہی نہیں ہوگا۔ یہ میزان ہر شخص کے عمل کو تول کر بتا دے گی کہ کس کا عمل حق اور وزن دار ہے اور کس کے اعمال بالکل باطل اور پھوک ہیں۔ فرمایا ہے:

وَالْوِزْنُ يُوْصَلُ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ

اس دن وزن صرف حق کا ہوگا تو جن کے پلے بھاری ہوئے وہ تو فلاح پلنے والے ہوں گے۔



وَمَنْ حَقَّتْ مِرَازُهُ ۝ اور جن کے پڑے ہلکے رہے وہی ہیں جنہوں  
فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ ۝ نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا جو اس کے  
بِمَا كَانُوا بِآلِهَتِنَا يُطْلَبُونَ ۝ کہ وہ ہماری آیات کی ناندری کر کے اپنی جانوں

(الاعراف - ۷ : ۸ - ۹) پر ظلم ڈھاتے رہے۔

’فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ‘ یہاں ’مَنْ‘ کے لحاظ سے ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن اس سے مراد جیسا کہ  
اوپر سورۃ اعراف کی آیات میں شہادت موجود ہے، جمع بھی لے سکتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ پسندیدہ  
عیش میں ہوں گے۔ یعنی جو کچھ یہ چاہیں گے وہ بھی انہیں ملے گا اور ان کا رب ان کو وہ کچھ بھی دے گا  
جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے ہوں گے۔

وَأَمَّا مَنْ حَقَّتْ مِرَازُهُ ۝ فَأُمُّهُ هَارِيَةٌ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا مِيعَةٌ ۝  
نَادُّ حَامِيَةً (۸ - ۱۱)

یہ ان لوگوں کا حشر بیان ہو رہا ہے جن کے پاس صرف باطل ہی باطل ہوگا۔ حق ان کے پاس  
ہو بھی گا نہیں یا ہوگا تو ان کے عقیدے اور ان کی نیت نے اس کو بھی بالکل بے وزن کر دیا ہوگا۔  
فرمایا کہ ان کا ٹھکانا کھٹ ہوگا۔ اس کھٹ کی وضاحت آگے فرمادی کہ ’نَادُّ حَامِيَةً‘ وہ دوزخ کا کھٹ  
ہوگا جس میں آگ بھڑک رہی ہوگی۔

’نَادُّ حَامِيَةً‘ کے معنی ماں کے ہیں لیکن یہاں یہ ملجا اور ٹھکانے کے معنی میں ہے اور نہایت بلاغت  
کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

’مَا مِيعَةٌ‘ میں ’ہا‘ سکتہ کی ہے جو تانیہ کی رعایت سے آئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے اس  
کتاب میں گزر چکی ہیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیرًا۔

لاہور

۱۰ - اپریل ۱۹۸۰ء

۲۳ جمادی الاول ۱۴۰۲ھ







تذکرہ قرآن

۱۰۲

الشکاک







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

یہ سورہ سابق سورہ ————— القارعة ————— کی مثنیٰ ہے۔ دونوں کے مضمون میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں بتایا ہے کہ آخرت میں کام آنے والی چیز وہ نیکیاں ہیں جو اس دنیا میں کرنی جائیں۔ خدا کی میزان میں انہی کے اندر وزن ہوگا۔ جس نے ان کا ذخیرہ جمع کر لیا وہ فلاح پائے گا اور جو ان سے محروم رہا اس نے، خواہ کتنا ہی خزانہ اکٹھا کر لیا ہو، اس کی میزان بالکل بے وزن رہے گی۔ حسرت داندہ کے سوا اس کے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔ اب اس سورہ میں ان لوگوں کو متنبہ فرمایا ہے جنہوں نے ساری عمر اس جدوجہد میں کھپا دی کہ مال و دولت کے اعتبار سے وہ دوسروں سے آگے نکل جائیں، ان کا بنک بیلنس سب سے زیادہ ہو جائے، کاروباری میدان میں کوئی ان کا حریف نہ رہے۔ معیار زندگی کی مسابقت میں وہ سب کچھ چھوڑ جائیں۔ بس اسی تک وہ وہیں ان کی ساری زندگی ختم ہوگئی اور اس امر پر غور کرنے کی انہیں کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ آگے ایک یقینی مرحلہ حساب کتاب اور جزا و سزا کا بھی آنے والا ہے جس سے بے پرواہ کر زندگی گزارنے والوں کو جہنم سے سابقہ پیش آئے گا اور اس دن ہر ایک سے یہ پرسش بھی ہونی ہے کہ اس نے دنیا میں جو کچھ حاصل کیا کس راہ سے حاصل کیا اور اس کو کس راہ میں صرف کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں اور صلاحیتیں اور جو نعمتیں اس کو بخشیں ان کا کتنا حصہ اس نے بخشے والے کی خوشنودی کے لیے استعمال کیا اور کتنا اپنے نفس اور شیطان کی خوشنودی کے لیے۔







# سُورَةُ التَّكَاثُرِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات: ۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 الْهَٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوْفَ  
 تَعْلَمُونَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ  
 عِلْمَ الْيَقِينِ ۝۵ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ  
 الْيَقِينِ ۝۷ ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝۸

تم کو طلب مال کی مسابقت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ قبروں میں  
 جا پہنچے۔ ہرگز نہیں، تم آگے جانو گے! ہاں، ہرگز نہیں، تم آگے جان لو گے! ا-۴  
 ہرگز نہیں، اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ دوزخ سے ضرور دو چار ہو گے، پھر تم  
 اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے اس دن نعمتوں کے باب میں پرسش  
 ہونی ہے تو..... ۵-۸



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلْهَمَكُمُ التَّكَاثُرَ (۱)

رُالْهَمَاءُ کے معنی غافل اور مبتلا شے فریب رکھنے کے ہیں۔

تَکَاثُرُ کے معنی ہیں مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جگہ دو۔

عرب جاہلیت میں حفاظت و ممانعت کی ذمہ داری چونکہ خاندان اور قبیلہ ہی پر ہوتی تھی اس وجہ

سے قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی خاندان کو حاصل ہوتا جس کے افراد زیادہ ہوں۔ اس چیز نے قدرتی

طور پر ان کے ہاں مال کے تکاثر کے ساتھ ساتھ اولاد کے تکاثر کے جذبہ کو بھی بہت قوی کر دیا تھا۔

چنانچہ ان کے لٹریچر پر جن کی نظر سے وہ جانتے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے مال کی کثرت پر فخر کرتے اسی

طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اولاد کی کثرت پر بھی فخر کرتے۔ اب موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کے

بدلے ہوئے نظام اور خاص طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے تصور نے اولاد کی کثرت کے رجحان کو دبا کر

اس کی جگہ معیار زندگی کے رجحان کو غالب کر دیا ہے۔ اس دور کی عام بیماری یہی ہے۔ مشکل ہی سے

اس زمانے میں کوئی شخص اس دبا کے اثر سے محفوظ ملے گا۔ ہر شخص رات دن معیار زندگی اونچا کرنے

کی دھن میں ہے اور چونکہ اس کی کوئی حد معین نہیں ہے اس وجہ سے جو اس میدان میں گامزن ہیں ان

کو اپنا ہر قدم پہلا قدم معلوم ہوتا ہے، آخری منزل ڈگا ہوں سے ادھیل ہے، کسی کو معلوم نہیں

کہ وہ کہاں ہے، کب آٹے لگی اور کبھی آٹے لگی بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ معیار زندگی کی بلندی کا سارا

انحصار مال پر ہے تو جب معیار کی کوئی حد معین نہیں ہے تو مال کی حرص میں بھی کسی کمی کا امکان نہیں ہے۔

چنانچہ جس رفتار سے زندگی کا معیار اونچا ہو رہا ہے اس سے زیادہ شدت کے ساتھ مال کی ترس بڑھتی

جا رہی ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن نے 'تکاثر' سے تعبیر کیا ہے اور اس کا اثر یہ بتایا ہے کہ اس نے

ہر شخص کو اس طرح اپنے دامن فریب میں گرفتار کر لیا ہے کہ اسی میں عمر بیت جاتی ہے اور کسی کو اس

سوال پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں اور ہے تو اس

کے لیے بھی کچھ کرنا ہے یا نہیں۔

حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَعَابِرَ (۲)

یعنی اسی تک دو دوسری زندگی گزرتی ہے یہاں تک کہ عمر تمام ہو جاتی ہے اور قبروں میں جا پہنچتے

ہو۔ لفظ 'زُرْتُمُ' عربی میں بالکل سادہ معنوں میں آتا ہے۔ اردو کے لفظ 'ذیارت' کی طرح اس کے اندر



کسی شرف و تقدس کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ "ذُرْتُمْ الْمَقَابِرَ" کے معنی بس یہ ہوں گے کہ تم نے قبروں کو دیکھا  
یعنی ان کے حوالے ہوئے۔ کسی حماسی کا شعر ہے:

اذا زدت ارضا بعد طول اجتنابها فقدت مدایعی والبلاد كما هيا

رجب میں کسی سرزمین کو، عرصہ تک اس سے جدا رہنے کے بعد، دیکھتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ

اجباب تر میں نے سارے کھود دیے لیکن زمین اسی طرح ہے جس طرح تھی

اگرچہ عربوں میں یہ روایت بھی رہی ہے کہ اپنے قبیلہ کے ناموروں اور مقتولوں کی قبروں کا شہدائے گشتگان  
رکھتے اور مغائرت کی مجلسوں میں ان کا ذکر بھی کرتے لیکن یہ چیز یہاں مراد نہیں ہے اور یہ کوئی ایسی بات بھی دنیا کی حالت  
نہیں ہے کہ اس کا یوں ذکر آئے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلوب "حَتَّىٰ ذُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" کا پرابہ راز  
کیوں اختیار کیا گیا۔ بیدھے لفظوں میں یوں کیوں نہیں کہا گیا کہ "یہاں تک کہ تمہاری موت آگئی، یا یہاں  
تک کہ تم نے جان، جانِ آفرین کے حوالہ کی۔ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اول تو قافیہ کی رعایت  
یہ اسلوب اختیار کرنے کی مقتضی ہوئی دوسرے اس سے گشتگان دنیا کی محرومی و بے نصیبی پر اظہار  
افسوس کا مضمون آیت میں پیدا ہو گیا۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اسی نکاح کی بھاگ دوڑ میں لگے رہے یہاں تک  
کہ قبروں سے دو چار ہوئے یا قبرستانوں میں جا برائے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ (۳-۴)

یہ ان غفلت کے ماتوں کو تنبیہ اور نہایت زوردار و مؤثر تنبیہ ہے کہ سب کچھ سمجھا دینے کے بعد  
بھی اگر تم آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں ہو تو سن رکھو کہ زندگی یہی نہیں ہے جو تمہیں نظر آ رہی ہے اور  
جس کے عشق نے تمہیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ اس کا اصل چہرہ تمہاری نظروں سے اوجھل  
ہے جس کو تم جلد دیکھو گے اور پھر سن لو کہ اس کو تم غمگین دیکھو گے!!

یہ تاکید و تاکید انداز کو مؤثر بنانے کے لیے بھی ہے اور اس حقیقت کے اظہار کے لیے بھی کہ جس قوم  
کو اللہ کا رسول انداز کرتا ہے وہ اس کی تکذیب کے نتیجہ میں اس دنیا میں بھی گرفتار عذاب ہوتی ہے  
اور آخرت میں بھی اس کے آگے وہ سب کچھ آئے گا جس سے رسول نے آگاہ کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم  
نے اپنی روش نہ بدلی تو اس دنیا میں بھی دیکھو گے اور آخرت میں بھی دیکھو گے اور اس میں زیادہ دیر  
نہیں ہے۔ تمہارے لیے عدالت قائم ہو چکی ہے اور فیصلہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ لفظ "تَعْلَمُونَ" کے  
ابہام کے اندر جو وعید مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

كَلَّا تَوَعَّلَمُونَ عِلْمًا يَلْقَيْنَ ۚ تَسْتَوْنَ الْجَحِيمَ ۚ ثُمَّ تَسْتَوْنَ فِيهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۚ

ثُمَّ تَسْتَوْنَ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۵-۸)

یہ ان غافلوں کی اس غفلت کے اصل سبب سے پردہ اٹھا یا ہے کہ تمہاری یہ حالت اس وجہ غفلت کا  
موجب



سے ہے کہ تم کو یہ یقین نہیں آ رہا ہے کہ فی الواقع ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس دن جہنم کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے، پھر تم سے ان تمام نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے جو تمہارے رب نے تم کو بخشیں لیکن تم نے ان کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا۔ اگر ان باتوں کا یقین ہوتا تو تم اپنی زندگیاں اس طرح دنیا کے پیچھے نہ گزارتے بلکہ لمحہ لمحہ اس آنے والے دن کی تیاریوں میں مصروف کرتے۔

کلام کی تالیف پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں 'کو' کا جواب مخدوف ہے۔ جواب کو مخدوف تو سب مانتے ہیں لیکن 'لَتَعْلَمُونَ الْجَحِيمَ' اور بعد کی آیات کو 'کو' کے تحت نہیں مانتے، لیکن میرے نزدیک یہ تینوں آیتیں 'کو' کے تحت ہی ہیں۔ یعنی اگر تم یہ باتیں یقین کے ساتھ جانتے ہو تو اپنے آپ کو اس طرح نہ کھو بیٹھتے۔

کلام کی

تالیف

'لَتَعْلَمُونَ الْجَحِيمَ' سے کلام کا پھر آغاز نہیں ہو رہا ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے خیال کیا ہے، بلکہ یہ 'کو' 'تَعْلَمُونَ' 'عِلْمًا یَقِیْنًا' کے مفعول کے محل میں ہے یعنی اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ جہنم کو لازماً دیکھو گے 'لَتَعْلَمُونَ الْجَحِيمَ' پر 'لی' اس یقین کی تعبیر کے لیے ہے جس کا ہونا مطلوب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ علم یقین جو ان باتوں کو ماننے کے لیے مطلوب ہے اس کے وسائل اللہ تعالیٰ نے آفاق و انفس کے شواہد اور قرآن کی آیات بتیات میں رکھ دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہر عاقل مکلف ہے کہ ان کو سمجھے اور مانے۔ جو ان سے گریز کرتا ہے، خواہ سمجھنے سے گریز کرتا ہے یا اس کے قبول کرنے سے وہ اپنی بدبختی کا ذمہ دار خود ہے۔ عند اللہ وہ اپنے اس گریز کی سزا بھگتے گا۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ ایک عاقل کو اس دنیا میں غیب کے حقائق کا علم یقین تو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ علم یقین دلائل سے حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس اور قرآن میں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن عین الیقین کا درجہ اس کو آخرت ہی میں حاصل ہوگا اس لیے کہ اس کا تعلق معائنہ و مشاہدہ سے ہے۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ چیز اس دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے ان کا دعویٰ ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے۔ اس دنیا میں عین الیقین نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس بات کا علم یقین حاصل ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ ہمیں بتا رہا ہے وہ ایک دن ہم آنکھوں سے بھی دیکھیں گے عین الیقین اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

اس دنیا میں

صرف علم یقین

حاصل ہوتا ہے

'ثُمَّ لَنَسْأَلَنَّهُ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ' یہ بات بھی 'لَتَعْلَمُونَ عِلْمًا یَقِیْنًا' کے تحت ہی ہے یعنی اگر تمہیں اس بات کا علم ہوتا کہ اس دن تم سے تمام نعمتوں کی پرسش ہونی ہے۔ پرسش سے مراد، ظاہر ہے کہ، وہ سرا ہے جو ان کی ناشکری، ناقدری اور ان کے سوء استعمال کے نتیجہ میں بھگتنی پڑے گی۔

نعمتوں کا

حق

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متنی تو تمیں و صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور جو وسائل و ذرائع بھی بخشے



ہیں وہ سب 'نعیم' میں داخل ہیں۔ ان کا فطری حق یہ ہے کہ ان کے لیے خدا کا شکر گزار رہا جائے اور ان کو اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر ان کاموں میں استعمال کیا جائے جن کے لیے وہ عطا ہوئے ہیں۔ کوئی نعمت اگر ضائع کی گئی یا وہ خالق کی پسند کے خلاف استعمال ہوئی تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سزا دے۔ انسان کے کان، آنکھ، دل، دماغ اور تمام اعضا و جوارح نعمت ہیں، اسی طرح اس کو جو ظاہری و باطنی قوتیں اور صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بھی نعمت ہیں، علیٰ ہذا القیاس اس دنیا میں زندگی کے جو اسباب و وسائل اس کو عطا ہوئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت ہیں۔ ان کا فطری حق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی ہے کہ انسان ان کو برتے اور اپنے رب کا شکر گزار رہے۔ اس ناشکر گزاری کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ ان کے برتنے میں نہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرے اور نہ ان میں سے کسی کے عشق میں اس طرح مبتلا ہو جائے کہ اسی کو معبود بنا بیٹھے اور خدا کو بھول جائے۔ جو لوگ اس طرح کے کسی تجاوز میں مبتلا ہوں گے وہ قیامت کے دن لازماً اس کی سزا بھگتیں گے۔

اس سورہ میں چونکہ تکاثر اموال کے فتنہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے اس وجہ سے وہ یہاں خاص طور پر پیش نظر ہے۔ ہر صاحب مال سے یہ سوال ہو گا کہ اس نے اپنا مال کن راستوں سے حاصل کیا اور کن کاموں میں صرف کیا۔ جنہوں نے نہ اس کے حاصل کرنے میں حرام و حلال کی پروا کی اور نہ اس کے صرف کرنے میں اصل مالک کی مرضی پیش نظر رکھی بلکہ مال ہی کو انھوں نے معبود بنا لیا اور اسی کے حاصل کرنے میں ساری زندگی کھپا دی ان کو اس انجام سے سابقہ پیش آئے گا جو سورہ ہمزہ میں بیان ہوا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۚ إِنَّ الْإِنْسَانَ	ہلاک ہے ہر اُمسازہ باز، عیب جو کے لیے
جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۚ يَحْسَبُ أَنَّ	جس نے مال سمیٹا اور اس کو گن گن کر رکھا۔
مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ	یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس کے مال نے اس
فِي الْحُطَمَةِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۚ	کو زندہ جاوید کر دیا۔ ہر گز نہیں وہ چور چور
نَارُ اللَّهِ الَّتِي تَطْلُعُ	کر دینے والی میں پھینکا جائے گا۔ اور کیا
عَلَى الْأُفُودَةِ ۚ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ	سمجھے کہ چور چور کر دینے والی کیا ہے! خدا
مُؤَصَّدَةٌ ۚ فِي غَمَدٍ مُّثَدَّدَةٍ ۚ	کی بھڑکتی آگ جو دلوں پر چڑھ جائے گی۔ وہ
(الهمزة - ۱۰۴ - ۹۰۱)	اس میں بند ہوں گے لمبے ستونوں میں جکڑے۔

آخر میں نو کا جواب جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مخدوف ہے۔ شرط کا جواب ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اظہار کے بغیر واضح ہو۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ اس



حذف سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ساری بات محذوف مافی جاسکتی ہے جس کے لیے موقع کلام مقتضی ہو۔ اس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ مخاطب کو گویا یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ خود ٹھنڈے دل سے اپنے رویہ کا جائزہ لے اور فیصلہ کرے کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں (اور ان کے صحیح ہونے سے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے) تو اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور اس نے اب تک جو زندگی گزاری ہے وہ کتنی غلط، حقائق سے کتنی بعید اور انجام کے اعتبار سے کتنی ناعاقبت اندیشاں اور لاابالیا نہ زندگی گزاری ہے۔ یہاں اس حذف سے یہ سارا مضمون پیدا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر تم ان بدیہی حقائق پر سنجیدگی سے غور کرتے تو اپنی قیمتی زندگی یوں برباد نہ کرتے۔ اب بھی اگر بھلائی چاہتے ہو تو عقل سے کام لو اور جس زندگی کے بدلے ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہو اس کو اس دنیا سے فانی کے حقیر خرف ریزوں کو جمع کرنے میں برباد نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیراً۔

لاہور

۱۶ - اپریل ۱۹۸۰ء

۲۹ - جمادی الاول ۱۴۰۱ھ



تدبر القرآن

١٠٣

العصر







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا مضمون، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

سابق سورہ ————— التکاثر ————— میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی ہے جو ساری عمر اسی دنیا کے مال و متاع جمع کرنے کی فکر میں گنوا بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ موت کی گھڑی آ جاتی ہے اور انھیں یہ سوچنے کی فرصت کبھی نہیں ملتی کہ یہ عمر عزیز اللہ تعالیٰ نے انھیں کس مقصد بلند کی خاطر عطا فرمائی اور وہ اس کو کس بڑا لہو سی دبے حاصلی میں برباد کر بیٹھے۔ اگر وہ جانتے کہ ایک دن تمام نعمتوں کی طرح زندگی کی عظیم نعمت سے متعلق بھی ان سے سوال ہو گا کہ اس کو انھوں نے کس کام میں صرف کیا تو وہ ہرگز یہ حماقت نہ کرتے کہ جس چیز سے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے تھے اس کو دنیا کے خرف ریز جمع کرنے اور اپنے لیے ابدی لعنت کا سامان کرنے پر قربان کر دیتے۔ اب اس سورہ میں بتایا ہے کہ زندگی کی اصل قدر قیمت کیا ہے؛ کیا چیز اس کو ابدی فلاح کی ضامن بناتی ہے اور کیا چیز اس کو دائمی خسران میں تبدیل کر دیتی ہے؛ کس طرح انسان اس کو اپنے لیے رحمت بنا سکتا ہے اور کس طرح یہ آپ سے آپ اس کے لیے نعمت اور عذاب بن جاتی ہے اگر وہ اس کو رحمت بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس میں زمانہ کی قسم بطور شہادت کھائی گئی ہے کہ انسان غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ اس دنیا میں اصل سرمایہ جو اسے حاصل ہے بس وہ تھوڑا سا وقت ہے جو مہلت حیات کی حیثیت سے اس کے حصہ میں آیا ہے۔ اس کو صحیح استعمال کر کے وہ زندگی بچھنے والے کا پسندیدہ بندہ بھی بن سکتا اور رَا حِیَۃً مَّوْجِبَۃً کا مقام بھی حاصل کر سکتا ہے اور اسی کو غلط کاموں میں ضائع کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بھی بنا سکتا ہے۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ ایک شمشیرِ دوم ہے اس کو انسان نے اگر اپنے حق میں استعمال نہ کیا تو یہ آپ سے آپ اس کے ابدی دشمن ————— شیطان ————— کے حق میں استعمال ہو گا۔ اس کا بہت تھوڑا سا حصہ یعنی صرف حاضر ہے جو اس کے اختیار میں ہے جس میں وہ کوئی تصرف کر سکتا ہے، باقی یا تو ماضی بن چکا جو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں مل سکتا یا مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہتا ہے اور ہے بھی یا نہیں اور ہے تو وہ اپنے ساتھ کیا احوال و مسائل اور کیا تقاضے رکھتا



رکھتا ہے۔ جو وقت آتا ہے وہ اپنے مطالبے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان حاضر کے فرض کو مستقبل پر مثال سکے۔

اس اہم حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے بعد وہ صحیح طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کرنے والے اپنی مہلت حیات سے صحیح فائدہ اٹھاتے اور اس حیات چند روزہ کے بدلے حیات جاوداں پاتے ہیں۔ اگرچہ یہ طریقہ صرف چند لفظوں میں بتایا گیا ہے لیکن ایسے جامع اور حکیمانہ اسلوب میں بتایا گیا ہے کہ انسان تدبر کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں سے متعلق اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں جو اسے ادا کرنے ہیں اور جن کے ادا کرنے ہی پر اس کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کا بھی اصل مقصد اسی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا اور انسان کی شخصی و اجتماعی زندگی کو آخرت کے نصب العین کے تحت منظم کرنا ہے۔ گویا جو بات قرآن کی ایک سوچودہ سورتوں میں سمجھائی گئی ہے وہ اس سورہ کی تین آیتوں میں سمودی گئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ اگر لوگ تنہا اسی سورہ۔ العصر۔ پر غور کریں تو ان کے لیے کفایت کرے۔“



# سُورَةُ الْعَصْرِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
وَالْعَصْرِ ۱ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۲ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا ۳  
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۴ وَتَوَّصَّوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَّصَّوْا بِالصَّبْرِ ۶

زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے بجز ان کے جو ایمان لائے اور  
انہوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے  
کو صبر کی نصیحت کی۔ ۱-۳



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْعَصْرِ (۱)

لفظ عصر کی تحقیق کے لیے ہے اور عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ استاد امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کی جو تحقیق اپنی تفسیر سورہ عصر میں بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ ہم اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ جس طرح لفظ دُھڑگیں زمانہ کی مجموعیت کا اعتبار ہے اسی طرح لفظ عصر میں اس کے گزرنے اور اس کی تیز روی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ اس کا غالب استعمال گزرے ہوئے زمانہ ہی پر ہوتا ہے۔ امرؤ القیس کا مصرعہ ہے:

وَهَلْ يَنْعَمُ مَنْ كَانَ فِي الْعَصْرِ الْخَالِي

(اور اب ان کے لیے کیا مبارکی ہے جو گزرے ہوئے زمانوں میں ہوئے)

علیہ بن ابی مرثد نے کہا ہے:

فَذَاكَ عَصْرٌ قَدِ ارَادَنِي يَحْمِلُنِي بِأَذَلِّ شَبُوبٍ

(وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے کو دیکھتا کہ ایک جوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار ہوں) کلام عرب کی روشنی میں لفظ کی تحقیق بیان کرنے کے بعد مولانا خلاصہ بحث پیش کرتے ہیں:

”اس سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر ایک طرف زمانہ گزشتہ کے احوال و واقعات یا دلائل کا ہے دوسری طرف اس کی مخصوص صفت تیز روی اور برق رفتاری کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کی طرف اشارہ سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے ان کے اعمال کے اعتبار سے نازل ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی سے نائدہ اٹھالینا چاہیے۔“

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ زمانہ کی قسم یہاں کیوں کھائی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں قانون مجازات کے ظہور کے پیش آئے اور جو قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف لوگوں کو اس سے بھنبھوڑا ہے کہ لوگ اپنی زندگیاں غفلت میں نہ گزاریں بلکہ پوری



مستعدی سے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ انہی تیز رو لمحات کے بدلے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہیں اگر انھوں نے ان کی صحیح تدریج پائی اور اگر ان کی قدر نہ پہچانی تو بابر رکھیں کہ یہ ان کے لیے ابدی لعنت بن جائیں گے۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کی وضاحت اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

”پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نازل ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے۔ انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج بخشا اور اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الہی نے، اتمامِ حجت کے بقدر مہلت دینے کے بعد ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی حقیقت کی یاد دہانی کے لیے یہاں زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اس قانونِ مکافات سے لازماً انھیں بھی دوچار ہونا ہے۔“

”علاوہ ازیں اس قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمون ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ پھر یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا اور زندگی کی بے ثباتی، قیامت کی باز پرس اور جزائے عمل کے قانون سے غافل رہتا ہے۔“

اس حقیقت کو مولانا مثال سے یوں سمجھاتے ہیں:

”اس معاملے میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے، لیکن بجائے اس کے کہ جلد سے جلد اس کو بیچ کر اپنے دام کھرے کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔“

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف مولانا ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں:

”علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویتِ مبرک بھی ہے۔ وہ

اس طرح کہ اس تھوڑی سی مدت میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لافزداں خزانہ

جمع کر سکتا ہے۔ ایک بد محنت انسان اس حیاتِ فانی کی چند روزہ لذتوں پر ریچھ کر

اپنے کو ابدی مسرت و کامیابی سے محروم کر لیتا ہے لیکن ایک عاقل اسی فانی زندگی کے

چند روزوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب اور برقِ خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ

اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں چھیڑ کر..... خدا کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی

تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔“



إِنَّ الْإِنْسَانَ لِفَتَىٰ خُسْرٍ ۖ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالنَّحَقِ ۖ  
وَتَوَّصُوا بِالْقَبْرِ (۲-۳)

اصل بات

یہ وہ اصل بات ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ جب ایک طرف مہلتِ حیات کی اہمیت اور قدر و قیمت کا حال یہ ہے کہ اسی کے بدلے میں انسان ابدی بادشاہی حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس سے غفلت برتنے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ دوسری طرف اس کی تیز روی کا یہ حال ہے کہ ہر سیکنڈ کے ساتھ وہ ماضی کے اندر تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس پر انسان کو کوئی قابو نہیں تو وہ سارے انسان انتہائی خسارے میں ہوئے جن کا اصل راس المال اس تیزی سے برباد ہو رہا ہے اور وہ اس سے غافل ہوں۔ چنانچہ اس کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا کہ انسان گھاٹے میں ہیں بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کی ساری قدر و قیمت ایمان اور عمل صالح کے اندر مضمر ہے۔ غافل نے یہ عطا فرمائی ہی اس لیے ہے کہ انسان اس کو شیطان کے علی الرغم اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارے اور اس کے صلہ میں رَاضِیَۃً مَرْضِیَّۃً کی سند اور ابدی جنت کا ٹکٹ حاصل کر لے۔ چند دنوں کے امتحان کے بدلے میں ابدی جنت کا انعام جس طرح کوئی معمولی انعام نہیں اسی طرح اس کو شیطان کی ترغیبات کے جال میں پھنس کر کھو بیٹھنا بھی کوئی معمولی محرومی نہیں ہے۔

ایمان کا  
مفہوم

ایمان کی تعریف اس کتاب میں جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ خدا کو اس کی تمام صفات اور ان کے لازمی مقتضیات کے ساتھ پورے صدقِ دل سے تسلیم کرنا ایمان ہے۔ استادِ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایمان کا مفہوم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

”ایمان کی اصل ’امن‘ ہے۔ یہ لفظ لغت میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔  
”اَمْنٌ“ ای اعطاه اماناً (اس کو امن دیا) قرآن میں ہے: ”وَأَمَّنْهُمْ مِنْ خَوْفٍ“  
(قریش - ۱۰۶: ۴) (اور ان کو خوف سے امان دی)۔ ”اَمْنٌ لَهُ“ صدقہ و اعتمد علیہ  
(اس کی تصدیق کی، اس پر اعتماد کیا) ”اَمْنٌ بِهِ“ یقین بہ (اس کا یقین کیا)“

”قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے مشتقات میں سے لفظ ”مُؤْمِنٌ“ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی میں سے ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔“

”یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے۔۔۔۔۔۔ پس وہ یقین جو خشیت، توکل اور اعتقاد کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے“



اس کے فیصلوں پر راضی رہے وہ مومن ہے۔

ایمان کے بعد عمل صالح کی حیثیت اس کے لازمی تقاضی کی ہے۔ رجب حقیقی ایمان پیدا ہو گا تو وہ لازماً زندگی کے باطنی گوشوں کی طرح اس کے ظاہری اعمال کو بھی منور کرے گا۔ اگر ایمان سے اس کے تقاضوں کے مطابق عمل نہ پیدا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان نے دل میں جڑ نہیں پکڑی۔ ایمان اور عمل میں مطابقت اور ہم آہنگی ہونا لازمی ہے۔ امام فراہیؒ اپنی تفسیر میں اس نکتہ کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

”قرآن مجید میں ایمان کے بعد عمل صالح کا جو ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح اطاعت رسول کو اطاعت اللہ پر جو عطف کیا جاتا ہے یہ بھی عطف تفصیل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس تفصیل کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ بعض اہم الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے۔ عقل اور دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ اپنے کو مومن سمجھتا ہے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے۔ ایک قول اور دوسرا عمل۔ قول بھی چونکہ جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے ایمان کی تصدیق کرے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَمِنُوا  
(النساء - ۱۳۶)

عمل سے ایمان لاؤ۔

اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر کرنے کی حکمت امام فراہیؒ نے ان الفاظ میں واضح فرمائی ہے:

”اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں۔ یعنی عملِ صالح حکمت

لہ یہ امر واضح رہے کہ یہاں زیر بحث حقیقی ایمان ہے، فقہی اور قانونی ایمان پر بحث نہیں ہے۔ جو لوگ فقہی اور قانونی ایمان کی نوعیت سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس بحث کو اس کے محل میں دیکھیں۔ مولانا فراہیؒ نے اس کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف تفسیر سورہ عصر میں اشارے کیے ہیں اور ہم نے بھی اس کتاب میں بعض جگہ اس کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔



وہ عمل ہوا جو انسان کے لیے زندگی اور نشوونما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعے سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ آگے چل کر اس نکتہ کی مزید وضاحت انھوں نے یوں فرمائی ہے:

”اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال میں سے صالح صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس مجموعی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بازیچہ اطفال نہیں بنایا ہے، بلکہ ایک خاص نظام حکمت ہے جو اس پرورے کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اسی نظام حکمت کے تحت ہو، اس سے الگ ہو کر نہ ہو۔“

”وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ“ اور پر والے ٹکڑے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا تعلق اصلاً انسان کی انفرادی زندگی سے ہے لیکن انسان صرف انفرادی زندگی نہیں رکھتا بلکہ وہ فطرتاً معاشرتی مزاج رکھنے والی مخلوق ہے اور جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی خاندان کے رکن اور معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی پایا جاتا ہے۔ اگر اس نے اس کے خلاف کوئی اور روش زندگی کی اختیار کی ہے تو اپنے فطری مزاج کے تقاضے سے نہیں بلکہ کسی غیر فطری انحراف کے باعث اختیار کی ہے۔ خاندان اور معاشرہ کے ساتھ اس کا تعلق فطری ہے۔ وہ جس طرح اپنی مادی زندگی کی تعمیر و ترقی میں ان سے سہارا حاصل کرتا ہے اسی طرح اپنے اخلاقی و روحانی ارتقا میں بھی ان سے رہنمائی پاتا ہے۔ یہیں سے اس پر خاندان اور معاشرہ کا یہ حق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی صلاح و فلاح کے فرض سے غافل نہ رہے ورنہ یہ چیز اس کی بقوت کے خلاف ہوگی۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و عمل کی صراطِ مستقیم سے آشنا ہوں وہ دوسروں کو بھی اس حق کی تلقین کریں جس کی راہ ان پر ایمان و عمل صالح کی زندگی نے کھولی ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو صبر و عزیمت کی بھی تلقین کریں اس لیے کہ صبر و عزیمت کے بغیر نہ حق کو اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا آسان ہے اور نہ اس کی دعوت دینا کوئی سہل بازی ہے۔

انسان پر اس کے معاشرہ کا حق

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بات یوں نہیں فرمائی کہ وہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت دیتے ہیں بلکہ یوں فرمائی کہ وہ حق اور صبر کی ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں۔ اس اسلوب نے وہ باتیں بھی اپنے اندر سمیٹ لی ہیں جو پہلے ٹکڑے میں ہیں اور ان کے اوپر مزید نہایت اہم اضافے بھی کر دیے ہیں۔ لفظ ”حق“ کے اندر ایمان بدرجہ اولیٰ داخل ہے اس لیے کہ وہ خدا کا حق اور سب سے بڑا حق ہے۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ کا تعلق بھی یا تو خدا کے حقوق سے ہے یا بندوں کے حقوق سے اس وجہ

ایک دقیق نکتہ



سے وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ ساری باتیں حقوق اور فرائض کی طرح ادا بھی کرتے ہیں، دوسروں کو اس کی تلقین بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ حکمت بھی لوگوں کو بتاتے ہیں کہ حقوق کو ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے، اس کے لیے صبر و عزم و کمیت ضروری ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہیں ہوگا ان کے لیے حقوق کا ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

حق کا  
مفہم

’حق‘ کی وضاحت امام فراہیؒ نے اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

”حق‘ اصل میں کہتے تو ہیں موجود قائم کو لیکن استعمال میں اس کے معنی مختلف ہو گئے ہیں۔ کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال معروف ہے:

۱۔ وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

۲۔ وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلم ہو۔

۳۔ وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔“

ان تینوں معنوں کی تائید میں قرآن سے دلائل نقل کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

”باقی رہا اس کا خاص مفہوم یعنی غریبوں اور کمزوروں کی ہمدردی تو وہ اسی عام معنی سے نکلا ہوا ہے۔ گویا اہل عرب کے نزدیک سب سے بڑا حق یہی ہے جو ہر صاحب استطاعت پر لازم ہے اور جو ہر مستحق کو حاصل ہونا چاہیے جو عقل کے نزدیک مسلم اور تمام اچھے لوگوں کے نزدیک بالکل متعین و معروف ہے۔ اسی سبب سے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوتی ہے اور تمام معقول لوگوں کے اندر مسلم قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق کے معنی اگر غریبوں کی ہمدردی کے لیے جائیں تو اس کے اندر ان تمام معانی کی جھلک موجود ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔“

عبر کا

’صبر‘ کی تحقیق کے ذیل میں مولانا فراہیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ عربوں کے نزدیک صبر کوئی عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور در ماندوں کا خلیوہ ہے بلکہ ان کے نزدیک یہی تمام قوت و انتقام کی نیا ہے۔ کلام عرب میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ حاتم طائیؒ کہتا ہے:

وغمرة موت ليس فيها هودة      يكون صدور المشوق جبرها

(موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا جن پر تلواروں کے پل تھے)

صبر ناله في نهكها ومصا بها      باسيا فتاحت ييوخ سبيها

(مہمان نے ان کی تمام آفات کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھائی یہاں تک کہ



وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔“

بعض دوسرے مشہور شاعروں کے کلام سے نظائر پیش کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ نے ’صبر‘ کا مفہوم خود قرآن سے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

”اصبر! کا اصل مفہوم قرآن نے خود کھول دیا،

وَالصَّبْرُ فِي الْبَأْسِ وَالْقَصْدِ  
وَحِينَ الْبَأْسِ (البقرة - ۱۷۷: ۲) لڑائی کے وقت۔“

”اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر ہوئے ہیں: غربت، بیماری اور جنگ۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام معائب و شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں جو ان تینوں امتحانوں میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ صابر ہیں۔“

حق و صبر کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

”خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ حق‘ تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور صبر تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق‘ اصل محبوب‘ مطلوب ہے اور صبر اس کے لیے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔“

اہل بعیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ سعادت کے حاصل ہو جانے کے بعد اصلی چیز اس پر جھے رہنا ہے۔ اب غور کرو، در لفظوں — حق اور صبر — کے اندر تمام سعادتیں اور بھلائیاں کس خوبی و اختصار کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔“

.....

”یہاں در حقیقت ایک ہی جڑ سے کئی شاخیں نکلی ہیں۔ ایمان ایک اصل اور مرکز کی حیثیت سے ہے۔ اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اس کی تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ دل و دماغ دونوں کو محبوب ہے اور اسی پر ان دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس وجہ سے اس کی محبت کے نتیجے کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کے لیے آدمی کے اندر ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہو۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ ثابت قدمی اور استقامت محبوب کی حیثیت کے لحاظ سے ہوتی ہے جو شے جس قدر محبوب ہوگی اس کے لیے اسی قدر پارہی و استقلال کا جوڑا ملے گا۔ ولعت، غصب اور غیرت کے جذبات کا ظہور سرشے کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ مختلف درجہ کا ہوتا ہے۔ دل کو جو شے جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کے لیے اسی درجہ کا جذبہ غیرت و حمیت بھر جاتا ہے۔“



”اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہے اس  
 وجہ سے جو لوگ اس کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے۔ جو شے تم کو عزیز  
 محبوب ہوگی کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت کر لو گے؟ اس کی حمایت کے  
 لیے تمہاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی۔ ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے اور تم دیکھتے ہو  
 کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونا نہ غیرت بھی رکھتی ہے اور جب وقت  
 آتا ہے ماں کو بچہ کی مدافعت میں زبان کر دیتی ہے۔ یہی جوش غیرت و حمایت قوموں میں  
 اپنے قومی حقوق و مطالبات کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسکین کبوتری بھی اپنے  
 انڈوں اور بچوں کے لیے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس  
 کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے تو وہ اپنے کمر پر دلوں سے ضرور تم کو دفع  
 کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر و حقیقت محبت حق سے پیدا ہوتا ہے۔“

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ایمان و عمل صالح، اور تواضع بالحق والصبر میں باہم کتنا تعلق  
 ہے؟ اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں:

”وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر حق اور صبر کی صفات  
 موجود ہیں اور یہ ان پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ان کی دعوت دیتے ہیں۔  
 یہ مضمون آیت کے اندر مضمر ہے اور اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ  
 ہے کہ ”أَمِنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کے اندر یہ بات موجود تھی۔ ”ثَانِيًا“ و غلط بے عمل کی برائی  
 اس قدر واضح ہے کہ اس مدح کے محل میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ لوگ دوسروں کو  
 حق و صبر کی نصیحت کریں گے اور خود ان اوصاف سے محروم ہوں گے۔“

”اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عمل صالح وجود میں آیا اسی طرح عمل صالح  
 سے تواضع، وجود میں آیا۔ جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کی  
 خاطر صبر و استقامت کی کڑیاں بھی جھیلنے پر آمادہ ہوگا اس کے بارے میں لازماً اس کا علم  
 اس کی محبت اور اس کی غیرت بڑھ جائے گی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس  
 سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ ساری دنیا اس سے محبت کرے اور وہ جہاں  
 کہیں بھی حق کو مظلوم و مظلور اور باطل کو غالب و فتنہ دیکھے گا، تڑپ اٹھے گا اور  
 ایک غیور و اولوالعزم انسان کی طرح دوسروں کو بھی ابھارے گا کہ وہ حق کی حمایت کے  
 لیے کمر بستہ ہوں۔ اس کا دوسروں کو یہ ابھارنا بھی خود اس کے اپنے ہی جذبہ حمیت حق  
 کا ایک قدرتی نتیجہ اور اسی کا ایک حصہ ہے۔ پس یہاں تواضع، کا ذکر عمل صالح کے ایک



جزا اور اس کی ترویج کی بنیاد سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :  
 اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ **فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا  
 وَاٰخِرًا۔**

لاہور

۲۴ - اپریل ۱۹۸۰ء  
 ۸ - جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ



تدبر قرآن

١٠٢

الهمزة







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

یہ سورہ سابق سورہ ————— العصر ————— کی ثنیٰ ہے۔ دونوں کے مضمون میں نہایت واضح مناسبت، جو باتوں پہلے سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ سابق سورہ میں فلاح پانے والے انسانوں کا کردار یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سختی و صبر کی تلقین کرتے ہیں اور اس سورہ میں اس کے بالکل مندر کردار یعنی ان بنجیلوں کا کردار بیان ہوا ہے جو روپیہ گن گن کر رکھتے ہیں اور لوگوں کو ادائے حقوق پر ابھارنا تو درکنار کسی کو اگر دیکھ پا ئیں کہ وہ ادائے حقوق کے معاملے میں عملاً و قولاً سرگرم ہے تو اپنے طعن و طنز اور ہمز و ملز سے اس کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں اور ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا سوسلہ اتنا پست کر دیں کہ وہ بھی انہی کی طرح بے حس و بے غیرت بن کر رہ جائے تاکہ اس کی بنجالت پر پردہ پڑا رہے اور اس کی دعوت و تلقین سے ان کے ضمیر کو خفت و ندامت کی اذیت سے دوچار نہ ہوتا پڑے۔

قرآن نے نخل سرمایہ داروں کے اس کردار کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورہ توبہ

میں فرمایا ہے:

الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ	جو لوگ خوش دلی سے اتفاق کرنے والے
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ	اہل ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں
وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا	بکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب اپنی محنت و
جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ	مزدوری ہی سے اتفاق کرتے ہیں تو ان
مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ	پر کھینچیاں چست کرتے ہیں، اللہ نے ان
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝	کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے ایک دردناک

عذاب ہے۔

(التوبة - ۹ - ۷۹)

اس آیت کے تحت ہم نے تدبر قرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے:



”مُتَطَوِّعٌ أَوْ رُطْبُوعٌ“ دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔ ”مُتَطَوِّعٌ“ اس کو کہتے ہیں جو صرف فرائض و واجبات ہی ادا کر لینے پر قناعت نہ کر بیٹھے بلکہ اپنی خوشی اور حوصلہ مندی سے نفلی نیکیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔

”لَمَّا“ کے معنی عیب لگانا، ہجو کرنا، مذمت کرنا۔

”اوپر کی آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ منافقین نہ صرف یہ کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتے دیکھ نہیں سکتے۔ جس کو خرچ کرتے دیکھتے ہیں اس کو فوراً ہنر و لہز کا نشانہ بنا لیتے ہیں جو فیاض اور مخلص مسلمان اپنی نیامنی اور خوش دلی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کو تو کہتے ہیں کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے، اپنی دینداری کی دھونس جلاتے کے لیے خرچ کر رہا ہے اور جو غریب بے چارے کچھ رکھتے ہیں نہیں، بس اپنی محنت مزدوری کی گاڑھی کماٹی ہی میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں ان کی حوصلہ شکنی کے لیے یہ ان کا مذاق اڑاتے اور ان پر بھیتیاں چیت کرتے ہیں کہ لا آج یہ بھی اٹھے ہیں کہ خاتم کا نام دنیا سے مٹا کے رکھ دیں گے۔“

بخیلوں اور کنجوسوں کی نفسیات کا یہ پہلو ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اپنی بخلالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں۔ نکٹا دوسروں کو بھی نکٹا ہی دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اسے کوئی نکٹا کہنے والا باقی نہ رہے۔ یہی نفسیات ان بخیلوں کی بھی تھی۔ پھر اس سے ان کے اسلام دشمنی کے جذبہ کو بھی تسکین ہوتی تھی۔ وہ نہ خود خدا کی راہ میں کوڑی خرچ کرنا چاہتے تھے، نہ اس بات پر راضی تھے کہ کوئی دوسرا خرچ کرے۔ اپنی اس خواہش کے برخلاف جب دوسروں کو دیکھتے کہ وہ اسلام کے لیے اس دریا دلی سے لٹا رہے ہیں گویا اپنے ہی گھر بھر رہے ہیں، یہاں تک کہ مزدور اپنی مزدوری میں سے، بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اس خوشی سے دیتا ہے گویا اپنی آدھ سیر کھجور یا جو کے عوض دولت کو نین خرید رہا ہے تو ان بخیلوں کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ غصہ سے کھولتے اور حسد سے جلتے پھر اپنے دل کا سبھا رطین و تشنیع، طنز اور پھبتی سے نکالتے رہے۔“

بخیلوں کا یہ کردار ان کی بے بسی کی تصویر ہے۔ بخلالت کے سبب سے نہ یہ حوصلہ ان کے اندر ہوتا کہ ادائے حقوق کے میدان میں سبقت کر سکیں اور نہ ادائے حقوق کی دعوت



دینے والوں کی زبانیں ہی بند کر سکتے۔ اپنی مدافعت کی واحد تدبیر ان کے پاس صرف یہ رہ جاتی ہے کہ ان لوگوں کا مذاق اڑائیں اور ان پر پھبتیاں چست کریں جن کی دعوت سے ان کی پردہ دری ہو رہی ہو۔ ان کی یہ کوشش چونکہ اپنے باطن پر پردہ ڈالنے کی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس سورہ میں ان کے ظاہر و باطن کے ہر گوشہ کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ ان سورتوں میں اگرچہ اصلاً زیر بحث بخیلوں کا کردار ہے لیکن یہی کردار ان لوگوں کا بھی ہوتا ہے جو دوسری اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ بھی اپنے سے بڑے بزرگوار رکھنے والوں کا مقابلہ ہمیشہ اپنے ہمزو ملز سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوم لوط کے گنڈوں نے جب دیکھا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی دعوت اصلاح کے مقابل میں ان کے لیے اپنی آبر و بچاؤ دشوار ہو رہا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے رویہ کی اصلاح کرتے انھوں نے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر فقرے چست کرنے شروع کر دیے کہ یہ لوگ بڑے پارسانتے ہیں۔ اور قوم کو ابھارا کہ ان لوگوں کو ملک سے باہر نکالو، ورنہ یہ پوری قوم کو ذلیل کر دیں گے۔







# سُورَةُ الْهُمَزَةِ

مِکَّۃٌ \_\_\_\_\_ آیات ۹۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آیات  
۹-۱

وَبِلْ تَكْلِ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۱ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۲  
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۳ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۴  
وَمَا أَذْرَكَ مَا الْحُطَمَةُ ۵ نَارُ اللَّهِ الْمَوْقَدَةُ ۶ الَّتِي  
تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۷ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۸  
فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۹

۱  
۲۹

ہلاکی ہو ہر اشارہ باز، عیب جو کے لیے! جس نے مال سمیٹا اور اس کو گنتا رہا۔ ترجمہ آیات ۹-۱

گویا اس کے مال نے اس کو زندہ جاوید کر دیا۔ ۱-۳

ہرگز نہیں، وہ چور چور کر دینے والی میں پھینکا جائے گا اور تم کیا سمجھے کہ چور  
چور کر دینے والی کیا ہے! اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ! جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ اس  
میں وہ موندے ہوئے ہوں گے۔ لمبے ستونوں میں جکڑے ہوئے۔ ۴-۹



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيْلٌ لِّكُلِّ هَسَزَةٍ لُّسَنَةٍ (۱)

ایک ہی کردار کے دو پہلو  
'هَسَزٌ' کے معنی اشارہ بازی کرنے اور 'لُسَنٌ' کے معنی عیب لگانے کے ہیں۔ 'هَسَزَةٌ' اور 'لُسَنَةٌ' مبالغہ کے صیغے ہیں اور اسی سورہ میں آگے 'حُطْمَةٌ' بھی اسی وزن پر آیا ہے۔ 'هَسَزَةٌ' کے معنی اشارہ باز اور 'لُسَنَةٌ' کے معنی عیب جو اور عیب چس کے ہیں۔ اشارہ بازی کا تعلق زیادہ تر حرکتوں اور اداؤں سے ہے اور عیب جوئی کا تعلق زبان سے۔ یہ دونوں ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جب کسی کا مذاق اڑانا، اس کا تہنک کرنا اور اس کو دوسروں کی نگاہوں سے گرا نا مقصود ہو تو اس میں اشارہ بازی سے بھی کام لینے ہیں اور زبان سے بھی۔ اشارہ بازی سے کسی کی تفحیک و تحقیر کے جو پہلو پیدا کیے جاسکتے ہیں بسا اوقات وہ زبان کی فقرہ بازیوں سے زیادہ کارگر ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے 'هَسَزَةٌ' کو مقدم رکھا ہے۔

هَسَزٌ لِسَانٍ کی عادت مہذب اور شائستہ سوسائٹی میں ہمیشہ عیب سمجھی گئی ہے۔ تمام آسمانی مذاہب میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ قرآن مجید میں نہایت واضح الفاظ میں اس سے روکا گیا ہے:

وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِاللِّغَاءِ  
اور اپنے آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے پر پھبتیاں  
(الحجرات - ۲۹، ۱۱) جہت نہ کر دو

دعوت حق کا مقابلہ دہچھے ہتھیاروں سے  
لیکن جدید جاہلیت کی طرح قدیم جاہلیت میں بھی اس فن کو بڑا فروغ حاصل رہا ہے۔ اس زمانے میں جس طرح اخباروں میں مزاحیہ کالم بھی ہوتے ہیں اور کارٹون بھی چھپتے ہیں جو اشاروں کی زبان میں حریفوں کی تفحیک کرتے ہیں اسی طرح قدیم زمانے میں نقال، بھانڈا اور فقرہ باز ہوتے تھے جو اجرت لے کر شریفوں کی گپڑیاں اچھالتے اور اپنے سر پرستوں کا جی خوش کرتے۔ سورہ قلم میں قریش کے لیڈروں اور ان کے گنہگروں پر قرآن نے جو جامع تبصرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مسلمانوں کی 'تَوَاهِي بِالْحَقِّ وَالْقَبْرِ' کی دعوت کو اسی حربے سے شکست دیتے کی کوشش کی جو حربے اس زمانے کے پیشہ ور لیڈر اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ان ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت فرمائی گئی۔



وَلَا تُطْعَمُ كَلَّ حَلَّابٍ  
مِهْنِيْنَ ۖ فَمَا زُتَّ شَاوٍ  
بِسَمِيْعٍ ۖ قَنَاعٍ لِلْحَيْرِ  
مُعْتَدٍ اَشِيْمٍ ۖ عُنْتِيْ، بَعْدَ  
ذَلِكَ زَنِيمٍ ۖ اَنْتُ كَانَتْ  
ذَا مَالٍ وَبَنِيْنٍ ۙ

اور تم ہر پیاٹھے ذلیل کی بات کا دھیان  
نہ کرو۔ اشارہ باز اور لگانے بھانے  
والے کا۔ بھلائی سے روکنے والا، حدود  
سے تنجا وڑ کرنے والا اور حق کو تلف کرنے  
والا۔ اجڈ مزید برآں چا پلو س۔  
برجہ اس کے کہ وہ مال و اولاد والا  
ہو۔

(الفلم - ۶۸: ۱۰ - ۱۴)

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ (۲)

یعنی حقوق کی یاد دہانی اور نصیحت کرنے والوں کو تو انھوں نے ہنزدلمر کے حربے سے  
چپ کرنے کی کوشش کی اور خود مال جمع کرنے اور اس کو گن گن کر سمیٹنے میں لگے رہے۔ مال کے  
حریر، و بخیل مال داروں کی یہ نہایت جامع تصویر ہے۔ ان کا دل و دماغ ہمیشہ اپنے سرمایہ کے حساب  
کتاب میں لگا رہتا ہے۔ کس کا رد بار میں کتنا منافع ہوا ہے؟ فلاں سرمائے سے یافت کی کتنی توقع  
ہے؟ فلاں خسارہ جو ہوا ہے اس کی تلاشی کی کیا صورت ہوگی؟ اگلے سال تک سرمایہ کی مجموعی مقدار  
کہاں تک پہنچ جائے گی؟ اسی طرح کے سوال ہمیشہ ان کے دل و دماغ پر مستولی رہتے ہیں۔ اگر کسی نے  
ذکر کیا کہ فلاں نے غریبوں اور یتیموں کی امداد کے لیے اتنا خرچ کیا ہے تو اس پر پھبتی چست کر دی  
کہ شیخی باز ہے، اپنی دولت مندی کی دھونس جھاتا ہے۔ آخر ہم بھی تو ڈھیر دن مال لٹاتے ہیں لیکن کسی  
کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

يَحْسَبُ اَنْ مَّا كُهُ اَخْلَدَا (۳)

یہ ان کے اس اہمک کے باطن پر عکس ڈالا گیا ہے کہ یہ انہماک پتہ دیتا ہے کہ وہ گویا یہ  
خیال کیے بیٹھے ہیں کہ یہ مال ان کو زندہ جاوید رکھے گا۔ اگر وہ جانتے کہ یہ مال بھی فانی اور ان کی زندگی  
بھی فانی ہے تو وہ مال کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے میں سبقت کرتے جو ان کی ابدی زندگی میں  
کام آنے والا ہوتا لیکن اس کی محبت میں ان کا یہ استغراق پتہ دیتا ہے کہ وہ اس مال ہی میں اپنی زندگی پائے  
ہیں۔ اسی ذہنیت کی تصویر سورہ شعراء میں کھینچی گئی ہے:

اَتَتَّبِعُونَ لِبِئْسَ رِجْعٍ اَيَّةٌ تَعْبَثُونَ لَا  
وَتَتَّخِذُونَ مَصَارِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۙ

کیا تم ہر بلندی پر عبث یاد گاریں تعمیر کرتے  
اور شاندار محل تعمیر کرنے رہو گے گویا تمہیں

ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔

(الشعراء - ۲۶: ۱۲۸ - ۱۲۹)

آدمی کے باطن کا سراغ دینے والی اہل چیز اس کی زبان نہیں بلکہ اس کی زندگی کا رویہ ہے۔



جو آدمی اسی دنیا کو اپنی منزل سمجھتا ہے اس کی زندگی اس شخص کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اس دنیا کو منزل نہیں بلکہ راہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص آخرت کا قائل اور اس کا طالب ہو وہ اپنا مال گن گن کر اس دنیا کے بنکوں اور تجزیوں میں رکھے بلکہ وہ اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھتا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ”تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ اس لیے کہ جہاں تیرا مال رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔“

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (۴)

بخیلوں کے  
سرایہ کا حشر  
’کَلَّا‘ یہاں اس خیالِ باطل کی تردید کے لیے ہے جو ’يَحْبِبُ اَنْ مَّالَهُ اُخْلَدَ‘ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا کہ ہرگز نہیں، وہ بھی اور اس کا یہ سارا اندوختہ بھی چور چور کر دینے والی میں پھینک دیا جائے گا۔ ’حُطَمَةٌ‘ ’حطم‘ کے مادہ سے ہے جس کے معنی چور چور کر دینے کے ہیں۔ یہ بھی ’هُمَزَةٌ‘ اور ’كُمَزَةٌ‘ کے وزن پر ہے اس وجہ سے اس کے اندر بھی مبالغہ کا مفہوم موجود ہے۔

وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ (۵)

یہ سوال اس کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے کہ اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے!

اس آگ کو ’حُطَمَةُ‘ یعنی چور چور کر دینے والی کی صفت سے تعبیر کرنے کی حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ خلیل سرمایہ دار اپنی دولت اس زمانے میں سونے چاندی کی اینٹوں، زیورات، ظروف اور برائت وغیرہ کی شکل میں محفوظ کرتے تھے۔ اس طرح کی دولت کو برباد کرنے کے لیے چور چور کر دینے کی تعبیر زیادہ موزوں ہے یعنی یہ ساری دولت جلا کر اور چور چور کر کے پراگندہ کر دی جائے گی کہ جو لوگ اس کو حیاتِ جاوداں کی ضمانت سمجھے بیٹھے تھے وہ اس کا حشر دیکھیں۔

نَارُ اللَّهِ الْمَوْقُودَةُ ۖ اَلَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْاَفْسَادِ (۶-۷)

اللہ کی بھڑکائی  
ہوئی آگ کی  
ایک صفت  
یہ اس ’حُطَمَةُ‘ کی وضاحت ہے کہ یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ یعنی اس کا خاص مزاج یہ ہوگا کہ وہ سب سے پہلے ان دلوں کو کپڑے کی جن میں مالی کی محبت اس طرح رچی بسی رہی ہے کہ اس نے خدا اور آخرت کی یاد کے لیے کوئی جگہ ان کے اندر باقی نہیں چھوڑی۔ اس آگ کی مطلوب غذا چونکہ انہی دلوں کے اندر ہوگی اس وجہ سے اس کا سب سے پہلا حملہ انہی پر ہوگا۔ اس زمانے میں خاص خاص چیزوں کے تعاقب کے لیے ایسے آلات ایجاد ہو گئے ہیں جو دوسری سے اپنے شکار کو بھانپ لیتے اور انہیں خود ان کا پیچھا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کو مار گراتے ہیں۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی آگ کا ہوگا۔ یہ ان دلوں پر خود بخود جا چڑھے گی۔



جو مال کے عشق میں گرفتار اور اللہ کے حاجت مند بندوں کے حقوق سے بے پروا رہے۔  
 (اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّوَةٌ) (۸)

یہ آگ ان پر اس طرح بھڑکے گی اور اوپر سے وہ ڈھانک بھی دی جائے گی کہ تپش کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو بلکہ سب کا سب ان کے جلانے ہی میں صرف ہو۔ اَوْصَدَ الْبَابُ کے معنی ہوں گے دروازے کو بند دیا۔ یہ آگ بھی بھڑے اور پڑا یہ کی آگ کی طرح اوپر سے ڈھانک دی جائے گی تاکہ وہ پروری قوت کے ساتھ اپنا عمل کرے۔

فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (۹)

یہ ان کی ذلت اور بے بسی کی تصویر ہے کہ اس آگ کے اندر وہ لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ بھاری بھاری زنجیروں سے جکڑے ہوئے بھی ہوں گے کہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں۔ یہاں ستونوں کا ذکر ہے، سورۃ حاقہ میں اسی طرح کے مجرموں کے لیے زنجیر کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا ہے:

خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ۖ ثُمَّ الْجَحِيمَ	اس کو پکڑو، پھر طوق ڈالو، پھر دوزخ میں
مَصْلُوهُ ۖ ثُمَّ فِي سُلَيْلَةٍ	داخل کرو، پھر ایک زنجیر میں جس کا طول
ذُرِّعَها سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ۚ	ستر گز ہے، اس کو جکڑو۔ یہ غولے
اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ	عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور
وَلَا يَحْضُرُ عَلٰی طَعَامِ الْمُسْكِيْنِ ۚ	مسکین کو کھلانے پر نہیں اُجھارتا
وَالْحَاقَّةُ ۙ ۴۹ : ۳۰ - ۳۴	تھا۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَاَلْحَمْدُ لِلّٰہِ  
 عَلٰی اِحْسَانِهٖ۔

لاہور

۲۸ - اپریل ۱۹۸۰ء

۱۲ - جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ







تذکرہ قرآن

۱۰۵

الفیل







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا عمود، سابق و لاحق سے تعلق اور ترتیب بیان

’المقارعة‘ سے لے کر ’المہمۃ‘ تک خاص بات جو قریش پر واضح فرمائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے مال اور اولاد کے عشق میں مبتلا ہو کر اللہ اور بندوں کے حقوق کو تمام برباد کر دیے ہیں لیکن یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمعیل علیہ السلام کے وارث اور ان کے بتائے ہوئے گھر کے متوال ہیں۔ اب اس سورہ اور اس کے بعد کی سورہ۔ قریش۔ میں جو اس کی ترام ہے، ان کو یہ تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تمہیں اس سرزمین میں جو امن اور رزق حاصل ہے وہ تمہاری تدبیر و قابلیت اور تمہارے استحقاق کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ تمام تر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور ان کے بنائے ہوئے اس گھر کی برکت کا ثمرہ ہے اس وجہ سے تم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس امن و رزق پر نازاں ہونے کے بجائے اس گھر کے خدائد کی بندگی کرو جس نے تمہیں بھوک میں کھلایا اور خطرے سے نچنت کیا ہے۔ یہ مضمون آگے والی سورہ میں یوں واضح فرما دیا گیا ہے: **تَلْعَبُونَ دَارًا لِّبَنَاتِكُمْ لَمْ يَكُن لَّهِنَّ دَارٌ وَارَبُّ هَٰذَا الْبَيْتِ ۖ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۖ وَآٰلَهُمْ مِنْهُمْ مِنْ حَوَافٍ** (قصیدہ - ۱۰۶ - ۳ - ۴) (پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے خداداد کی بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرے سے نچنت کیا) ان دونوں سورتوں میں بس یہ فرق ہے کہ سورہ فیل میں ایک نہایت اہم شہادت اس امر کی پیش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی حفاظت کے لیے اپنی کیا شان دکھائی ہے اور سورہ قریش میں یہ واضح کیا ہے کہ اس سرزمین کے باشندوں کے لیے رزق و فضل کی بھراہیں کھلی ہیں وہ اسی گھر کے واسطے سے کھلی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت حضرت اسمعیل علیہ السلام کو مکہ کی سرزمین میں بسایا، اس وقت یہ علاقہ امن اور رزق کے وسائل سے بالکل محروم تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں چیزوں کے لیے دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ان کی ذریت کو یہ دونوں چیزیں حرم ہی کے واسطے سے حاصل ہوئیں لیکن بعد میں لوگ اس حقیقت کو فراموش کر کے اپنی بدستیوں میں کھو گئے۔ ان کی اس ناشکری پر قرآن نے ان کو جگہ جگہ تنبیہ فرمائی ہے جس کی وضاحت ہم کرتے آ رہے ہیں۔ اس گردپ کی سورتوں میں سے سورہ بلد میں بھی اس کے بعض اہم پہلو زیر بحث آئے ہیں تفصیل ملاحظہ ہو۔



ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

زیر نظر سورہ میں قریش کو ابرہہ کی اس فوج کشی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس نے بیت اللہ الحرام کو ڈھادیے کے ناپاک ارادے سے ساٹھ ہزار کے لشکرِ حِجْر کے ساتھ، مکہ پر کی۔ ایک ایسے بھاری لشکر سے، باعصوص جب کہ اس کا ہر اہل دستہ ہاتھیوں پر مشتمل ہو، عربوں کے لیے میدان میں نکل کر عہدہ برآ ہونا آسان نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے پہاڑوں میں محفوظ ہو کر سنگ باری کی صورت میں اپنی مدافعت کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تائیدِ غیبی سے ان کی اسی کمزور مدافعت کو ابرہہ کے لشکر گراں کے لیے ایک قہرِ الٰہی بنا دیا اور وہ اس طرح تباہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا گوشت مکہ کی وادی میں چیلوں، کتوں اور گرگھوں کو کھلایا۔



# سُورَةُ الْفِيلِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات : ۵

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ① أَلَمْ يَجْعَلْ  
 كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ② وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ③  
 تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ ④ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ  
 مَّأْكُولٍ ⑤

۱  
۳۰  
ترجمہ آیات  
۵-۱

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے خداوند نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا! ترجمہ آیات  
 کیا ان کی چال بالکل برباد نہ کر دی! اور ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں نہ بھیجیں! ۳-۱  
 تم ان کو مارتے تھے سنگِ گل کے قسم کے پتھروں سے، بالآخر ان کو اللہ نے  
 کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ ۵-۴



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ (۱)

’اَلَمْ تَرَ‘ کے خطاب کی نوعیت ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ اگرچہ یہ لفظ واحد ہے لیکن اس کا استعمال بیشتر جمع کو مخاطب کرنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ طرز خطاب گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو فرداً فرداً متوجہ کرتا ہے۔ یہاں مخاطب قریش ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے توجہ دلائی ہے کہ اصحابِ فیل کے ساتھ تمہارے رب نے جو معاملہ کیا، کیا وہ تم نے نہیں دیکھا؟ یہ امر ملحوظ رہے کہ اصحابِ الفیل کے واقعہ پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عام الفیل ہی کے دوران میں ہوئی ہے اس وجہ سے اس سورہ کے نزول کے وقت بہت سے ایسے لوگ رہے ہوں گے جنہوں نے اس واقعہ کا پچھم خود مشاہدہ کیا ہوگا اور اگر مشاہدہ نہیں کیا ہوگا تو اس واقعہ کے ساتھ سنا ہوگا کہ وہ مشاہدہ ہی کے حکم میں ہے۔ اس وجہ سے ’اَلَمْ تَرَ‘ کا خطاب یہاں بالکل اپنے موزوں محل میں ہے۔

خطاب کی  
نوعیت

قرآن نے یہاں ان ہاتھی والوں کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی ہے کہ وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور ان کے آنے کا مقصد کیا تھا؟ اجمال کے ساتھ صرف ان کے انجام کی طرف اشارہ کر کے بات ختم کر دی ہے۔ اس اجمال کی وجہ یہ ہے کہ مخاطب گروہ کو ان کا سارا واقعہ معلوم تھا۔ اصحابِ الفیل کے الفاظ سے ان کا تعارف ہی سمجھ جانے کے لیے کافی تھا کہ یہ اشارہ یمن کے حبشی حکمران، ابرہہ کی طرف ہے جس کے حملہ آور لشکر کے ساتھ کرہ پیکر ہاتھی بھی تھے۔ ہاتھیوں والے لشکر کا تجربہ عربوں کو پہلی بار اسی جنگ میں ہوا اس وجہ سے اسی نام سے انھوں نے اس حملہ کو یاد رکھا جس سے اس کی سنگینی کا اظہار ہوتا ہے۔

اصحابِ الفیل  
کون تھے؟

ہاتھی ایک ہی تھا یا اس سے زیادہ تھے قرآن کے الفاظ سے دونوں ہی مفہوم نکل سکتے ہیں لیکن چونکہ صاحبِ الفیل نہیں بلکہ اصحابِ الفیل کہا گیا ہے اس وجہ سے قیادری ہی ہوتا ہے کہ ہاتھی ایک سے زیادہ تھے اور روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کا ایک پورا دستہ فوج کے ساتھ تھا جس سے اس کی قوت اور سببیت میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔

ابرہہ اور اس کا کردار  
ابرہہ کو اگرچہ بعض مورخین نے ایک بڑے حکمران لکھا ہے لیکن اس کے حالات زندگی سے اس شخص کی تائید نہیں ہوتی بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک موقع پرست، غدار اور نہایت متعصب عیسائی تھا۔ اس نے خود حبش کے بادشاہ کے ساتھ بھی غدار کی جس کی فوجوں کے ذریعہ سے اس نے یمن پر قبضہ کیا تھا،



اس کی تفصیل تاریخوں میں موجود ہے لیکن یہاں اس سے تعترض کا موقع نہیں ہے۔ میں پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے نہ صرف اس کے یہودی بادشاہ کو قتل کیا بلکہ وہاں سے یہود اور یہودیت کا بیج و بطن سے خاتمہ کر دیا۔ عیسائیت کے نقشب کے جنون میں اس نے یہ اسکیم بنائی کہ عربوں کو عیسائی بنائے۔ اس اسکیم کو ابرہہ کی چال بروئے کار لانے کے لیے اس نے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا بنوایا اور حبش اور اس کے گرجاؤں کے نواب السلطنت کی حیثیت سے وہ یمن پر حکومت کر رہا تھا۔ اس نے لکھا کہ میں نے ایک ایسا گرجا تعمیر کرایا ہے جس کی نظیر چشم نلک کے نہیں دیکھی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ عربوں کے حج کا رخ بھی اسی کی طرف موڑ دوں اور ان کے مکہ کے معبد کو ڈھا دوں۔ اس کے بعد اس نے کعبہ پر حملہ کا جواز پیدا کرنے کے لیے یہ مشہور کیا کہ اس کے تعمیر کردہ گرجا کو کسی عرب نے بقصد توہین ناپاک کیا ہے۔ یہ واقعہ اول تو بالکل جھوٹ معلوم ہوتا ہے، عرب ہمیشہ تلوار کے دھنی رہے ہیں، بہادر قوموں کے افراد اس طرح کی لپٹ حرکتیں نہیں کیا کرتے، لیکن بالفرض صحیح بھی ہو تو کسی ایک شخص کا انفرادی فعل اس بات کو جائز ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کا انتقام پوری قوم سے لیا جائے، یہاں تک کہ اس جرم کی پاداش میں ان کے دینی معبد کو ڈھا دینے کی جسارت کی جائے لیکن عیسائیوں کے جذبات بھڑکانے اور نجاشی کی تائید حاصل کرنے کے لیے اس جھوٹ کو خوب شہرت دی گئی یہاں تک کہ ساٹھ ہزار کا لشکر بھجوا دیا جس کے ساتھ نو دس ہاتھی بھی تھے، جمع کر کے مکہ پر حملہ کر دیا گیا۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ (۲)

لیکن ابرہہ کی یہ ساری تدبیریں اللہ تعالیٰ نے بالکل پامال و رائگاں کر دیں۔ ان تدبیروں کو کید (چال) سے تعبیر کرنے کی ایک واضح وجہ تو یہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ایک نہایت ظالمانہ اقدام کو جائز ثابت کرنے کے لیے ایک نہایت بے ہودہ قسم کا الزام گھڑا گیا لیکن اس کے کید ہونے کے بعض اور پہلو بھی ہیں جن کی طرف امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اشارے فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ اس نے محترم مہینوں میں حملہ کیا۔ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ خونریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونے کی کوشش کی جب اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مناسک ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔

۳۔ اس نے غاص طور پر تعلیم متی کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منی میں قربانی میں مشغول ہوں گے یا تھکے ماندے گھر دن کو واپس آ رہے ہوں گے۔

اس کی ان چالوں کو ناکام کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا اس کا خلاصہ، واقعہ سے مستنبط کر کے، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

ابرہہ کی چالوں کی ناکامی کا خدا کی انتقام



”۱۔ ان کی فوج کو دادمی محسوس ہی میں رد کر دیا۔

۲۔ محسوس کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا اور ان پر سنگ باری کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۳۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے غار کعبہ کے ان دشمنوں پر سنگ باری کرنے والی ہوا (عاصب) بھی

بھیجی جس نے ان کو بالکل پامال کر دیا۔“

اس عاصب کا ذکر واقعہ کے بعض عینی شاہدوں نے کیا ہے اور ابن ہشام وغیرہ نے اپنی کتابوں میں ان شہادتوں کو نقل کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر پوری تفصیل سے بحث کی ہے۔ ہم بقصد اختصار صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مشہور شاعر ابرقیس اس واقعہ کے سلسلہ میں قدرت الہی کی بعض شانوں کا ذکر کرتے ہوئے عاصب کا ذکر یوں کرتا ہے:

فارس من ربهم عاصب یلعنهم مثل لعن القذم

(پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عاصب (سنگ ریزے برسانے والی آندھی) چلی جو خسرو خاشاک کی طرح ان کو لپیٹ لیتی)۔

۔ اسی طرح صیفی بن عامر نے بھی ساف اور عاصب کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

فلما اجازوا بطن نعمان ردھم جنودا لاله بین ساف و عاصب

(جو نہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے، خدا کی فوجوں نے ساف اور عاصب کے درمیان نمودار ہو کر ان کو لپیٹ کر دیا)۔

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ (۳)

یہ ابرہہ کی فوجوں کی بربادی، پامالی اور بے کسی دے بسی سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی

ابرہہ کی فوجوں

قدرت کا ملہ سے اس طرح ان کو پامال کیا کہ کوئی ان کی لاشوں کو اٹھانے والا نہ رہا۔ وہ میدان میں پڑی ہیں۔

کی بربادی کی

اللہ تعالیٰ نے ان پر گوشت خوار چڑیاں بھیجیں جنہوں نے ان کا گوشت نوچا، کھایا اور دادمی مکہ کو ان

تغیر لپیٹ گئے

کے تعفن سے پاک کیا۔ دشمن پر چڑیوں کو مسلط کرنا اس کی شکست و پامالی کی تعبیر کے لیے معروف

۱

کنایہ ہے۔ عرب شعراء نے اپنے فخریوں میں یہاں تک کہا ہے کہ جب ہماری فوجیں دشمن پر حملہ آور ہوتی

ہیں تو گوشت خوار چڑیاں ہمارے ہم رکاب ہوتی ہیں، انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے حملہ سے دشمن

پامال ہوں گے اور ان کو سپٹ بھر ان کا گوشت کھانے کا موقع ملے گا۔ تو رات میں حضرت داؤد اور جالوت

کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس میں بھی ہے کہ جب حضرت داؤد اس سے مقابلہ کرنے پر لبثہ ہوئے اور اس

کی مغرورانہ باتوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا تو اس نے جھٹاکر کہا کہ اچھا آ، آج تیرا گوشت چلیوں اور کوٹوں

نہ فقط ساف بھی عاصب کی طرح تند ہوا ہی کے لیے آتا ہے۔ دونوں میں صرف درجے کا فرق ہے۔



کو کھلاتا ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس پر غلبہ دیا اور خود اسی کے گوشت کو  
چیلوں اور گدھوں نے کھایا۔

‘آبَابِیْلَ’ سے ابابیل میں مراد نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے۔ یہ لفظ گھڑوں کی  
جماعت اور چڑیوں کے جھنڈ کے لیے آتا ہے۔ اس کے واحد و جمع ہونے کے باب میں اختلاف ہے۔  
بعض کہتے ہیں کہ اس کی واحد نہیں ہے۔ بعض اس کو آبَابِیْلَ کی جمع بناتے ہیں۔ یہاں یہ ان چڑیوں کے  
لیے آیا ہے جو مقتولوں کی لاشیں کھانے کے لیے جمع ہو جاتی ہیں۔

‘أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ’ میں مسقط کر دینے کا مضمون ہے جس سے اصحابِ فیل کی کس مہر سی کی طرف  
اشارہ مقصود ہے کہ کوئی ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے والا نہیں تھا۔ اس وجہ سے چڑیوں کو پوری آزادی  
سے ان پر تصرف کرنے کا موقع ملا۔

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ ۖ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۴-۵)

اب آخر میں بتایا کہ اس لشکرِ جبر کے تباہ کرنے میں کتنا حصہ عربوں کا ہے اور کتنا قدرت کا۔ فرمایا مفسرین  
کہ تم ان کو پتھروں اور کنکروں سے مار رہے تھے، پس خدا نے ان کو کھانے کے بھس کی طرح پامال کر دیا یعنی ایک عام  
اس لشکرِ جبر کے مقابلے میں تمہاری یہ مدافعت نہایت کمزور تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تائیدِ غیبی سے غلط فہمی  
تمہاری یہی کمزور مدافعت اتنی مؤثر بنا دی کہ وہ کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو کر رہ گئے۔

ہمارے مفسرین تو عام طور پر کہتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کا کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ ان کے سردار <sup>المطلب</sup> ہبشہ  
قوم کرے کر پہاڑوں میں جا چھپے اور خانہ کعبہ کو خدا کے سپرد کر دیا جس کا یہ گھر ہے وہ خود اس کی حفاظت  
کر لے گا۔ ان کے نزدیک ‘تَوْفِی’ کا ناعل ‘طَيِّبًا آبَابِیْلَ’ ہے یعنی چڑیوں نے ابرہہ کی فوجوں پر سنگباری  
کر کے اللہ کو پامال کر دیا۔ اگرچہ اس قول پر تمام مفسرین متفق ہیں لیکن گونا گوں وجوہ سے یہ بالکل غلط ہے جن  
میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے:

۱۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر قریش پہاڑوں میں چلے گئے تھے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں  
کہ وہ مدافعت سے کلیتہً دست بردار ہو کر پہاڑوں میں جا چھپے تھے، بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابلے میں  
مدافعت کی واحد ممکن شکل جو وہ اختیار کر سکتے تھے یہی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہی اختیار کی اور  
اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق کہ بندہ جب اپنے اسکان کے حد تک اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا  
ہے تو وہ اس کی مدد فرماتا ہے، اس نے قریش کی مدد فرمائی۔

ادھر آپ پڑھ آئے ہیں کہ ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک دستہ  
بھی تھا۔ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ میدان میں نکل کر اور صفت بندی کر کے، اتواروں کے ذریعہ سے کرنا، قریش  
کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اگر اپنا پورا زور و اثر استعمال کرتے تو بھی شاید دس بیس ہزار سے زیادہ آدمی



اکٹھے نہ کر پاتے، اس وجہ سے انھوں نے اپنے لیے بہترین جنگی پالیسی یہی خیال کی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں میں محفوظ ہو جائیں اور وہاں سے گوریلوں کے طریقہ پر جس حد تک ان کے اقدام میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہیں، کریں۔ یہ اسی طرح کی ایک تدبیر تھی جس طرح کی تدبیر سلمان نے غزوہ اتراب کے موقع پر اختیار کی۔ یعنی مدینہ کے ارد گرد خندق کھودی اور اس کے اندر محفوظ ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا۔

۲۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قریش نے کوئی مزاحمت نہیں کی ان کا دعویٰ واقعات کے بھی خلاف ہے اور قریش کی حیثیت و غیرت کے بھی۔ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ابرہہ کی فوج جس جن راستوں سے گزریں ان کے عرب قبائل نے ان کو مزاحمت کے بغیر گزرنے نہیں دیا بلکہ یہ جانتے ہوئے کہ اس دل بادل فوج سے ان کے لیے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے انھوں نے مزاحمت کر کے شکست کھانا تو گوارا کیا لیکن یہ ننگ نہیں گوارا کیا کہ دشمن غارت گری پر حملہ کرنے کے لیے ان کے حدود کے اندر سے آسانی سے گزر جائے۔ صرف ایک قبیلہ بنو ثقیف نے اہل عرب کی اس نام حیثیت کے خلاف روش اختیار کی۔ اس کے بعد ایک فرد، ابو رغال نے ابرہہ کی فوج کو مکہ کا راستہ بتایا لیکن اس قبیلہ کو اس بے حیثیتی کی سزا یہ ملی کہ پورے عرب میں اس کی آبرو منٹ گئی اور ابو رغال کا حشر یہ ہوا کہ اس کی قبر پر اہل عرب ایک مدت تک لعنت کے طور پر سنگ باری کرتے رہے۔ غور کیجیے کہ جب چھوٹے چھوٹے قبائل نے اس بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا تو قریش اس کے آگے اس بے حیثیتی کا اظہار کس طرح کرتے کہ اس کو بے روک ٹوک اللہ کے گھر پر قابض ہو جانے دیتے۔ اور اگر انھوں نے واقعی بغیر کسی مزاحمت کے اس کو راہ دے دی تھی تو ابو رغال نے کیا گناہ کیا تھا کہ اس کی قبر پر وہ سنگ باری کرتے رہے۔ بہر حال یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ بغیر کوئی مزاحمت کیے پہاڑوں میں جا چھے۔ قریش کی غیرت و حیثیت ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ انھوں نے کبھی معمولی باتوں میں بھی کوئی ایسی کمزوری نہیں دکھائی جس سے ان کی غیرت و حیثیت پر حرف آئے، تو وہ بیت اللہ کے معاملہ میں ایسی رجمیتی کا ثبوت کیوں کر دے سکتے تھے جس پر ان کی دینی و دنیوی دونوں سیادتوں کا انحصار تھا۔ بیت اللہ کے بعد ان کے پاس بچ کیا رہتا تھا جس کے لیے وہ پہاڑوں میں چھپ کر زندگی بچانے کی تمنا کرتے!

۳۔ جن لوگوں نے قریش پر اس بے حیثیتی کا الزام لگایا ہے ان کے نزدیک اس سورہ کا درجہ گویا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کا محافظ خود ہے۔ اس کے پاس ان دشمن سے ڈر کر اگر اس کو چھوڑ کے بھاگ جائیں جب بھی خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ جب قریش ابرہہ کی فوجوں سے ڈر کر پہاڑوں میں جا چھے تو اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کے ذریعہ سے ان پر پتھر اڑ کر کے ان کو بھس کی طرح پامال کر دیا۔ اگر فی الواقع اس سورہ کا درس یہی ہے تو یہ درس اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ



یہ نہیں ہے کہ بندے اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے بنی اسرائیل کی طرح یہ کہیں کہ 'فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ  
فَقَاتِلْ اِنَّا هُمْ قَاعِدُوْنَ' (المائدہ - ۵: ۲۴) (تم اور تمہارا خداوند جاؤ لڑو، ہم یہاں بیٹھے  
ہیں) اور خدا ان کے بے میدان جہیت کر ان کے لیے تخت بچھا دے اور یہ اس پر برا جہان ہو جائیں۔  
اگر اللہ تعالیٰ ایسا کرنے والا ہوتا تو بنی اسرائیل کے ساتھ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ ان کو تو اس نے  
اس کی سزا یہ دی کہ چالیس سال کے لیے ان کو صحرا ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت  
جو قرآن سے واضح ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد فرماتا ہے جو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے  
اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم اور ان کے وسائل کتنے ہی محدود ہوں۔ چنانچہ قرآن  
نے بیت اللہ سے متعلق سورہ بقرہ، سورہ توبہ، سورہ حج وغیرہ میں ہماری جو ذمہ داریاں بتائی ہیں  
وہ یہی ہیں کہ ہم اس کی آزادی و حفاظت کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ کریں، اللہ ہماری مدد  
کے گا۔ یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ تم کچھ کر دیا نہ کرو ہماری ابا بیلوں اس کی حفاظت کر لیں گی۔ بہر حال  
قریش نے جو کچھ ان کے امکان میں تھا وہ کیا۔ اگرچہ ان کی مدافعت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، کمزور تھی لیکن  
اللہ تعالیٰ نے اپنی حامیوں کے ذریعہ سے ان کی اس کمزور مدافعت کے اندر اتنی قوت پیدا کر دی کہ دشمن  
کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر صرف مٹھی بھر  
خاک قریش کے لشکر کی طرف پھینکی تھی لیکن وہی مٹھی بھر خاک ان کے لیے طوفان بن گئی اور اللہ تعالیٰ  
نے اس کی اہمیت یوں واضح فرمائی کہ 'وَمَا دَمِيَّتْ اِذْ دَمِيَّتْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی' (الانفال - ۸: ۱۷)  
(اور وہ کنکریاں دشمنوں پر تم نے نہیں پھینکیں تھیں بلکہ اللہ نے پھینکیں)۔

۴۔ عبد المطلب نے جبل حرا پر چڑھ کر رب کعبہ سے جو استغاثہ کیا اس سے یہ بات نہیں عبد المطلب  
نکلے کہ وہ بیت اللہ کی مدافعت سے بالکل دست بردار ہو کر اور سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر کے 'لا اپنے رب  
خود الگ ہو رہے ہیں بلکہ اس میں انھوں نے بعض فقرے تو ایسے کہے ہیں جن کے اندر ناز اور اعتماد سے استغاثہ  
کی وہ شان پائی جاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں ہے جو آپ نے غزوہ بدر کے  
موقع پر عین میدان جنگ میں فرمائی ہے۔ اس طرح کی دعا میدان جنگ چھوڑ کر بھگنے والا نہیں کرتا  
بلکہ وہ شخص کرتا ہے جو اگرچہ حالات کی نزاکت سے پریشان تو ہوتا ہے لیکن اپنے رب کی قدرت سے  
مایوس نہیں ہوتا۔ اس دعا کو جن لوگوں نے فرار کے مفہوم میں لیا ہے انھوں نے نہایت بدزدنی کا ثبوت  
دیا ہے۔ میں تو جب اس کو پڑھتا ہوں مجھے اس کے اندر ایک رجز کی شان معلوم ہوتی ہے اور اس  
سے ایمان کی مہک آتی ہے۔ آپ بھی ذرا اپنے ذوق کو بیدار کر کے یہ اشعار پڑھیے۔ ان میں کتنی  
سزائے اور اللہ تعالیٰ کی غیرت کو جوش میں لانے والی کتنی ٹوٹا پیل ہے!

اللہم ان الموء یمنع رحله فامنع رحاله



(اے خدا، آدمی اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر)

لَا يَغْلِبُكَ صَلَيبُهُمْ وَمَعَالِدُهُمْ أَبَدًا مَعَ الْكَ

(ان کی صلیب اور ان کی قوت تیرے قوت پر ہرگز غالب نہ ہونے پائے)

إِنْ كُنْتَ تَادِكُهُمْ وَقِيلَتْنَا فَمَرَّمَا بَدَا لَكَ

(اگر تو ہمارے قبضہ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتا ہے تو کر جو تیری مرضی)

کیا اس غیرت و حمیت کے شخص کے بارے میں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ بہر حال یہ رائے ہمارے نزدیک بالکل بے بنیاد ہے کہ قریش میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ چڑیوں نے سنگ باری کر کے ابرہہ کی فوجوں کو یا مال کیا۔ 'تَدْعِي' کے فاعل، ہمارے نزدیک قریش ہیں جو 'أَلْمَدَنَةُ' کے مخفی طب ہیں رُفْعُ 'تَدْعِي' چڑیوں کے لیے کسی طرح موزوں ہے بھی نہیں۔ چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگ ریزے گراتی سکتی ہیں لیکن اس کو 'دعی' نہیں کہہ سکتے۔ 'دعی' صرف اسی صورت میں ہوگی جب پھینکنے میں بازو یا فلاخن کا زور استعمال ہو یا ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ جو لوگ چڑیوں کی رمی کے قائل ہوئے ہیں انہیں بھی لفظ 'دعی' کھٹکا ہے۔ انھوں نے تکلف کر کے اس کی شکل یہ بیان کی ہے کہ چڑیاں مٹر کے دانوں کے برابر سنگ ریزے گراتی تھیں جو ہاتھیوں کے سواروں کے جسموں میں سے گزر کر ہاتھیوں کے جسموں میں گھس جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے چڑیوں کی چونچوں سے گرے ہوئے سنگ ریزوں کا مؤثر ہونا دکھا دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس صورت کو 'دعی' سے تعبیر کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

سَبِيلُ

'يَجْجَارَةٌ مِّنْ سَبِيلِ' لفظ 'سَبِيلِ' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہ ناری کے سنگ گل

سے مرتب ہے۔ اس کا ترجمہ اگر کنکر کیجیے تو میرے نزدیک یہ صحیح ہوگا۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ عربوں کی یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی۔ اصل مقابلہ تو اس صورت میں ہوتا جب کھلے میدان میں صف بندی کر کے تلواروں، نیزوں اور تیروں سے دو بدو جنگ ہوتی۔ اگر حریف کے پاس ہاتھی تھے تو ان کے پاس بھی کم از کم گھوڑے ہوتے لیکن اس طرح کی جنگ کا، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، امکان نہیں تھا اس وجہ سے قریش نے آخری چارہ کار کے طور پر یہ راہ اختیار کی کہ جہاں داؤدنگ گیا پہاڑوں سے پتھر اڑ کر کے دشمن کی راہ رکنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ یہ مدافعت ایک کمزور مدافعت تھی اور اس کی اس کمزوری ہی کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے 'يَجْجَارَةٌ مِّنْ سَبِيلِ' کے الفاظ سے اس کی نوعیت واضح کر دی۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۵)

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت بیان فرمائی ہے کہ اگرچہ تمہاری مدافعت کمزور مدافعت تھی لیکن جب تم حوصلہ کر کے مدافعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی سنت کے مطابق تمہاری مدد کے لیے اپنی نشان دکھائی اور ان کو کھلانے کے بھس کی طرح یا مال کر دیا۔ کسی شے کا نام اس کے انجام کے اعتبار سے



رکھنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے: 'كَعْصِفٌ مَّا كُوْلٍ' اسی نوع کی ترکیب ہے۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رہے کہ دُعا کی نسبت تو مخاطب کی طرف کی ہے لیکن ان کو کھانے کے بھس کی طرح کر دینا اللہ تعالیٰ نے اپنی شان بتائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر کو پامال کر دینا تنہا عربوں کی سنگ باری کے بس کی بات نہ تھی اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان دکھائی اور یہ شان ان کی سنگ باری کے پردے میں دکھائی۔ ہم سمجھے بعض عینی شاہدوں کا یہ بیان نقل کر آئے ہیں کہ ابرہہ کی فوجوں پر حاصِب بھی چلی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حاصِب اسی وقت چلی ہے جب عربوں نے دادی محشر کے کنکروں سے ان پر پتھر اڑ کیا۔ یاد ہو گا کہ غزوہ خندق کے موقع پر بھی ہوانے مسلمانوں کی مدد کی تھی اسی طرح کی مدد اس موقع پر بھی نمودار ہوئی۔ ہم سمجھے یہ اشارہ کرتے ہیں کہ ابرہہ کی فوجوں کے مقابل میں قریش نے اس سے ملتی جلتی تدبیر اختیار کی جو مسلمانوں نے احزاب کے مقابل میں اختیار کی۔

اب صرف ایک سوال قابل غور رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر واقعہ یہ ہے کہ ایرہمہ کی فوجوں کی پالٹا  
چڑھیوں کی شگ باری سے نہیں بلکہ عربوں کی سنگ بادی اور حاصب کے ذریعہ سے ہوئی، چڑیاں صرف  
لاشوں کو کھانے آئی تھیں، تو ترتیب کلام یوں ہونی چاہیے تھی کہ 'تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ'ؕ  
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍؕ وَارْتَدَّ عَلَيْهِمْ حَطِيرًا أَبَابِيلٍؕ یہ سوال جن لوگوں کے  
ذہن میں پیدا ہوا ہے ہمارے نزدیک وہ عربیت کے ایک خاص اسلوب بلاغت سے نا آشنا ہیں۔  
وہ یہ کہ بعض مرتبہ کسی نتیجہ خیر یا شر کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے اس کو فعل کی پوری تفصیل سے  
پہلے ہی ظاہر کر دیتے ہیں۔ دعاؤں کی قبولیت کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے یہ اسلوب جگہ جگہ  
اختیار کیا ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ یہاں سورۃ نوح جے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ انْهَدْ عَصَوِي  
وَاتَّبِعُوا مِن تَوْحِيدِهِ مَالَهُ  
وَدَلْدُهُ الْإِخْسَارُ وَكَرُوا  
مَكْرًا كِبَارًا وَقَالُوا  
لَا تَذَرُنَا إِيهَتَكُمُ  
لَا تَذَرُنَا وَدَاوِلَا سَوَاعَا  
وَلَا يُعُوتَ دَعْوَتُ  
وَأَسْرَارُهُ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا  
وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا  
مِمَّا خَطِيئَتُهُمْ أُغْرِقُوا

نوح نے فریاد کی، اے میرے رب! انھوں نے  
میری نافرمانی کر دی اور ان لوگوں کی پیروی کی  
جن کے مال اور اولاد نے ان کے خسارے ہی  
میں اضافہ کیا اور انھوں نے بڑی بڑی چابیس  
چلیں اور اپنی قوم کو درغلا یا کہ اپنے مبعودوں کو  
ہرگز نہ چھوڑا اور نہ چھوڑا اور نہ سوائے  
کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسل کو اور اے  
میرے رب! انھوں نے ایک خلیق کتیرے گمراہ کر  
رکھا ہے اور تو ان ظالموں کی گمراہی ہی میں اب  
اضافہ کر، پس وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں



فَادْخُلُوا نَارًا فَخَلُّوا مِنْهَا فَذُكِّرْتُمْ ۚ  
 كَلَّهْم مِّنْ دُونِ اللَّهِ أَصَارًا ۚ وَقَالَ  
 نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنْ  
 الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۚ إِنَّكَ  
 إِن تَذَرَهُمْ بِيْضُوا غُبَارًا ۚ  
 وَلَا يَكِيدُ إِلَّا الْآخِضِرَاءُ كَفَّارًا ۚ

پانی میں غرق اور آگ میں داخل کیے گئے  
 اور اللہ کے مقابل میں وہ اپنے لیے کوئی مددگار  
 نہ پاسکے اور نوح نے کہا، اے میرے رب!  
 تو ان کافروں میں سے زمین پر ایک قمقمس بھی  
 نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ  
 تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف نابکاروں  
 اور ناشکروں ہی کو جہنم دیں گے۔

(نوح - ۷۱: ۷۶-۷۷)

ان آیات پر تہذیب کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے پہلے ہی  
 فقرے کے بعد ان کی قوم کا انجام رکھ دیا گیا ہے اور ان کی باقی دعا کو منحصر کر دی گئی ہے حالانکہ  
 انجام پر حال پوری دعا کے بعد ہی سامنے آیا ہوگا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ  
 قبولیت دعا کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے ترتیب کلام میں تقدیم یا تاخیر کر دی  
 گئی! بالکل اسی طرح اس سورہ میں ابراہیم کی فوجوں کا انجام ظاہر کرنے کے لیے ان پر چڑیوں کے بھیجے  
 جانے کا ذکر پہلے کیا اور ان کے پامال ہونے کا ذکر اس کے بعد کیا۔ سورہ کا مزاج چونکہ قریش پر انتقام  
 احسان کا تھا اس وجہ سے بلاغت کا تقاضا یہی تھا کہ دشمن کی بد انجامی کی تصویر پہلے سامنے آئے۔

استاذ اہم حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ نے اس سورہ کی تفسیر نہایت مفصل لکھی ہے۔ میں نے  
 بقصد اختصار ان کی کتاب کی بعض باتیں اس میں نہیں لی ہیں حالانکہ وہ تفسیر کے پہلو سے نہایت اہمیت  
 رکھنے والی ہیں۔ مولانا نے حج کے سلسلہ میں رمی جمرات کی سنت کو اسی 'رمی' کی یادگار قرار دیا ہے  
 اور بعض دوسری تحقیقات بھی نہایت اہم بیان فرمائی ہیں۔ اس کتاب کے قارئین کو میرا مشورہ یہ ہے  
 کہ وہ مولانا کی تفسیر بھی ضرور پڑھیں۔ اس سے ان کے زاویہ نگاہ میں وسعت بھی ہوگی اور وہ فرق بھی سمجھ  
 آئے گا جو ان کے اور میرے نقطہ نظر میں بہت باریک سا ہے۔

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَاَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيرًا۔

لاہور

۱۵۔ مئی ۱۹۸۰ء

۲۹۔ جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ



مدبر قرآن

۱۰۶

القریش







## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

### سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

یہ سورہ سابق سورہ ————— الفیل ————— کی توام ہے۔ اس کی تفسیر میں ہم دونوں سورتوں کے عمود کی طرف ایک جامع اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ قریش بیت اللہ کے ساتھ جس نوعیت کی وابستگی رکھتے تھے وہ ان پر واضح کر کے اس کے فطری اثر کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

سابق سورہ میں یہ دکھایا ہے کہ اس سرزمین میں ان کو جو امن حاصل ہے وہ اسی گھر کی بدولت حاصل ہے۔ اس سورہ میں یہ دکھایا ہے کہ اس سرزمین میں ان کو نذوق کے جو وسائل حاصل ہیں ان کی راہیں بھی اسی گھر کی بدولت کھلی ہیں۔ اس وجہ سے حق ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں، اس کے اس حق میں بلا دلیل دوسروں کو شریک نہ کریں۔

ایک اچھی حکومت سے شہریوں کو جو برکتیں حاصل ہوتی ہیں ان میں سرفہرست یہی دو چیزیں ہیں: امن اور رزق۔ سرزمین مکہ میں یہ دونوں برکتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بدولت قریش کو بیت اللہ ہی کے طفیل حاصل ہوئیں۔ اس کا فطری حق یہی تھا کہ ان کی وابستگی کلیتہً اللہ وحدہ لا شریک کے ساتھ ہوتی لیکن قریش نے شرک میں مبتلا ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بندے ہوئے گھر میں دوسرے فرضی دیویوں دیوتاؤں کو لا بٹھایا۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس گھر کے ساتھ اپنی وابستگی کی نوعیت کو نہ بھولیں۔ یہ گھر انھیں خدا ہی نے امانت میں دیا تھا۔ اسی کی بدولت انھیں امن بھی حاصل ہوا اور اسی کے فیض سے رزق کی راہیں بھی کشادہ ہوئیں۔ اگر انھوں نے اس گھر کے رب کی ناشکری کی تو یاد رکھیں کہ اس گھر کی پاسبانی کا شرف بھی کھو بیٹھیں گے اور ساتھ ہی وہ تمام روحانی و مادی برکتیں بھی جو اس گھر کی بدولت انھیں حاصل ہیں۔

سورہ میں پہلے اس وابستگی کی خاص نوعیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو قریش کو سرزمین مکہ اور بیت اللہ کے ساتھ حاصل ہوئی۔ پھر ان کے ان بنی رتی سفروں سے ساتھ ان کی وابستگی کا حوالہ دیا ہے جو سردیوں اور گرمیوں میں بالاتزام وہ کرتے اور جن پر ان کی تمام معاشی آسودگی کا انحصار



تھا۔ ان کی معاشی زندگی میں خون کی گردش اپنی تجارتی سفروں سے ہفتی ادراں کی کامیابی کی ضمانت  
 ان کو بیت اللہ کے متوئی ہونے کی بدولت حاصل ہوتی۔ اس شرف سے محروم ہو کر وہ یہ درجہ  
 نہیں حاصل کر سکتے تھے کہ جو راستے دوسروں کے لیے غیر محفوظ تھے ان میں ان کے تجارتی قافلوں  
 کی حفاظت کے لیے راہ کے قبائل بدرقہ فراہم کریں۔

---



# سورۃ قریش

مِکَئِہٖ ۴۰ آیات: ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
 لِاٰیْلِیْنِ قُرَیْشٍ ۱۱ اِلَیْهِمْ رِحْلَۃُ الشِّتَآءِ ۲ وَالصَّیْفِ ۳  
 فْلِیْعَبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۴ الَّذِیْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ  
 جُوعٍ ۵ وَاَمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۶

بوجہ اس وابستگی کے جو قریش کو ہے۔ اس وابستگی کے سبب سے جو سردی اور گرمی کے سفر کے ساتھ ان کو ہے۔ پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے انھیں قحط کے سبب سے کھلایا اور خوف کے سبب سے امن بخشا۔ ۴-۱



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا يُلْفِقُ قُرَيْشٍ (۱)

ایلاف کا  
مفہوم  
'الف المكان واللفہ ایلافا' کے معنی ہوں گے 'تعودہ داستانیں بہ' وہ اس جگہ کا عادی اور اس سے مانوس ہے۔

'الفتہ مکان کذا ایلافا' کے معنی ہوں گے 'جعلتہ یالفتہ' میں نے اس جگہ سے اس کو مانوس کر لیا۔

'الفہ موالفتہ والاف' کے معنی ہیں 'اشہ دعاشدہ' وہ اس سے مانوس ہوا اس کے ساتھ رہا سہا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ 'ایلاف' ہو یا 'ایلاف' دونوں ہی صورتوں میں معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ اس کا اصل مفہوم انس، تعلق اور وابستگی ہے۔ اگرچہ 'لَا يُلْفِقُ قُرَيْشٍ' کے محمل الفاظ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ قریش کی کس چیز کے ساتھ وابستگی زیر بحث ہے لیکن آگے 'رِحْلَةَ الشَّتَاءِ وَالصَّيْفِ' اور 'فَلْيَبْدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ' کے الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں ان مفادات کے ساتھ ان کی وابستگی زیر بحث ہے جو انھیں بیت اللہ کے تعلق اور اس کی خدمت و ولایت کی بدولت حاصل ہوئے۔

گویا اس سورہ میں قریش کو یہ یاد دہانی کی جا رہی ہے کہ انھیں مکہ میں یا پورے ملک عرب میں جو عظمت و قائلہ اور اس کے نتیجہ میں جو غیر معمولی دنیوی مفادات حاصل ہیں ان میں اصلی دخل ان کی ذہانت و قابلیت اور ان کے حسن تدبیر و تدبر کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس گھر کے ساتھ تعلق و وابستگی کو ہے۔ اس وجہ سے ان پر واجب ہے کہ وہ اس گھر اور اس کے مالک کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو ہمیشہ یاد رکھیں، اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں ان حقوق و فرائض کو نہ بھول بیٹھیں جو اس گھر اور اس کے خداوند سے متعلق ان پر عائد ہوتے ہیں۔

الْفِيهِمْ رِحْلَةَ الشَّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۲)

یہ سابقہ ایلاف سے بدل ہے۔ پہلے بات محمل طور پر کہہ کر ناقص چھوڑ دی ہے تاکہ سننے والوں میں سوال پیدا ہو جائے کہ قریش کی کونسی وابستگی کس پہلو سے زیر بحث ہے؟ یہ اسلوب کلام قرآن میں بعض دوسرے مقامات میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا نمونہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب آ



کو سنے کے لیے بیدار ہو جاتا ہے اور دوسرا نائذہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت اجمال کے بعد گویا تفصیل کی ہوتی ہے اس وجہ سے بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

فرمایا کہ یہاں خاص طور پر قریش کی جس وابستگی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ ان کی وہ وابستگی قریش کے جوان کو اپنے گرمی و سردی کے دونوں تجارتی سفروں کے ساتھ ہے۔ یہ واضح رہے کہ سردیوں میں تجارتی سفروں قریش کے تجارتی قافلے مین کا سفر کرتے اور گرمیوں میں شام و فلسطین کا۔ ان تجارتی قافلوں کے ساتھ ک نوعیت پوری قوم کا مال اور سرمایہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے تاجر ایسے ہوتے جو دوسروں کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتے اور ان کے واسطے سے وہ لوگ بھی اس نفع بخش تجارت میں حصہ دار بن جاتے جو خود یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہی سفر در حقیقت اہل مکہ کی تمام دولت و ثروت کا ذریعہ تھے۔ اس طرح ان کی تمام قابل فروخت اشیاء دوسری منڈیوں میں پہنچتیں اور دوسرے بازاروں کی ضرورتی اشیاء ان کے صارفین کو حاصل ہوتیں۔ یہ تجارتی گزرگاہیں قریش کے لیے رگ جان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ یہ بین الاقوامی گزرگاہیں تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صحیح معنوں میں محفوظ صرف قریش کے لیے تھیں، دوسروں کو ان میں وہ تحفظ نہیں حاصل تھا جو قریش کو حاصل تھا۔ دوسروں کے قافلے ان میں علانیہ ٹٹ جاتے، ان کو قدم قدم پر راہ میں واقع قبیلوں سے اجازت حاصل کرنی پڑتی اور اس کے لیے بھاری بھاری معاوضے ادا کرنے پڑتے، لیکن قریش کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اپنے تمام سامان تجارت کے ساتھ بے خطر گزرتے اور کسی کا ان سے تعرض کرنا تو درکنار راہ کے قبائل اپنے اپنے حدود میں ان کے لیے بد رفتہ فراہم کرتے کہ یہ رگ بیت اللہ کے خادم، اس کے متوتی اور حاجیوں کی خدمت کرنے والے ہیں۔ اسی نسبت کو قرآن نے یہاں یاد دلایا ہے کہ اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں اس گھر کے رب کو نہ بھولو، تمہاری ذبیحہ کا میاں بھی اسی گھر کے طفیل سے ہیں اور اسی وقت تک تم ان کے حقدار ہو جب تک تم اس گھر کے وفادار ہو۔

قریش کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ بیت اللہ کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت یہ نہیں ہے بیت اللہ کے باہر سے کوئی قبیلہ آیا ہو، وہ مکہ میں بسا ہوا اور پھر اس گھر کا متوتی بن بیٹھا ہو بلکہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کو تعمیر کیا اسی وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کو اس گھر کے پاس بسایا تاکہ یہ اس مشن کو پورا کریں جو اس گھر کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی وقت ان کے لیے امن اور رزق کی دعا کی جس کی برکات کا ذکر سابق سورہ میں بھی ہوا اور اس سورہ میں بھی آ رہا ہے۔ گویا قریش کو ان کی تاریخ یاد دلاتی جا رہی ہے کہ اس گھر کے ساتھ ان کا تعلق اتفاقی نہیں بلکہ ایک خاص مشن اور مقصد پر مبنی اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے جس کو وفاداری کے ساتھ نبھانے ہی میں ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔ اگر وہ اس کو بھول بیٹھے تو سب کچھ بھول بیٹھیں گے۔ سورہ ابراہیم میں اس حقیقت



کی یاد دہانی یوں فرمائی گئی ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ  
هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ  
نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ رَبِّ إِنَّهُمْ أَضَلُّونَ  
كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِي  
فَإِنَّهُ مِنِّي ۚ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ  
غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۚ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ  
هِنَ دُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ  
عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا  
لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ  
أُفُقَهُم مِّنَ النَّاسِ فَهَوَّيْ  
إِلَيْهِمْ دَاوُدَ قَهُم مِّنَ الشُّعُوتِ  
لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝

اور یاد کرو حبیب کا براہیم نے دعا کی: اے  
میرے رب! اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا  
اور مجھ کو اور میرے بیٹوں کو اس بات سے محفوظ  
رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں: اے میرے رب!  
ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو  
گمراہ کر رکھا ہے۔ پس جو میری پیروی کریں  
وہ تو مجھ سے ہیں اور جو میری نافرمانی کریں تو  
تو غفور رحیم ہے۔ اے ہمارے رب! میں  
نے اپنی ذریت میں سے کچھ کو ایک بن کھیتی  
کی وادی میں، تیرے محترم گھر کے پاس، بسایا  
ہے تاکہ وہ ناز کا اہتمام کریں تو تو لوگوں کے  
دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی  
روزی دے تاکہ وہ تیرے شکر گزار رہیں۔

(ابراہیم: ۱۲-۳۵: ۳۷)

ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام  
نے بیت اللہ کے جوار میں جو بسایا تو ان مقاصد کی تکمیل کے لیے بسایا جو اس گھر کی تعمیر سے مد نظر تھے۔  
اسی مقصد کی خاطر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے امن و رزق اور مرجعیت خلق کی دعا فرمائی جو  
قبول ہوئی اور ہر دور میں ان کو یہ نعمتیں حاصل رہیں۔ اسی چیز کی یہاں قریش کو یاد دہانی فرمائی ہے کہ  
اس گھر کے ساتھ اپنے اس تعلق کو نہ بھولو، آج بھی تمہیں جو مرجعیت خلق حاصل ہے اور جس سے اپنے  
تجارتی سفروں میں فائدہ اٹھا رہے ہو اسی گھر کی برکت سے ہے۔ یہ انتہائی ناپاسی ہوگی کہ اس کے تعلق  
سے تمہیں جو دنیوی فوائد حاصل ہیں ان سے تو بہرہ مند رہو اور اس کے جو حقوق و فرائض تم پر عائد ہوتے  
ہیں ان کو یکسر فراموش کر دو۔ یہ گھر خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا۔ اس کے مقصد تعمیر میں یہ بات  
شامل ہے کہ بتوں کی پرستش کی لعنت سے خلق کو بچایا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے  
اسی وجہ سے اس کو الگ ٹھلگ ایک وادی غیر ذی زرع میں بنایا لیکن تم نے اس کے کونے کونے میں  
بتوں کو لایا یا یہاں تک کہ اب خدا تو اس گھر میں بالکل اجنبی ہو کے رہ گیا ہے البتہ احصاء کی خدائی  
اس کے ہر گوشہ پر قائم ہے۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّنْ جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (۳-۴)



اب یہ حق بیان فرمایا ہے اس رزق اور امن کا جو اس گھر سے وابستگی کی بدولت ان کو حاصل نعمتوں کا ہوا۔ فرمایا کہ جب ان کو رزق اور امن دونوں اسی گھر کے خداوند نے بخشے تو اس کا حق یہ ہے کہ وہ حق اس گھر کے خداوند ہی کی بندگی کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ شرک کی تمام آلودگیوں کے باوجود قریش اس گھر کے خداوند سے نا آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اپنے بتوں میں سے کسی کو بھی وہ اس گھر کا خداوند نہیں سمجھتے تھے۔ عبدالمطلب نے جو دعا ابرہہ کے حملہ کے موقع پر، جس پر حرا پر کی اور جو سالتی سورہ کی تغیر میں مذکور ہوئی ہے، اس کو پڑھیے۔ اس میں اس گھر کی حفاظت کے لیے جو استغاثہ انھوں نے کیا ہے وہ تمام تر اس گھر کے خداوند ہی سے کیا ہے۔ اس میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی بتوں میں سے کسی کی طرف نہیں ہے۔ ان بتوں کی حیثیت ان کے نزدیک، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آئے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ ان کو وہ خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنا خالق و مالک اور بیت اللہ کا رب وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ ان کے اس عقیدے میں کوئی فرق کبھی نہیں آیا۔

”الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ“ اس ٹکڑے میں ”جوع“ میرے نزدیک ”جوع“ اور سبب ہے اور ”جوع“ اور ”خوف“ کے الفاظ خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ ”جوع“ سے مراد ”خوف“ کا کسی علاقہ کی وہ خاص حالت ہے جو غذائی اشیاء و اجناس کی قلت یا نایابی سے پیدا ہوتی ہے۔ خاص مفہوم اسی طرح ”خوف“ سے کسی علاقہ کی وہ حالت مراد ہے جو امن و امان کے فقدان اور جان و مال کے عدم تحفظ سے رونما ہوتی ہے۔ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں اس خاص مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً:

وَلَنَسْأَلَنَّكَ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَ  
الْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ  
وَالشَّمْرِ ۖ (البقرة - ۲: ۱۵۵)

اور ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر  
خوف، بھوک اور مالدوں، جانوں اور  
پھلوں کی کمی سے۔

یہ علاقہ، جس میں حرم واقع ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد اور بیت اللہ کی تعمیر سے پہلے امن سے بھی، جیسا کہ تفصیل گزری، محروم تھا اور غذائی وسائل سے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نعمتوں سے اس علاقہ کو بیت اللہ کی برکت سے بہرہ ور کیا۔ قرآن میں اس کا ذکر جگہ جگہ قریش پر احسان کے طور پر ہوا ہے، مثلاً فرمایا ہے:

أَدَلَّوْا نَسَمَكُنَّ تَهْوَ حَرَمًا أَمَّا يُجِيبِي  
إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ  
(المقصود - ۲۸: ۵۷)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے  
لیے تو ایک مامون حرم برپا نہیں کیا جس کی  
طرف ہر قسم کی پیداواریں کھینچی چلی آرہی ہیں۔

سورہ عنکبوت میں فرمایا ہے:



وَلَكُمْ يَوْمَآآ أَنَّا جَعَلْنَا  
حَرَمًا مِّنَّا وَيَخْفَىٰ  
النَّاسِ مِنْ حَوْلِهِمْ  
(العنكبوت - ۲۹: ۶۷)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے  
تو ایک مامون حرم بنایا اور لوگوں کا مال  
یہ ہے کہ وہ ان کے ارد گرد سے اچکے لیے  
جاتے ہیں۔

یہی بات جامع الفاظ میں اس سورہ میں فرمائی ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں  
جس نے غذائی اجناس کی ناپائی کے سبب سے ان کے لیے غذائی ضروریات کا سامان کیا اور جان و مال  
کے عدم تحفظ کے سبب سے ان کے لیے امن و امان فراہم کیا — مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں ان کو  
اس سر زمین میں حاصل ہیں تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی سے حاصل ہیں۔ ان کے سبب سے استکبار میں مبتلا  
ہونے کے بجائے ان پر اپنے رب کا شکر واجب ہے اور شکر کا تقاضا رب کی بندگی اور اطاعت ہے  
نہ کہ نافرمانی و سرکشی۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ حمدًا کثیرا۔

لاہور

۲۱ - مئی ۱۹۸۰ء

۶ - رجب ۱۴۰۱ھ



تذکرہ قرآن

۱۰۷

الماعون







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا عمود، سابق و لاحق سے تعلق اور ترتیب بیان

ادپر کی دونوں توام سورتوں ————— الفیل اور قریش ————— میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ قریش کو رزق دامن کی تمام نعمتیں بیت اللہ کی بدولت حاصل ہوئیں، اس کا حق یہ تھا کہ یہ لوگ اس گھر کے خداوند کی بندگی کرتے اور جس مقصد کے لیے یہ تعمیر ہوا تھا اور ان کی تولیت میں دیا گیا تھا اس کو کامل و ناداری کے ساتھ پورا کرتے۔ اب آگے کی دونوں توام سورتوں ————— الماعون اور الکوتر ————— میں پہلے تو قریش کے ان لیڈروں کا کردار دکھایا جا رہا ہے جو سورہ کے زمانہ نزول میں بیت اللہ کے منتظم و متولی تھے، پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اب یہ لوگ اس بات کے اہل نہیں رہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس محترم گھر کے متولی بنے رہیں، انھوں نے اس کے تمام مقاصد برباد کر دیے ہیں اس وجہ سے سزا دار ہیں کہ معزول ہوں اور یہ امانت ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہیں۔

سورہ زیر بحث میں ترتیب بیان اس طرح ہے کہ پہلے قریش کے ایک لیڈر کے کردار کی طرف نہایت تعجب انگیز بلکہ نفرت انگیز انداز میں توجہ دلائی ہے کہ یہ شخص جس ثقافت قلب کے ساتھ یتیموں کو دھکے دیتا ہے وہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اس کا سینہ جزا و سزا کے عقیدے سے خالی ہے۔ اگرچہ اس کا نام نہیں لیا گیا ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے جو سورہ کے زمانہ نزول میں بیت اللہ کے تمام مالی وسائل پر تنہا قابض و مقرر تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے جو بیت اللہ میں آکر بظاہر نماز کی رسم ادا کرتے لیکن ان کی نماز بالکل بے روح، محض ایک قسم کی ایکٹنگ، ہوتی چنانچہ ان کی سخت کا یہ حال تھا کہ انفاق تو درکنار روزمرہ ضروریات زندگی کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان سے کوئی مانگ بیٹھتے تو وہ بھی دینے کا سوسلہ نہیں رکھتے تھے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ بیت اللہ کے بنیادی مقصد دو تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ واحد کی عبادت کا مرکز ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ فقرا اور یتیم کی ہمدردی و خدمت کا ایک موثر ادارہ ہو۔ اس کے



متوتیوں کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان دونوں مقاصد کے پورے کرنے کا اہتمام کرتے لیکن جن متوتیوں کا کردار بیان ہوا ہے ان سے ان دونوں میں سے کسی مقصد کے پورے ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس وجہ سے آگے کی سورہ میں ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔

---



# سُورَةُ الْمَاعُونِ

مَكِّيَّةٌ ————— آیات: ۷

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَرَّعَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْإِيمَانِ ۚ ۱ فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ  
الْيَتِيمَ ۚ ۲ وَلَا يَجُزُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۚ ۳ فَوَيْلٌ  
لِّلْمُصَلِّينَ ۚ ۴ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۚ ۵  
الَّذِينَ هُمْ بِرَأْعُورٍ ۚ ۶ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۚ ۷

دیکھا تم نے اس کو جو چیز اموال کو جھٹلاتا ہے! وہی ہے جو یتیم کو دھکے  
دیتا ہے اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں اُبھارتا۔ ۱-۳

پس ہلاکی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر  
ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور ادنیٰ چیزوں میں بھی نجاست کرتے ہیں۔ ۴-۷



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَرَوَيْتَ الْبَذَىٰ يُكْذِبُ بِالذِّينِ (۱)

’أَرَوَيْتَ‘ کے اسلوب خطاب پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ اسلوب کسی کی طرف تعجب اور نفرت کے ساتھ متوجہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ لفظ ’ذین‘ یہاں جزاء و سزا کے معنی میں ہے جس طرح ’مَلِكٌ يَوْمَ الدِّينِ‘ (الفاتحة) میں ہے۔

مکہ کا قارون

’الْبَذَىٰ‘ سے کون مراد ہے؟ اس کی وضاحت یہاں نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے۔ یہ ایک نہایت مال دار نجیل تھا جو حرم کے بیت المال (رنادہ) پر سورہ کے زمانہ نزول میں، قابض تھا۔ آگے اس کے ذلیل کردار اور اس کی تباہی کا ذکر ایک مستقل سورہ \_\_\_\_\_ اللہب \_\_\_\_\_ میں آ رہا ہے۔ اس سورہ کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ اس نے رنادہ کو اپنی ذاتی جائیداد بنا لیا تھا۔ اس کی آمدنی اپنے ذاتی مقاصد میں اس نے استعمال کی اور اس کی بدولت مکہ کا قارون بن گیا۔

یہاں اصل مقصود کلام تو اس کی شقاوت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو شخص اتنا نفسی القلوب ہے کہ وہ یتیموں کو دھکے دیتا ہے اس سے کسی خیر کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ بیت اللہ کے کسی شعبہ کا ذمہ دار بن سکے لیکن بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جس سے اس کا وہ باطن بھی سامنے آگیا ہے جو اس کی اس قسارت کا اصل سبب ہے۔

’يُكْذِبُ بِالذِّينِ‘ کی صفت اس کے باطن پر عکس ڈال رہی ہے کہ وہ آخرت اور جزاء و سزا کا جھٹکانے والا ہے۔ جو شخص آخرت کا منکر ہو گا اس کے اندر اس انفاق کا کوئی محرک سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا جو خدا کی خوشنودی اور خالصتہ خدمت خلق اور سدر دئی غرباء کے لیے ہو۔ ایسا شخص اگر کچھ خرچ کرتا ہے تو اپنی کسی ذاتی غرض یا ریا و نمائش کے لیے کرتا ہے۔ بے غرض نیازی صرف اسی شخص کے اندر پیدا ہوتی ہے جو آخرت کی جزاء و سزا پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہے۔ سورہ لیل میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے :

آخرت کا منکر

بے غرض انفاق

نہیں رکھتا

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ

بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۖ

أَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۖ وَكَذَّبَ

پس جس نے دیا اور ڈرا اور اچھے انجام کی اس

نے تصدیق کی تو ہم اس کے لیے آسان راہ ہموار

کریں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا



بِالْعُسَىٰ ۖ فَسَنِّيْرُكَ لِلْعُسَىٰ ۖ  
(البیل - ۹۲ : ۵ - ۱۰)  
اور اس نے اچھے انجام کی تکذیب کی تو ہم اس  
کو دشوار راہ پر ڈالیں گے۔

فَذٰلِكَ الَّذِي يُبَدِّعُ الْيَتِيْمَ (۲)

فرمایا کہ یہی شخص ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے۔ 'ذُبُّع' کے معنی دھکے دینے کے ہیں۔ فرمایا  
ہے، 'يَوْمَ يُدْعَوْنَ اِلٰى نَارٍ جَهَنَّمَ دَعَا' (الطود ۱۳۱: ۵۲) (جس دن وہ دھکے دے دے کہ جہنم کی طرف  
لے جائے جائیں گے) یتیموں کے ساتھ صحیح رویہ جس کی تعلیم دی گئی ہے 'اکوام' کا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے،  
'كَلَّا بَلْ لَّا تَكْرُمُوْنَ الْيَتِيْمَ' (الفجر ۸۹: ۱۷) ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے، اسلامی معاشرہ  
میں، جیسا کہ حضرت البرکہ صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، ضعیف اس وقت تک سب سے زیادہ  
قوی اور بااثر ہے جب تک اس کا حق اس کو مل نہ جائے۔ اس چیز کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر  
فرد ان لوگوں کی دل سے عزت کرے جن کے حقوق ابھی ملنے ہیں۔ ان کے حقوق کی حمایت کرنا، ان  
کو ادا کرنے کی تلقین کرنا اور ان کو حاصل کرنے کے لیے سینہ سپر ہونا ہر اچھیت مسلمان کا فرض ہے۔  
ذٰلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۳)

یہ وہی بات منفی پہلو سے فرمائی ہے کہ بھلا جو شخص یتیموں کو دھکے دے گا وہ مسکینوں کی  
پرورش اور ان کی خدمت و اعانت پر لوگوں کو کیا ابھارے گا! اس حقیقت کی طرف جگہ جگہ اشارہ  
کیا جا چکا ہے کہ جو لوگ نجیل ہوتے ہیں وہ اپنی نجیلی پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے یہ بھی چاہتے ہیں  
کہ دوسرے بھی نجیل بنے رہیں تاکہ کوئی شخص ان کو نجیل کہنے والا نہ رہے۔ ان کی خواہش کے خلاف  
اگر کوئی کچھ خرچ کرتا ہے تو وہ، جیسا کہ سورہ ہمزہ کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں، اس کو اپنے ہمزہ دلمز  
اور طعن دشمنی کا ہدف بنا لیتے ہیں تاکہ شروع ہی میں اس کا حوصلہ پست کر دیں اور وہ اس راہ میں  
آگے نہ بڑھے۔

یہ امر واضح رہے کہ یہ اس شخص کا کردار بیان ہو رہا ہے جو اس زمانے میں بیت اللہ کے  
خاص اس شعبہ پر مسلط تھا جس کا تعلق غرباء و یتیموں کی خدمت سے تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب چوری  
کو توال بنا بیٹھا ہے تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ معلوم ہے۔

قَوْلٌ لِلْمُصَلِّيْنَ ۖ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (۴-۵)

یہ بیت اللہ کے ان پرہتوں کی نمازوں کی بے حقیقتی کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ بیت اللہ  
کے متوتی ہونے کے تعلق سے اپنے عوام کو دکھانے کے لیے نماز کی رسم بھی ادا کرتے ہیں لیکن ان پرہتوں کی  
کی نماز محض دکھاوے کی ہوتی ہے اس وجہ سے روح سے بالکل خالی، نری ریاکاری ہوتی ہے۔  
یہ امر واضح رہے کہ بیت اللہ کا اصل مقصد تعمیر نماز کا قیام تھا اور اس کے جوار میں حضرت اسماعیلؑ



کو حضرت ابراہیمؑ نے خاص اسی مقصد سے بسایا تھا کہ وہ اور ان کی ذریت نماز کا اہتمام رکھیں۔ اسی کی خاطر انھوں نے ان کے لیے امن اور رزق کی دعا بھی فرمائی تھی۔ سورہ ابراہیم میں یہ دُعا یوں مذکور ہے:

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ  
یَوَاحِشٍ ذِیْ زُرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ  
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لَیْقِیَنَّ الصَّلَوةَ  
لِہِ ہمارے رب، میں نے اپنی ذریت میں سے  
بعض کو ایک بن کھیتی کی دادی میں تیرے محترم  
گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے رب،  
تاکہ یہ نماز کا اہتمام کریں۔ (ابراہیم - ۱۴: ۳۷)

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نماز کے قیام و اہتمام کا فریضہ جس طرح ادا فرمایا اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ (مدینہ - ۱۹: ۵۵) (اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا) اگرچہ بعد کے ادوار میں مبتدعین اور خاستوں کے تسلط کے سبب سے نماز اور زکوٰۃ دونوں کا حکم بالکل بگڑ گیا۔ زکوٰۃ کا جو حشر ہوا اس کی تفصیل اوپر گزری۔ نماز کا جو حال ہوا اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ سورہ انفال کی آیت ۳۵ میں موجود ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً (الانفال - ۸: ۳۵) (بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹھی اور تالی بجا نا رہ گئی ہے) تاہم اپنی بگڑی ہوئی صورت میں سہی یہ چیزیں باقی رہیں اور جس طرح ہر دور کے لیڈر اپنے عوام کو بے وقوف بنائے رکھنے کے لیے مذہبی رسوم کی نمائش کرتے رہتے ہیں اسی طرح قریش کے لیڈر بھی خاص خاص مواقع پر ان رسوم کی نمائش کرتے رہتے تھے۔ ان کی اسی نماز پر فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے لیے تیاہی ہے جو اپنی نمازوں کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

الَّذِينَ هُمْ يَرُودُونَ لَا يَخْتَلِعُونَ إِلَّا مَعًا وَعُيِّنَ لِمَا يُعْمَلُونَ (۶-۷)

یہ ان کی نمازوں کی بے حقیقتی کی وضاحت ہے کہ یہ محض دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی نہایت بخیل ہیں۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی نمازوں کے بے روح و بے جان ہونے پر دو چیزوں سے دلیل قائم کی ہے۔ ایک ان کی ریاکاری سے دوسرے ان کی خستہ ہے۔

نماز کی اصل حقیقت اخلاص ہے۔ یعنی وہ صرف اللہ وحدہ لا شریک کی خوشنودی اور رضا طلبی کے لیے پڑھی جائے۔ اس کے سوا اگر کوئی اور غرض اس میں شامل ہو جائے تو نماز بالکل باطل اور اپنے اصل مقصد کے اعتبار سے نہ صرف بے نتیجہ بلکہ نہایت مہلک ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی نمازیں اول تو ان کے فرائد عقیدہ کے سبب سے اخلاص سے محروم تھیں ثانیاً وہ پڑھتے بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، محض دکھاوے ہی کے لیے تھے تاکہ ان کے عوام ان کو مذہبی سمجھیں۔ اس طرح کی نماز ظاہر ہے کہ محض



ایکٹنگ ہوتی ہے جس کا زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ جس طرح کسی ڈرامے میں مجنوں کا پارٹ ادا کر دینے سے کوئی مجنوں نہیں بن جاتا اسی طرح اس قسم کے لوگ مسجد میں آجانے اور رکوع سجود اور قیام و قعود کی نمائش کر دینے سے نمازی نہیں بن جاتے۔

علاوہ ازیں ان لوگوں کی ہمت بھی اس بات کی دلیل تھی کہ ان کی نمازیں بالکل بے روح و بے جان ہیں۔ نماز کی اصل روح اپنے رب کی شکر گزاری ہے۔ جو بندہ اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہے وہ خسیس و یتیم نہیں ہوتا بلکہ نیاز و کریم ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی نعمتوں میں دوسروں کو شریک کرتا اور اس کو ان کا حق سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ جب میرے رب نے مجھے بخشا ہے تو اس کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس میں ان لوگوں کو شریک کروں جو اس سے محروم ہیں اور یہ جذبہ اس پر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ بسا اوقات وہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسروں کی مدد کرنے میں لذت و ملاوت محسوس کرتا ہے۔ نماز اور انفاق کے باہمی تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ بحث ہو چکی ہے۔ فلسفہ دین کے اعتبار سے جذبہ شکر کی تحریک سے سب سے پہلے نماز وجود میں آتی ہے اور پھر نماز انفاق کے لیے محرک بنتی ہے اور پھر انہی دو چیزوں پر شریعت کا پورا نظام قائم ہے۔

يَمْنَعُونَ لِمَا عُرِّنَ لَفْظُ مَا عُرِّنَ رُوزْمَرۃ استعمال کی ان چیزوں کے لیے آتے ہیں جن کے عاریت لین دین میں کوئی قباحت خیال نہیں کی جاتی بلکہ ہر پڑوسی اپنے پڑوسی سے ان کو بعض اوقات مانگنے پر مجبور ہوتا ہے اور ان کا مانگنا اور دینا دونوں اچھے معاشرہ میں حسن معاشرت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی پڑوسی کو آپ سے کسی ضرورت سے ایک چار پائی یا بستر یا کوئی برتن یا چھری یا دیاسلائی یا اسی طرح کی کوئی اور چیز مانگنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے تو ہر شریف پڑوسی اس کی ضرورت نہایت خوش دلی سے پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صرف وہی لوگ اس طرح کے موقع پر تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو نہایت یتیم ہوتے ہیں۔ اس طرح کے یتیم اگر نماز پڑھتے ہیں تو ان کی نماز محض نمائش ہوتی ہے۔ اس نماز کے لیے نہ کوئی محرک ان کے دل کے اندر ہوتا اور نہ یہ نماز کسی پہلو سے ان کے دل پر اثر انداز ہوتی۔ بلکہ نمائش ہونے کے سبب سے یہ ان کی تساوت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

بعض لوگوں نے اسی قویاً لِلْمَعْدِيْنِ..... الاية والے ٹکڑے کی بنا پر اس سورہ کو مدنی قرار ایک شبہ دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی ریاکارانہ نماز پڑھنے والے تو مدنی دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ کئی دور میں اس قسم کے لوگ کہاں تھے؟ اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ اس سے انہوں نے وہ نماز مراد لی ہے جس کا حکم اسلام نے دیا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی،



وہ نماز ہے جس کے قیام کا حکم حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کو بیت اللہ کی تعمیر کے ساتھ ہی دیا گیا تھا اور جس کی روایت بعد کے ادوار میں بھی باقی رہی اگرچہ اس کا حکم بدعات کے غلبہ کے سبب سے بہت بگڑ گیا تھا۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد لله حمداً کثیراً۔

لاہور

۲۶۔ مئی ۱۹۸۰ء

۱۱۔ رجب ۱۴۰۰ھ



تذکرہ قرآن

۱۰۸

الکوش







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور پیغمبر کو بشارت

سابق سورہ ————— الباقون ————— میں آپ نے دیکھا کہ قریش کے لیڈروں پر حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کے جوار میں حضرت ابراہیم نے اپنی ذریت کو جس مقصد کے لیے بسایا اور جس کی خاطر ان کے لیے امن اور رزق کی دعا فرمائی وہ مقصد انھوں نے بالکل برباد کر دیا۔ یہ گھر خدا واحد کی عبادت اور نقراء و تپا مئی کے حقوق کی حفاظت، کے مرکز کی حیثیت سے قائم کیا گیا لیکن اب جو لوگ اس پر قابض ہیں ان کو نہ نماز کی خبر ہے نہ یتیموں اور مسکینوں کے حقوق کا کوئی لحاظ ہے۔ اس بات کے بیان سے مقصد دظاہر ہے کہ قریش کے اس فخر و ناز پر ضرب لگانا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس گھر کا متولی جو سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ گمان جو رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے منظور نظر ہیں ان کو یہاں سے کوئی ہلا نہیں سکتا، یہ محض ایک زعم باطل ہے۔ لیکن اس سورہ میں صرف فرد قرار داد جرم بیان کر کے بات ختم کر دی۔ یہ نہیں بتایا کہ اس جرم پر یہ لوگ کس سزا کے مستحق ہیں؟ یہ بات مستقلاً سورہ زیر بحث میں بتائی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براہ راست خطاب کر کے بشارت دی ہے کہ اب خیر کثیر کے اس خزانہ یعنی بیت اللہ کو ان خائنوں سے لے کر ہم نے تمھاری تحویل میں دیا تو تم اپنے رب ہی کی نماز پڑھنا اور اسی کے لیے قربانی کرنا، ان مشرکوں کی طرح اس کو شرک سے آلودہ نہ ہونے دینا۔ ساتھ ہی مخالفین کو یہ وعید بھی سنادی کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جو رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں وہ اس گھر کی بدولت ہی حاصل ہوئیں، اس سے منقطع ہو جانے کے بعد وہ تمام برکتوں سے محروم ہو جائیں گے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ ان کی جڑ ہی کٹ جائے گی۔ ان برکتوں سے اب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نوازے گا جو اس کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور اس کے حقوق ادا کریں گے۔ وہ اس سرزمین میں ممکن و اقتدار حاصل کر کے اس گھر کو اس کے اصل ابراہیمی جمال سے منور کریں گے۔

یہ سورہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بشارت کی سورہ ہے اور اِنَّا اَعْطَيْنَاکَ میں حرف تاکید اور صیغہ ماضی وعدے کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے جس کی مثالیں قرآن میں جگہ جگہ موجود ہیں۔



اللہ تعالیٰ کے ہاں جو بات طے ہو جاتی ہے اس کو کوئی دوسرا بدل سکنے پر قادر نہیں اس وجہ سے اگرچہ وہ مستقبل کے متعلق ہو لیکن قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے صیغہ میں کی جاتی ہے بالجملہ بشارت کے مواقع میں۔

مکی زندگی کے آخری دور میں، جب مسلمانوں پر مکہ میں عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے فتح و غلبہ کی بشارت مختلف سورتوں میں دی گئی ہے۔ یہ بشارت بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس بشارت ہی کے سبب سے اس سورہ کو واقعہ حدیبیہ کے دور سے متعلق مانا ہے، اسناد امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، لیکن میرے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ قرب ہجرت کی سورتوں میں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اس قسم کی بشارتیں دی گئی ہیں اور وہ ہر گروپ کی آخری مکی سورتوں میں موجود ہیں۔ ان کے حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قریش پر روزِ اذل ہی سے یہ بات واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کا جھگڑا یہ ہے کہ ملتِ ابراہیم پر کون ہے، وہ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا پھر اسی جھگڑے کا لازمی نتیجہ یہ بھی وہ سمجھتے تھے کہ بیت اللہ کی تولیت کا اصلی حقدار وہی ہے جو اصل ملتِ ابراہیم کا وارث ہے۔ قریش اپنے موروثی پندار کی بنا پر اپنے آپ کو ملتِ ابراہیم کا وارث اور بیت اللہ کی تولیت کا حق دار سمجھتے تھے اور یہ رعوت ان کے اندر اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ حرم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے نماز پڑھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ذہن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے یہ حقیقت اچھی طرح راسخ ہو چکی تھی کہ بیت اللہ پر قریش کا قبضہ غاصبانہ ہے اور ایک دن اس کو ان کے قبضہ سے آزاد کرانا بعثتِ محمدی کی اصل غایت ہے۔

یہ بات بھی فریقین پر واضح تھی کہ جو اس گھر سے کٹا وہ ایک شاخِ بریدہ ہو کے رہ جائے گا اور اس کی جڑ سارے عرب سے کٹ جائے گی۔ یہ چیز بھی متفقہ تھی کہ ہجرت کے موقع ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اطمینان دلادیا جائے کہ بیت اللہ کی خدمت و تولیت کا ثمر ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ جو کشمکش اس وقت قریش کے ساتھ برپا ہے وہ اللہ کے رسول کے غلبہ پر منتہی ہوگی اور جڑ اللہ کے رسول کی نہیں کٹے گی، جیسا کہ قریش گمان رکھتے ہیں، بلکہ اعدائے رسول کی کٹے گی۔ درحقیقت نصرتِ الہی کی یہی بشارت تھی جس نے مسلمانوں کے لیے ہجرت جیسے کٹھن امتحان کو آسان بنا دیا ورنہ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کوئی آسان بازی نہیں تھی۔



# سُورَةُ الْكَوْثَرِ

مَكِّيَّةٌ \_\_\_\_\_ آیات: ۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا آتَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ②  
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ③

آیات  
۳-۱  
ع  
۳۳

ہم نے تم کو نبی کا کوثر تو اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھو اور اسی کے لیے  
قربانی کرو۔ تمہارا دشمن ہی منقطع ہونے والا ہے۔ ۱-۳

ترجمہ آیات  
۳-۱



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَنَا اَعْطَيْتُكَ الْكَوْثَرَ

لفظ کثرت کا: کثرت کے معنی دوات و ثروت کے ہیں۔ اس وجہ سے کثرت کے معنی ہوں گے بڑی کثرت اور بڑی برکت و ثروت والا۔ یہ تسمیہ کے لیے بھی استعمال ہے اور بطریق صفت بھی اس کا استعمال عام ہے۔

از روئے عربیت یہاں کثرت کی تین تاویلیں ممکن ہیں:

۱۔ یہ اسمیت کی طرف منتقل ہو کر کسی خاص چیز کے لیے مخصوص ہو گیا ہو جس کا نام اللہ تعالیٰ نے کثرت رکھا ہو۔

۲۔ اس کو کسی ایسے موصوفہ مخدود کی صفت مان لیا جس کے ساتھ اس کو خصوصیت ہو۔ مثلاً کہتے ہیں 'مرد علی جرد' یعنی رجاں مرد علی خیر جرد (نوخیز جوان اصل گھوڑوں پر) قرآن مجید میں ہے: 'وَالذَّرِيَّتِ' (الذریۃ - ۱: ۵۱) یعنی والد۔ الذریۃ (غبار اڑانے والی ہواؤں کی قسم)۔ لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہے جب صفت اس موصوفہ کے لیے اس طرح مخصوص ہو کہ یا تو صفت کا ذکر کرتے ہی موصوفہ ذہن میں آجائے یا کوئی واضح قرینہ اس کی طرف اشارہ کر دے۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اس کو اسمائے صفت کی طرح اس کے عموم ہی پر باقی رکھیے۔ اس صورت میں اس سے ہر وہ چیز مراد لی جاسکے گی جس میں خیر کثیر ہو۔ البتہ قرائن کے اشارے سے بعض افراد صفت پر اس کی دلالت زیادہ واضح ہوگی۔

لفظ کی لغوی تحقیق کے بعد اب یہ دیکھیے کہ سلف نے اس کے کیا معنی لیے ہیں۔

ابن جریر نے کثرت کی تاویل میں تین قول نقل کیے ہیں:

۱۔ کثرت جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، مجاہدؓ اور ابو العالیہؓ سے مروی ہے۔

۲۔ کثرت سے مراد خیر کثیر ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت سعید بن جبیرؓ، عکرمہؓ، قتادہؓ اور مجاہدؓ سے مروی ہے۔

۳۔ کثرت جنت میں ایک حوض ہے۔ یہ عطاءؓ سے مروی ہے۔



ان میں سے پہلے اور تیسرے قول میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو جس کا ذکر پہلے قول میں ہے۔ اس کے بعد صرف دو قول رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے خاص چیز مراد لی جائے، مثلاً حوضِ محشر، یا نہرِ جنت، دوسرا یہ کہ اس کو عام رکھا جائے تاکہ ہر وہ چیز مراد لی جاسکے جس میں خیرِ کثیر ہو۔

استاذِ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حسنِ تدبر سے ان دونوں قولوں میں نہایت خوبی سے تطبیق پیدا کر کے دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ انھوں نے سورہ کے موقع و محل اور اس کی اندرونی شہادتوں سے کوثر سے مراد خانہ کعبہ کر لیا ہے جو گونا گوں پہلوؤں سے خیرِ کثیر کا خزانہ بھی ہے۔ اور اس دنیا میں اس نہر کوثر کا حجاز بھی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں ملنے والی ہے۔ انھوں نے جن قرآن اور شہادتوں کی روشنی میں یہ بات فرمائی ہے اس کی وضاحت اپنی تفسیر سورہ کوثر میں فرمائی ہے۔ وہ کوثر کے باب میں اقوالِ سلف کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں،

”پچھلی نساخ میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر آخرت کے بارے میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کی عمومیت اور صیغہ ماضی کی رعایت سے وہ چیزیں بھی اس کے دائرہ میں داخل کر دی ہیں جو داخل ہو سکتی تھیں تاکہ لفظ عام وسیع اور اپنی دلالت میں اسمِ ماضی (کوثر) ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں جستجو اور کاوش جائز سمجھی ہے اگر اس کے منطقی کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے۔ اس وجہ سے میں اگر کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں جو زمین کے کوثر (خانہ کعبہ) اور آسمان کے کوثر کو ایک کر دے تو جس طرح میں سلف کو اس کی تاویل میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا البتہ یہ فرق ہو گا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دے کر اس سے حوض یا نہر جنت سمجھی اور ان کے ماسوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو، مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوت جن کو حوض یا نہر سے کوثری مناسبت نہیں ہے، مگر میں اس سے وہ چیز مرادوں گا جس کو حوض یا نہر سے نہایت واضح شاہد ہے، جس کی کیفیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اور جس کی تحقیقت و ردحانیت شبِ معراج میں آپ کے سامنے بے نقاب ہوئی۔“

اس تمہید کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جن سے ان کے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں،



۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے نفوس کے اندر خدا کی طرف ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے۔ نفس انسانی اس چیز سے محروم رہ کر تسلی نہیں پاسکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذہب و ادیان کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔ ..... اب سوچو کہ اس فطری اشتیاق اور چاہ کی موزوں تعبیر پیاس کے سوا کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ زبور میں یہی تعبیر بار بار استعمال ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو پیش نظر رکھ کر ان عاشقانِ الہی کے حال پر غور کرو جو حج کے ایام میں سراپا شوق و آرزو بن کر بیت اللہ کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں۔ کیا ان کی مثال ان خشک لب پیاسوں کی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطرب ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہو گئے ہوں؟ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خانہ کعبہ ان کے لیے اس دنیا میں اس حوض کوثر کی مثال ہے جس پر میدانِ حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

اربعیتم لوان نہر آباب بھلا تاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر  
احد کو یغتسل فیہ کل ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو  
یوم خمساً (الحديث) لڑکیا اس کے اوپر کچھ میل کچیل باقی رہے گا۔

یہ تشبیہ بھی اصلاً پانی ہی کی ہے۔ پانی جس طرح میرابی کا ذریعہ ہے اسی طرح طہارت کا بھی ذریعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے۔ اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اس سرچشمہ کی نہریں ہیں جن سے ہم میرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ خانہ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابل میں امت مسلمہ کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح حوض کوثر پر اس کے اجتماع سے بھی، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس کی کثرت کا اظہار ہوگا۔ اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین شکل یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو۔ اس اجتماع سے دوسری امتیں اندازہ کرتی ہیں کہ زائرین بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحر بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے جو پورے کرۂ ارض پر پھیلا ہوا ہے۔ پس جس طرح حوض کوثر پر اس کے اجتماع سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر اس کی کثرت واضح ہوگی اسی طرح موسم حج میں خانہ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع اظہار کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ غور کرو، لفظ 'کوثر' ان دونوں کی مطابقت کس خوبی سے واضح کر رہا ہے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی امت کو حوض کوثر پر دھوکے



آثار سے پہچانیں گے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ غلو میں قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔  
۵۔ فتح مکہ کو اللہ تعالیٰ نے امت کی کثرت کا سبب بنایا چنانچہ حج اکبر کے بعد لوگ گروہ درگروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

۶۔ مسجد حرام کو اللہ تعالیٰ نے مبارک (سرچشمہ خیر و برکت) کہا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ  
لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا  
وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ۔  
بلاشبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا وہی ہے جو مکہ میں ہے، سرچشمہ خیر و برکت اور لوگوں کے لیے نشان ہدایت۔

(ال عمران - ۹۶: ۳)

ہم نے اختصار کے خیال سے صرف چند اہم اشارات یہاں نقل کیے ہیں۔ جن لوگوں کو تفصیل مطلوب ہو وہ مولانا علیہ الرحمۃ کی تفسیر سورہ کوثر کی مراجعت کریں۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے چل کر اپنی تفسیر میں یہ بھی واضح فرمایا ہے کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی حقیقت ہے۔ ایک ضروری اقتباس اس سلسلے کا بھی ملاحظہ فرمائیے:

”معراج میں جو نہر کوثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی اس کی صفات پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی حقیقت ہے۔ اس کے متعلق مختلف طریقوں سے جو روایات منقول ہیں ان کی قدر مشترک یہ ہے کہ کوثر، ایک نہر ہے، اس کے کناروں پر عجوت موتیوں کے محل ہیں۔ اس کی زمین یا قوت و مرجان اور زیر جہد کی ہے۔ اس میں طرف ہیں جو آسمان کے تاروں کے مانند ہیں، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اس پر چڑیاں اترتی ہیں جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں۔“

آگے مولانا علیہ الرحمۃ ان مشاہدات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے زمین کے حوض کوثر اور آسمان کے حوض کوثر کی مشابہت یوں واضح فرماتے ہیں:

”اب ایک لمحہ توقف کر کے کعبہ اور اس کے ماحول کے مشاہدات پر غور کرو جب تمام انبیا و علم سے عشاق الہی کے قافلے، عشق و محبت الہی کی پیاس بجھانے کے لیے اس چشمہ خیر و برکت کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیا ان کے احساس روحانی میں اس مقدس وادی کے سنگ زیرے یا قوت و مرد سے زیادہ خوش جمال، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار اور اس کے ارد گرد



حجاج کے خیمے محو موتیوں کے تہوں سے زیادہ حسین و خوبصورت نہیں ہوتے! پھر حجاج اور ان کے ساتھ قربانی کے اونٹوں کی قطاروں پر بھی نظر ڈالو۔ کیا یہ ایک چشمہ کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ نہیں ہے؟

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جنت کے حوض کوثر اور خانہ کعبہ میں نسبت حقیقت اور مجاز کی ہے۔ یہی خانہ کعبہ جنت میں حوض کوثر کی صورت میں ان لوگوں کو ملے گا جو اس پر پہنچنے کے شوق میں بیت اللہ کے حج کرتے رہے۔ سورہ کے زمانہ نزول تک چونکہ حالات پردے میں تھے اس وجہ سے بات اشاروں میں فرمائی گئی ہے لیکن مقصد یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بشارت دی جائے کہ اگرچہ آپ کے اعداء آپ کو اس گھر سے نکلنے کے درپے ہیں لیکن ہم نے یہ آپ کو بخش دیا اور یہ اس دنیا میں بھی آپ کے لیے خیر کثیر کا ضامن ہے اور آخرت کی ہر کوثر کا بھی ضامن ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۲)

اس ذمہ داری کا بیان ہے جس کے ساتھ یہ عطیہ مشروط ہے۔ ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا ہونا لازمی اور اس کے ادا کرنے ہی پر اس حق کے قیام و بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ کوئی حق بھی ذمہ داری کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اور ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قریش کو اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی توحید نہایت اہم ذمہ داریوں کے ساتھ سونپی تھی جن میں سے اہتمام نماز اور انفاق (جس کی ایک معروف شکل بیت اللہ کے تعلق سے قربانی بھی ہے) کو خاص اہمیت حاصل تھی لیکن انھوں نے نماز اور قربانی دونوں ضائع کر دی۔ نماز کے ضائع کرنے کی جو شکل ہوئی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی۔ قربانی انھوں نے یوں ضائع کی کہ شرک میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے ان کی قربانی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں رہ گئی بلکہ اس میں ان کے شرکار و اصنام بھی شریک ہو گئے۔ یہاں جب اس عطیہ گرامی کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشے جانے کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی اس گھر سے متعلق ان دو بڑی ذمہ داریوں کی یاد دہانی بھی فرما دی جو اس کے مدعی متوہیوں نے ضائع کر دی تھیں اور جن کے ضائع کرنے کے جرم ہی میں وہ اس منصب سے معزول کیے جانے کے مستحق قرار پائے۔

قربانی کے لیے یہاں 'نَحْرُ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اونٹ کی قربانی کے لیے معروف ہے لیکن یہ اپنے عام استعمال میں دوسرے بہائم کی قربانی کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں خاص طور پر اس لفظ کے استعمال سے مقصود ابراہیمی قربانی کی طرف اشارہ کرنا ہے اس لیے کہ اونٹ کی قربانی ملت ابراہیم میں ایک محبوب قربانی تھی جس کو یہود نے اپنی بدعتوں کے تحت حوام قرار دے رکھا تھا۔ بعض لوگوں نے 'نَحْرُ' کے معنی نماز میں پسینہ پڑنا یا تھکا ہونے کے لیے ہیں لیکن لفظ کے معنی اختیار کرنے میں موقع و محل کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ یہاں یہ معنی لینے کا کوئی محل نہیں ہے۔ نماز اور قربانی کے حکم



کے لیے مزدوں موقع اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ لفظ 'کوثر' جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے، یہاں اپنے مجازی مفہوم یعنی خانہ مکعبہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

نماز کے ساتھ قرآن میں بالعموم اتفاق یا زکوٰۃ کا حکم آیا ہے لیکن یہاں قربانی کا ذکر آیا ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بیت اللہ جس طرح نماز کا مرکز ہے اسی طرح قربانی کا بھی مرکز ہے اور اس قربانی کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے غرباء و مساکین اور ضیوف الہی کی خدمت ہوتی ہے یعنی دوسرے روحانی مقاصد کے ساتھ ساتھ قربانی سے وہ مقصد بھی پورا ہوتا ہے جو اتفاق کا ہے۔  
 اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۳)

یہ قریش کے لیڈروں کی ان طعن آمیز پیشین گوئیوں کا جواب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے مستقبل سے متعلق وہ کرتے رہتے تھے۔ آپ کو کوثر دیا اور کوثر آخرت کی بشارت دینے اور اس کی ذمہ داریاں تباہی کے بعد فرمایا کہ تمہارے دشمن کہتے ہیں کہ تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے، تمہاری جڑ عنقریب کٹ جائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم کو دنیا اور آخرت دونوں کی نہایت شاندار فیروزندیاں حاصل ہونے والی ہیں البتہ تمہارے ان دشمنوں کی جڑ کٹ کے رہے گی۔ 'شانی' کے معنی مخلف اور عداوت کے ہیں اور 'ابتو' اس کو کہتے ہیں جس کے خلاف میں کوئی اس کا نام لیوانہ رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی راہ میں قریش نے اپنے جبر و ظلم کے زور سے مکہ میں تڑکچہ رکاوٹیں پیدا کر رکھی تھیں لیکن اطراف بالخصوص مدینہ میں بالتدریج دعوت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس سے قدرتی طور پر انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے عوام اس صورت حال سے متاثر ہوں گے اور وہ ان وعیدوں کو سچ باد رکھنے لگیں گے جو قرآن قریش کے لیڈروں بالخصوص حرم کے پردہنتوں کو سنا رہا تھا۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر عوام کا اعتماد ان کی نیابت پر متزلزل ہو گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ان کا حسن ظن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑھے گا اور وہ آپ کو مستقبل کے متوقع لیڈر کی حیثیت سے دیکھنے لگیں گے جس سے دعوت کی کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے۔ اس خطرے کے سدباب کے لیے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل سے متعلق بالوسی پیدا کرنے والی پیشین گوئیاں پھیلانی شروع کر دیں تاکہ لوگوں کے اندر یہ خیال زور نہ پکڑنے پائے کہ آپ کا اثر روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مختلف قسم کی باتیں بنائیں، از انجملہ دعوت کی طرف انصار کے میلان کو دیکھ کر انھوں نے یہ بات بھی پھیلانی شروع کی کہ یہ شخص اپنے نئے دین کے سبب سے اپنی قوم اور اپنے مرکز دینی (بیت اللہ) سے کٹ چکا ہے اور اب اگر اس نے ہم سے کٹ کر اجنبیوں کے اندر یعنی انصار کے اندر ناہلی تو اس کی مثال ایک شاخ بریدہ کی ہوگی جو درخت سے جدا ہو چکی ہے



اور جس کا سوکھ جانا لازمی ہے۔ ہجرت سے متصل زمانہ میں یہ قیاس لوگ کرنے لگے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اپنی قوم اور سرزمین مکہ کو چھوڑا تو آپ انصار کے پاس جائیں گے اس لیے کہ وہی اس پوزیشن میں تھے کہ آپ کی حمایت و نصرت کر سکیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قریش نے انصار کے بعض قبائل کو، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے آئے تھے، یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر آپ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں تو یہ سوچ کر بیعت کیجیے کہ یہ بیعت اسود و احمر سے جنگ کے لیے کر رہے ہیں۔ لیکن ان دھمکیوں کا انصار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی عقیدت اور اسلام کے ساتھ ان کی محبت برابر بڑھتی گئی۔ یہ رنگ دیکھ کر اگرچہ قریش کو اپنے پروپیگنڈے میں کامیابی کی کوئی توقع باقی نہیں رہی لیکن وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہ ہجرت سے پہلے بھی اپنے عوام کو یہی باور کراتے رہے کہ انصار کی حمایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوگی اور ہجرت کے بعد بھی یہی باور کراتے رہے کہ اب ایک اجنبی ماحول میں العیاذ باللہ داعی اور دعوت دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن پیشین گوئی سچی قرآن کی ثابت ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداد کی جڑ کٹ کے رہی اور حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا کے کوثر سے بھی فیضیاب ہوئے اور جنت کے کوثر پر بھی آپ سب سے پہلے پہنچیں گے اور اپنی امت کی کثرت کا مشاہدہ فرمائیں گے۔ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ فالحمد لله حمداً کثیراً۔

لاہور

۸۔ جون ۱۹۸۰ء

۲۴۔ رجب ۱۴۰۱ھ



تذکرہ قرآن

۱۰۹

الکُفْرُون







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا اعمو، سابق سورہ سے تعلق اور دعا کی ترتیب

اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قریش کے ائمہ کفر سے براءت کا اعلان ہے پچھلی سورتوں میں بھی تمام تر بحث قریش کے لیڈروں ہی سے رہی ہے لیکن خطاب ان سے قومی اور انسانی بنیاد پر ہوا ہے، کہیں بھی 'يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ' کے الفاظ سے ان کو خطاب نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اس سورہ میں ان کو صاف صاف 'اے کافرو!' کے الفاظ سے مخاطب کر کے ان سے بالکل حتمی طور پر قطع تعلق اور براءت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ اعلان براءت رسولوں کی اس سنت کے مطابق ہوا ہے جس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے کہ اللہ کے رسول اپنی قوم کو پہلے دین کی بنیاد کی باتوں ————— توحید اور قیامت ————— کی دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت میں وہ قوم کو اپنی قوم ہی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہیں اور اس پر اس وقت تک پوری استقامت سے جھمکے رہتے ہیں جب تک قوم کے ایمان و اکابر اپنے رویہ سے ان کو مایوس نہیں کر دیتے۔ جب وہ مایوس کر دیتے ہیں اور بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ہٹ دھرم اپنی ضد سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور وہ قوم سے اعلان براءت کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ رسول کی ہجرت قوم کے لیے گویا آخری تنبیہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے رویہ میں کوئی اچھی تبدیلی نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایک محدود مہلت دینے کے بعد قوم کے تمام مکتذبین کو تباہ کر دیتا ہے، خواہ یہ تباہی رسول کی زندگی ہی میں واقع ہو یا اس کے بعد اور خواہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی قہر آسمانی نازل کرے یا رسول کے ساتھیوں کی تلوار اس کے لیے بے نیام ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام رسولوں کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے اس میں یہ مشترک حقیقت موجود ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت برابر کرتے آ رہے ہیں۔

یہاں 'يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ' سے خطاب، ظاہر ہے کہ انہی ائمہ کفر سے ہے جو اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان کی مسلسل مخالفت نے یہ حقیقت واضح کر



دی تھی کہ یہ چیز کسی شبہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ موروثی قیادت کا پندار ہے جس نے ان کو بالکل اندھا بہرا دشمن بنا دیا ہے اور اب خدا کے تازیانہ عذاب کے سوا کوئی اور چیز ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔  
مخاطب کی اس ذہنیت کی بنا پر اس سورہ میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں وہ بالکل دو ٹوک الفاظ ہیں فرمائی گئی ہیں اور ہر بات بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ جن لوگوں نے اس خطاب کو مذمت یا غضب پر محمول کیا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی جماعت کا کفر اس وقت تک واضح ہوتا ہی نہیں جب تک اہل حق اس پر اتمام حجت نہ کر دیں۔ اتمام حجت کے بعد ہی اس کا کفر واضح ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی یہ بات جائز ہوتی ہے کہ اہل حق اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیں بلکہ ضرورت داعی ہو تو اس سے جہاد کریں۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے ہجرت اور جہاد کے لیے اتمام حجت کے بعد ہی کیا ہے اور یہی حق و عدل کا تقاضا ہے۔

اس سورہ نے قریش کے لیڈروں کے ساتھ دین کے معاملے میں کسی سمجھوتے کے تمام امکانات کا قطعی سد باب کر دیا ہے اس وجہ سے یہ صرف ہجرت ہی کی سورہ نہیں بلکہ یہ معنا اعلان جنگ کی سورہ بھی ہے۔ سورہ یونس میں وضاحت سے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ قریش کے لیڈروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اگر ہم سے اپنے دین کو منوانا ہے تو اس کی واحد شکل یہ ہے کہ یا تو اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ایسی مناسب ترمیم کر دو کہ یہ ہمارے لیے قابل قبول ہو سکے: 'إِنَّمَا نَبْقُوَانِ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ' (یونس - ۱۰: ۱۵) اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کر دو۔ اس آیت کی تفسیر کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سب سے زیادہ اصرار قرآن کی دعوت توحید کی ترمیم پر تھا، وہ اس کو اپنے آباء کے عقیدے کے بھی خلاف سمجھتے تھے اور یہ اندیشہ بھی رکھتے تھے کہ اگر اللہ کے سوا انھوں نے تمام معبودوں کو ہی باطل ٹھہرا دیا، جیسا کہ قرآن مطالبہ کر رہا ہے تو اس سے ان کی سیاسی ہستی ہی سرے سے ختم ہو جائے گی۔ ان کے اس مطالبہ کا جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دیا گیا کہ قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَ لَہٗ مِنْ تَلْفَآئِ نَفْسِیْ (یونس - ۱۰: ۱۵) ان سے کہہ دو کہ مجھے کیا حق ہے کہ میں بطور خود اس میں کوئی ترمیم کر دوں (اگرچہ یہ جواب قریش کے لیے مایوس کن تھا لیکن فیصلہ کن نہیں تھا۔ لیکن اس سورہ میں اس کا ایسا حتمی اور فیصلہ کن جواب دیا گیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس بحث کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ اس معاملے میں اب کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہے، اگر قریش اپنی فتنہ پر قائم رہے تو بالآخر



اس کا فیصلہ تلواریں سے ہوگا۔

ترتیب میں اس سورہ کا سورہ کوثر کے بعد جگہ پانا بھی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے سورہ کوثر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ فتح مکہ کی بشارت ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہجرت اور اعلان جہاد کی سورہ سے پہلے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح و نصرت کی بشارت دے دی گئی تاکہ حضور ادرآپ کے صحابہ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اگرچہ آگے ہجرت اور جنگ کے کٹھن مرحلے آنے والے ہیں لیکن انجام ان کا نہایت شاندار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے رسول کو فتح سے نوازے گا اور وہ دنیا و آخرت دونوں کے کوثر سے شاد کام ہوں گے۔ اسی طرح کی بشارت حضور کو ہجرت کی اس دعا میں دی گئی ہے جو سورہ بنی اسرائیل میں مذکور ہے:

وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مَدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مَخْرَجَ صِدْقٍ (بنی اسرائیل - ۱۰۰: ۸۰)

راوردعا کر دے کہ اے میرے رب، مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور نکال عزت کا نکالنا) اس دعا پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کے پیرائے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دے دی ہے کہ اگرچہ آپ کے مکہ سے نکلنے کا وقت اب قریب آ رہا ہے لیکن اس نکلنے سے پہلے ہی اللہ نے دارالہجرت میں آپ کے شاندار داخلہ کا انتظام کر لیا ہے۔

مختصر الفاظ میں اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کے لیڈروں کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان دین کے بنیادی مسئلہ ————— معبود ————— کے باب میں کوئی قدر مشترک نہ حاضر ہیں ہے نہ ماضی میں رہی ہے اور نہ مستقبل میں اب اس کے پائے جانے کا امکان ہے اس وجہ سے ہمارے مابین کسی معاہدت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اب تم اپنے دین پر چلو، ہم اپنے دین پر چلیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔







# سُورَةُ الْكَافِرِينَ

مَكِّيَّةٌ ۖ آیات: ۶

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ① لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ② وَلَا  
أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ③ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ④  
وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ⑤ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ⑥

آیات  
۶-۱

۱  
۶۴

کہہ دو، اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجنے

ترجمہ آیات  
۶-۱

کے جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے والا ہوں جن کو تم نے پوجا اور نہ تم پوجنے

والے ہوئے جسے میں پوجتا آ رہا ہوں۔ ۱-۵

تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین! ۶



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق و آیات کی وضاحت

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱)

’قُل‘ یہاں اعلان کر دینے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔

’قُل‘ اعلان

اس سورہ کا مضمون اعلان کا مقصد تھا تاکہ جو مفسدین کفر اور اسلام کے درمیان سمجھوتے کے غلط فہمی میں مبتلا تھے وہ بھی اپنی اس سعی نامراد سے مایوس ہو جائیں اور جو سادہ لوح اس طرح کی تجویزیں پیش کرنے والوں کو امن پسند اور صلح جو گمان کر رہے تھے ان پر بھی اصل حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ صلح و امن کی راہ نہیں بلکہ فساد کی مستقل پرورش کی راہ ہے۔

کے مضمون میں

ائمہ کفر سے

خطاب

’يَٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ‘ کا خطاب ظاہر ہے کہ قریش کے ان ائمہ کفر سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطب اول تھے لیکن آپ کی برسوں کی جدوجہد کے بعد ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی ہوئی تو یہ ہوئی کہ انھوں نے کفر اور اسلام دونوں کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ رسولِ اتمامِ حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر اس کی محنت بھی ان کو متاثر نہ کر سکی تو اس کے معنی یہ ہونے کہ پھر کوئی بھی دوسرا ایسی چیز نہیں رہ گئی تھی جو ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ چنانچہ ان لوگوں کے بارے میں آگے اس سورہ میں جس مایوسی کا اظہار فرمایا گیا ہے وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ان میں سے کوئی بھی اسلام لانے والا نہیں بنا بلکہ ہر ایک اپنے غرور اور انانیت کا شکار ہوا۔

دوسرا سوال اور

ان کے جواب

یہاں اس خطاب سے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن میں عام طور پر قریش کے لیڈروں کو اس طرح کے سخت خطاب سے کہیں مخاطب نہیں کیا گیا ہے، پھر اسی سورہ کی کیا خصوصیت ہے کہ اس میں ان کو ’يَٰٓأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ‘ سے خطاب کیا گیا۔ دوسرا یہ کہ قریش بلکہ اہل عرب بالعموم خدا کے منکر نہیں بلکہ اس کے شریک ٹھہرانے والے تھے تو قرآن نے ان کو اے کافر، کیوں کہا، اے شرکاء سے کیوں نہیں خطاب کیا؟

ان دونوں سوالوں کے جواب اگرچہ اس کتاب میں جگہ جگہ دیے جا چکے ہیں اور تمہید میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے لیکن ہم یہاں پھر ان کو صاف کیے دیتے ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضور نے یہ انداز خطاب اس وقت اختیار فرمایا ہے جب اچھی طرح اتمامِ حجت کر دینے کے بعد، قوم کے رویہ سے بالکل مایوس ہو کر، اللہ تعالیٰ کے اذن سے، آپ نے ہجرت کا فیصلہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کو ہجرت کا حکم اسی



وقت دیتا ہے جب قوم کے مدبر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر ایمان قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے اور اس کی مکابرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر اس کا مزید تعاقب کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ خدا نخواستہ وہ رسول کو قتل کر دے۔ اس مرحلے میں رسول کے لیے یہ بات بالکل معقول ہوتی ہے کہ وہ قوم اور قوم کے مبعودوں سے اپنی کامل بیزاری کا اعلان کر کے ان سے الگ ہو جائے اور چونکہ رسول کی دعوت سے کفر اور اسلام دونوں کی اچھی طرح وضاحت ہو چکی ہے اس وجہ سے جو بھی ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرتا ہے، اس کے متعلق اس شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس نے کفر یا اسلام میں سے کسی کو بے سمجھے بوجھے اختیار کیا ہے اس وجہ سے اگر اس دور میں رسول کفر پھاڑے رہنے والوں کو اے کافر! سے خطاب کرتا ہے تو یہ خطاب بالکل بر محل، جائز اور معقول ہوتا ہے۔

اس سے ہمارے لیے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ جو چیز کفر یا شرک ہے اس کو کفر یا شرک بتانا اور اس سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کرنا تو ہر مسلمان کی ہر لمحہ ذمہ داری ہے لیکن کسی فرد یا گروہ کو کافر قرار دے کر اس سے اعلانِ برائت کرنا یا اپنے جملہ روابط اس سے کاٹ لینا یا اس سے اعلانِ جنگ کر دینا بڑی احتیاط کا متقاضی ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کا مسئلہ بڑا مشکل ہے جو اپنی ہر گمراہی کو اسلام بناٹے ہوئے ہوں اور صحیح اسلام ان کے آگے پیش کرنے کا کوئی شرعی نظام موجود نہ ہو۔ اس طرح کے حالات میں صحیح راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی غلطیوں اور گمراہیوں پر تنقید تو کرے اور لوگوں کے ان افعال میں شرکت سے اجتناب بھی کرے جو شرکت و بدعت کی نوعیت کے ہوں لیکن ان کو کافر قرار دے کر ان سے کھینٹ غلیجہ کی کا اعلان اس وقت تک نہ کرے جب تک اس کے لیے مجبور نہ ہو جائے یا یہ باور کرنے کے لیے اس کے سامنے معقول وجوہ نہ آجائیں کہ اس نے لوگوں پر سختی واضح کر دیا اور یہ دوسری چیز نہایت مشکل ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شرک حقیقت میں کفر ہی ہے۔ دین میں ایمان صرف وہی معتبر ہے جو کامل توحید کے ساتھ ہو یعنی آدمی خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق میں کسی دوسرے کو کسی پہلو سے بھی شریک نہ ٹھہرائے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ایمان اور اس کی بندگی کا محتاج نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کا ایمان اور ہر قسم کی بندگی قبول ہی کر لے اگرچہ اس میں شرک کی ملاوٹ بھی ہو۔ وہ اپنی بندگی اپنی شرائط پر چاہتا ہے، نہ کہ دوسروں کی شرائط پر، اس وجہ سے ہر وہ عمل خدا کے ہاں غیر مقبول ہے جو صرف اسی کے لیے نہ کیا گیا ہو بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کر دیا گیا ہو۔ قرآن کے فلسفہ کی رو سے اس شخص میں جو خدا کا منکر ہے اور اس شخص میں جو اس کو مانتا ہے لیکن خدا نے واحد کی حیثیت سے نہیں بلکہ بہت سے دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا یا سید سے بڑے دیوتا



کی حیثیت سے مانتا ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں ہی خدا کے منکر یا دوسرے الفاظ میں کافر ہیں۔ اس لیے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی ہے اور صفات کی نفی کے ساتھ اس کو ماننا اس کے نہ ماننے کے ہم معنی ہے۔ قرآن نے یہاں ان مشرکوں کو کافر کہہ کر اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ شرک درحقیقت کفر ہی ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ کسی دجے میں بھی کفر کے مقابلے میں اہوں یا قابل لحاظ ہے۔

لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ (۲)

مبھرتے کی پیشکش کا جواب  
کفر کے سرغٹوں کو خطاب کر کے یہ ان کی اس پیشکش کا جواب ہے جو وہ باہمی سمجھوتے کے لیے کر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں ان چیزوں کو نہیں پوجوں گا جن کو تم پوجتے ہو۔ گویا پہلے ہی فقرے میں ان کی توقع کا خاتمہ کر دیا۔

عام طور پر لوگوں نے 'لَا أَعْبُدُ' کو حال کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس کو حال کے مفہوم میں لینا صاحب کشف کے نزدیک عربیت کے خلاف ہے اور میرے نزدیک ان کی رائے صائب ہے۔ مضارع پر جب اس طرح 'لا' آئے گا تو وہ مضارع کو لازماً مستقبل کے مفہوم میں کر دے گا۔ حال کے مفہوم کے لیے 'لا' نہیں بلکہ 'ما' کا استعمال موزوں ہے۔

علاوہ ازیں حال سے متعلق کسی نفی یا اثبات کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں۔ قریش میں سے ہر شخص کو علم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان بتوں میں سے کسی کو نہیں پوجتے۔ پھر ان کو یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم پوجتے ہو؟ سمجھوتے کی تجویزیں پیش کرنے سے ان کا اصلی مقصد تو یہی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس رویے میں کچھ لمچک پیدا کریں جس میں دوسرے معبودوں کے لیے سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ ان کی اس توقع پر ضرب لگ سکتی تھی تو اسی صورت میں لگ سکتی تھی جب ان کو آئندہ کے لیے یہ یقین دلادیا جائے کہ خدا کی توحید کے باب میں آپ کوئی لمچک قبول کرنے والے نہیں ہیں۔

سورہ قلم کی آیت دَدُّوا لَوْ تَدْرُوهُنَّ فَيُكْفِّرْنَ بَعْضُهُنَّ بِالْبَعْضِ (۴: ۶۸) (وہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم پڑ جائیں گے) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ قریش اپنے جبر و ظلم کے تمام حربے آزما کر ہجرت سے کچھ پہلے پہلے یہ اندازہ کر چکے تھے کہ اسلام کی روز افزوں ترقی کو روکنا ان کے امکان میں نہیں رہا۔ اب اگر کچھ امکان ہے تو صرف یہ ہے کہ دباؤ ڈال کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ کچھ دواور کچھ لو کے اصول پر معاملہ کرنے کی طرف مائل ہوں یعنی جس



طرح ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ایک تمام تسلیم کرتے ہیں اسی طرح آپ ہمارے بتوں کے لیے بھی عبادت میں ایک حق تسلیم کر لیں تو یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ ان کو توقع تھی کہ دباؤ ڈال کر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا موقف تسلیم کرالیں گے چنانچہ انھوں نے اپنا پورا زور صرف کر دیا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کی راہ اختیار کرنی پڑی لیکن دین کی بنیاد چونکہ توحید ہی پر ہے اس وجہ سے ہجرت کے استمان سے گزرتا گوارا کر لیا گیا لیکن اس معاملے میں کوئی یک گوارا نہیں کی گئی بلکہ صاف صاف لَا أَتَّبِعُونَ مَا تَدْعُونَ کا اعلان کر دیا گیا۔

وَلَا أَتَّبِعُونَ مَا تَدْعُونَ ۚ أَعْبُدُوا ۲

ساتھ ہی ان کو اس حقیقت نفس الامری سے بھی حضور نے آگاہ فرما دیا کہ تم جو یہ گمان کیے ایک حقیقت بیٹھے ہو کہ تم اس خدا کو پوجنے والے ہو یا بن جاؤ گے جس کو میں پوجتا ہوں تو تمھارا یہ گمان محض گمان نفس الامری ہے۔ میرے پروردگار کی بندگی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ بندگی صرف اسی کا حق ہے، اس میں کوئی دوسرا اس کا ساتھ نہیں ہے۔ تم اگر اپنے دیویوں دیوتاؤں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو تو اس کے پرستار بھی نہیں بن سکتے۔ یہ تمھارا محض مغالطہ ہے کہ تم اپنے کو خدا کی عبادت کرنے والا سمجھتے ہو۔ خدا کی عبادت کے ساتھ کوئی اور عبادت جمع نہیں ہو سکتی۔ اس کی بندگی میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے تمام معبودوں کو باہر چھوڑ کر آؤ۔ اگر اس کی بندگی کے ساتھ تم نے ان کی بندگی بھی جمع کرنے کی کوشش کی تو اپنے معبودوں کے پرستار تو بے شک رہو گے لیکن خدا کی بندگی میں تمھارا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

مشرکین کے معبودوں کے لیے مَا تَعْبُدُونَ کا استعمال بالکل ٹھیک ہے اس لیے کہ وہ فرضی اور وہی چیزوں کی پوجا کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے عَبَدُوا کا استعمال کچھ کھٹکتا ہے۔ یہ مجاہد کے اسی اصول پر استعمال ہوا ہے جس کی مثالیں عربی زبان اور قرآن دونوں میں معروف ہیں، شَرَّ دَنَائِهِمْ كَدَاثًا أَوْ يَابِسًا ۚ وَمِنْ ثَمَرِهِ نَبْذٌ ۚ إِنَّ الشَّيْءَ إِذَا رُفِيَ عَنِ الشَّيْءِ أَوْ يَابِسًا ۚ وَمِنْ ثَمَرِهِ نَبْذٌ ۚ (الشوریہ ۲۰: ۲۰) وغیرہ۔ اس اسلوب پر اس کے محل میں منسل گفتگو ہو چکی ہے۔

وَلَا أَتَّبِعُونَ مَا تَدْعُونَ ۚ أَعْبُدُوا ۲

ادھر کا اعلان تو، جیسا کہ واضح ہوا، مستقبل سے متعلق ہے۔ اب یہ ماضی سے متعلق بھی آپ نے اپنا موقف واضح فرما دیا کہ ماضی میں بھی میں ان چیزوں کا پرستار نہیں رہا ہوں جن کی تم نے پرستش متعلق تھی

کا اظہار



کہ صاف بکشتاف نے اس آیت کی یہی تاویل کی ہے اور مجھے زبان اور نظام دونوں پہلوؤں سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

’وَلَا أَنَا عَابِدٌ‘ کا جملہ اسمیہ ہے اس وجہ سے اس کے حاضر، ماضی اور مستقبل میں سے کسی کے ساتھ مقید ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تینوں زمانوں کے ساتھ یکساں مربوط ہو سکتا ہے بشرطیکہ قرینہ ان میں سے کسی کو ترجیح نہ دے۔ یہاں ’مَا عَبَدْتُكَ‘ چونکہ ماضی ہے اس وجہ سے یہ واضح قرینہ ہے کہ ’وَلَا أَنَا عَابِدٌ‘ کی نفی ماضی ہی سے متعلق ہے یعنی میں پہلے بھی کبھی ان چیزوں کا پوجنے والا نہیں رہا ہوں جن چیزوں کو تم نے پوجا۔

اس کلام کا فائدہ یہ ہو گا کہ اس اعلانِ برائت کی شدت میں اس سے بڑا اضافہ ہو جائے گا جو اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ جب میں تمہارے ان بتوں کو اپنی زندگی کے اس دور میں بھی کبھی خاطر میں نہیں لایا جب میں ثمرتِ نبوت سے مشرّف اور نورِ وحی سے منور نہیں ہوا تھا تو اب جب کہ میں براہِ راست اپنے رب سے ہدایت حاصل کر رہا ہوں تمہاری اس ضلالت میں کس طرح مبتلا ہو سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہو گا کہ کوئی دور بھی میری اور تمہاری زندگی میں اگر ایسا گزرا ہو تا جب میں تمہارے اس دینِ شرک میں شریک رہا ہوتا تو تم مجھ سے یہ توقع کر سکتے تھے کہ شاید میں سابقِ دین پھر اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا لیکن جب میرا دامن جاہلیت میں بھی شرک سے داغدار نہ ہوا تو اب مجھ سے اس کی توقع تم کیسے کر رہے ہو!

’وَلَا أَتَمَّ عِبْدُكَ مَا عَبَدْتُ‘ (۵)

یہ آیت لفظاً تو آیت ۳ کا اعادہ ہے اس وجہ سے تکرار کا شبہ پیدا ہوتا ہے لیکن معنایاً یہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا تعلق آیت ۴ کی طرح دورِ ماضی سے ہے جب کہ آیت ۳ کا تعلق ’جیسا کہ واضح ہوا مستقبل سے ہے۔ یعنی قریش کے لیڈروں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تم اگر اس معاملے میں مبتلا ہو کہ ماضی میں تم بھی اسی معبود کی پوجا کرتے رہے ہو جس کی میں پوجا کرتا رہا ہوں تو یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔ شرک کے ساتھ میرے معبود کی پرستش کا، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، کوئی امکان ہی نہیں ہے اور تم شرک سے کبھی پاک نہیں ہوئے اس وجہ سے نہ میں کبھی تمہارا دینی بھائی بنا نہ تم میرے دینی بھائی بنے تو یہ توقع تم کس طرح کرتے ہو کہ اپنی اس گندگی میں لہقرے ہوئے تم مجھے اپنا دینی بھائی بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے!

یہاں بادلِ دہلہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مطلب آیت کا یہ ہے، جو ہم نے اختیار کیا ہے تو ’مَا عَبَدْتُ‘ کی جگہ ’مَا عَبَدْتُكَ‘ کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب صاحبِ کثافت نے یہ دیا ہے کہ ’مَا عَبَدْتُ‘ اس لیے نہیں فرمایا کہ اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی بندگی نہیں کی



اس وجہ سے آپ نے اس کا حوالہ نہیں دیا بلکہ صرف حال کا حوالہ دیا لیکن یہ جواب بالکل غلط ہے۔  
حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرتاً سلیم برہن تھے اور توحید چونکہ دین فطرت ہے  
اس وجہ سے وہ کبھی فطرت کے خلاف شرک یا بتلا نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی وہ لازماً اپنے رب کی  
کسی نہ کسی شکل میں عبادت بھی کرتے رہے ہیں اگرچہ وہ طریقہ انھوں نے اپنے اجتہاد سے اختیار  
کیا ہو یا دین کی سابق روایات سے اخذ کیا ہو۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے بھی  
عبادت کرتے تھے اگرچہ اس کا طریقہ واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں ہے تاہم اتنی بات معلوم ہے  
کہ اس کی بنیاد حقیقت پر تھی جس کی روایت حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل علیہما السلام کے زمانے  
سے کسی نہ کسی شکل میں چلی آرہی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک 'مَا عَبَدْتُ' نہ کہنے کی وجہ  
صحیح نہیں ہے جو صاحب کشاف نے بیان کی ہے بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ آپ  
کا تعلق صرف ماضی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ نے جس طرح ماضی میں اپنے رب ہی کی عبادت  
کی اسی طرح آپ حاضر میں بھی اسی کی عبادت پر قائم تھے اس وجہ سے آپ نے 'مَا عَبَدْتُ' فرمایا  
جس سے تسلسل اور استمرار کا اظہار ہوا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ تم اس خدا کے پوجنے والے ماضی میں  
بھی نہ بنے جس کی بندگی میں نے ماضی میں بھی کی اور اب بھی اس پر قائم و دائم ہوں۔

لَكُمْ دِينُكُمْ دِينِ الْاٰیٰتِ (۶)

یعنی جب میرے دین اور تمہارے دین میں کوئی اشتراک ماضی میں نہ ہوا، نہ حاضر میں ہے  
تو آئندہ کس طرح توقع کرتے ہو کہ ہم کسی ایک نقطہ پر مجتمع ہو سکیں گے۔ اس وجہ سے سمجھوتے کی توقع  
بالکل لا حاصل ہے۔ میرے لیے میرا دین ہے اور تمہارے لیے تمہارا دین۔ میں اپنے طریقہ پر کام  
کرتا ہوں اور تم اپنے طریقہ پر کام کرو اور دیکھو کہ انجام کار میری بات سچی ثابت ہوتی ہے یا تمہاری  
یہی بات سورہ انعام میں یوں ارشاد ہوئی ہے: 'ثُمَّ لَيَقُوْمُنَّ اَعْمَلُوْا عَلٰی مَا كُنْتُمْ كُفْرًا فِیْ غَمٰلٍ'  
(الانعام - ۴: ۱۳۵) (کہہ دو، اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ پر کام کرو، میں اپنی جگہ پر کام کرتا ہوں)  
سورہ ہود آیت ۹۳ اور سورہ زمر آیت ۳۹ میں بھی دوسرے رسولوں سے یہی کلمات نقل ہوئے ہیں  
اور مقصد اس سے صرف اس بحث و جدال کے دروازے کو بند کرنا ہے جو مخالفین اس مقصد سے  
کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے موقف کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس اعلان سے آپ  
نے ان کو آخری آگاہی دے دی کہ نہ آپ اپنے دین سے ذرہ برابر ہٹنے کے لیے تیار ہیں اور  
نہ ان کے دین کے لیے ہی کوئی مقام تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو رواداری کے مفہوم میں لیا ہے حالانکہ یہ کفار کے رویہ سے  
بیزاری بلکہ انجام کار کے اعتبار سے ان سے ابدی مفارقت اور اعلان جنگ کے مفہوم میں ہے۔  
حضرت ابراہیم  
کے اعلان کا  
اعادہ



مختصر الفاظ میں یہ وہی اعلان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے کیا تھا، جس کا حوالہ قرآن نے ان الفاظ میں دیا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي  
إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا  
لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءُوكُمْ فَاصْطَلُوا  
مَعَ اللَّهِ عِبَادُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ  
كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَ  
بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ  
أَبَدًا حَتَّى تَوْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدُّكَ  
(المستحسنة - ۶۰، ۶۱)

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی  
زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ یاد کرو جب کہ انہوں  
نے اپنی قوم سے کہا کہ تم تم سے اور ان چیزوں سے  
جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بری ہو،  
ہم نے تمہارے عقیدے کا انکار کیا اور ہمارے  
اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت  
اور نفرت آشکارا ہو گئی تاکہ تم اللہ و وحدہ  
لا شریک لہ پر ایمان لاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اصحاب کا یہ اسوہ حسنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
اور آپ کے صحابہؓ کے سامنے رکھا ہی اس لیے گیا تھا کہ اسی طرح کا اعلان برائت آپ اور آپ  
لے صحابہؓ اپنی قوم سے کریں چنانچہ اسی کی پیروی میں یہ اعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
تو اس کے اندر رد اداری کی گنجائش کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ کلام کے سیاق و سباق اور نظم کی  
رعایت ملحوظ نہ رکھنے سے ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ بیزاری اور رد اداری کے  
کلمہ میں امتیاز سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں اور یہ آیت اس کی ایک نہایت عبرت انگیز مثال ہے۔  
اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر اتمام کو پہنچی۔ وَاخُذُوا  
إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

لاہور

۲۴۔ جون ۱۹۸۰ء

۱۰۔ شعبان ۱۴۰۰ھ



تدبر القرآن

١١٠

النَّصْر







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کا خلاصہ

سابق سورہ ————— الکفرون ————— سے متعلق وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ براہِ امت ہجرت اور منشا اعلانِ جنگ کی سورہ ہے۔ اب اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ آپ کے لیے خاص نصرتِ غیبی ظاہر ہوگی، مکہ فتح ہوگا اور جس مشن پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مامور فرمایا آپ اس سے سرخ روئی کے ساتھ فارغ ہو کر اپنے رب کی خوشنودی و رضا مندی سے سرفراز ہوں گے۔ سورہ فتح کی ابتدائی آیات میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ وہاں ہم نے وضاحت سے اس کے ہر پہلو پر بحث کی ہے تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

ہجرت، جہاد اور فتح و نصرت میں جو گہرا ربط ہے اس کی طرف ہم سابق سورہ ————— الکفرون ————— میں بھی اشارہ کر چکے ہیں اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ رسولوں کی دعوت میں ہجرت کا مرحلہ ہی وہ مرحلہ ہے جب ان کی قوم پر اللہ کی حجت تمام ہوئی ہے، جب انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ، قوم سے الگ ہو کر، اپنی ایک خاص ہیئتِ تنظیمی بنائی ہے، جب قوم تمام صالح عناصر سے خالی ہو جانے کے سبب سے بالکل ایک جسدِ بے روح ہو کر رہ گئی ہے اور اہل ایمان اپنے عقائد و تصورات کی آزاد فضا میں پہنچ کر ایک ایسی ناقابلِ تسخیر قوت بن گئے ہیں کہ جو ان سے ٹکرایا اس نے شکست کھائی اور جس پر وہ گرے اس کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ رسولوں نے اپنے دشمنوں سے جو جنگ کی ہے وہ ہمیشہ ہجرت کے بعد ہی کی ہے اور اس جنگ میں اگرچہ جماعت کی تربیت کے پہلو سے بعض اوقات آزمائشیں بھی ان کو پیش آئی ہیں لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ان کو وہ فتح حاصل ہوئی ہے جس کو چیلنج کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

ہجرت اور فتح و نصرت کے درمیان یہی وہ رشتہ ہے جس کے سبب سے یہ سورہ جو بالاتفاق مدنی ہے، ایک کی سورہ کی ثنائی قرار پائی۔ اس سورہ کے زمانہ نزول سے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد



نازل ہونے والی سورتوں میں یہ سبب سے آخری سورہ ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک اسی دوسرے قول کو ترجیح حاصل ہے۔

اس کی اول وجہ یہ ہے کہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بات واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملتِ ابراہیم پر ہوئی تھی اور ملتِ ابراہیم کا اصل مرکز چوکہ بیت اللہ ہی تھا اس وجہ سے اس کو خاندانوں کے تسلط سے آزاد اور ملتِ ابراہیم کی خصوصیات سے معمور و آباد کرنا آپ کے مشق کا اصل اور تکمیلی کام تھا۔ چنانچہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَیْکُمْ رِضْوَانِی وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ - ۵: ۳) میں اسی کام کو آپ کا تکمیلی کام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو کام ہوئے وہ سب اسی کے توابع و مقتضیات تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب میں اصل طاقت قریش ہی کی تھی جو مکہ پر قابض تھے اور بیت اللہ کے متولی ہونے کے سبب سے تمام عرب پر اپنی دھاک جمائے ہوئے تھے۔ ان کی طاقت کو توڑ دینا ہی اصل فتح تھی۔ ان کی طاقت توڑے بغیر کوئی فتح نہ حقیقی معنوں میں فتح ہو سکتی تھی اور نہ ان کی طاقت کے ٹوٹ جانے کے بعد کسی اور کے لیے یہ امکان باقی رہ جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی کسی وجہ میں بھی کوئی مزاحمت کر سکے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں جس نصرت اور جس فتح کا ذکر ہے اور وہ جس انداز سے آیا ہے وہ عام نصرت اور فتح نہیں ہے بلکہ یہ اس نصرت اور فتح کا ذکر ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے وعدوں اور سنتِ الہی کے تقاضوں کی روشنی میں ہجرت کے بعد ہر مسلمان کے دل میں رچی بسی ہوئی تھی اور جس کے ظہور کا ہر مسلمان دل سے متمنی تھا۔ یہ وہ نصرت ہے جس کا ذکر سورہ مجادلہ کی آیت ۲۱ اَنْتُمْ اَنْتُمْ لَا غَیْبَ لَنَا وَ دُرُسِلَی (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول) میں آیا ہے۔ اور یہ اس فتح و نصرت کا حوالہ ہے جس کا ذکر سورہ صف آیت ۳ میں بدیں الفاظ وارد ہوا ہے: وَ اٰخِرٰی تُحِبُّوْنَہَا اِنْ نَصَرْنَا اللہَ وَ فَتَحَ قَدِیْبٌ (اور ایک اور عظیم فیوز مندی بھی ہے جس کی تم متنازعہ ہو، وہ ہے اللہ کی نصرت اور غمغریب ظہور میں آنے والی فتح) ان آیات میں جس نصرت اور فتح کی طرف اشارہ ہے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق فتح مکہ سے ہے اس کے سوا کسی اور فتح و نصرت کو یہاں مراد لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس سورہ کا نزول فتح مکہ کے بعد مانا ہے انہیں ایک روایت کے سمجھنے میں غلط فہمی پیش آئی ہے لیکن اس پر نہ یہاں بحث کی گنجائش ہے اور نہ غالباً ہماری ساری بحث غور سے پڑھ لینے کے بعد اس کی کوئی خاص ضرورت ہی باقی رہے گی۔

یہ سورہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یکسر بشارت ہے۔ فیصلہ کن نصرت کی بشارت، مکہ کی آزادی کی بشارت، اللہ کے دین میں لوگوں کے جو حق و برحق داخل ہونے کی بشارت اور آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم



کو اپنے مفوضہ مشن سے سرخ روٹی کے ساتھ فارغ ہونے کی بشارت۔ اس آخری بشارت سے یہ بات آپ سے آپ نکل کہ اب دنیا سے آپ کے رخصت ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے! اس وجہ سے آپ کو اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مزید اضافہ کر دینا چاہیے تاکہ اس عظیم النعم کا حق بھی ادا ہو جو تکمیل دین کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرمایا اور غدا ئے قواب کی مزید عنایت بھی آپ کو حاصل ہو تاکہ آپ اپنی سعی کا بڑے سے بڑا اجر اپنے رب کے پاس پا لیں۔ اسی ٹکڑے سے قرآن کے سب سے بڑے نکتہ وان حضرت ابن عباسؓ نے یہ نکتہ نکالا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ نکتہ دقیق ہے، جس کے دقیق ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی تحسین و تصویب فرمائی ہے۔ لیکن یہ نکتہ بھی اپنے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بہت بڑی بشارت رکھتا ہے جس کی وضاحت ان شاء اللہ ہم متعلق آیت کی تفسیر کے تحت کریں گے۔







# سُورَةُ النَّصْرِ (۱۱۰)

مَدَنِيَّةٌ ————— آیات: ۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ  
 فِي دِينِ اللَّهِ أَنْفُسًا ② فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ ③  
 إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ④

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور لوگوں کو دیکھو کہ وہ فوج در فوج خدا کے

دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے خداوند کی تسبیح پڑھو اس کی حمد کے ساتھ، اور

اس سے مغفرت مانگو۔ بے شک وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔ ۱-۳



## الفاظ واسالیب کی تحقیق و آیات کی وضاحت

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (۱)

یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح کا جس اہتمام خاص کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حمد و تسبیح کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے عام مدد اور عام فتح مراد نہیں ہے بلکہ وہ مدد اور فتح مراد ہے جو سنت الہی کے مطابق اللہ کے رسولوں کو ان کے مخالفوں کے مقابل میں اس وقت حاصل ہوئی ہے جب رسولوں نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں اپنی ساری طاقت پھوڑ دی اور قوم رسول کی تکذیب اور اس کی دشمنی پر اس طرح اڑ گئی ہے کہ یہ توقع کرنے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے کہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع ہو سکے گی۔

اللہ تعالیٰ

کی خاص مدد

سورہ یوسف میں اس نصرت الہی کے ظہور کے لیے یہ ضابطہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ کے رسول اپنی قوم کے ایمان سے یالوس ہو گئے ہیں اور قوم نے اپنے رویے سے ثابت کر دیا ہے کہ الیاذ باللہ وہ رسول کے انذار کو بالکل جھوٹ اور لاف زنی خیالی کرتی ہے تب اللہ کی یہ مدد ظہور میں آئی۔

اس مدد کے

ظہور کا وقت

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَرَ الرُّسُدُ  
وَقَالُوا إِنَّمَا كَذِبٌ بَوَّابُ  
جَاءَهُمْ نَصْرُنَا لَا

میان تک کہ جب رسول قوم کے ایمان سے یالوس ہو گئے ہیں اور قوم کے لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ ان کو جھوٹ موٹ عذاب سے ڈرایا گیا ہے تب

(یوسف - ۱۲ : ۱۱۰) ہماری مدد رسولوں کے پاس آگئی۔

یہی بات دوسرے الفاظ میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔

فَصَبَّرُوا عَلَىٰ مَا كُنَّا بَوَّابُ  
وَأَوْذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ج  
(الانعام - ۴ : ۳۳)

پس وہ (رسول) ثابت قدم رہے قوم کی طرف سے تکذیب اور ایذا رسانیوں کے باوجود یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آگئی۔

اسی طرح 'الْفَتْحُ' پر الف لام اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد موعود و منتظر فتح ہے جو اللہ کے رسولوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے سنت الہی کا تقاضا ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا اور جس کے وہ اپنی زندگی کے سخت سے سخت مرحلے میں بھی منتظر و متوقع رہے ہیں۔

موعود و منتظر

فتح

اسی فتح کی طرف سورہ صف کی اس آیت میں اشارہ ہے جس کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں :  
'وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ' (الصف - ۱۶۱ : ۱۳۱) (اور ایک دوسری فیروزہ کا بھی



ہے جس کو تم عزیز رکھتے ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور جلد ظاہر ہونے والی فتح) قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں بھی اس کا ذکر اسی اجمال کے ساتھ ہوا ہے جس طرح یہاں ہوا ہے لیکن یہ چیز پہلے سے ذہنوں میں موجود تھی اس وجہ سے، اجمال کے باوجود، اس کے سمجھنے میں لوگوں کو کوئی تردد پیش نہیں آیا۔ مثلاً فرمایا ہے: **لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ تَبَايُهَا الْفَتْحِ وَتَنْدَ** (الحديد - ۵۷: ۱۰) (تم میں سے وہ لوگ جو فتح سے پہلے انفاق اور جہاد کریں گے اور جو بعد میں کریں گے دونوں درجے میں یکساں نہیں ہوں گے)۔ یہاں دیکھ لیجیے اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ کون سی فتح مراد ہے لیکن ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس سے فتح مکہ مراد ہے اس لیے کہ وہی فتح تھی جو جدوجہد کرنے والوں کے اعمال کی قدر و قیمت کے گھٹانے اور بڑھانے کے معاملے میں ایک میزان کا کام دے سکتی تھی۔ اس سے پہلے متعدد غزوات میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو چکی تھی اور اس کے بعد بھی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن نہ ان میں سے کسی کا یہ درجہ تھا کہ نام لیے بغیر اس کی طرف ذہن منتقل ہو سکیں اور نہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر ان کا یہ اثر پڑا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی نیکیوں کی قدر و قیمت میں ان کے سبب سے وہ تفاوت واقع ہوا ہو جو اس فتح کے سبب سے واقع ہوا۔ اس فتح کے بعد عرب میں کفر نے اسلام کے آگے اس طرح گھٹنے ٹیک دیے کہ اس کے لیے پھر سراٹھانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس سے بعثت محمدی کا اصل مقصد گویا پورا ہو گیا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتح کے بعد خانہ کعبہ کے دروازے پر جو خطبہ دیا اس میں آپ نے فرمایا کہ:

**لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ صَدَقَ** اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے

**وَحْدَهُ دَفَعَهُ عِبْدَهُ دَهْرًا** اپنا وعدہ پورا کیا اور اس نے یکہ و تنہا دشمنوں

**الاحزاب و حدة** کی تمام جماعتوں کو شکست دی۔

اس خطبہ کے بعد ہی آپ نے قریش کے ان سرغنوں کی طرف توجہ فرمائی جو اس سے پہلے تو پرے جا جا کر آپ سے لڑتے رہے تھے لیکن اس وقت محکومانہ حاضر اور تقدیر کے فیصلہ کے منتظر تھے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں! سب نے بیک زبان جواب دیا کہ آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں! آپ نے ان کا یہ جواب سن کر فرمایا کہ جاؤ، میں نے تم سب کی جان بخشی کی!

یہاں نصرت اور فتح دونوں کا ذکر جس طرح ساتھ ساتھ ہوا ہے اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ کسی کو کوئی فتح اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اس وجہ سے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی فتح پر اتراٹھے اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ یہ اس کی اپنی تدبیر جنگ ہے اور مہارت و بسالت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ ادھر ہم نے

فتح و نصرت

تائید الہی ہے

جامل ہوتے ہے



نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کا جو حوالہ دیا ہے اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ آپ نے دشمنوں کی تمام پارٹیوں کی ہزیمت کو تنہا اپنے ریا ہی کی قدرت کا کرشمہ قرار دیا، اس کا کریڈٹ نہ خود لینے کی کوشش کی نہ اس میں کسی اور کو حصہ دار بنایا۔ اس سورہ میں آپ کو حمد و تسبیح کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اس سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس فضل و انعام پر شکر کا اصل حق دار اللہ تعالیٰ ہی ہے اس وجہ سے زیادہ سے زیادہ اس کی حمد و تسبیح ہونی چاہیے۔

وَرَأَيْتِ النَّاسَ يَبْدُوْنَ فِيْ دِيْنِهِ اللّٰهُ اَنْوَاجًا (۲)

یہ اس عظیم بشارت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم سے جو جھگڑا تھا وہ دنیا کی کسی غرض کے لیے نہیں تھا، صرف اللہ کے دین کے لیے تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ قریش کے لیڈر اس امانت کا حق ادا کریں جو بیت اللہ کی صورت میں ان کی تحویل میں ہے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر ان کو اس پر قابض رہنے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین سے بے خبر و ظلم روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس مذہبی جبر کو (جس کو قرآن نے فتنہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے) ختم کرنے کے لیے آپ نے قریش کو مکہ سے بے دخل کیا اور چونکہ دین کی راہ میں جو رکاوٹ تھی وہ صرف لیڈروں کے جبر و استبداد ہی کے سبب سے تھی، عوام کے دلوں میں اس کے خلاف کوئی بدگمانی نہیں تھی اس وجہ سے اس استبداد کے بند کے ٹوٹتے ہی لوگ رکے ہوئے سیلاب کی طرح قبول اسلام کے لیے ٹوٹ پڑے۔ فتح مکہ سے پہلے جو لوگ قبول اسلام کے لیے حضور کی خدمت میں آئے وہ ڈرتے ڈرتے آتے۔ اس وقت تک اسلام قبول کرنا تو درکنار اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہمدردی کا کوئی حکم کہنا بھی عام لوگوں کے لیے ایک خطرہ مول لینے کے حکم ہی تھا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس دور میں انصار کے بعض وفود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے آئے تو قریش کے لیڈروں نے ان کو ڈرایا کہ آپ لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ یہ بیعت اسود و احمر سے جنگ کے ہم معنی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے استبداد کی موجودگی میں وہی لوگ اسلام لانے کا سوچ کر کشتے تھے جو پیٹروں سے لڑ جانے کا حوصلہ رکھتے ہوں لیکن جب یہ استبداد پاش پاش ہو گیا تو پھر کوئی مزاحمت باقی نہیں رہ گئی۔ لوگ ہر طرف سے اس طرح مدینہ کی طرف بڑھے گویا اس چشمہ جواں پر پہنچنے کے لیے پیاس سے تڑپ رہے تھے۔

یہی فتح ہے جس نے ملک کے حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی کہ لوگ اپنے دین کے انتہائی بے مصلحتی میں بالکل آزاد ہو گئے اور سرزمین عرب سے اس فتنہ کا بالکل خاتمہ ہو گیا جس کے بل پر قریش کے لیڈر لوگوں کے دین و ایمان کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ اس بشارت کے پردے میں گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا گیا کہ اب جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ لوگ قریش کے ظلم و استبداد سے بالکل آزاد ہو کر اللہ کے دین

اس عظیم بشارت

کا سب سے

نمایاں پہلو



کی طرف دھڑیں گے اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ ان کی راہ میں کوئی مزاحمت پیدا کر سکے۔ یہ چیز اس بات کی نہایت محکم دلیل ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور فتح نہیں ہے جس سے یہ اثرات نمایاں ہوئے ہوں۔ جن لوگوں نے اس سے کوئی اور فتح مراد لی ہے انھوں نے اس سورہ کے مفسرات اور فتح مکہ کے اثرات دونوں کا اندازہ کرنے میں غلطی کی۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۳)

یہ آیت اپنے اندریوں کو کئی پہلو رکھتی ہے لیکن درپہلو خاص اہمیت دے رہی ہے۔

اس آیت کے درخاس پہلو اول یہ اس فرض کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو اس فتح و نصرت کے حاصل ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر عائد ہوا یعنی یہ کہ اس پر اترانے اور فخر کرنے کے بجائے لوگ اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگیں اور یہ توقع رکھیں کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی مہربان و کریم ہے اس کے جو بندے اپنی کوتاہیوں کی معافی کے لیے اس سے رجوع کرتے ہیں وہ ان کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ سورہ کوثر میں جس طرح فرمایا ہے: **إِنَّا آعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ الْكَوْثَرَ** (۱۰۸: ۲) (ہم نے تم کو نجشہ کوثر تو اپنے خداوند ہی کی ناز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو) اسی طرح یہاں یہ آیت اس ذمہ داری کے بیان کے لیے بھی آئی ہے جو اس فتح و نصرت کا لازمی تقاضا ہے اور اس چیز کی بھی یہ تعلیم دے رہی ہے جو اس کے بقا و کی ضامن ہے۔ بندوں کو جو نعمت بھی حاصل ہوتی ہے اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی لازماً وابستہ ہوتی ہیں۔ جب تک بندہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں وہ نعمت ان کو حاصل رہتی ہے، جب وہ ان کو بھلا بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کچھ مہلت دینے کے بعد وہ ان سے یا تو چھین لیتا ہے یا وہ اس کے سبب سے نہایت سخت آزمائشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دوسرا پہلو اس کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت کا ہے کہ اس فتح کے بعد آپ کے لیے اس عظیم فریضہ سے باعزت طور پر سبکدوش ہونے کا وقت آجائے گا جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا جو بوجھ ڈالا گیا اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں آپ نے اپنی ساری طاقت جس طرح سچوڑی اور جس طرح اپنے آپ کو اس میں مصروف رکھا اس کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے نہایت محبت آمیز انداز میں عقاب فرمایا کہ: **مَا أُنْزِلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ بِتَشْفِيٍّ** (ظہ - ۲۰: ۲) ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ اس کی خاطر تم اپنی زندگی اجیرن بنا لو اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے بڑی بشارت کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ وہ دن آئے کہ آپ اس بار عظیم سے سبکدوش ہوں اور باعزت طریقہ سے سبکدوش ہوں۔



چنانچہ اس سورہ نے آپ کو یہ بشارت دے دی اور فحوائے کلام سے یہ بات بھی نکلی کہ آپ اپنی ذمہ داری سے عزت و سرخروئی کے ساتھ فارغ ہوں گے۔ اس لیے کہ آیت میں آپ کو استغفار کی ہدایت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے ثواب ہونے کی بشارت بھی دی گئی ہے۔ لفظ تَوَابُ جب اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں پر بڑا ہی ہر بان اور ان کی لغزشوں سے درگزر کرنے والا ہے۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اس کا تعلق اسی طرح کی باتوں سے ہے جن کی وضاحت ہم براہِ برکتے آرہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے اتباعِ ہوا کے قسم کے گناہ تو صادر نہیں ہوتے لیکن بعض اوقات کوئی نیک محرک ان کو کسی نیکی میں تہ مطلوب سے متجاوز کر دیتا ہے جس کی ایک مثال سورہ ظہ کی اس آیت میں بھی موجود ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کو جس بات پر ٹوکا گیا ہے وہ اتباعِ ہوا کے قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ دین میں صراطِ انہاک اور ان سرکشوں کے پیچھے اپنے کو کھپانے پر ٹوکا گیا ہے جو اس باز برداری کے اہل نہیں تھے۔

حضرت انبیاء

علیہم السلام

صادر ہونے

و لغزشوں

کی نوعیت

یہ بشارت اس سے زیادہ واضح لفظوں میں سورہ فتح میں گزر چکی ہے اور ہم ہر پہلو سے اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔ آیت کا حوالہ ہم یہاں دیے دیتے ہیں جن کو تفصیل مطلوب ہو وہ تدبر قرآن میں اس کی تفسیر پڑھ لیں۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۚ لِيُغْفِرَ لَكَ  
اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ  
وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا  
مُسْتَقِيمًا ۝ (الفتح: ۱-۲)

ہم نے تمہیں ایک کھل ہوئی فتح عطا فرمائی تاکہ  
اللہ تمہاری اگلی اور پچھلی لغزشیں معاف فرمائے  
اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے اور تمہیں ایک سیدھی  
راہ کی ہدایت بخشے۔

’فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا‘ کی وضاحت اس کے عمل میں ہو چکی ہے کہ جب تسبیح اور حمد کے الفاظ ساتھ ساتھ آئیں تو تسبیح کے اندر تنزیہ کا پہلو غالب ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان باتوں سے پاک قرار دینا جو اس کی شانِ الوہیت کے منافی ہیں اور حمد کے اندر ان صفات کا اثبات ہوتا ہے جن سے وہ فی الحقیقت موصوف ہے۔ ان دونوں کے صحیح امتزاج ہی سے حقیقی توحید وجود میں آتی ہے جو ایمان کی بنیاد ہے۔

رَبِّ کریم کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ نالحمداً للہ حمداً کثیراً۔

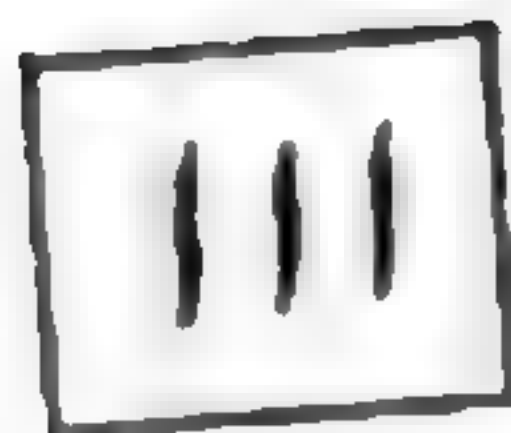
لاہور

۴۔ جولائی ۱۹۸۰ء

۲۰۔ شعبان ۱۴۰۱ھ



تدبر قرآن



اللّٰهَب







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ۱۔ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلق

اس سورہ کے عمود اور سابق و لاحق سے اس کے تعلق پر اسناد امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایسی جامع اور حکیمانہ بحث کی ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے اسی کے بعض اہم اقتباسات پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :

”سورہ نصر کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی اسی طرح آپ کے لائے ہوئے صحیفہ کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ خانہ کعبہ کے مرکز توحید و اسلام اور سرچشمہ ملت ابراہیم ہونے کے سبب۔ سے فتح مکہ ہی آپ کی بعثت کا گویا آخری اور تکمیلی کام تھا۔ اس کے بعد صرف ثابت قدمی اور استقامت کی ضرورت رہتی تھی جس کے لیے تین سورتیں اس کے بعد لگادی گئیں۔ سورہ اخلاص، جو تمام معارف، توحید کا خزانہ اور دین کی بنیاد ہے اور سورہ فلق و سورہ ناس دعائے استقامت کی تعلیم اور شیطاں جن و انس کی ممانعت سے اس خزانہ کی حفاظت کے لیے۔“

اس کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ سورہ نصر، سورہ اخلاص اور مؤذنین (سورہ فلق اور سورہ ناس) کے اس جھرمٹ میں سورہ لہب کے رکھے جانے کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں :

”اس تمہید سے واضح ہوا کہ یہ تمام سورتیں — سورہ نصر، سورہ اخلاص اور مؤذنین — باہم گہر مربوط ہیں اس وجہ سے سورہ لہب کا ان کے درمیان رکھا جانا بھی لازماً کسی حکمت پر مبنی ہوگا ورنہ یہ پورا سلسلہ نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورہ نصر میں جس فتح و غلبہ کا ذکر ہے سورہ لہب میں اسی کی دفاحت و بشارت۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو غلبہ دیا اور اس کے دشمن کو برباد کیا۔ چنانچہ دوسرے مقام میں یہ بات یوں واضح فرمائی گئی :

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّقَ الْبَاطِلُ ۚ  
حق نمودار ہو گیا اور باطل برباد



رَأَى الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوْتًا ه  
ہوا۔ بلاشبہ باطل ٹٹنے ہی کی

ربنی اسراءیل (۸۱: ۱۰) چیز ہے

اس نظم کی نہایت خوب صورت، مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ میں بھی ہے  
جو آپ نے فتح مکہ کے دن، خانہ کعبہ کے دروازے پر دیا۔ آپ نے فرمایا:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔

وَمُصَدِّقُ وَعْدِهِ وَنَصْرُ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بند

عبدہ دھڑملا حزاب کی مدد فرمائی اور دشمنوں کی تمام پارٹیوں

وَحْدَهُ۔ کو یکہ و تنہا شکست دی۔

نظامِ نزویہ تین الگ الگ فقرے ہیں لیکن ایک صاحبِ نظر کے لیے ان تینوں کے اندر  
علی الترتیب تین سورتوں کے مضمون پنہاں ہیں۔ پہلا فقرہ 'لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ' سورت  
کافرون کے ہم معنی ہے۔ دوسرا فقرہ 'وَمُصَدِّقُ وَعْدِهِ' سورت نصر کے ہم معنی  
ہے۔ تیسرا جملہ 'وَنَصْرُ' سورت احزاب، وحہ اور سورہ لہب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں  
ہیں۔ معلوم ہوا کہ تین طرح یہ تینوں فقرے ایک صاحبِ نظر کے لیے بالکل مربوط و منظم ہیں اسی  
طرح جو لوگ ان سورتوں کے مضامین پر غور کریں۔ گم وہ ان سب کو ایک ہی زنجیر کی مربوط کر دیں  
کی شکل میں پائیں گے۔

## ب۔ اس امر کا بیان کہ یہ سورہ مدنی اور فتح مکہ کی بشارت ہے

ایک اہم سوال اس سورہ سے متعلق یہ بھی ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی؟ ہمارے مفسرین نے عام طور پر  
اس کو مکی قرار دیا ہے لیکن یہ رائے کچھ قوی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے حق میں واحد دلیل جو ان کی طرف سے  
پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ یہ جواب ہے ابو لہب کی اس گستاخی کا جو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں  
کی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اپنے قریبی اعزہ کو خدا  
کے عذاب سے ڈرائیں تو ایک دن آپ علی الصبح کوہ صفا پر چڑھ گئے اور وہاں 'دا صبا حاکم' کا نعروں  
لگایا۔ عرب میں یہ نعروں کا الارم سمجھا جاتا۔ یہ نعروں سن کر قریش کے تمام خاندان آپ کے گرد جمع ہو گئے۔  
آپ نے ان سے پوچھا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر گراں تمہارے اوپر حملہ  
کے لیے لگات لگاتے ہوئے ہے تو کیا تم باور کرو گے، سب نے جواب دیا کہ ہاں ہم ضرور باور کریں گے،  
میں نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو میں ایک سخت عذاب سے  
آگاہ کر رہا ہوں جو تم پر آنے والا ہے۔ یہ سن کر ابو لہب نے سبقت کر کے کہا: 'يَبَّأُكَ اِهْذَا دَعُونَا!'



(تیرا نام ہو، کیا اسی لیے تم نے ہم سب کو دعوت دی!)

مفسرین اسی واقعہ کو اس سورہ کا شانِ نزول قرار دیتے ہیں کہ جب تَبَّأَنَّكَ کے الفاظ سے ابو لہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کا قصہ کہہ کر اس کی اور اس کی بیوی کی مذمت میں یہ سورہ اتاری۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ مکہ کے بالکل ابتدائی دور میں پیش آیا اس وجہ سے مفسرین کے نزدیک سورہ کا نزول بھی اسی دور میں ہوا ہے۔ جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے اس سے تو انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ بات مختلف وجوہ سے مٹی نظر ہے کہ یہ سورہ ابو لہب کے جواب اور اس کی بیوی کی مذمت میں نازل ہوئی ہے۔

اول تو یہی بات کھٹکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں میں سے کسی کی گستاخی کا اس طرح ترکیب ترک کیا جائے۔ جہاں تک مخالفت، اور توہین و دل آزاری کا تعلق ہے ابو لہب کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ مگر اور طائفہ کے اکثر لیڈر اس جرم میں شریک رہے ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تمام زیادتیوں کے جواب میں خود بھی صبر و حلم کا رویہ اختیار فرمایا، اپنے صحابہ کو بھی اسی کی تاکید فرمائی اور اسی رویہ کی تاکید آپ کو بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی فرمائی گئی۔ ان میں سے کسی کے جواب میں بھی، خواہ اس کی گستاخی کی نوعیت کتنی ہی سنگین رہی ہو، آپ کی زبان مبارک سے کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلا جس میں مذمت کا کوئی پہلو ہو۔ آپ کو حکمت اور دل پذیر مغفرت کے ساتھ دعوت کی ہدایت فرمائی گئی تھی اور آپ نے اس ہدایت پر ہمیشہ عمل فرمایا۔ مذمت اور ست، دشمنی اور درکنار آپ نے اپنی قوم کے کفار کو کفار کے لفظ سے بھی، جیسا کہ سورہ کافرون کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، اس وقت خطاب فرمایا ہے، جب ان پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ آپ قوم سے اعلانِ براءت کر کے ہجرت کر جائیں۔ یہی طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم السلام کا بھی رہا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کے بالکل آغاز ہی میں اپنے چچا کے ایک فقرہ سے اس درجہ آزرده ہو جائیں کہ اس کی مذمت کے جواب میں آپ کی تسکینِ قلب کے لیے ایک ایسی سورہ نازل کی جائے جس میں مفسرین کے بقول صرف اسی کی نہیں بلکہ اس کی بیوی کی بھی خبر لی گئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تَبَّأَنَّكَ کے الفاظ اور تَبَّتْ يَدَايَ كَفَّي کے الفاظ میں باعتبارِ مفہوم بڑا فرق ہے۔ تَبَّأَنَّكَ کے الفاظ تو بے شک بدعا، مذمت اور تحقیر کے لیے آتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے کہ تَبَّتْ سے جو دوسرے محاورات پیدا ہوئے ہیں، ان کے اندر بھی لازماً ہجو و مذمت کا مفہوم پایا جائے۔ اگر تَبَّأَنَّكَ کے الفاظ ہوتے تب تو اس گمان کے لیے گنجائش تھی کہ اس کو ابو لہب کی بات کا ترکیب ترک جواب سمجھا جائے لیکن الفاظ تَبَّتْ يَدَايَ كَفَّي کے الفاظ میں



کے ہیں۔ اس محاذ سے کے اندر سجد و مذمت اور بڑے کا مضمون نہیں بلکہ، جیسا کہ آیت کی تفسیر کے تحت ہم واضح کر دیں گے، ابولہب کے اقتدار کے ڈھکے جلنے، اس کے انصار و اعوان کے ٹوٹ جانے اور اس کی دولت و حشمت کے برباد ہو جانے کا مضمون پایا جاتا ہے۔ دوسرے نقطوں میں پورا سمجھیے کہ یہ جملہ انشائیہ نہیں بلکہ خبریہ ہے اور یہ خبر ماضی کے صیغہ میں ابولہب کی بربادی کی پیشین گوئی ہے جو اس وقت کی گئی ہے جب اس پر حجت تمام کی جا چکی ہے۔ پس یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ بالکل ابتدائی مکی دور میں نازل ہوئی ہے بلکہ اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جب ابولہب کی تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اس کی موت غزوہ بدر کے کچھ بعد واقع ہوئی ہے اس وجہ سے اس کا نزول بھی اسی کے لگ بھگ ہوا ہے۔ اسلوب کلام سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ سورہ اس کی موت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر موت کے بعد نازل ہوتی تو اس کا اسلوب کلام اس سے مختلف اکتثر کثیف یا اس سے ملتا جلتا ہوتا۔ ماضی کا یہ اسلوب بیان مستقبل میں ہونے والے واقعات کی قطعیت کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کی بکثرت مثالیں اس کتاب میں پچھے گزر چکی ہیں۔



# سُورَةُ الْهَبِ

مَدَنِيَّةٌ ————— آیات: ۵

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ① مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا  
كَسَبَ ② سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ  
الْحَطَبِ ④ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ⑤

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ڈھے گا۔ نہ اس کا مال اس

کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اس کی بیوی بھی

ایندھن ڈھوتی ہوئی۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی ہوگی۔ ۵-۱

ترجمہ آیات  
۵-۱

ع  
۳۶

آیات  
۵-۱



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ (۱)

تَبَّتْ کے معنی ہلاک ہونے اور خسارہ میں پڑنے کے ہیں۔ اسی سے تَبَّتْ دیا، فلان کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ فلاں کے دونوں ہاتھ حصولِ مقصد میں ناکام و عاجز رہے۔ دونوں ہاتھوں کی ناکامی اور بے بسی کامل بے بسی کی تعبیر ہے۔ اگر کہیں کہ تَبَّتْ دیا، تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز ہو گیا۔ اسی طرح کسبِ دیا، (ہاتھ توڑ دینا) کسی کا زور توڑ دینے کی تعبیر ہے۔ فدا الزانی کا شعر ہے:

وتوكتا ديا د تغلب قفرا وكسونا من الغواة الجناحا

دہم نے تغلب کے علاقہ کو چٹیل بنا کے چھوڑ دیا اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ دیے۔  
عبرانی زبان میں بھی، جو عربی کی بہن ہے، یہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ صغیر ذی الکفل کے باب آیات ۲-۱۲ کے فقرے ملاحظہ ہوں:

”گیارہویں برس کے پہلے مہینہ کی سانوس تاریخ کو یوں ہوا کہ خداوند کا کلام مجھے پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! میں نے مصر کے بادشاہ، فرعون کا بازو توڑا اور دیکھ وہ باندھا نہیں جائے گا اور دوا کی تدبیر کر کے اس پر ٹپیاں کسی نہیں جائیں گی کہ تلوار پکڑنے کے لیے مضبوط ہو۔ اس لیے خداوند سیوہ یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں مصر کے بادشاہ، فرعون کا مخالف ہوں اور اس کے بازوؤں کو، اُسے جو پرزدہ ہے اور اسے جو ٹوٹا تھا، توڑ دوں گا اور اس کے ہاتھ سے تلوار گراؤں گا؟“

اس سے معلوم ہوا کہ اس لفظ کے اندر سجد و مذمت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ یہ صرف، الہب کے اقتدار کے زوال اور اس کی تباہی کی پیشین گوئی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ ہے کہ یہاں اس کا ذکر کنیت کے ساتھ ہوا ہے اور اہل عرب جب کسی کا ذکر کنیت کے ساتھ کرتے ہیں تو اس میں فی الجملہ احترام مد نظر ہوتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ پورے قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں میں سے کسی کا ذکر بھی اس کے نام کی تصریح کے ساتھ نہیں ہوا پھر الہب ہی کی کیا خصوصیت تھی کہ اس کا ذکر اس کے نام سے ہوا؟

ایک سوال

اور اس کا

جواب



اس کا جواب یہ ہے کہ خاص اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کرنے کی یوں تو کسی وجہ سے ہو سکتی ہیں لیکن دو باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں جن کا ہم ذکر کریں گے۔

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو لہب کی عداوت کی نوعیت دوسرے مخالفوں کی عداوتوں سے بہت مختلف تھی۔ قریش کے دوسرے لیڈروں کو آپ سے جو اختلاف تھا اس کی بڑی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کی دعوت کو دینِ آباؤی کے خلاف سمجھتے تھے، یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اس میں اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے لیے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہوں۔ آپ جن مکارم اخلاق کی دعوت دیتے تھے ان کی عزت ان کے دلوں میں بھی تھی۔ آپ یتیموں اور مسکینوں اور غلاموں کے ساتھ جس حسن اخلاق پر لوگوں کو ابھارتے تھے قریش کے بہت سے شریفوں کے اندر اس کے لیے بھی بڑا احترام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ سارے کام ہوں۔ اور اس معاملہ میں ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسِ ظن بھی تھا اس لیے کہ وہ آپ کو تمام اعلیٰ اوصاف سے عملاً متصف پاتے تھے۔ ان کو غصہ تھا تو اس بات پر تھا کہ اپنی دعوت میں آپ ان کے بتوں کی تحقیق کرتے ہیں۔ سورہ کافروں کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتوں کے معاملے میں اپنا لب و لہجہ کچھ نرم کر دیں تو وہ بھی آپ کی دعوت کے معاملہ میں اپنی روش تبدیل کر دیں گے۔

اس کے برعکس ابو لہب کی مخالفت تمام تر اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے تھی۔ وہ ابو لہب کا ذکر بیت اللہ کے بیت المال (رنادہ) کا نگران تھا اور اپنے زمانے میں اس نے اس طرح اس پر قبضہ کر رکھا تھا کہ اس کا بڑا حصہ یتیموں، مسکینوں اور حاجیوں کے بجائے اس کے اپنے جیب میں جاتا جس کی بدولت وہ اپنے زمانے کا تارون بن گیا۔ اس نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکارم اخلاق کی دعوت اور بیت اللہ کے مقصدِ تعمیر کی آیتیں سنیں تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے اعتبار کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اگر جلد سے جلد آپ کی دعوت کو دبانے کی اس نے تدبیر نہ کی تو ان تمام مفادات سے اسے دست بردار ہونا پڑے گا جن سے وہ اس وقت بے روک ٹوک بہرہ مند ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ کمر باندھ کے آپ کی دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کردار کی تصویر سورہ ہمزہ اور بعض دوسری سورتوں میں کھینچی گئی ہے۔ جن لوگوں کی مخالفت یا موافقت ذاتی اغراض سے بالآخر کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے، اگرچہ وہ مقصد غلط ہی ہو، ان کے اندر فی الجملہ



شرافت ہوتی ہے برعکس اس کے جس کی مخالفت و موافقت محض اس کی ذات کے مفاد کے ارد گرد گھومتی ہے وہ شرافت سے بالکل نہیں ہوتی ہے۔ یہی رمز ہے کہ ابو جہل اور ابوسفیان کی مخالفت اور ابولہب کے انداز مخالفت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے اور یہی فرق ہے جو سبب ہوا اس بات کا کہ اس عدو کا ذکر خاص طور پر نام لے کر کیا جائے تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو کہ کس کے دار کے لوگ حق کے اصلی دشمن ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مزاج ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں وصل اور فصل کی بنیاد صرف اللہ کا دین ہے۔ وہ لوگ نبی کے ساتھی اور محبوب و محب بن جاتے ہیں جو اللہ کے دین کو اختیار کر لیتے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی دور کے ہوں اور وہ لوگ کاٹ پھینکے جاتے ہیں جو اللہ کے دین کے مخالف ہوتے ہیں، اگرچہ باعتبار نسب و رشتہ وہ نبی کے کتنے ہی قریبی ہوں۔ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے واقعات نہایت خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اسی مقصد سے یہاں ابولہب کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا تاکہ یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاندان اور نسب کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک گڈ ریا رسول کا محب اور محبوب بن سکتا ہے اگر وہ اس کی دعوت قبول کر لیتا ہے اور اگر اس کا چچا بھی اس کی دعوت رد کر دے تو اس کا تعلق بھی اللہ اور رسول سے یک قلم ختم ہو جاتا ہے۔ سورہ کافرون میں اہل کفر سے برادرت کا جو اعلان ہے یہ گویا اس کی عملی شہادت ہے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ابولہب کے اقتدار کے زوال کی پیشین گوئی کے لیے تو تَبَّتْ يَدَايَ لَهَبٍ کے الفاظ بظاہر بالکل کافی ہیں، پھر اس کے بعد وَتَبَّتْ کا لفظ لائے کا کیا خاص فائدہ ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ٹکڑے میں اس کی سیاسی قوت کے ٹوٹ جانے کی پیشین گوئی ہے اور اس دوسرے میں اس کی اپنی ذات کے خاتمہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی ٹھیک ٹھیک اسی طرح پوری بھی ہوئی۔ غزوہ بدر میں قریش کے جو سردار مارے گئے ان میں سے اس کے بہت سے خاص مامی تھے جن کی موت سے اس کی سیاسی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔ پھر غزوہ بدر کے کچھ ہی بعد وہ خود چمچک میں مبتلا ہوا۔ اس بیماری کے دوران چھوٹ کے اندیشہ سے، نہ اس کے ساتھیوں نے اس کی خبر گیری کی نہ اس کے بیٹوں اور خاندان کے عزیزوں نے۔ اسی بے کسی کے حال میں اس نے جان دی اور لاش کئی دن تک گھر ہی میں پڑی سڑتی رہی۔ بالآخر لوگوں کے طعنوں سے تنگ آکر اس کے بیٹوں نے کرایہ کے کچھ حبشیوں کی مدد سے لاش لکڑ کے بالائی حصہ میں پھینکوائی اور درودور رہی سے اس پر پتھر وغیرہ ڈال کر ڈھانک دی۔ یہ

ایک سوال

اور اس کا جواب



امریاں ملحوظ رہے کہ کسی پر پتھر پھینکنا اس پر لعنت کرنے کے ہم معنی ہے۔

علاوہ ازیں یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ غزوہ بدر میں، قریش کے تمام سردار پورے جوش و خروش سے شریک ہوئے، لیکن ابولہب نے بزدلی کے سبب سے شرکت نہیں کی بلکہ ایک دوسرے شخص کو، جس پر اس کا کچھ قرض آتا تھا، جس کی وصولی کی توقع باقی نہیں رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ وہ اس قرض کے عوض میں اس کی طرف سے جنگ میں شریک ہو۔ چنانچہ وہ شریک ہوا اور غالباً مارا بھی گیا اور یہ بزدل گھر میں بیٹھا رہا لیکن یہ تدبیر بھی اس کو موت سے بچانے میں کارگر نہ ہو سکی۔ اس جنگ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ چھپک میں مبتلا ہو کر نہایت ذلت کی موت مرا۔ ہمارے نزدیک دَوَّاب کا لفظ اس کے اسی انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ (۲)

روپیہ کے حریف روپیہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ذہن کے اندر یہ خیال سما جاتا ہے کہ اگر روپیہ ہے تو وہ خدا کی گرفت سے بھی محفوظ ہیں۔ سورہ ہمزہ میں زر پرست بخیلوں کی ذہنیت سے یوں پردہ اٹھایا گیا ہے:

الَّذِي جَمَعَ مَالًا دَدَّ ذَكَهُ لَا يَحْسَبُ  
أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۖ

جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر  
رکھا گمان کرتے ہوئے کہ اس کا مال اس  
کو ہمیشہ رکھے گا۔

(المزہ - ۱۰۴ : ۲ - ۳)

ہم نے اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ یہ درحقیقت ابولہب اور اس کے ہم مشربوں کی تصویر ہے۔ اس طرح کے لوگ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ انھیں خدا سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے اور وہ ان کو کسی ایسی آزمائش میں ڈال سکتا ہے جس سے روپیہ کی بے حقیقتی بالکل واضح ہو جائے گی۔ ابولہب اسی غلط فہمی میں غرق رہا بالآخر اس پر وہ گردش آئی کہ اس نے اپنی آنکھیں دیکھ لیا کہ روپیہ کی بڑی سے بڑی مقدار بھی خدا کی پکڑ سے انسان کو نہیں بچا سکتی۔

دَوَّاب کی تاویل میں مفسرین سے کئی قول منقول ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے اس کے بیٹوں 'مَکْسَب' کو مراد لیا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ آخر میں، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، اس کے بیٹے بھی اس کے کچھ کام نہ آئے لیکن اس تاویل میں تکلف ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے اس کی وہ کمائی مراد لی ہے جو اس نے حرام راستوں سے حاصل کی، لیکن اس مفہوم کے لیے اول تو یہ لفظ کچھ موزوں نہیں ہے ثانیاً مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ کے بعد اس کی کچھ ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہمارے نزدیک اس سے اس کے وہ اعمال مراد ہیں جو اس نے اپنی دانست میں نیکی کے سمجھ کر کیے لیکن اس کے خبیث باطن اور شرک کے سبب سے وہ بھی رائگاں ہو گئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ وہ بیت اللہ کے



شعبہ مالیات کا انچارج تھا اس وجہ سے اسے غریبوں، مسکینوں اور حاجیوں کی خدمت کے کچھ کام کرنے ہی پڑتے تھے۔ لیکن یہ محض نمائش کے لیے مجبورانہ صرف اس غرض سے کیے جاتے کہ اس کی خیانتوں پر پردہ پڑا رہے۔ اس طرح کے کام خدا کے ہاں درخور اعتناء نہیں ٹھہرتے۔

سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳)

پچھلے دونوں آیتوں میں اس کا وہ حشر بیان ہوا ہے جو اس دنیا میں اس کے سامنے آیا۔ اب آخرت میں جس یہ اس کا وہ انجام بیان ہو رہا ہے جس سے وہ آخرت میں دوچار ہو گا۔ فرمایا کہ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ یہاں آگ کی صفت 'ذَاتَ لَهَبٍ' پر نظر رہے۔ اس کی کنیت 'ابولہب' تھی، اس کی رعایت سے اس کے لیے آگ 'ذَاتَ لَهَبٍ' ہو گی۔ 'لَهَبٌ' کے معنی شعلہ کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ سرخ و سپید شعلہ زد تھا اس وجہ سے اس نے یا تو خود یہ کنیت اختیار کی یا اس کے خوشامدیوں نے اس سے اس کو پکارا اور یہ اتنی مشہور ہوئی کہ اس کا اصل نام ————— عبدالعزیٰ — غائب ہو گیا۔ قرآن نے یہاں اس کا یہ انجام بیان کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اس دنیا میں اس کو اپنی جس شدہ روٹی پر ناز رہا آخرت میں یہ اس کے لیے وبال بنے گی۔ وہ شعلوں والی آگ میں جھونکا جائے گا جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ظاہر کا حسن کوئی فخر کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ آدمی کے لیے وبال بن سکتا ہے اگر اس کے ساتھ باطن کا حسن نہ ہو۔

وَأَصْرَاتُهَا حَمَالَةَ الْحَطَبِ (۴)

فرمایا کہ اس کی بیوی بھی ایندھن ڈھونڈھوتی ہوئی اس کے ساتھ جہنم میں پڑے گی۔ عذاب میں اس کی بیوی کی یہ شرکت اسی صورت میں مطابقت میں ہے جب وہ بھی اس کے ان جرائم میں شریک رہی ہو جو اس کو جہنم میں لے جانے والے بنے۔ آدمی کے بیوی بچے بسا اوقات اس کے لیے ایسے جرائم کا سبب بن جاتے ہیں جو اس کی تباہی کا بھی سبب بنتے ہیں اور بیوی بچوں کی بھی۔ اسی بنا پر قرآن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن مِّنْ

اے ایمان والو تمہاری بیویوں اور تمہاری

أَزْوَاجٍ كُودًا وَلَدِكُمُ عَدُوٌّ لَّكُمْ

اولاد میں بعض تمہارے دشمن بھی ہیں تو ان

فَاخْذُوا مِنْهُمْ (التغابن - ۶۲ - ۱۳)

سے بچ کے رہو۔

بیوی بچوں کے دشمن ہونے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی بے جا خواہشوں اور فرمائشوں کی تعمیل اور ان کی غلط ناز برداری کے فتنہ میں مبتلا ہو کر آدمی خدا کے احکام و حدود کی پاسداری سے غافل اور بخل و خیانت کا ترکیب ہو جائے۔ بیوی بچوں کو اسی پہلو سے فتنہ قرار دیا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا ہے کہ آدمی کی اولاد اس کو بخل اور بزدلی میں مبتلا کرنے والی ہے۔



معلوم ہوتا ہے کہ ابو لہب کی بیوی جگرڑی ہوئی بیگیا کی طرح نیشن کی دلدادہ، زیورات کی شوقین، دولت کی حریف اور نمائش کی رسیا تھی۔ اس نے ابو لہب کے بگڑے ہوئے مزاج کو اور بگاڑا۔ یہاں تک کہ وہ بھی اسی عذاب کی مستحق ٹھہری جس میں اس کا شوہر داخل ہوا۔

حُمَالَةُ الْحَطَبِ کی تائید میں بڑا اختلاف منقول ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے تو یہ ہے کہ یہ بطور ہجو و تحقیر اس کی وہ حالت بیان ہوئی ہے جو اس کی اس دنیا میں تھی۔ وہ لونڈیوں کی طرح گلے میں رسی ڈال کر جنگل جاتی اور سر پر ایندھن کا گٹھڑا دکر لاتی۔ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن یہ جتنا ہی مشہور ہے اتنا ہی خلاف عقل و قیاس ہے۔

یہ امر یاد رکھیے کہ عرب کی غنائ حکومت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ خاص طور پر بنی ہاشم کو پورے عرب کے سرتاج۔ تھے۔ ابو لہب یوں تو خاندانی صاحب ثروت و دولت تھا پھر اس زمانے میں، جس کا ذکر ہے، اس کو قریش کی مذہبی حکومت میں اتنا ادنیٰ مقام حاصل ہو گیا تھا کہ یہ کہنا بالذات نہیں ہے کہ پوری حکومت عملاً اس کے آگے بڑھے کے نیچے آگئی تھی۔ کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اتنے بڑے دولت مند لیڈر کی بیگم لونڈیوں کی طرح ایندھن ڈھونڈنے کا کام کرے گی! ان لوگوں کا حال تو یہ تھا کہ ایک ایک خوش حال کے پاس درجنوں لونڈیاں اور غلام ہوتے اور ان کی بیگیا کی نازک مزاجی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانا بھی کسر شان سمجھتی تھیں۔ ان کے عام آدمی بھی اپنے بچوں کو دوسرے قبیلوں کی دائیوں سے دودھ پلاتے۔

پھر ابو لہب کی بیوی بھی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ یہ ام جمیل بنت حرب، خاندان بنی عبد شمس کی ایک نہایت باعزت خاتون تھی جو ہاشمی خاندان میں بیابھی گئی۔ اس کے شوہر کا جو مرتبہ حکومت میں تھا اس کا اعتبار کیجیے تو یہ کہنا بالذات نہیں ہو گا کہ اس کو اس وقت قریش میں وہی درجہ حاصل تھا جو اس زمانے میں کسی قوم کے اندران بیگم صاحبہ کو حاصل ہوتا ہے جو خاتون اول کہلاتی ہیں۔

غالباً انہی اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ دودھ دار بھاریاں لالا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ڈالتی تھی اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کے اندر لگانے سمجھانے کی عادت تھی جس کی تعبیر حُمَالَةُ الْحَطَبِ سے کی گئی ہے۔ یہ اقوال اس قدر کمزور و درعربیت سے اس درجہ بعید ہیں کہ ان پر تنقید کرنا محض اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا ہے اس وجہ سے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اگر کسی کو تفصیل مطلوب ہو تو وہ مولانا فراہی علیہ الرحمۃ کی تفسیر میں ان پر تنقید پڑھ لے۔

ہمارے نزدیک حُمَالَةُ الْحَطَبِ ترکیب میں حال پڑا ہوا ہے اور اس کی یہ حالت اس



وقت کی بیان ہوئی ہے جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ دوزخ میں پڑے گی۔ اس وقت اس کا حال اس مجرم کا سا ہوگا جو اپنی سولی کا تختہ اور اپنے جلانے کا ایندھن خود اٹھائے ہوئے ہو۔ حال کے سوا کوئی اور ترکیب اس کی از روئے مہربیت صحیح نہیں ہو سکتی اور اس صورت میں وہ تمام اقوال از خود بے معنی ہو جاتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس لیے کہ حالت کی صورت میں ان کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

قیامت کے دن مجرموں کا جو حال ہوگا اس کی تصویر قرآن میں جگہ جگہ کھینچی گئی ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حَمَلَةُ الْعَطَبِ کے الفاظ سے جو تصویر ابولہب کی بیوی کی سامنے آتی ہے وہ ٹھیک ٹھیک اسی کے مطابق ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ      اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے  
عَلَى ظُهُورِهِمْ إِلَّا نَسَاءَ مَا      ہوں گے اور سن لو کہ نہایت ہی بری چیز ہوگی جو وہ  
يَسِرُّونَ (الانعام - ۶: ۳۱)      اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس سے زیادہ وضاحت سورہ نحل میں ہے:

لِيَسْلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً      تاکہ وہ اٹھائیں اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے  
يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا فَرْجَ لَهُمْ      پورے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے بوجھ کا بھی  
الَّذِينَ يُفْلِتُونَ عَنْهَا      کچھ حصہ جن کو وہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے  
عَنِ النَّحْلِ (النحل - ۱۶: ۲۵)      ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہوگی اور ابولہب کے جن گناہوں کی وہ محسوس ہوگی کچھ بوجھ ان کا بھی اس کو اٹھانا پڑے گا اور یہ بوجھ اس کے جلانے کے ایندھن کی صورت میں ہوگا۔

ابن نفیل سے یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ابولہب کی بیوی کے ذکر سے مقصود یہاں اس کی مذمت اور سبجو کر کے دل کو تسلی دینا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے گمان کیا ہے، بلکہ اصل مقصود لوگوں، یا مخصوص طبقہ نسواں کو، اس کے انجام سے عبرت دلانا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی عورت کس طرح اپنی تباہی کا بھی سامان کرتی ہے اور اپنے شوہر اور اپنی اولاد کی تباہی کا بھی۔ قرآن نے مردوں کے پہلو پہلو عورتوں کا ذکر اسی لیے کیا ہے کہ ہر طبقہ اپنے طبقہ کے لوگوں کے حال اور انجام سے زیادہ بہتر طریقہ پر سبق حاصل کر سکتا ہے۔ یہ عورت ذبیہی اختیار سے چونکہ اونچے طبقہ سے تعلق رکھنے والی تھی اس وجہ سے اس کے انجام سے نوندریاں اور بیگمات دونوں عبرت حاصل کر سکتی ہیں۔



فِي حَبِيبٍ مَا حَبِلَ مِنْ نَسِيدٍ (۵)

یہ اسی تصویر کی تکمیل ہے جو اس سے پہلے والی آیت میں کھینچی گئی ہے۔ یعنی اس کی گردن البولہب کی ہوتی ہے۔ اس طرح کی موٹی رسی پڑی ہوگی جس طرح کی رسی ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس آیت میں جو حالت اس کی بیان ہوئی ہے اس کو مفسرین آخرت کے متعلق قیامت کے دن مانتے ہیں، پھر تعجب ہے کہ اس سے پہلے والے ٹکڑے کو انھوں نے آخرت سے متعلق کیوں نہیں مانا جب کہ عربیت کے قاعدے سے ان دونوں کے درمیان ایسا اتصال ہے کہ ان کو کسی طرح الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔

لفظ مَسَدٌ کھجور کے اس ریشے یا پتے یا چھلکے کے لیے بولا جاتا ہے جس سے مضبوط رسیاں بٹی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ عام طور پر مضبوط اور موٹی رسی کے لیے بھی آتا ہے، خواہ وہ کھجور کے ریشے کی ہو یا چمڑے کی یا اس قسم کی کسی اور چیز کی۔ چرخی کی رسی کے لیے اس کا استعمال عام ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مضبوط اور موٹی رسی کے معنی میں معروف ہے۔

آیت کی تلاوت پر تاویل یہ ہے کہ جب وہ قیامت کے دن اٹھے گی تو اس کی گردن میں ایک مضبوط رسی پڑی ہوگی جو ایندھن ڈھونے والی لونڈیوں کی گردن میں پڑی ہوئی رسی کی طرح موٹی ہوگی۔

اب غور کیجیے کہ اس صفت کے اضافے سے کیا نئے حقائق روشنی میں آتے ہیں :

۱۔ اس میں البولہب کی بیوی کی اس حالت کی وضاحت ہے جو لفظ حَمَّالَةٌ الْعَطَبِ میں بیان ہوئی ہے۔

۲۔ اس میں اس ذلت کی تصویر ہے جس میں وہ قیامت کے دن گرفتار ہوگی۔

۳۔ اس میں عمل اور نتیجہ عمل کی موافقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس ہمارے کو پس کر وہ دنیا میں ترقی تھی قیامت کے دن وہ موٹی رسی کی شکل میں بدل جائے گا جس کے سبب سے اس کی مثال اس لونڈی کی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔

۴۔ مغرور عورتیں آرائش کے ساتھ ساتھ نمائش کی بھی دلدادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے سامانِ آرائش کے حجم اور وزن کا خاص خیال رکھتی ہیں، اس وجہ سے مغروری ہوا کہ رسی موٹی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد لله حمداً کثیراً۔

لاہور

۱۴۔ جولائی ۱۹۸۰ء

۳۔ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ







تذکرہ قرآن

۱۱۲

الاخلاص







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا عمود، ترتیب میں اس کا مقام، مانہ نزول و سابق و لاحق سے تعلق

سورہ ان سورتوں میں سے ہے جن کے نام ہی سے ان کے مضمون و عمود کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا نام 'اخلاص' ہے اور یہ اخلاص ہی اس کا عمود ہے۔ اخلاص کا مطلب اللہ واحد پر اس طرح ایمان لانا ہے کہ اس کی ذات یا صفات یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی پہلو سے کسی دوسرے کی شرکت کا کوئی شبہ نہ پایا جائے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کو ماننے کا تعلق ہے دنیا نے اس کو ہمیشہ مانا ہے۔ یہ چیز انسانی فطرت کا بدیہی تقاضا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیطان توحید کا ابدی دشمن ہے اس وجہ سے وہ انسان کو فریب دے دے کر اس ماننے میں ایسی ملاوٹیں کرتا رہے کہ ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو کے رہ گیا ہے۔ توحید کی اصل حقیقت کو جاگر کرتے رہنے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے لیکن انسان بار بار اس حقیقت کو پا پا کر کھوتا رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید ہی کی خاطر اپنی قوم سے ہجرت کی اور اپنی اولاد کو ایک واحدی غیر ذی زرع میں بسایا کہ وہ شرکانہ ماحول سے بالکل محفوظ رہ کر صرف اللہ واحد کی عبادت کرے لیکن پچھلی سورتوں میں آپ نے دیکھا کہ آپ ہی کی ذریت نے آپ ہی کے بنائے ہوئے مرکز توحید (بیت اللہ) کو ایک بت خانے کی شکل میں تبدیل کر دیا اور وہ اپنے خود تراشیدہ بتوں کی عصبيت میں اتنی سخت ہو گئی کہ خدا کے آخری رسول سے وہ اس بات پر لڑتی رہی کہ جب تک ان کے بتوں کا مقام تسلیم نہ کر لیا جائے گا وہ خدا کا حق بھی تسلیم نہیں کرے گی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے جواب میں وہ فیصلہ کن اعلانِ برادیت کرنا پڑا جو سورہ کافرون میں آپ نے پڑھا۔

یہ اعلان اگرچہ کافی تھا لیکن اس کا تعلق اصلاً قریش اور مشرکین مکہ سے تھا۔ عرب میں اہل کتاب کے بھی مختلف قبائل تھے۔ یہ لوگ اگرچہ حامل کتاب ہونے کے مدعی تھے لیکن شیطان نے ان کو بھی ورغلا کر شرک کی نہایت گھنونی قسموں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مدینہ اور اس کے اطراف میں ان کا خاصا اثر تھا یہاں تک کہ دینی معاملات میں اہل عرب بھی ان کی برتری علانیہ تسلیم



کرتے تھے۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اس وقت تک تو ان کی مخالفت درپردہ رہی لیکن جب آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو ان کی مخالفت بھی علانیہ ہو گئی۔ یہ لوگ چونکہ اہل کتاب تھے اس وجہ سے اس پندار میں مبتلا رہے کہ قرآن ان کے عقائد و اعمال کو بہر حال مشرکین کے مقابل میں کچھ اونچا درجہ دے گا لیکن قرآن نے ان پر واضح کر دیا کہ عقائد ہوں یا اعمال، ہر پہلو سے وہ نہایت گہرے کھڈ میں گر چکے ہیں۔ خاص طور پر نصاریٰ کے شرک پر قرآن نے جو تنقید کی اس کا اثر ان پر یہ پڑا کہ وہ بھی یہود کی طرح علانیہ میدانِ مخالفت میں اتر آئے اور مخالفین کے تینوں گروہوں — مشرکین، یہود اور نصاریٰ — نے مل کر ایک متحدہ محاذِ اسلام کے خلاف قائم کر لیا۔ یہ صورتِ حال تقضی ہوئی کہ اخلاص کی حقیقت واضح کرنے کے لیے آخری سورہ ایسی جامع ہو کہ وہ شرک کے تمام رخنوں کو یک تلم بند اور مشرکین اور اہل کتاب دونوں پر حجّت تمام کر دے۔ چنانچہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ اگرچہ ایک گروہ نے اس کو مکی قرار دیا ہے لیکن اس سورہ کی جامعیت، جیسا کہ آگے وضاحت ہوگی، دلیل ہے کہ یہ مکہ میں ہیں بلکہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے جب اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کی مخالفت بالکل آشکارا ہو گئی ہے۔

قرآن میں اس سورہ کو سورہ لہب کے بعد جگہ ملی ہے اور ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ اب حق کا سب سے بڑا دشمن ختم ہوا اور وقت آگیا کہ اس حقیقی توحید کی مادی اس سرزمین سے پھر بلند ہو جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حرم تعمیر فرمایا۔ سورہ لہب سے پہلے سورہ نصر میں فتح کی بشارت تھی۔ اس کے بعد سورہ لہب میں اسلام کے سب سے بڑے عدو کی ہلاکت کی خبر ہے۔ پھر اس سورہ — الاخلاص —

میں اسلام کے بنیادی بتھر — توحید — کے اس کے اصلی مقام میں نصب کرنے کا اعلان ہے۔ یہ اعلان پیش نظر رکھیے کہ قریش اور اہل کتاب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کشمکش ملک و مال کے لیے نہیں تھی بلکہ اس لیے تھی کہ غیر اللہ کی خدائی کے ہر نقش کو مٹا کر اس کی جگہ خدائے وحدہ لا شریک کی خدائی کے نقش کو اس طرح اجاگر کر دیا جائے کہ کسی کے لیے بھی اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس سورہ میں توحید و اخلاص کا ہر پہلو نمایاں کر دیا گیا اور اس کو قرآن کے سب سے آخر میں جگہ دی گئی۔ اس کے بعد جو دو سورتیں ہیں، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، اسی خزانہ توحید کے پاسبان کی حیثیت رکھتی ہیں شیطان کی رخنہ اندازیلوں سے حفاظت کے لیے وہ اس کے ساتھ لگا دی گئی ہیں۔

قرآن مجید کی ترتیب اس طرح ہے کہ اس میں سب سے پہلے توحید و اخلاص کی سورہ



\_\_\_\_\_ الفاتحة \_\_\_\_\_ کو جگہ دی گئی ہے اور پھر سب سے آخر میں بھی توحید و اخلاص ہی کی سورہ \_\_\_\_\_ الاخلاص \_\_\_\_\_ کو جگہ ملی ہے۔ اس سے اس دین میں توحید کی اہمیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے کہ وہی اس میں اول بھی ہے اور آخر بھی۔ سورہ فاتحہ میں خدا کی شکر گزاری کا حق اس پہلو سے واضح فرمایا گیا ہے کہ وہی 'رب العلمین' بھی ہے اور وہی 'مَا إِلَهٌ إِلَّا هُوَ' بھی۔ پھر اس سورہ میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے اللہ تعالیٰ کی وہ صفات بیان کی گئی ہیں جو ہر اس رخنہ کو بند کر دیتے والی ہیں جن سے شرک کوئی راہ پاسکتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ توحید کی تعلیم میں مبادی کی حیثیت رکھتی ہیں اور مقدمہ کتاب میں ہم اس آخری گردپ کی اس خصوصیت پر ایک جامع تبصرہ کر چکے ہیں کہ اس میں ان سورتوں کو جگہ ملی ہے جو دین کی تعلیم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

---







# سُورَةُ الْاِخْلَاصِ

مَدَنیَّہ \_\_\_\_\_ آیات: ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ① اللّٰهُ الصَّمَدُ ② لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ③ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ④

کہہ دو، وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کے ساتھ ہے۔ نہ

وہ کسی کا باپ اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا کفو۔ ۱-۴

آیات  
۴-۱

۱  
۴

ترجمہ آیات  
۴-۱



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (۱)

یہ قُلْ اسی مفہوم میں ہے جس میں قُلْ یَا یٰہَا اِلٰکِیْفِرُوْنَ (الکفرون - ۱۰۹، ۱۰) میں قُلْ، منادی کے ہے یعنی اعلان کر دو، بر ملا کہہ دو اور اس طرح منادی کر دو کہ ہر شخص سن اور جان لے، نہ کسی کو کوئی اختیار باقی رہے، نہ کسی مزید سوال و جواب کی گنجائش رہ جائے۔

قُلْ، منادی کے

مفہوم میں

اس طرح کے اعلان کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب بحث و مناظرہ کا پورا دور گزر چکا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سمجھانے کا حق ادا ہو چکا ہے، اب جو لوگ مزید بحثیں اٹھا رہے ہیں وہ سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ بات کو الجھانے اور طول دینے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ اس طرح کے موقع پر یہ مناسب ہوتا ہے کہ بات دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اس طرح کہہ دی جائے کہ مخاطب اندازہ کر لے کہ مسئلہ نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا، اب وہ نہ اپنا مزید وقت ضائع کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ اس کے موقف میں کسی تبدیلی یا لچک کی گنجائش ہے۔

اعلان کا

موقع و محل

لَهُوَ، میرے نزدیک ضمیر شان ہے۔ یہ اس معبود ذہنی یا صورت حال کے لیے آتی ہے جو مخاطب اور متکلم میں اس طرح مشترک ہو کہ اس کے بولتے ہی بے تکلف ذہن اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسلام کی دعوت شروع ہونے کے بعد سے اہل عرب کی ہر مجلس میں سب سے زیادہ گرم موضوع یہی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا موضوع تھا۔ دعوت کے دوسرے عنوانات — مواد اور رسالت — بھی زیر بحث آتے لیکن ان کی حیثیت ضمنی مباحث کی تھی۔ توحید کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ قریش اس کو اپنی اور اپنے آباؤ اجداد کی شان کا مسئلہ بنا بیٹھے تھے اور کفر و کفریت پر بھی اپنے معبودوں اور اپنے ان اجداد کی توہین گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو ان کو پوجتے رہے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر آتا ہے تو وہ دعوت دینے والوں پر ان کا منہ لوچنے کے لیے جھپٹ پڑتے ہیں۔ ایک طرف قریش کی یہ انانیت و دوسری طرف قرآن اور رسول کا وہ بے لچک موقف جو سورہ کافرون میں بیان ہوا کہ پورا قوم کو کاٹ پھینکنا منظور لیکن شرک کے ساتھ کوئی سمجھوتہ منظور نہیں۔

لَهُوَ، کا

مفہوم

جب تک بحث صرف شرکین قریش سے تھی اس وقت تک تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے مسئلہ میں کچھ زیادہ الجھنیں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے تقلید آباء میں بت پرستی اختیار تو کر



لی تھی لیکن اس کی تائید میں انھوں نے نہ منکلمانہ قسم کی موثر گانیاں پیدا کی تھیں اور نہ اپنی امیت کے سبب سے یہ چیز وہ پیدا کر ہی سکتے تھے لیکن عربیہ میں کھلم کھلا اہل کتاب سے بھی سابقہ پیش آیا جو اہل کتاب ہونے کے باوجود نہ صرف شرک کی نہایت گھنونی قسموں میں مبتلا تھے بلکہ انھوں نے اپنے شرک کی حمایت میں ایک پورا علم کلام تیار کر رکھا تھا۔ خصوصاً نصاریٰ کی میتھالوجی (Mythology) تو اپنی الجھنوں کے اعتبار سے دنیا میں شاید ایک ہی ہے۔ قرآن نے ان سب کو چیلنج کیا، ان سے مباحثہ کیے اور ان کی گمراہیاں ان پر واضح کیں۔ ان میں سے جن کو ایمان کی توفیق ہوئی وہ ایمان لائے۔ جو ایمان نہیں لائے ان کو قرآن نے اپنے دلائل سے اس طرح لپکا کر دیا کہ ان کے اہل کتاب ہونے کا رتبہ کم از کم عربوں کے دلوں پر سے تو بالکل ہی اٹھ گیا۔

یہ نئی صورت متفقہ ہوئی کہ توحید کے باب میں ایک مختصر سورہ بھی نازل ہو جو مشرکین اور اہل کتاب دونوں کے پیدا کردہ شرک کے ہر رخنہ کو اس طرح بند کر دے کہ شیطان کے لیے درا نڈازی کی کوئی راہ کھلی نہ رہ جائے اور جو جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی مختصر بھی ہو کہ اس کو ہر شخص یاد کر کے تعویذ اور جامع ہونے کی طرح حرز جاں بنا سکے۔ چنانچہ یہ سورہ نازل ہوئی جو نہایت چھوٹی چھوٹی کل چار آیتوں پر مشتمل ہے لیکن 'معانی' کے اعتبار سے اس کو بعض عارفین قرآن نے ثلث قرآن کے برابر قرار دیا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ بات بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ قرآن کے مباحث اگر اپنے مطالب کے اعتبار سے جمع کیے جائیں تو وہ تین جامع عنوانات کے تحت جمع ہو سکتے ہیں: توحید، معاد اور رسالت۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ توحید کا حصہ قرآن میں بقدر ایک ثلث کے ہے۔ یہ مباحث قرآن کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان پھیلے ہوئے مباحث کو اگر اچھی طرح چھاننیے تو ان کے اندر سے خدا کی ذات و صفات سے متعلق وہ جواہر ریزے نکلیں گے جو اس مختصر سورہ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ گویا قرآن میں رد شرک کی ساری بحث انہی چند نکتوں پر مبنی ہے جن کا اس سورہ میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

”قُلْ هُوَ اللَّهُ“ کے الفاظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا ہو کہ آپ اپنے اللہ کی صفات بیان کریں تب ہی آپ نے یہ سورہ سنائی ہو۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے اصل صفات اوپر اشارہ کیا، فضا میں اس سوال پر گرما گرمی کا پایا جاتا اس بات کے لیے کافی تھا کہ یہ سورہ نازل ہو اور لوگوں کو سنادی جائے۔ ”هُوَ اللَّهُ“ کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اللہ جس کے بارے میں تم سوال و جواب کر رہے ہو اور بحث و جدال کر رہے ہو اس کی صفات جاننی چاہتے ہو تو مجھ سے سنو، وہ یہ ہیں۔ اس کے بعد وہ صفات بیان ہوئی ہیں جو شرک کے تمام رخنوں کو بند کر دینے والی ہیں۔ مخاطبوں کی گمراہی دور کرنے کے لیے اصلاً انہی صفات کا جاننا ضروری تھا۔ ان کو جان لینے کے بعد دوسری صفات کے



جاننے کے لیے راہ خود باز ہو جاتی ہے۔

اللہ، اسم ذات ہے۔ اس کے مفہوم پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ مشرکین عرب اس نام کو اسم ذات ہی کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ قرآن نے تمام صفاتِ خُشنی کا موصوف اسی اسم کو قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ وہ اللہ اَحَدٌ ہے۔ اہل لغت نے دَاحِدٌ اور اَحَدٌ میں یہ فرق کیا ہے کہ اَحَدٌ وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور دَاحِدٌ وہ ہے جس کی صفات میں کوئی اس کا شریک نہ ہو۔ غالباً اسی وجہ سے لفظ اَحَدٌ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے صفت کے طور پر نہیں آیا۔ اس سے یکتائی و بے ہنگمی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔ ہر شے و قرابت سے پاکی و برتری اس کا لازمہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب حادث و مخلوق۔ ظاہر ہے کہ جو سب سے پہلے خود بخود تھا وہ ہمیشہ سے تھا کیونکہ جو کبھی نیست رہا ہو وہ خود ہرگز ہست نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے دو باتیں ماننی ضروری ہوئیں۔ ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ بے ہنگمی کے یہ لازمی نتیجے ہیں جن کا انکار عقل کے خلاف ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ اَحَدٌ ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ وہ قدیم لم یزل اور خالق کل ہے۔

اللہ الصَّمَدُ (۲)

لفظ صَمَدٌ اصل میں اس بڑی چٹان کے لیے آتا ہے جس کی دشمن کے حملہ کے وقت پناہ پکڑتے ہیں، یہیں سے قوم کے سردار کو جو قوم کا پشت پناہ اور سب کا مرجع ہو صَمَدٌ کہنے لگے۔ زبور اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں اللہ تعالیٰ کو بکثرت چٹان اور مدد کی چٹان کہا گیا ہے۔ جس طرح غَنِیُّ کے بعد قرآن میں حَمِید کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے بطور بدر قرآنی ہے اسی طرح یہاں اَحَدٌ کے بعد صَمَدٌ کی صفت بطور بدر قرآنی ہے۔ غَنِیُّ اور حَمِید کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ لفظ غَنِیُّ سے خدا کی بے نیازی کا جو تصور ذہن میں آتا ہے اس سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے بالکل بے تعلق ہے۔ اس کا اثر ان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ اس کو اپنی رسائی سے بالاتر سمجھ کر دوسروں کے سہارے پکڑتے ہیں۔ لوگوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت غَنِیُّ کے ساتھ حَمِید کا بھی ذکر فرمایا جس سے مقصود یہ رہنمائی دینا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ تمام سزاوارِ حمد کاموں کا منبع بھی ہے۔ اس وجہ سے اس



کے بندوں کو چاہیے کہ ہمیشہ اسی سے کو لگائیں، کبھی اس سے مایوس ہو کر دوسروں کا سہارا نہ پکڑیں۔  
 ٹھیک اسی طرح اَحَدُ کے بعد یہاں صفت صَمَدٌ کی یاد دہانی فرمائی تاکہ لفظ اَحَدُ سے خدا کی یکتائی و بے ہنگی کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے مغلوب ہو کر کوئی اللہ تعالیٰ کو ایک بالکل الگ تھلگ اور خاموش علت العلل نہ سمجھ بیٹھے ورنہ یہ غلط فہمی بھی دوسرے سہاروں کی تلاش کا سبب بن سکتی ہے۔ اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے اَللّٰهُ الصَّمَدُ کہہ کر وضاحت فرمادی کہ بے شک اللہ ہے تو سب سے الگ بے نیاز و بے ہم، مگر وہ سب کی خبر گیری اور دست گیری بھی کرتا ہے، سب کے لیے پناہ کی چٹان بھی ہے، سب کا مادی و مرجع بھی ہے۔ اس کے بندے جب اس سے فریاد کرتے ہیں وہ ان کی فریاد سنتا اور ان کی فریاد سنی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی متقابل صفات میں صحیح توازن قائم نہ رکھنے سے قوموں کو جو گمراہیاں پیش آتی ہیں اور ان سے شرک کے جو دروازے کھلے ہیں ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ مذاہب کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی اکثر گمراہیوں کی تہ میں ان کا یہی عدم توازن مقمّر ہے۔ اس قبیل کی جو گمراہیاں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے ہاں پائی جاتی تھیں ان کا ذکر اس کتاب میں ان کے محل میں ہوا ہے۔ ان کو نگاہ میں رکھیے تو اس کی ہلاکت انگیزیوں کی پوری تصویر ذہن کے سامنے آجائے گی۔

كُفُّوا لَكُمْ يَوْمَ كَذ (۳)

نہ اس نے کسی کو جتنا اور نہ وہ کسی کا جتنا ہوا۔ یہ بات اگرچہ لفظ اَحَدُ کے اندر بھی، جیسا کہ نصاریٰ بھی ہم نے اس کی وضاحت کی ہے، موجود تھی اور وہ عاقلوں کے لیے کافی ہے لیکن جو چیزیں قوموں گمراہی اور کے لیے مزہ قدم ہوتی ہیں ان کو قرآن نے مختلف اسلوبوں سے اس طرح واضح کر دیا ہے کہ کسی کے لیے کوئی غذر باقی نہ رہ جائے۔ یہ مسئلہ بھی اپنی مسائل میں سے ہے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی شادریاں اور ان کے اولاد و احفاد کی جو تفصیلات ہمیں یونانیوں اور ہندوؤں کی دیومالا (MYTHOLOGY) میں ملتی ہیں اسی سے ملتی جلتی مزعوامات ہمیں ان قوموں کے اندر بھی ملتی ہیں جو قرآن کی اول مخاطب تھیں۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔ یہود نے بھی تورات کے حامل ہونے کے مدعی ہوتے ہوئے عزیر کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ نصاریٰ نے باپ، بیٹے اور روح القدس کی ایک تثلیث قائم کی اور اس کے تعصب میں اس طرح گرفتار ہوئے کہ ان کے پادری اکیلے مانہ میں جب کسی کو اپنے دین میں داخل کرتے تو اس سے پہلے اس شخص سے وہ نعوذ باللہ اس خدا پر لعنت کروا دیتے جس کی صفات قُلْ هُوَ اللَّهُ اَحَدٌ میں بیان ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سورہ پیران کا یہ غصہ اسی وجہ سے تھا کہ اس میں توحید کا جو تصور دیا گیا ہے اس کے ہوتے نہ خدا کو



باپ فرض کرنے کی گنجائش باقی رہتی تھی نہ بیٹا اور نہ کسی کو اس کی ماں بنایا جاسکتا تھا۔  
 قرآن نے کُمُ یَدِّدُ ۙ وَکُمُ یُؤَلِّدُ ۙ کے الفاظ سے خدا کی یکتائی اور بے ہنگی کی حقیقت  
 اس طرح بے نقاب کر دی ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کسی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں  
 رہی ہے اور دنیا کو یہ روشنی سب سے پہلے قرآن ہی کے ذریعے سے ملی ہے جس کا اعتراف  
 اب وہ لوگ بھی کرنے لگے ہیں جو اپنے قومی و مذہبی تعصبات کے غول سے باہر نکل کر حقائق  
 کا مواجہہ کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتے تھے جو عیسائی اس خدا کو کبھی نفوذ باللہ گایا  
 دیتے تھے جس کا ذکر سورہ اخلاص میں ہوا ہے ۛ اب انہی عیسائیوں کے اندر ایسے لوگ بھی  
 پیدا ہو رہے ہیں جو علانیہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ توحید کی حقیقت سے دنیا سب  
 سے پہلے قرآن کے ذریعے سے آشنا ہوئی ہے۔

وَلَا یُکُنْ لَّہٗ کُفُوًا أَحَدٌ (۲)

”کُفُو“ کے معنی ہم سر، ذات، برادری کے ہیں۔ یعنی کوئی اس کے جوڑ کا نہیں۔ سب مخلوق  
 وہ خالق، سب محتاج، وہ غنی، سب فانی اور وہ تنہا باقی۔

خدا کا صحیح

تصور

اس سورہ میں جو مثبت و منفی صفات اللہ تعالیٰ کی مذکور ہوئی ہیں ان سب کو سامنے  
 رکھ کر اللہ تعالیٰ کا تصور ذہن میں آراستہ کیجیے تو بالا جمال وہ تصویر ہوگا کہ وہ ازلی وابدی ہے۔  
 جب کچھ نہیں تو وہ تھا اور جب کچھ نہیں ہوگا تب بھی وہ ہوگا۔ وہ اپنی ذات میں کامل اور بالکل بے نیاز  
 ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب کے لیے سہارا اور سب کے  
 لیے پناہ ہے۔ ہر چیز اس کے حکم سے وجود میں آتی ہے اور اسی کے حکم سے فنا ہوتی ہے۔ نہ  
 وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا بلکہ سب کا خالق اور سب کا پروردگار ہے۔ کوئی چیز اس کی ذات  
 یا اس کے جوہر سے نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کی مخلوق و مرئوب ہے اور کوئی اس کا ہم سر یا اس  
 کی برابری کا نہیں ہے بلکہ سب اس کے بندے، غلام اور محکوم ہیں۔

خدا نے یکتا و بے ہمتا کی نوازش سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَاَلْحَمْدُ  
 لِلّٰہِ اَوَّلًا وَاٰخِرًا۔

لاہور

۲۵۔ جولائی ۱۹۸۰ء

۱۱۔ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ



تدبر القرآن

۱۱۳

الفلق







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا مضمون اور سابق و لاحق سے تعلق

سابق سورہ ————— الاخلاص ————— کی تمہید میں ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ توحید کو دین کی اساس کی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا آغاز بھی توحید ہی سے فرمایا اور پھر اس کا اتمام بھی اسی پر کیا۔ گویا اصلاً قرآن کی آخری سورۃ الاخلاص ہوئی۔ اس کے بعد دو سورتیں، جو معوذتین کے نام سے موسوم ہیں، اس خزانہ توحید کے پاسبان اور محافظ کی حیثیت سے اس کے ساتھ لگا دی گئی ہیں جن میں ان تمام آفتوں سے بندوں کو اپنے رب کی پناہ مانگنے کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے جو درباب توحید ان کے لیے مزید قدم ہو سکتی ہیں۔

توحید کے لیے اس اہتمام خاص کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تمام دین کی بنیاد ہے۔ اگر بندے کا قدم توحید میں استوار ہے تو وہ دین پر استوار ہے۔ اگر وقتی طور پر اس سے کوئی لغزش صادر بھی ہوگی تو اساس دین سے وابستہ ہونے کے سبب سے امید ہے کہ اس کو اصلاح کی توفیق ملے اور وہ راہ راست پر آجائے۔ برعکس اس کے اگر درباب توحید اس کو کوئی گمراہی پیش آگئی تو اندیشہ ہے کہ وہ ہر قدم پر دین سے دور ہی ہوتا جائے گا اور درجہ بدرجہ اتنا دور ہو جائے گا کہ اس کے لیے دین کی طرف بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان جس امتحان میں ڈالا گیا ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مرتے دم تک شیطان کا مقابلہ کرے اور اس کو شکست دے۔ شیطان کے مقابل میں اس کی اسی متحدی پر اس کی آخری فوز و فلاح کا انحصار ہے۔ شیطان کا خاص واؤ جس پر اس نے انسان کو شکست دینے کی قسم کھا رکھی ہے یہی توحید ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج دے رکھا ہے کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس کو اس راہ سے ہٹا کر شرک کی راہ پر ڈال دے گا۔ سورۃ اعراف میں اس کے اس چیلنج کا ذکر یوں ہوا ہے:



قَالَ فِيمَا أُغْوَيْتَنِي لَأَتَّكِدَنَّ  
لَهُمْ مِرَاطًا الْمُسْتَقِيمَ  
ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ  
أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ  
أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ  
وَلَا تَحِيطُ أَكْثَرُهُمْ شِكْرِينَ ۝

(الاعتراف - ٤: ١٢ - ١٤)

شیطان نے کہا، بوجہ اس کے کہ تو نے مجھے  
مگر اسی میں ڈالا، میں بھی ان کی (بنی آدم کی)  
گھات میں تیری سیدھی راہ (توحید) پر بیٹھوں گا۔  
پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے،  
ان کے دہنے سے اور ان کے بائیں سے ان پر  
تاخت کروں گا۔ پس تران سے اکثر کو اپنا سرگزا  
(موجد) نہیں پائے گا۔

شیطان کے ان ہتھکنڈوں کی تفصیل جو وہ انسان کو شرک کے جال میں پھنسانے کے لیے اختیار کرے گا خود شیطان کی زبان سے سورۃ نسا میں یوں بیان ہوئی ہے :-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ  
بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ  
ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ  
يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ  
ضَلَالًا بَعِيدًا إِنَّ يَدْعُونَ  
مِنْ دُونِهِ إِلَّا لَأَنشَاءً وَإِنْ  
يَدْعُونَ إِلَّا الشَّيْطَانَ مَرِيدًا  
لَعَنَهُ اللَّهُ وَقَالَ لَا تَخْذَنْ  
مِنْ عِبَادِي نَصِيبًا مَفْرُوضًا  
وَلَا ضِلَّهِمْ وَلَا صَلِّهِمْ وَلَا  
مُرْتَلِبِهِمْ فَلْيَكُنْ أَذَانُ  
الْأَنْعَامِ وَلَا مَرْثَهُمْ  
فَلْيَغْيِرَنَّ خَلْقَ اللَّهِ وَد  
مَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا  
مَنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ  
خُسْرَانًا مُبِينًا

(النساء - ٣ : ١١٤ - ١١٩)

اللہ اس جوہم کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ کسی  
کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے  
سوا جو گناہ ہیں ان کو جس کے لیے چاہے گا  
بخش دے گا۔ اور جو اللہ کا شریک  
ٹھہرائے گا تو وہ نہایت دور کی گمراہی میں جا  
پڑا۔ یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے بھی ہیں تو  
دیوبلوں کو، اور پکارتے بھی ہیں تو شیطان کیش  
کو۔ اس پر اللہ کی لعنت۔ اور اس نے کہہ  
رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک  
مقرر حصہ ہتھیا کر رہوں گا۔ ان کو گمراہ کر  
ڈالوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں  
اور ان کو سمجھاؤں گا تو وہ جو پایوں کے کان  
کاٹیں گے اور ان کو سمجھاؤں گا تو وہ اللہ کی  
بنائی ہوئی ساخت کو بدلیں گے اور جو اللہ  
کو چھوڑ کر شیطان کو کارساز بنائے گا تو وہ  
نہایت کھلی نامرادی میں پڑا۔

اس سے بھی زیادہ جامعیت سے یہی مضمون سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۶۱-۶۵ میں بھی



آیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان آیات کی تفسیر تدبر قرآن میں پڑھ لیجئے تاکہ ان کے مضمرات اچھی طرح آپ کے سامنے آجائیں اور واضح ہو جائے کہ شیطان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو شرک کے کسی پھندے میں پھنسا دے تاکہ وہ اس گناہ کا ارتکاب کر کے خدا کی رحمت سے بالکل محروم ہو جائے جس کے لیے مغفرت نہیں ہے۔ شیطان کے دل میں نبی آدم کے خلاف جو حسد و غصہ ہے وہ اسی انتقام سے تسکین پاتا ہے۔

یہ چیز مقفی ہوئی کہ آخر میں توحید کی جامع تعلیم کے ساتھ ساتھ شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنے کا وہ طریقہ بھی بتا دیا جائے جو سب سے زیادہ کامیاب طریقہ ہے اور جس کو اختیار کر کے اللہ کا ہر بندہ شیطان کے حملوں سے اپنے خزانہ توحید کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اسی طریقہ کو واضح کرنے کے لیے آگے کی دونوں سورتوں میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ شیطان جیسے شاطر دشمن کے حملوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان صرف اپنے رب کی پناہ ڈھونڈھے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کی شاطرانہ چالوں اور کیدالیوں سے بچانے والا نہیں ہے۔ اگر انسان اس کے لیے ہر لمحہ چوکتا نہیں رہے گا تو اندیشہ ہے کہ وہ شیطان سے مار کھا جائے اور پھر اس کے لیے اس کے دام سے نکلنا مشکل ہو جائے۔

دوسری چیز یہ بتائی گئی ہے کہ خدا کی وہ کیا صفات ہیں جن کے واسطے سے بندے کو خدا کی وہ پناہ حاصل ہوتی ہے جو اس کو شیطان کے فتنوں سے بالکل مامون کر دیتی ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ ہی کے بتانے کی تھی اور یہ اس کا اپنے بندوں پر عظیم احسان ہے کہ اس نے ان سورتوں میں اپنی ان صفات سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق اس کی اعلیٰ صفات ہی کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے اور یہ اسی کو معلوم ہے کہ اس کے بندے اپنے کس دشمن سے مقابلہ کے لیے اپنے رب کی کس صفت کو سپر بنائیں۔ یہ چیز ہر شخص نہیں جان سکتا اور اس میں معمولی غلطی بھی انسان کی جدوجہد کو بے اثر بنا سکتی ہے۔

تیسری چیز اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ انسان کو گمراہ کرنے کے معاملے میں شیطان کی جدوجہد کی رسائی کہاں تک ہے اور اس کے سب سے زیادہ مؤثر حربے کیا ہیں۔ اس سے مقصود انسان کو اس کے دشمن کی طاقت کا اندازہ کر دینا ہے تاکہ وہ اس کی قوت سے نہ مرعوب ہو اور نہ اس سے بے پردہ رہے بلکہ وہ اچھی طرح آگاہ رہے کہ دشمن کن راستوں سے اس پر وار کر سکتا ہے اور



اس کے مقابلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود اسے کن طاقتور اسلحہ سے مسلح کر رکھا ہے۔  
 ان اشارات کی روشنی میں پہلے سورۃ فلق کی تلاوت فرمائیے۔

---



# سُورَةُ الْفَلَقِ

مَدَنِيَّةٌ ————— آیات : ۵

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ① مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ② وَ  
مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ③ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثِ  
فِي الْعُقَدِ ④ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ⑤

آیات  
۵-۱  
ع  
۳۸  
ترجمہ آیات  
۵-۱

کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں نمودار کرنے والے خدا کی، ہر اس چیز کے شر سے  
جو اس نے پیدا کی ہے اور اندھیرے کی آفت سے جب وہ چھا جائے اور گرہوں  
میں پھونک مارنے والوں کی آفت سے اور حسد کرنے والے کی آفت سے جب  
وہ حسد کرے۔ ۱-۵



## الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱)

’الفلق‘ کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے صبح کیا ہے لیکن اس کے اصل معنی بھاڑنے کے ہیں۔ صبح چونکہ شب کے پردے کو چاک کر کے نمودار ہوتی ہے اس وجہ سے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوا۔ لیکن بھاڑ کر نمودار ہونے والی چیز صرف صبح ہی نہیں ہے۔ ہر چیز کسی نہ کسی چیز کے اندر سے اس کو چاک کر کے ہی نمودار ہوتی ہے۔ گٹھلی سے پودا نمودار ہوتا ہے، دانے کو بھاڑ کر انکھونے نکلتے ہیں، زمین کو بھاڑ کر نباتات گنتی ہے، پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے چشے اور دریا بہتے ہیں، اسی طرح اندھے کو بھاڑ کر بچے نکلتے ہیں اور رحم کے منہ کو کھول کر دوسری تمام زندہ مخلوقات وجود پذیر ہوتی ہیں۔ پھر لفظ ’فَلَقٌ‘ کو اس قدر ممد و دکر دینے کے لیے کیا جوازی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کو اس کے وسیع معنی میں رکھنا ہی موقع و محل کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ لغت میں یہ لفظ وسیع معنی میں آیا بھی ہے۔ قرآن میں جس طرح ’فَالِقُ الْإِصْبَاحِ‘ (الانعام - ۶: ۹۶) کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اسی طرح ’فَالِقُ الْوَحْيِ وَالنَّوْءِ‘ (الانعام - ۶: ۹۵) کی ترکیب بھی وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح زمین اور آسمان سے متعلق ارشاد ہے کہ ’كَانَتْ تَارِقًا فَفَتَقْنَاهُمَا‘ (الانبیاء - ۲۱: ۳۰) وہ دونوں بند ہوتے ہیں تو ہم ان کو بھاڑتے ہیں۔ یعنی آسمان کو کھول کر اس سے پانی برساتے اور زمین کو بھاڑ کر اس سے نباتات اگاتے ہیں۔

’فَلَقٌ‘ کا  
وسیع مفہوم

میں نے لفظ کی اس وسعت کو پیش نظر رکھ کر ’رَبِّ الْفَلَقِ‘ کا ترجمہ نمودار کرنے والے خداوند کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ جامع اور معنی تیز ہے۔ آگے کے مضمون سے بھی اس کو، جیسا کہ وضاحت آرہی ہے، زیادہ مناسبت ہے۔

مِنْ شَيْءٍ مَا خَلَقَ (۲)

یہ اس مقصد کا حوالہ ہے جس کے لیے تمام عالم کے نمودار کرنے والے خداوند کی دہائی کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا کہ جس خداوند نے تمام عالم کو نمودار کیا ہے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے پناہ ان کے پیدا کرنے والے ہی سے مانگو، کسی دوسرے سے نہ مانگو۔ کوئی دوسرا ان کے شر سے پناہ اسی صورت میں دے سکتا ہے کہ جب وہ ان کے پیدا کرنے والے سے زیادہ طاقتور ہو اور یہ بات بالکل خلاف عقل ہے کہ کوئی چیز خالق کائنات سے زیادہ قدرت و اختیار والی ہو یا ہو سکے

مخلوقات کے  
شر سے پناہ  
مناقیج ہی کے  
سکتا ہے



اس وجہ سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے شر سے کسی غیر خدا کی پناہ ڈھونڈنا سراسر سفاہت ہے۔  
یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ چیزیں جتنی بھی ہیں سب خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ خالق اس کے سوا  
کوئی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ اجمالاً مقصدِ خیر سے پیدا کی ہیں لیکن وہ جب چاہے  
ان کو شر میں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ بارش اس دینک کے لیے سراسر رحمت ہے لیکن اللہ تعالیٰ  
چاہتا ہے تو اس کو عذاب بھی بنا دیتا ہے۔ اسی طرح خود انسان اپنی بے خبری اور سوء استعمال  
سے ایک چیز کو جو اصلاً نافع ہے، مضر بنا لیتا ہے۔ اشیاء کے ان برے پہلوؤں سے اپنے کو  
محفوظ رکھنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی خدا ہی سے استعاذہ کرے۔ نہ ان اشیاء میں سے کسی چیز  
کو مؤثر بالذات سمجھ کر ان کی دہائی دینی شروع کر دے جس طرح مشرک تو میں کرتی ہیں اور نہ خدا کے سوا  
کسی غوث یا قطب کو پکارنا شروع کر دے کہ وہ اگر خدا کی اس پکڑ سے اس کو بچائیں۔ خدا کی  
پکڑ سے خدا کے سوا کوئی دوسرا دہائی نہیں دے سکتا۔ آفتوں سے اپنے کو بچانے کی جو جائز تدبیریں  
انسان اختیار کرتا ہے، مثلاً کسی بیماری میں ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے، تو یہ چیز اس کے منافی  
نہیں ہے بشرطیکہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ طبیب حقیقی صرف اللہ ہے، شفا صرف اسی کے اختیار  
میں ہے، اگر وہ شفا نہ دے تو کسی دوسری طاقت کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کسی معمولی سے معمولی  
بیماری سے بھی نجات دے سکے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہ ایک ہی کلمہ مشرک کے بہت سے دروازوں کے بند کر دینے  
کے لیے کافی ہے۔ اس سے شریعت اور خیر و شر کی الگ الگ خدائی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ مشرک  
قومیں ہر آفت کو بجائے خود ایک مستقل نافع و ضار وجود سمجھ کر اس کی دہائی پکارنی شروع کر دیتی ہیں۔  
حالانکہ کوئی آفت اپنا خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں ہی  
کے ظلال و آثار ہیں سے ہیں جو اللہ ہی کے اذن سے وجود میں آتی ہیں، اسی کے حکم سے اثر انداز  
ہوتی ہیں اور تنہا اسی کی مدد سے ان کے شر سے نجات ملتی ہے اس وجہ سے حقیقی پناہ اور دادی  
ملجا وہی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ (۳)

غاسق رات کو کہتے ہیں جب شفق غائب ہو جانے کے بعد اس کی تاریکی بڑھ جائے۔ شرکاء وجود  
وقب کے معنی تاریکی چھا جانے کے ہیں۔ اہل لفظ نے 'غاسق' کے معنی چاند کے بھی لکھے ہیں۔ مستقل بالذات  
لیکن یہاں 'إِذَا وَقَبَ' کا قرینہ اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد رات ہی ہے۔ اس لیے کہ اس کی  
تاریکی جب بڑھتی ہے تو اپنے دامن میں آفتیں لیے ہوئے بڑھتی ہے۔



یہ مکڑا بہترین مثال ہے اس بات کی کہ اس دنیا میں شر کا وجود مستقل بالذات نہیں ہے کہ خیر و شر کے خالق الگ الگ مانے جائیں اور دونوں کی دہائی دی جائے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں ہی کے متعلقات و حواشی میں سے ہے اس وجہ سے اس سے بچنے کے لیے کسی غیر اللہ کی نہیں بلکہ اللہ ہی کی پناہ ڈھونڈنی اور اسی کی دہائی دینی چاہیے۔

قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اس دنیا کے بقا کے لیے جس طرح دن اور اس کی روشنی و حرارت ضروری ہے اسی طرح رات اور اس کی خنکی و سکون بخشی بھی ضروری ہے، پھر ظاہری تضاد کے باوصف دنیا کے بقا میں ان دونوں کے توافقی کو توحید کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اسی رات کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا تلقین کر کے گویا یہ درس دیا گیا ہے کہ رات کی جو تاریکی تمھاری راحت کے لیے ناگزیر ہے اسی کے ظلال و آثار میں سے یہ چیز بھی ہے کہ اس میں چور، قاتل، دشمن اور شہرات و ہوام نکلتے ہیں جن سے تمھیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ شب کے سکون میں ان غیر مطلوب چیزوں کی مداخلت سے یہ نتیجہ نکالنا تو بالکل غلط ہوگا کہ رات کا خالق کوئی اور ہے اور ان کے اندر نمودار ہونے والے ان ناخواندہ مہازوں کا خالق کوئی اور پھر دونوں کی دہائی پکاری جائے بلکہ صحیح اور موافق عقل و فطرت بات یہی ہو سکتی ہے کہ ان دونوں کا خالق ایک ہی ہے۔ اسی نے رات کا سکون بخشا ہے اور وہی اس میں خلل انداز ہونے والی آفتوں سے پناہ دے سکتا ہے۔ یعنی جس طرح اس کی برکتیں خدا ہی کے فیض سے ہیں اسی طرح اس کی زحماتیں بھی اسی کے اذن سے ہیں۔ پس ہر حال میں مرجع اسی کو بنانا چاہیے۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا کہ شر کے وجود کی اس نوعیت کو نہ سمجھ سکنے کے سبب ہی سے نادانوں نے شر کو بھی مستقل حیثیت دے دی اور پھر خیر و شر دونوں کے الگ الگ خالق مان کر شہوت کی بنیاد رکھ دی۔ قرآن نے یہاں بہترین مثال دے کر واضح کر دیا کہ شر کی اصل حیثیت کیا ہے اور اس سے پناہ دینے والا کون ہے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ (۴)

مادی اور محسوس آفات سے پناہ مانگنے کے بعد یہ روحانی و اخلاقی آفتوں سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے۔

لَقَدْ نَأْتِي فِي الْعُقَدِ کے معنی گرہوں میں پھونک مارنے والوں کے ہیں۔ اگرچہ یہ مؤنث ہے لیکن اس سے عورتوں کو مراد لینا لازم نہیں ہے۔ عربیت کے قاعدہ سے آپ اس سے

روحانی آفات  
سے پناہ مانگنے  
کا طریقہ۔



اور ارجح بخیر اور نفوسِ خبیثہ مراد لے سکتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ مردہوں یا عورتیں اور قطع نظر اس سے کہ ان کا اشارہ یہود و مجوس کی طرف ہو یا عرب کے ساحروں اور کاهنوں کی طرف۔

گم ہوں میں پھونک مارنے کا یہ طریقہ ٹونے ٹونے اور گندھے کا عمل کرنے والے اختیار کرتے ہیں۔ وہ دھاگے یا تانت پر اپنے تصور کے مطابق کچھ پڑھ کر پھونکتے اور گم ہوں لگاتے جلتے ہیں۔ اور ان کے زعم کے مطابق ان کا معمول اس طرح ان کے دام میں اسیر ہو جاتا ہے اور پھر وہ اس کو جو اذیت پہنچانا چاہتے ہیں پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس صفت سے ان کا ذکر کرنے سے مقصود ان کے بھگل کی تصویر کھینچنا ہے۔ یہ اسی طرح کی تصویر ہے جس طرح سورہ شعراء میں کاهنوں کے مراقبہ کی تصویر یَلْقُونَ السَّحَابَ دَاكِرُهُمْ كَذِبُونَ رَا شِعْرَاء۔ (۲۲: ۲۶) (اور وہ کان لگا کر بیٹھتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں) کے الفاظ سے کھینچی گئی ہے۔ میرے نزدیک اس سے مقصود اس چیز کی لغویت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

رہا یہ سوال کہ یہ اعمال سفلیہ کچھ مؤثر ہوتے ہیں یا نہیں تو اس سوال پر ہم سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت، بضمن قصہ ہاروت و ماروت، اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کا اکثر حصہ، جیسا کہ سورہ شعراء کی محولہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے محض ڈھونگ اور بھگل ہے لیکن اس کے اندر اگر کچھ حقیقت ہے بھی تو قرآن میں یہ تصریح ہے کہ یہ مؤثر بالذات نہیں ہیں بلکہ ان سے کسی کو ضرر پہنچایا جاسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن ہی سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سحر اور اعمال سفلیہ ہی سے متعلق فرمایا ہے: دَمًا هُمْ يَصَارُونَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرہ - ۱۰۲: ۲) (اور اس کے ذریعہ سے وہ کسی کو ضرر پہنچانے والے نہیں بن سکتے مگر اللہ کے اذن سے) تو جب ان سے کوئی ضرر اللہ کے اذن ہی سے پہنچ سکتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ کے سوا کسی اور کی پناہ ڈھونڈنے کی حاجت باقی نہیں رہی۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہن جس طرح کے بناتے ہیں ان کے ساتھ وہ اسی طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنا تعلق اپنے رب سے استوار رکھتا ہے: لَا طَائِلَ لَهُمْ سے اپنے کو بچاتا ہے، خدا کی یاد سے اپنے دل کو آباد رکھتا ہے، اگر کوئی افتاد پیش آتی ہے تو اس میں رہنمائی اور استعانت کے لیے اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر شیطان کو غلبہ پانے نہیں دیتا۔ اگر اتفاق سے اس کو کوئی چھوٹ لگتی بھی ہے تو اللہ کی طرف توجہ اس کے شر سے اس کو بچا لیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان

لوگوں کو ہدایت

کرتا ہے جو

اس کو یاد

رکھتے ہیں



اس کے برعکس اگر کوئی شخص بالکل منفعل مزاج اور دہمی ہوتا ہے۔ عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے وساوس میں مبتلا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ پر مضبوط بھروسہ رکھنے کے بجائے اپنے دل کے دروازے شہات و شکوک کے لیے کھول دیتا ہے تو اس طرح کا آدمی بالعموم کسی شیطان جن و انس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے پھر وہ اس کو ہر وادی میں گردش کراتے ہیں۔ اس گردش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ اس سورہ نے یہ بتایا ہے کہ آدمی اپنے کو ہمیشہ اپنے رب کی پناہ میں رکھے، جب کبھی دل میں کوئی دغدغہ محسوس کرے فوراً اس کی امان طلب کرے جس کا بہترین ذریعہ یہ دونوں سورتیں ————— معوذتین ————— ہیں۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ (۵)

یہ آخر میں حاسدوں کے حسد کے شر سے بچنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اگرچہ لفظ 'حاسد' حاسد واک ہے یہاں عام ہے اور اس کو عام ہی رکھنا چاہیے بھی، اس لیے کہ جس حاسد کا حسد بھی سحرانی شکل اختیار کرے وہ قایل کے حسد کی طرح بائبل کا خون بہا کر ہی اترتا ہے، اس وجہ سے اس سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ لیکن سورہ کی تمہید میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ بنی آدم کا سب سے بڑا حاسد شیطان ہے اور اس کو خاص کہ عقیدہ توحید سے ہے۔ اس عقیدہ سے برگشتہ کرنے کے لیے اس نے اپنے جس عزم بالجزم کا اظہار کیا ہے اس کے ثبوت ہم ادھر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں سورہ بنی اسرائیل کی آیات بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ 'اِذَا حَسَدَ' کے الفاظ کا زور اچھی طرح واضح ہو جائے۔

قَالَ اَدَعَيْتَكَ هَذَا السِّدِّي  
كَرَّمَتْ عَلَيَّ رُسُلِيْنَ اٰخَرَتِيْنَ اِلٰى يَوْمِ  
الْقِيٰمَةِ لَا اُحْقِنُكَ ذَرْيَةً  
اِلَّا قَلِيْلًا ه قَالَ اَذْهَبْ فَمِنْ  
تَبَعَاتٍ مِنْهُمْ خَبَانٌ جَهَنَّمَ  
جَدًا اَذْكَرُ بَجْرًا مَوْجُوْرًا  
وَاَسْتَفْزِزُهُمْ اِنْ بَطَلَتْ مِنْهُمْ  
يَصُوْبَكَ وَاجْلِبَتْ عَلَيْهِمْ بِغِيْلِكَ  
وَرَجِلَكَ وَتَارَكَهُمْ فِيْ الْاَمْوَالِ  
وَالْاَدْرَاكِ وَعَدُ هُمْ هَا  
يَعِدُّهُمْ الشَّيْطٰنُ اِلَّا عُدُوْرًا وَاِلَّا  
عِبَادًا لِّكَ لَيْسَ اِلَهُكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ

شیطان نے کہا، اچھا یہی ہے وہ جسے  
تو نے مجھ پر نفیست بخشی ہے! اگر تو نے مجھے  
قیامت کے دن تک ہمت بخشی تو میں اس  
کی ذریت کو چٹ کر باؤں گا، صرف تھوڑے  
ہی بچیں گے۔ خدا نے فرمایا، جا، جو ان میں  
سے تیرے پیروں میں گے تو تمہارا بدنام پورا  
کرنے کے لیے جہنم کافی ہے تو ان میں سے  
جن پر تیرا پس چلے ان کو اپنے پراپیگنڈے  
سے گھبرائے، ان پر اپنے سوار اور پیادے  
چڑھائے اور ان کے مال و اولاد میں حصہ  
بٹائے اور ان سے پرفریب و دلدے کرے  
اور شیطان کے سامنے وعدے محض فریب ہیں



وَكُنْ بِرَبِّكَ ذَكِيًّا ۝

میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں

(بنی اسرائیل - ۱۷، ۶۲، ۶۵)

اور تیرا رب اعتقاد کے لیے کافی ہے۔

اس آیت سے اس زور، اس دلولہ اور ان اسباب و وسائل کا اظہار ہوتا ہے جو شیطان انسان کو توحید سے ہٹانے کے لیے بروئے کار لانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اسی چیز کی طرف 'اِذَا حَسَدُ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں یعنی جب کہ یہ حاسد اپنے حسد کے جوش میں اپنے ترکش کے سارے تیر آزمانے پر آمادہ ہو جائے۔

یہ سورہ کسی شانِ نزول کی محتاج تو نہیں ہے لیکن اس کے تحت لوگوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کی ضمیمہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر البیاض باللہ کچھ یہودیوں نے ایک زمانہ میں جاؤ۔ روایت کر دیا تھا جس سے آپ بیمار ہو گئے تو آپ کو یہ سورہ سکھائی گئی اور آپ اس جادو کے اثرات بد سے محفوظ ہو گئے۔ اگرچہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس جادو کا کوئی اثر آپ کے فرائض نبوت پر نہیں پڑا لیکن ساتھ ہی نہایت سادہ لوحی سے یہ اعتراض بھی کر لیا گیا ہے کہ اس کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پڑا کہ آپ گھلتے جا رہے تھے، کسی کلام کے متعلق خیال فرماتے کہ کر لیا ہے لیکن نہیں کیا ہوتا، ازدواجِ مطہرات کے متعلق خیال فرماتے کہ ان کے پاس گئے ہیں لیکن نہیں گئے ہوتے، بعض اوقات اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا کہ ایک چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا۔ ان حضرات کے بیان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت گھٹنے دو گھٹنے یا دن دو دن نہیں بلکہ پورے چھ ماہ رہی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب پورے چھ ماہ آپ پر البیاض باللہ، تعطل و مانع کی یہ کیفیت طاری رہی تو کیا یہ امکان متبعہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ البیاض باللہ، آپ نے خیال فرمایا ہو کہ نماز پڑھ لی ہے رانجی لیکہ نہ پڑھی ہو یا یہ کہ نازل شدہ وحی کا تبیین وحی کو لکھوا دی ہے حالانکہ نہ لکھوائی ہو یا یہ کہ جبریل امین کو دیکھا ہے حالانکہ نہ دیکھا ہو؟ ان امکانات کو کس دلیل سے آپ رد کر سکتے ہیں؟ اگر کوئی کہے کہ اس طرح کی کوئی بات روایات میں نہیں ملتی تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ روایات میں تمام جزئیات کہاں بیان ہو سکتی ہیں، لیکن ایک ایسے شخص سے جس کی ذہنی حالت آپ کے بیان کے مطابق وہ ہے جو مذکور ہوئی تو اس سے ان باتوں کا صادر ہونا تعجب انگیز نہیں بلکہ نہ صادر ہونا تعجب انگیز ہے۔

میرے نزدیک اس شانِ نزول کو رد کرنے کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ یہ اس مسلمہ عقیدے کے بالکل منافی ہے جو قرآن نے انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہمیں تعلیم کیا ہے۔ عصمت، حضراتِ انبیاء (علیہم السلام) کی ان خصوصیات میں سے ہے جو کسی وقت بھی ان سے منفک نہیں ہو سکتیں۔ اس عصمت کو اس امر سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ نبی کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے یا وہ زخمی



ہو گیا یا وہ قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کی نبوت میں قاذر نہیں ہے کہ اس کو آپ اس امر کی دلیل بنائیں کہ جب نبی ان چیزوں میں مبتلا ہو سکتا ہے تو مسح بھی ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کو کردہ اور ناکردہ، دیدہ اور نادیدہ میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے شیطانی تصرفات سے اپنے نبیوں کو محفوظ رکھا ہے اور ان کی یہ محفوظیت دین کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ محفوظیت ہی نبی کے ہر قول و فعل کو سند بناتی ہے۔ پورا قرآن انبیاء کی عصمت پر گواہ ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان کی عصمت پر ایمان رکھے۔

شانِ نزول کے اس واقعے کو اگر روایت کے اصولوں پر جانچا جائے تو اس میں نمایاں ضعف موجود ہے۔ صحاح کی ایک روایت میں رنگ آمیزی کرنے کے لیے تیسرے درجے کی ضعیف و موضوع روایتوں کا سہارا لیا گیا ہے اور اس کو ایک امر واقعہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ روایت صحاح میں سے صرف بخاری، مسلم اور ابن ماجہ نے لی ہے اور سند کے تیسرے واسطہ تک یہ خبر واحد ہی رہی ہے۔ حتیٰ کہ بخاری کی ایک روایت میں سفیان بن عیینہ یہ اقرا کرتے ہیں کہ میں نے اسے ابن جریج سے بالکل پہلی مرتبہ سنا۔ گویا اس واقعہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سو سال بعد شہرت پائی، اس سے پہلے اس کا علم صرف بعض افراد تک محدود رہا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ العیاذ باللہ، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھ ماہ تک مسح رہے ہوتے تو یہ واقعہ اتنا غیر معمولی تھا کہ صدرِ اول ہی میں اس کا چرچا ہو جاتا اور یہ روایت ایک متواتر روایت کی حیثیت سے ہم تک پہنچتی۔

صحاح کی کسی روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر یہ جادو ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا اثر کتنا عرصہ رہا۔ اس کے برعکس ان تینوں کتابوں کی متفق علیہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ 'حتیٰ اذا کان ذات یوم اذ ذات لیلة دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا دعا' (یہاں تک کہ جب ایک دن یا ایک رات گزر گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پے درپے دعا کی) اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس کا کوئی اثر آپ کی قوت متجذدہ پر پڑا بھی تو وہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہا۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا کی اور یہ اثر جاتا رہا۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بالکل اسی قسم کی بات ہوئی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کی رسیوں اور لٹھیوں کو سانپ سمجھ لیا اور وقتی طور پر گھبرا گئے۔ اس طرح کی کیفیات تھوڑی دیر کے لیے طاری ہو جانا ناممکن نہیں ہوتا۔ یہ کیفیات بطور امتحان بھی نبی کو پیش آ سکتی ہیں لیکن ہوتی یہ وقتی اور عارضی ہیں تاکہ نبی کی عصمت مجروح نہ ہو۔



یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ صحاح میں نہ اس واقعہ کو سورہ کے شان نزول کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ مؤذنین کی آیات پڑھ پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تمانت کی گواہی کھولیں۔ یہ چیز واضح کرتی ہے کہ محدثین نے اس واقعہ کو سورہ فلق سے متعلق نہیں مانا۔ یہ بعد والوں کی ذہانت ہے کہ وہ اس روایت کو مؤذنین کے ذیل میں لے آئے، حالانکہ جیسا کہ سورہ فلق کی تفسیر سے واضح ہوا اور آگے سورہ ناس کی تفسیر سے واضح ہوگا، ان کا مفہوم اس سے ابا کرتا ہے کہ ان کے نزول کو کسی مجہول جادوگر کے کسی شیطانی عمل کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ

علی احسانہ۔

لاہور

۹۔ اگست ۱۹۸۰ء

۲۶۔ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ







تدبر القرآن

١١٢

الثاس







## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### سورہ کا عمود، سابق سے تعلق اور اس کے امتیازی پہلو

سابق سورہ ————— الفلق ————— کی تمہید میں ہم اس سورہ کے موقع و محل اور اس کے عمود کی طرت بالا جمال اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ سورہ اس کی مثنی ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ جس طرح وہ تَعَوَّذ کی سورہ ہے اسی طرح یہ بھی تَعَوَّذ کی سورہ ہے۔ پس چند پہلو اس کے خاص ہیں جن کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے تاکہ اس کا امتیازی وصف سامنے رہے۔

ایک یہ کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ اس کی ان صفات کے توسل سے چاہی گئی ہے جن کا تعلق براہ راست انسان سے ہے۔ اس وجہ سے اس کی اپیل نہایت مؤثر ہے۔ اپیل مؤثر تو سابق سورہ کی بھی ہے لیکن اس پر استدلال کا پہلو غالب ہے۔ اس میں استدلال کا پہلو اگرچہ موجود ہے لیکن زیادہ نمایاں پہلو اس میں استرحام کا ہے۔

دوسرا یہ کہ سابق سورہ میں کئی آفتوں سے پناہ مانگی گئی ہے لیکن اس میں ساری توجہ صرف شیطان پر مرکوز کر دی گئی ہے جو درحقیقت تمام آفتوں کی جڑ اور توحید کا، جیسا کہ سابق سورہ میں واضح ہو چکا ہے، ازلی دشمن ہے۔

تیسرا یہ کہ سابق سورہ میں شیطان کا حوالہ صرف اس کے ایک معروف کردار ————— حد سے آیا ہے لیکن اس سورہ میں اس کی اصل تکنیک، اس کے دائرہ نفوذ و اثر، اس کی ذات اور برادری ہر چیز سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنے اس شاطر دشمن کو اچھی طرح پہچان لیں اور جن کمین گاہوں سے وہ حملہ آور ہو سکتا ہے ان سے ہوشیار رہیں۔ اس روشنی میں سورہ کی تلاوت کیجیے۔







# سُورَةُ النَّاسِ

مَدَنِيَّةٌ \_\_\_\_\_ آیات: ۶

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② إِلَهِ النَّاسِ ③  
مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ④ الْخَنَّاسِ ⑤ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ⑥ مِنْ الْجَنَّةِ وَالنَّاسِ ⑦

کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں

کے معبود کی وسوسہ ڈالتے والے دیک جانے والے کی آفت سے، جو دلوں

میں وسوسہ ڈالتا ہے، جنہوں میں سے اور انسانوں میں سے۔ ۱-۶



## الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ (۱-۳)

اللہ تعالیٰ کی پناہ اس کی تین صفتوں کے واسطے چاہی گئی ہے اور یہ تینوں صفتیں  
غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ان بنیادی حقوق کو بھی معین کرتی ہیں جو بندوں پر عائد  
واسطے نفع دہوتے ہیں اور پھر یہ رہنمائی بھی دیتی ہیں کہ ان صفات سے جو ذات متصف ہے وہی اہل ہے  
کہ بندے مشکلات میں اس کی پناہ ڈھونڈیں اور وہی اس لائق ہے کہ وہ بڑے سے بڑے  
دشمن کے مقابل میں بھی ان کی پناہ دے۔

اللہ تعالیٰ کی  
صفات اور  
اس کے حقوق  
حقوق کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ جو لوگوں کا پروردگار ہے وہی حق دار ہے کہ لوگوں  
کا بادشاہ حقیقی ہو اور جو بادشاہ حقیقی ہے وہی حق دار ہے کہ لوگوں کا معبود ہو۔ اگر پروردگار  
کے سوا کوئی دوسرا لوگوں کا بادشاہ بن کر اپنا قانون اور حکم چلائے تو یہ چیز بھی خلاف عقل و فطرت  
اور ناجائز ہے اور رب کے سوا اگر کسی اور کو لوگ اپنا معبود بنا لیں تو یہ چیز بھی خلاف عقل و  
فطرت اور حرام ہے۔

سورہ فاتحہ میں ربوبیت ہی کی دلیل پر بندوں کی تمام شکرگزاری کا حق دار اللہ تعالیٰ کو  
ٹھہرایا گیا ہے اور پھر اسی کو تمام عبادت اور استغانت کا مرجع بتایا گیا ہے۔ وہی بات یہاں  
بھی فرمائی گئی ہے۔ بس الفاظ مختلف ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ان تین صفتوں سے متصف مان لینے کے بعد غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شرک  
کے تمام رخنے بند ہو جاتے ہیں اور ان صفتوں میں ایسا لزوم ہے کہ ایک کو مان لینے کے بعد  
دوسری صفتوں کو ماننا لازم ہو جاتا ہے۔

مِنْ شَيْءٍ اَوْ سَوَآءٍ ۝ الْخَنَاسِ (۴)

اس چیز کا بیان  
جس سے پناہ  
مانگی گئی ہے  
یہ اس چیز کا بیان ہے جس کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ فرمایا کہ کہو میں دوسرے  
ڈالنے والے، دیک جانے والے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ الفاظ میں اگرچہ تصریح نہیں  
ہے لیکن ان صفات اور آگے کی تصریح سے واضح ہے کہ مراد اس سے شیطان ہی ہے۔  
یہ شیطان کے تکنیک کی وضاحت ہے کہ اس کا سارا اعتماد دوسرے اندازی، پراپگینڈہ  
اور پرفریب وعدوں پر ہے۔ انہی چیزوں سے وہ لوگوں کو اپنے دام فریب میں پھنساتا ہے۔  
شیطان کی  
تکنیک



پھر جب پھنسا لیتا ہے تو اپنے کو بری قرار دے کر ان بے وقوفوں کی بد انجامی کا تماشا دیکھتا ہے جو اس کے وام میں پھنس کر اپنی دنیا اور عاقبت برباد کر لیتے ہیں۔

’دسواس‘ (دس سو ڈالنے والے) اور ’خناس‘ (دیکھ رہے والے) کے درمیان حروف ربط نہیں ہے اور اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں صفتیں موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔

اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شیطان کے پاس واحد ہتھیار صرف دس سوہ اندازی شیطان کا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور زور و اختیار اللہ تعالیٰ نے اس کو نہیں بخشا ہے کہ لازماً وہ لوگوں کو گمراہ کر ہی ڈالے۔ پُر فریب وعدوں، طمع کی ہوئی باتوں، ناصحانہ تنبیہات اور دھمکیوں سے وہ لوگوں کو ڈرانے کی بھی کوشش کرتا ہے اور پرچانے کی بھی لیکن اللہ کے جو بندے اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوں تو ان کا وہ کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے جب اللہ تعالیٰ کو یہ دھمکی دی تھی کہ میں اولادِ آدم کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا تو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ واضح فرمادیا کہ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ، (بنی اسرائیل - ۷۵: ۱۷) (جاتیرا جو جی چاہے کر دیکھ تیرے خاص بندوں پر۔۔۔ جو میری بندگی پر قائم رہنا چاہیں گے۔ تیرا کوئی زور نہیں چلے گا) ساتھ ہی بندوں کے بارے میں یہ اطمینان بھی دلا دیا تھا کہ ’وَكُفِّيْ بِبَدَايِكَ وَكَيْدًا‘ (بنی اسرائیل - ۷۵: ۱۷) (اور تیرا خداوند اعتماد کے لیے بالکل کافی ہے) یعنی اس کے جو بندے اپنے رب پر بھروسہ کر کے شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے اعتماد کی لاج رکھے گا اور وہ مُنرِخ رُو ہوں گے۔

’خناس‘ کے لفظ سے اس کے کردار کا دوسرا رخ واضح کیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے اس ’خناس‘ کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ چھپ کر دس سوہ اندازی کرتا ہے، خود سامنے نہیں آتا اس وجہ سے اس کو ’خناس‘ کہا گیا۔ لیکن یہ بات اگر صحیح ہو سکتی ہے تو صرف انہی شیاطین کے حد تک صحیح ہو سکتی ہے جو جنات کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں دراصل ایک اسی سورہ کی آگے والی آیت میں تصریح ہے کہ شیاطین جنوں اور انسانوں دونوں میں سے ہوتے ہیں۔ اس دور کے بعض قلم کاروں نے اس کے معنی بار بار آنے والے کے لکھے ہیں لیکن اس معنی کو عربی لغت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں یعنی دیکھ رہے ہونے والا۔ اس سے مقصود شیطان کے کردار کے اس پہلو کو سامنے لانا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو درغللہ کے لیے نو نمودار ہوتا ہے لیکن جب کوئی شخص اس کے چکے میں آکر گناہ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کے نتائج کی ذمہ داری سے اپنے کو بالکل بری قرار دے کر اس کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ شیطان



کی صفت قرآن میں 'خَذُّوا' بھی آئی ہے یعنی اپنے مریدوں کو دعا دینے والا۔ اس کی اس دعا بازی اور بے وفائی کا ذکر قرآن میں مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ آیا ہے۔ سابق سورہ میں ہم سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت نقل کر آئے ہیں کہ 'وَمَا يَعِدُ هُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا' (بنی اسرائیل - ۱۷ - ۶۴) (اور شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں)۔

شیطان کا یہ کردار سورہ حشر میں نہایت واضح نقطوں میں یوں بیان ہوا ہے :

گَمَّشَ الشَّيْطَانُ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ	ان کی مثال شیطان کی ہے۔ جب کہ وہ
اُكْفُرْهُ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ	انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر تو جب وہ کفر
مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ دَبَّ	کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری
الْعَلَمِينَ (الحشر - ۵۶ : ۱۶)	ہوں، میں عالم کے خداؤں، اللہ سے ڈرتا ہوں۔

اسی شیطان کی کردار کا مظاہرہ یہود نے جنگ بدر کے موقع پر قریش کے ساتھ کیا کہ ان کو بھڑی دے کر مدینہ پر چڑھالائے کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر دیں، مسلمان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اگر ضرورت ہوئی تو وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ لیکن جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور انھوں نے میدان جنگ کا نقشہ دیکھا تو پھپ کر گھروں میں پھٹے رہے۔ قرآن نے ان کے اس کردار کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ	اور جب کہ شیطان (یہود) نے ان کے
أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ	(قریش کے) اعمال ان کی لگا ہوں میں کہا
لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ	دیے اور کہا کہ اب آپ لوگوں پر غالب ہونے
إِنِّي جَبَّارٌ تَكُفُّهُ فَلَمَّا تَرَأَتِ	کا تو کسی میں نہیں ہے اور میں آپ لوگوں کا
الْفِئْتَانِ نَكَصَ عَلَى عَقَبَيْهِ وَ	پڑوسی ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے
قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكُمْ إِنِّي أَرَى	ہوئے تو وہ دم دبا کر بھاگا اور بولا کہ میں تم
مَا لَا تَدْرُونَ لَهُ	سے بری ہوں میں وہ مشاہدہ کر رہا ہوں جو

(الأنفال - ۸ : ۲۸)

تم نہیں کر رہے ہو۔

شیطان اور اس کے پیروں کا یہی کردار اس دنیا میں بھی ہے اور اسی کا مظاہرہ وہ آخرت میں بھی کریں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروں کی اس توکار کی تصویر کھینچی گئی

لَهُ دُكَّانٌ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُّوا (الفرقان - ۲۵ : ۲۹) (اور شیطان انسان کے ساتھ بڑا ہی

بے وفائی کرنے والا ہے۔)

۱۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو تذکرہ قرآن - جلد سوم، صفحات ۸۰ : ۸۳



ہے جو ان کے درمیان جہنم میں برابر ہوگی۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم نے آپ لوگوں کی پیروی کی اور اس کے نتیجہ میں یہاں پہنچے تو کیا آپ لوگ اس عذاب میں سے کچھ حصہ بٹائیں گے جو ہمارے حصہ میں آیا؟ لیڈر جھٹ جواب دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی، ہم کو تمہارے اوپر کوئی زور تو حاصل نہیں تھا، تم جو کچھ بنے خود بنے تو اپنے کیے کی سزا خود بھگتو۔

لفظ 'خَتَّائِیْنَ' یہاں اس کے اسی کردار کی تصویر پیش کر رہا ہے تاکہ لوگ اس کے صرف اس چاڑ اور پیار ہی کو نہ دیکھیں جو وہ اس وقت ظاہر کرتا ہے جب وہ ان کے پاس فریب دینے کے لیے آتا ہے بلکہ اس کی اس غراری اور بے وفائی کو بھی پیش نظر رکھیں جس کا مظاہرہ وہ اس وقت کرتا ہے جب آدمی اس کے دام فریب میں پھنس جاتا ہے اور متوقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے کیے ہوتے وعدے پورے کرے گا۔

الَّذِیْ یُؤَسِّسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ لَا مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۵-۶)

شیطان کی  
ذات برادری  
کو اچھی طرح پہچان لیں۔ فرمایا کہ اس کا اصل کام لوگوں کے سینوں میں دوسوہ اندازی ہے۔ 'صُدُوْرِ' النَّاسِ 'ظرف ہے لیکن مراد اس سے منظور ہے یعنی دلوں میں دوسوہ اندازی۔ 'دوسوہ اندازی' کا مفہوم ظاہر ہے کہ لوگوں کو خدا کی صراطِ مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لیے دوسوہ اندازی ہے۔ اس کا اظہار شیطان نے خود کر دیا ہے اور ہم ضروری حوالے اور نقل کر آئے ہیں۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اپنے بندوں پر کوئی اختیار اور تصرف نہیں بخشا ہے۔ وہ صرف دوسوہ اندازی کرتا ہے۔ لوگوں کو بکھر دزور گمراہ کرنے کا اختیار وہ نہیں رکھتا۔

'مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ' یہ اس کی ذات برادری کی نشاندہی ہے کہ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے بلکہ جنوں اور انسانوں میں سے جو دلوں میں دوسوہ اندازی کا پیشہ اختیار کر لیں وہ شیطان بن جاتے ہیں جس شیطان نے بابا آدم کو دھوکا دیا، قرآن میں تصریح ہے کہ 'وہ جنوں میں سے تھا۔ جو لوگ اس کو ایک مستقل مخلوق اور زندہ جاوید سمجھتے ہیں ان کا خیال غلط ہے۔ البتہ اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جس مشن کا اعلان کیا تھا وہ مشن اس کے ان مریدوں کے ذریعہ سے قیامت تک قائم رہے گا جو انسانوں اور جنوں میں سے اپنی خدایات اس کے لیے پیش کریں گے۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ تدبر قرآن کی بھی آخری سطر آج سیرِ قرطاس ہوئی۔ میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں اپنے اس رب کا شکر ادا کروں



جس نے مجھ جیسے حقیر اور بے مایہ کو اس خدمت کی توفیق بخشی۔ بس یہ دعا ہے کہ رب کریم اس ناچیز خدمت کو اپنے اس غلام کی نجات کا ذریعہ بنائے۔ جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں ان سے خلق کو فائدہ پہنچے اور اگر کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے تو اس کے وبال سے اپنے اس غلام کو بھی محفوظ رکھے اور کتاب کے قارئین کو بھی۔ اللہم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وادنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه واخردعوانا ان الحمد لله رب العلمین۔

لاہور

۲۹۔ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ

۱۲۔ اگست ۱۹۸۰ء



# فہرست مضامین

۳۷	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق	۷	دیباچہ
۳۷	سورہ کے مطالب کا تجزیہ	۷	'تذکرہ قرآن' کی تاریخ
۳۹	آیات ۱ تا ۵۶	۸	'تذکرہ قرآن' کا نسخہ
۴۱	ترجمہ آیات	۹	تصنیف کا اصل محرک
۴۳	الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت	۱۱	کتاب کا مستقبل
۴۳	'مذکر' کا مفہوم		
۴۳	انذار عام کا حکم		
۴۵	شرک کی نجاست سے بچنے کا حکم	۱۷	تفسیر سورۃ المزمل - ۷۳
۴۷	قیامت کا دن کٹھن ہوگا	۱۸	سورۃ کا زمانہ نزول اور عمود
۴۸	مشرک لیڈروں کی ذہنیت	۱۹	سورہ کے مطالب کا تجزیہ
۵۰	نیکی اور بدی کے مزاج میں فرق	۲۰	آیات ۱ تا ۲۰
۵۱	معاندین کے عناد کی تصویر کشی	۲۰	ترجمہ آیات
۵۲	قرآن کو جادو کہنے کا ایک پہلو	۲۲	الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
۵۳	شکریہ کا انجام	۲۲	'مزل' کے معنی
۵۳	دوزخ پر انیس فرشتوں کی ماموریت	۲۳	قیام بیل کی برکتیں
	آیات متشابہات کے بارے میں	۲۳	قرآن کی تلاوت کا طریقہ
۵۴	بیچ رو بہ	۲۴	اقامت دین کی جدوجہد کی انبیاری خصوصیات
۵۵	متشابہات کے ذکر کی حکمت	۲۵	شب خیزی کی تاثیر
۵۷	اہل کتاب کا ردِ عمل	۲۶	دین میں مطلوب ذکر دوام ہے
۶۰	قیامت کی آفاقی نشانیاں	۲۸	صبر اور اس کا طریقہ
۶۱	چاند رات اور صبح سے استشہاد	۲۸	نبی کو جھٹلانے والوں کا انجام
۶۲	اصحاب الیمین کے باہمی سوالات	۳۱	قیام بیل کے حکم میں تخفیف
۶۳	اہل دوزخ کا اعترافِ جرم	۳۳	تخفیف کے وجوہ
			تفسیر سورۃ المدثر - ۷۴



۹۶	قیامت کی دلیل انسان کی خلقت سے
	تَفْسِیْرُ سُورَةِ الدَّهْرِ - ۶
۹۹	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق
۹۹	سورہ کے مطالب کا تجزیہ
۱۰۱	آیات ۱ تا ۳۱
۱۰۲	ترجمہ آیات
۱۰۵	الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
۱۰۵	ہل کا ایک بلیغ موقع استعمال
۱۰۶	انسان کی خلقت سے قیامت پر استدلال
۱۰۷	انسان کی خلقت کے مراحل
۱۰۹	انسان پر خدا کی نعمتوں کا حق
۱۱۰	شکر گزار بندوں کو انعام
۱۱۱	ایمانی نذر کی اہمیت
۱۱۲	غریبوں کی خدمت
۱۱۳	اتفاق رضائے الہی کے لیے
۱۱۴	عبر کی صفت کا صلہ
۱۱۵	بغلان اور ان کے اوصاف
۱۱۶	اہل جنت کا لباس
۱۱۸	نبی کو صبر اور انتظار کی تلقین
۱۱۹	مخالفین کی اصل بیماری
۱۲۰	توفیق ایمان کے بارے میں سنت الہی
	تَفْسِیْرُ سُورَةِ الْمُرْسَلَاتِ - ۷
۱۲۳	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق
۱۲۴	سورہ کے مطالب کا تجزیہ
۱۲۷	آیات ۱ تا ۵۰

۶۴	شفاعت کی نفی
۶۵	حق سے اعراض کرنے والوں کا حال
۶۶	ہدایت کے باب میں سنت الہی
	تَفْسِیْرُ سُورَةِ الْقِيَامَةِ - ۸
۷۱	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق
۷۲	سورہ کے مطالب کا تجزیہ
۷۵	آیات ۱ تا ۴۰
۷۶	ترجمہ آیات
۷۸	الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
۷۸	قسم سے پہلے لا کا استعمال
۷۸	نفس توامہ کی شہادت قیامت پر
۷۹	نفس کا توازن قائم رکھنے کی تدبیر
۸۰	بدی کا شعور انسان کی فطرت میں
۸۱	الکار قیامت کے لیے سخن سازیاں
۸۲	احوال قیامت
۸۳	قیامت کی غایت
۸۴	نزول وحی کے لیے آنحضرت کا اضطراب
	قرآن کے جمع و ترتیب اور حفاظت
۸۶	کا وعدہ
۸۸	حفاظت قرآن کے بارے میں شیعہ نقطہ نظر
۸۹	تکذیب قیامت کی اصل علت
۹۰	جنت و دوزخ کے مستحقین کی حالت
۹۱	رویت باری تعالیٰ
۹۱	موت کے وقت کی بے بسی کی تصویر
۹۲	نصیحت، نماز اور اتفاق
۹۵	اعراض کی تصویر اور اس کا سبب



۱۶۴ متقین کا صلہ

۱۶۵ مزمومہ سفارشوں کی نفی

۱۶۶ عذاب قیامت کے بارے میں تنبیہ

### تَفْسِيرُ سُورَةِ النَّازِعَاتِ - ۷۹

۱۶۹ سورہ کا عمود

۱۶۹ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

۱۷۱ آیات ۴۶ تا ۴۷

۱۷۲ ترجمہ آیات

۱۷۵ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تند و نرم ہواؤں سے عذاب

۱۷۵ پر شہادت

۱۷۷ قیامت کے دن کی یاد دہانی

۱۷۸ کفار کے استہزاء کی تصویر

۱۸۰ تکذیب کے نتیجے میں عذاب کی شہادت

۱۸۰ فرعون اور موسیٰ کی سرگزشت

آسمان و زمین کی نشانیوں

۱۸۳ سے استدلال

۱۸۴ ربوبیت کے تقاضے

۱۸۵ قیامت کی پہل کی تصویر

۱۸۷ نبی صلعم کی تسلی

### تَفْسِيرُ سُورَةِ عَبَسَ - ۸۰

۱۹۱ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

۱۹۱ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

۱۹۳ آیات ۴۲ تا ۴۳

۱۹۴ ترجمہ آیات

۱۲۸ ترجمہ آیات

۱۳۱ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

۱۳۱ ہواؤں سے عذاب پر شہادت

۱۳۲ ہوائیں مستحضر ہیں خود مختار نہیں

۱۳۴ قیامت کی پہل کی تصویر

۱۳۵ قیامت میں رسولوں کی شہادت

۱۳۶ مکذوبین کی ہلاکت پر تاریخی شہادتیں

۱۳۷ انسان کی خلقت سے قیامت پر دلیل

۱۳۹ پرورش کا اتہام جزا و سزا پر دلیل ہے

۱۴۱ پرورش کے انتظام میں پہاڑوں کا دخل

۱۴۲ قیامت کا سہ شاخہ دھواں

۱۴۳ قیامت میں مجرموں کی بے بسی

۱۴۵ متقین کا انجام

۱۴۶ منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت

### تَفْسِيرُ سُورَةِ النَّبَا - ۷۸

۱۵۱ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

۱۵۱ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

۱۵۳ آیات ۴۰ تا ۴۱

۱۵۴ ترجمہ آیات

۱۵۶ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

۱۵۶ منکرین قیامت کا سوال برائے استہزاء

۱۵۷ منکرین قیامت کا تناقض فکر

آثار قدرت و ربوبیت سے

۱۵۹ قیامت پر استدلال

۱۶۲ قیامت کی پہل کی تصویر

۱۶۳ باغیوں اور سرکشوں کا انجام



۲۱۸	ترجمہ آیات	۱۹۶	الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
	الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات	۱۹۶	نابینا مسیحا کے واقعہ کی نوعیت
۲۱۹	کی وضاحت	۱۹۷	حضرات انبیاء کی لغزشوں کی نوعیت
۲۱۹	ظہور قیامت کے وقت کی تیرگی	۱۹۸	رسول کا اصل مقصد تزکیہ
۲۲۰	محبوب چیزوں کی کس پرسی	۱۹۹	تزکیہ کے طابوں کی صفات
۲۲۰	نفسی نفسی کا عالم	۱۹۹	نبی صلعم پر بظاہر عقاب
۲۲۱	ظہور قیامت کے بعد کے احوال	۲۰۱	اس عقاب کی ایک حقیقت افروز تشیل
۲۲۲	مظلوموں کی دادرسی کا انتظام	۲۰۱	پیغمبر کی اصل دمر داری - یاد دہانی
۲۲۳	رسول کو کاہن کہنے کا اشتغال	۲۰۲	کلام وحی کی عظمت کا بیان
۲۲۳	کہانت کی دو بنیادوں پر ضرب	۲۰۳	کتاب الہی کے حاملین کی صفات
	ستاروں کی قسم کہانت کے	۲۰۴	انسان کی بددماغی پر اظہار افسوس
۲۲۶	ابطال کے لیے		انسان کی خلقت سے قیامت
۲۲۷	رات اور صبح کی قسم	۲۰۵	پر استدلال
۲۲۸	فرشتہ وحی کی صفات	۲۰۶	انسان کی نشوونما میں تیسیر
۲۲۹	رسول اللہ کی امانت	۲۰۷	انسان کا یقینی انجام - موت
۲۳۰	رسول اللہ کا تجربہ وحی	۲۰۸	ربوبیت کے اہتمام سے استدلال
۲۳۱	قبول ہدایت کے بارے میں سنت	۲۰۸	آیات پر غور کرنے کا طریقہ
	تفسیر سورۃ الانقطار - ۸۲	۲۰۹	زمین کی برکات
۲۳۵	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق	۲۱۱	قیامت کی یاد دہانی
۲۳۶	سورہ کے مطالب کا تجزیہ	۲۱۱	قیامت میں نفی نفسی کا عالم ہوگا
۲۳۷	آیات ۱۹ تا ۱۹		اہل ایمان اور اہل کفر کے چہروں
۲۳۷	ترجمہ آیات	۲۱۲	کافروں
۲۳۹	الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت		تفسیر سورۃ التکویر - ۸۱
۲۳۹	ظہور قیامت کے وقت کی بلجلی	۲۱۵	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق
۲۴۰	قیامت میں اعمال کا محاسبہ	۲۱۵	سورہ کے مطالب کا تجزیہ
۲۴۱	خدا کی کرمی سے مغالطہ	۲۱۷	آیات ۲۹ تا ۲۹



- ۲۶۹ آیات ۲۵  
۲۷۰ ترجمہ آیات  
الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات  
کی وضاحت  
۲۷۱ قیامت کے دن آسمان کا حال  
۲۷۱ قیامت کے دن زمین کا حال  
۲۷۲ انسان کی اصل منزل  
۲۷۲ نیکیوں کا رد یہ اہل دنیال کے بارے میں  
۲۷۳ آخرت سے غفلوں کا انجام  
۲۷۴ رات اور اس کے تفصیلات سے استدلال  
۲۷۴ چاند کے کمال و زوال سے استدلال  
۲۷۸ انسان کی ناسپاسی

## تفسیر سورۃ البروج - ۱۵

- ۲۸۳ سورہ کا زمانہ نزول اور مضمون  
۲۸۳ سورہ کے مطالب کا تجزیہ  
۲۸۵ آیات ۲۲  
۲۸۶ ترجمہ آیات  
الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات  
کی وضاحت  
۲۸۷ 'بروج' کی شہادت  
۲۸۸ آفاق کے دلائل و شواہد  
۲۸۹ اصحاب الاخذود سے مراد  
۲۹۰ اشیاء کا انجام قیامت میں  
۲۹۱ اہل ایمان کو ستانے والوں کو وعید  
۲۹۲ ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت  
۲۹۲ صفات الہی کا حوالہ

- ۲۲۲ انسان کی خلقت سے قیامت پر استدلال  
۲۲۳ اعمال کے ریکارڈ کا انتظام  
۲۲۴ نیکیوں کا رد یہ اور بدکاروں کا انجام  
۲۲۵ قیامت میں کامل اختیار اللہ کا ہوگا

## تفسیر سورۃ المطففین - ۸۳

- ۲۲۹ رہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق  
۲۵۰ رم کے مطالب کا تجزیہ  
۲۵۱ بات ۳۶  
۲۵۲ جمعہ آیات  
الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات  
کی وضاحت  
لینے اور دینے کے انگ پیمانے  
۲۵۳ رکھنے والوں پر لعنت  
عدل سے محبت اور ارتکاب ظلم  
۲۵۴ کی شہادت  
۲۵۶ مجرموں کا اعمال نامہ سنجین میں  
۲۵۷ مکذبین جزا کا کردار  
۲۵۸ تکذیب کی اصل علت  
۲۵۹ وفاداروں کا اعمال نامہ علیین میں  
۲۶۰ وفاداروں کے لیے نعمتوں کا انتظام  
۲۶۱ نیکیوں اور بدوں کا انقلاب حال  
۲۶۲ دنیا میں فراغت کی بد تمیزیاں

## تفسیر سورۃ الانشقاق - ۸۴

- ۲۶۷ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق  
۲۶۷ سورہ کے مطالب کا تجزیہ



## تفسیر سورۃ الطارق - ۸۶

- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق ۲۹۷  
 سورہ کے مطالب کا تجزیہ ۲۹۷  
 آیات ۱ تا ۱۷ ۲۹۹  
 ترجمہ آیات ۲۹۹  
 الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت ۳۰۱  
 آسمان اور ستاروں کی قسم ۳۰۱  
 ہر جان پر خدا کے نگران مقرر ہیں ۳۰۱  
 انسان کی خلقت سے قیامت پر لیل ۳۰۲  
 حیات بعد الموت پر آفاقی شہادت ۳۰۴  
 کفار کو ڈھیل کی حیثیت ۳۰۵

## تفسیر سورۃ الاعلیٰ - ۸۷

- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق ۳۰۹  
 سورہ کے مطالب کا تجزیہ ۳۰۹  
 آیات ۱ تا ۱۹ ۳۱۱  
 ترجمہ آیات ۳۱۱  
 الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت ۳۱۳  
 تسبیح کی اہمیت ۳۱۳  
 خدا کے ہر کام میں تدریج ہے ۳۱۳  
 تقدیر کا مفہوم ۳۱۴  
 غشاء احوی سے مراد ۳۱۵  
 وحی آسمانی میں تدریج کی حکمت ۳۱۶  
 صحیح توکل کی بنیاد ۳۱۷

## ہدایت و ضلالت کے باب میں

- ۳۱۸ سنت الہی  
 ۳۱۹ تزکیہ و نماز کی اہمیت  
 ۳۲۰ دنیا پرستی کا حجاب  
 ۳۲۰ قرآن کی تعلیم تمام نبیوں کی تعلیم ہے

## تفسیر سورۃ الغاشیہ - ۸۸

- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق ۳۲۵  
 سورہ کے مطالب کا تجزیہ ۳۲۵  
 آیات ۱ تا ۲۶ ۳۲۷  
 ترجمہ آیات ۳۲۸  
 الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت ۳۲۹  
 احوال قیامت کی تصویر ۳۲۹  
 دوزخیوں کی غذا ۳۳۰  
 اہل ایمان کی بشارت ۳۳۱  
 جنت کے مناظر اور آرائشیں ۳۳۲  
 قیامت کے آفاقی دلائل ۳۳۳  
 زمین اور پہاڑوں کے عجائبات ۳۳۵  
 نبی صلعم کے فرض کی حدود ۳۳۶

## تفسیر سورۃ الفجر - ۸۹

- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق ۳۴۱  
 سورہ کے مطالب کا تجزیہ ۳۴۲  
 آیات ۱ تا ۳۰ ۳۴۳  
 ترجمہ آیات ۳۴۴  
 الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت ۳۴۶



- ۳۷۳ نعمتوں کا صحیح معرفت  
۳۷۵ فطرت میں نیکی و بدی کا شعور  
۳۷۵ نیکی اور بدی کے مزاج میں فرق  
۳۷۶ غلاموں کی آزادی کی ترغیب  
۳۷۷ نیکوں کے لیے صبر کی ضرورت

## تفسیر سورۃ الشمس - ۹۱

- ۳۸۱ سورہ کا عمود اور مطالب کا تجزیہ  
۳۸۳ آیات ۱ تا ۱۵  
۳۸۳ ترجمہ آیات  
۳۸۵ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
۳۸۵ اضمداد کی باہم سازگاری کا درس  
۳۸۵ آفاق کی شہادت  
۳۸۶ 'ما' موصولہ اور 'ما' مصدریہ  
۳۸۷ نفیاتی شہادت  
۳۸۸ الہام خیر و شر کا تقاضا  
۳۸۹ آفاقی و انفسی شہادتوں کا درس  
۳۹۰ ثمود کے انجام سے ایک تاریخی شہادت  
۳۹۱ کلام عرب میں ثمود کا ذکر  
۳۹۲ ثمود کے طغیان کی کیفیت  
۳۹۳ قرآن کے فلسفہ تاریخ کا ایک نکتہ

## تفسیر سورۃ الیل - ۹۲

- ۳۹۷ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق  
۳۹۷ سورہ کے مطالب کا تجزیہ  
۳۹۹ آیات ۱ تا ۲۱  
۳۹۹ ترجمہ آیات

- ۳۴۶ دفن کی شہادت  
۳۴۷ دس راتوں کی شہادت  
۳۴۸ نجف اور طاق کی شہادت  
۳۴۹ رخصت ہوتی ہوئی رات کی شہادت  
۳۵۱ اضمداد کی شہادت  
۳۵۲ قوموں کی تاریخ کی شہادت  
۳۵۵ سرکشوں کے باب میں سنت الہی  
۳۵۶ خدا سب کی نگرانی کر رہا ہے  
۳۵۷ خدا کی نعمتوں سے مغالطہ  
۳۵۸ سوسائٹی میں یتیموں کا مقام  
تقسیم وراثت میں زور آور عصبیات  
۳۵۹ کا کردار  
۳۵۹ مال کے پرستاروں کو تنبیہ  
۳۶۰ احوال قیامت کی تصویر  
۳۶۱ مستحقین جنت کو بشارت  
۳۶۲ رضا کا مقام

## تفسیر سورۃ البلد - ۹۰

- ۳۶۵ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق  
۳۶۶ سورہ کے مطالب کا تجزیہ  
۳۶۷ آیات ۱ تا ۲۰  
۳۶۷ ترجمہ آیات  
۳۶۹ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
۳۶۹ سرزمین بکۃ کی شہادت  
۳۷۰ ابراہیم اور ان کی ذریت کی شہادت  
۳۷۲ بیت اللہ کی برکات کا حق  
۳۷۳ قریش کا فاسد کردار



- ۴۲۳ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق  
 ۴۲۳ سورہ کے مطالب کا تجزیہ  
 ۴۲۵ آیات اتا ۸  
 ۴۲۵ ترجمہ آیات  
 ۴۲۶ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
 ۴۲۶ شرح صدر سے مراد  
 ۴۲۶ حضور کا کرشمہ بوجھ  
 ۴۲۷ دعوت کا چرچا اطراف مکہ میں  
 ۴۲۸ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے  
 ۴۲۸ آخری منزل کے لیے جدوجہد کا طریقہ

## تفسیر سورۃ التین - ۹۵

- ۴۳۳ سورہ کا عمود اور مطالب کی ترتیب  
 ۴۳۵ آیات اتا ۸  
 ۴۳۵ ترجمہ آیات  
 ۴۳۶ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
 ۴۳۶ تین سے مراد جبل تین ہے  
 ۴۳۶ ذیتوں سے مراد کوہ زیتون ہے  
 ۴۳۷ طور سینا اور بلداہین  
 ۴۳۸ انسان بہترین صلاحیتوں سے راستہ ہے  
 ۴۳۹ جبل تین کی شہادت جزا پر  
 ۴۴۱ کوہ زیتون کی شہادت جزا پر  
 ۴۴۲ طور سینا کی شہادت جزا پر  
 ۴۴۳ بلداہین کی شہادت جزا پر  
 ۴۴۵ جزاء و سزا پر محکم دلیلیں  
 ۹۶ تفسیر سورۃ العلق

- ۴۰۱ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
 چیزوں کے جوڑے جوڑے ہوتے  
 ۴۰۱ سے استدلال  
 ۴۰۱ نیک اور بد کا انجام یکساں نہ ہوگا  
 ۴۰۲ نیکوں کے لیے آسانی کی منزل  
 ۴۰۳ بدوں کے لیے کٹھن منزل  
 ۴۰۴ بخیلوں کو تنبیہ  
 ۴۰۵ اتفاق کی صحیح شکل  
 ۴۰۶ خدا کے ہاں مقبول اتفاق

## تفسیر سورۃ الضحیٰ - ۹۳

- ۴۰۹ سورہ کا عمود اور سابق و لاحق سے تعلق  
 ۴۰۹ سورہ کے مطالب کا تجزیہ  
 ۴۱۱ آیات اتا ۱۱  
 ۴۱۱ ترجمہ آیات  
 ۴۱۲ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
 ۴۱۲ رات اور دن کی سازگاری کی دلیل  
 ۴۱۳ رنج و راحت تربیت کے لئے ضروری ہیں  
 ۴۱۳ وحی کے لیے نبی کا انتظار  
 ۴۱۴ غلبہ دین کی نشارت  
 ۴۱۵ نبی صلعم کی حالت نبی  
 ۴۱۶ تلاش حقیقت میں حضور کی سرگردانی  
 ۴۱۷ حقیقی غنا کا سرچشمہ ایمان ہے  
 ۴۱۸ انعاموں کا حق  
 ۴۱۹ تحدیث نعت

## تفسیر سورۃ الشرح - ۹۴



۴۷۳	سورہ کا زمانہ نزول
۴۷۴	سورہ کے مطالب کا تجزیہ
۴۷۷	آیات اتنا ۸
۴۷۷	ترجمہ آیات
۴۷۹	الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
	اہل کتاب و مشرکین کے ضدی لوگوں
۴۷۹	کاروبہ
	معجزہ کے مطالبہ کا جواب
۴۸۲	تفسیر میں تفسیر سے مراد
۴۸۳	ضدی لوگوں کے کبر و غرور پر ضرب
۴۸۴	اشکبار سے پاک مومنین کا صلہ

## تفسیر سورۃ الزلزال - ۹۹

۴۸۹	سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان
۴۹۱	آیات اتنا ۸
۴۹۱	ترجمہ آیات
۴۹۲	الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
۴۹۲	وقوع قیامت کے حوادث
۴۹۲	انسان کی بدحواسی کی تصویر
۴۹۳	زمین تمام ریکارڈ سادے گی
۴۹۳	ہر شخص خود جواب دہ ہوگا
۴۹۴	نیکیوں اور بدیوں کے جانچنے کا ضابطہ

## تفسیر سورۃ العنکبوت - ۱۰۰

۴۹۷	سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان
۴۹۹	آیات اتنا ۱۱
۴۹۹	ترجمہ آیات

۴۴۹	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق
۴۴۹	سورہ کے مطالب کا تجزیہ
۴۵۱	آیات اتنا ۱۹
۴۵۱	ترجمہ آیات
	الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
۴۵۳	قرأت قرآن کا مفہوم
۴۵۳	انسان کی خلقت سے دلیل
۴۵۵	اہل عرب پر خدا کا احسان
۴۵۶	قریش کے گنڈوں کی سرکشی
۴۵۸	سرکشوں کو تندالفاظ میں وعید
۴۵۹	سورہ کا زمانہ نزول

## تفسیر سورۃ القدر - ۹۷

۴۶۳	سورہ کا عمود اور مطالب کا تجزیہ
۴۶۵	آیات اتنا ۵
۴۶۵	ترجمہ آیات
	الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت
۴۶۶	لیلۃ القدر سے مراد
۴۶۷	لیلۃ القدر کی عظمت کی وجہ
۴۶۷	لیلۃ القدر کی برکات
۴۶۸	لیلۃ القدر کی تعیین میں اختلاف
۴۶۹	تقسیم امور کی رات
۴۶۹	اس رات میں شیاطین پابند ہوتے ہیں
	تفسیر سورۃ البینۃ - ۹۸
۴۷۳	سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق



الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات

۵۰۰ کی وضاحت

۵۰۰ جنگ گھوڑوں کی صفات سے استدلال

۵۰۲ انسان خدا کا ناشکرا ہے

۵۰۳ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے

۵۰۴ زبردست ناشکروں کو تنبیہ

تفسیر سورۃ القارعة - ۱۰۱

۵۰۹ سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

۵۱۱ آیات ۱ تا ۱۱

۵۱۱ ترجمہ آیات

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات

۵۱۲ کی وضاحت

۵۱۲ وقوع قیامت کی پہل

۵۱۳ ہر شخص پر نفسی نفسی کی کیفیت

۵۱۴ اس دن وزن نیک اعمال کا ہوگا

تفسیر سورۃ التکاثر - ۱۰۲

۵۱۹ سورہ کا عمود اور ترتیب بیان

۵۲۱ آیات ۱ تا ۸

۵۲۱ ترجمہ آیات

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

۵۲۲ معیار زندگی اونچا کرنے کا خبط

۵۲۳ سرکشگان دنیا پر افسوس

۵۲۳ غفلت کا اصل سبب

۵۲۴ اس دنیا میں صرف علم یقین حاصل ہوتا ہے

۵۲۴ قیامت میں نعمتوں کی پرکشش

تفسیر سورۃ العصر - ۱۰۳

۵۲۹ سورہ کا مضمون اور ترتیب بیان

۵۳۱ آیات ۱ تا ۳

۵۳۱ ترجمہ آیات

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

۵۳۲ تاریخ سے استدلال

۵۳۳ قانون مجازات

۵۳۴ ایمان کا مفہوم

۵۳۵ عمل صالح کا مفہوم

۵۳۶ انسان پر معاشرہ کا حق

۵۳۷ حق و صبر کا مفہوم

تفسیر سورۃ الہمزہ - ۱۰۴

۵۴۳ سورہ کا عمود اور ترتیب بیان

۵۴۴ بنجیل سرمایہ داروں کا کردار

۵۴۴ آیات ۱ تا ۹

۵۴۴ ترجمہ آیات

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

۵۴۸ 'ہمزہ لہزہ' کا مفہوم

۵۴۹ بنجیل سرمایہ داروں کی تصویر

۵۴۹ بنجیلوں کے باطن پر عکس

۵۵۰ بنجیلوں کے سرمایہ کا حشر

۵۵۰ خدا کی آگ کا خاص مزاج

تفسیر سورۃ الفیل - ۱۰۵

۵۵۵ سورہ کا مضمون اور سابق و لاحق سے تعلق



- ۵۸۱ ترجمہ آیات  
الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات  
۵۸۲ کی وضاحت  
۵۸۲ مکہ کے قارون - ابولہب - کا کردار  
آخرت کا منکر بے غرض اتفاق نہیں  
۵۸۲ کر سکتا  
۵۸۳ یتیم اور مسکین کا حق  
۵۸۳ بیت اللہ کے پرہیزوں کی بے فوج نماز  
ربا کاری اور سخت باطل نماز کی  
۵۸۴ علامت ہے  
۵۸۵ 'ماعون' کا مفہوم

## تفسیر سورۃ الکوثر - ۱۰۸

- ۵۸۹ سورہ کا عمود اور پیغمبر کو بشارت  
۵۹۱ آیات ۳  
۵۹۱ ترجمہ آیات  
۵۹۲ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
۵۹۲ لفظ کوثر کی تحقیق  
۵۹۳ کوثر کے باب میں فراہجی کا نقطہ نظر  
۵۹۴ کوثر اور کعبہ میں مماثلت کے دلائل  
کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری -  
۵۹۲ نماز اور اتفاق  
۵۹۴ اسلام کی کامیابی کی بشارت

## تفسیر سورۃ الکفرین - ۱۰۹

- ۶۰۱ سورہ کا عمود اور ردنا کی ترتیب  
۶۰۵ آیات ۲

- ۵۵۴ آیات ۵  
۵۵۴ ترجمہ آیات  
الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات  
۵۵۸ کی وضاحت  
۵۵۸ اصحاب الفیل سے مراد  
۵۵۸ ابرہہ اور اس کا کردار  
۵۵۹ ابرہہ کی چال اور اس کی ناکامی  
۵۶۰ اصحاب الفیل کی بربادی  
۵۶۱ 'ابابیل' سے مراد  
۵۶۱ ابرہہ کی فوج سے قریش کا مقابلہ  
۵۶۳ عبدالمطلب کا رب سے استغاثہ  
۵۶۵ ترتیب کلام میں تقدیم و تاخیر کا اسلوب

## تفسیر سورۃ الفلش - ۱۰۶

- ۵۶۹ سورہ کا عمود اور ترتیب بیان  
۵۷۱ آیات ۴  
۵۷۱ ترجمہ آیات  
۵۷۱ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت  
۵۷۲ 'ایلاف' کا مفہوم  
۵۷۳ قریش کی تجارتی سفر سے وابستگی  
۵۷۳ بیت اللہ کے ساتھ قریش کا تعلق  
۵۷۵ بیت اللہ کا حق - عبادت  
۵۷۵ 'جوع' اور 'خود' کا خاص مفہوم

## تفسیر سورۃ الماعون - ۱۰۷

- ۵۷۹ سورہ کا عمود، سابق و لاحق سے تعلق  
۵۸۱ آیات ۷



- ۴۲۷ یہ سورہ مدنی اور فتح مکہ کی بشارت ہے  
 ۴۲۸ آیات ۵  
 ۴۳۱ ترجمہ آیات  
 الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات  
 ۴۳۲ کی وضاحت  
 ۴۳۲ 'تبت پیدا' کا مفہوم  
 ابولہب کا ذکر نام کے ساتھ کرنے  
 ۴۳۳ کی جب  
 ۴۳۴ ابولہب کے زوال کی پیشین گوئی  
 ۴۳۶ ابولہب کی بیوی کا کردار  
 ۴۳۸ قیامت میں مجرموں کی حالت

## تفسیر سورۃ الاخلاص - ۱۱۲

- سورہ کا عمود، ترتیب میں اس کا مقام  
 ۴۴۳ اور زمانہ نزول  
 ۴۴۴ آیات ۴  
 ۴۴۴ ترجمہ آیات  
 الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات  
 ۴۴۸ کی وضاحت  
 ۴۴۹ توحید کے بارے میں جامع اعلان  
 ۴۵۰ اللہ احد کا مفہوم  
 ۴۵۰ اللہ الصمد کا مفہوم  
 ۴۵۱ نصاریٰ کی گمراہی  
 ۴۵۲ خدا کا صحیح تصور

## تفسیر سورۃ الفلق - ۱۱۳

- سورہ کا مضمون اور سابق و لاحق سے تعلق ۴۵۵

- ترجمہ آیات  
 الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات  
 ۴۰۶ کی وضاحت  
 ۴۰۶ انہ کفر سے خطاب اتمام حجت کے لیے  
 اعلان براءت بڑی احتیاط کا  
 ۴۰۷ متقاضی ہے  
 شرک حقیقت میں کفر ہے  
 شرک کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم  
 ۴۰۸ کا دو ٹوک رویہ  
 ۴۱۱ شرک سے آشکارا اعلان براءت  
 تفسیر سورۃ النصر - ۱۱۰

- سورہ کا عمود اور مطالب کا خلاصہ  
 ۴۱۵ آیات ۳  
 ۴۱۹ ترجمہ آیات  
 الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات  
 ۴۲۰ کی وضاحت  
 ۴۲۰ اللہ تعالیٰ کی مدد کی بشارت  
 فتح و نصرت تا یبدا الہی سے حاصل  
 ۴۲۱ ہوتی ہے  
 ۴۲۲ فتح مکہ کے اثرات  
 ۴۲۳ فتح مکہ کی نعمت کی ذمہ داری  
 ۴۲۳ حضور کی فریضہ دعوت سے سبکدوشی  
 ۴۲۴ حضرات انبیاء کی لغزشوں کی نوعیت

## تفسیر سورۃ اللہب - ۱۱۱

- سورہ کا عمود اور مطالب کا خلاصہ ۴۲۷



۶۶۵	نبی پر جادو ہونے کی روایت کا سقم	۶۵۵	معوذتین خزانہ توحید کی محافظ ہیں
	تفسیر سورۃ التاس - ۱۱۴	۶۵۹	آیات ۱ تا ۵
۶۶۱	سورہ کا عمود اور اس کے امتیازی پہلو	۶۵۹	ترجمہ آیات
۶۶۳	آیات ۱ تا ۶		الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات
۶۶۳	ترجمہ آیات	۶۶۰	کی وضاحت
	الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات	۶۶۰	’فلق‘ کا وسیع مفہم
۶۶۴	کی وضاحت		مخلوقات کے شر سے پناہ داتی دے
۶۶۴	اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے حقوق	۶۶۰	سکتا ہے
۶۶۴	شیطان کے شر سے پناہ	۶۶۱	شر کا وجود مستقل بالذات نہیں
۶۶۵	شیطان کا خاص کردار	۶۶۲	روحانی آفات سے پناہ مانگنے کا طریقہ
۶۶۷	شیطان کی ذات برادری	۶۶۳	ٹوٹے ٹوٹکے اور اعمال مفلحہ کا شر
		۶۶۳	حاسدوں کے حسد کا شر